رحمت دارین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے
سو شیدائی رضی اللہ عنہ
طالب الہاشمی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رحمتِ دارین صلی اللہ علیہ وسلم کے

سو شیدائی رضی اللہ عنہم

رحمتِ دارین صلی اللہ علیہ وسلم کے

سو شیدائی رضی اللہ عنہم

تالیف

طالب ہاشمی

البدر پبلی کیشنز

23 راحت مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

فون: 042-37225030-37245030-0333-4173066

☆ نام کتاب — رحمت دارین ﷺ کے سو شیدائی رضی اللہ عنہم
☆ مصنف — طالب ہاشمی
☆ ناشر — علی سعید
☆ اشاعت — جولائی 2014ء
☆ مطبع — علی اعجاز پرنٹرز لاہور
☆ ہدیہ — -/600 روپے

فہرست مضامین

فہرست اسمائے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بلحاظ حروفِ تہجی

(ب)

(ث)

(ج)

(ح)

(خ)

(ذ)

(ز)

(س)

(ش)

(ض)

(ط)

(ع)

انتساب

اپنی والدہ ماجدہ کے نام جن کی

پُرخلوص مشفقانہ دُعاؤں کی دولت مجھ ہیچمدان کو یہ توفیق نصیب ہوئی کہ ایک سو ۱۰۰ سے زائد صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے نقوشِ سیرت ان اوراق پر سجا سکا۔

میں بارگاہِ ربُّ العزت میں نہایت عجز والحاح سے دعا کرتا ہوں کہ وہ میری والدہ ماجدہ کو دنیا و آخرت میں اپنی رحمت و مغفرت سے نوازے۔ قارئینِ کرام سے استدعا ہے کہ وہ بھی اس دعا میں میرے ساتھ شریک ہو کر عند اللہ ماجور ہوں..........

ناچیز: طالب ہاشمی

۲۰ ر دسمبر ۱۹۸۲ء

آہ! میری مادرِ مہربان ۱۳ ر ذیقعدہ ۱۴۰۸ مطابق ۲۸ ر جون ۱۹۸۸ء کو خالقِ حقیقی کے حضور پہنچ گئیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

اس کتاب کے تمام پڑھنے والوں سے التجا ہے کہ وہ میری والدہ مرحومہ کے لیے صدقِ دل سے دعائے مغفرت کریں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اجرِ جزیل سے نوازے گا...... دلفگار: طالب ہاشمی

۱۶ ر ذیقعدہ ۱۴۰۸ھ بمطابق
یکم جولائی ۱۹۸۸ء

اللہ اُن سے راضی ہوا

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۝

وہ مہاجر و انصار جنہوں نے سب سے پہلے دعوتِ ایمان پر لبیک کہنے میں سبقت کی، نیز وہ جو بعد میں راست بازی کے ساتھ اُن کے پیچھے آئے، اللہ اُن سے راضی ہوا، اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ اللہ نے اُن کے لیے ایسے باغ مہیا کر رکھے ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہی وہ عظیم الشان کامیابی ہے۔

(سورۃ التوبہ)

اصحابِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ مَنْ كَانَ مُسْتَنًّا فَلْيَسْتَنَّ بِمَنْ قَدْمَاتَ فَإِنَّ الْحَيَّ لَا تُؤْمَنُ عَلَيْهِ الْفِتْنَةُ أُولٰٓئِكَ اَصْحَابُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانُوْا اَفْضَلُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اَبَرَّهَا قُلُوْبًا وَاَعْمَقَهَا عِلْمًا وَاَقَلَّهَا تَكَلُّفًا اِخْتَارَهُمُ اللّٰهُ لِصُحْبَةِ نَبِيِّهٖ وَلَا قَامَةِ دِيْنِهٖ فَاعْرِفُوْا لَهُمْ فَضْلَهُمْ وَاتَّبِعُوْهُمْ عَلٰى اَثَرِهِمْ وَتَمَسَّكُوْا بِمَا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ اَخْلَاقِهِمْ وَ سِيَرِهِمْ فَاِنَّهُمْ كَانُوْا عَلَى الْهُدَى الْمُسْتَقِيْمِ ۔ (رواہ رزین، مشکوۃ باب الاعتصام ص ۳۲)

''حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جو شخص کسی کی راہ پر چلنا چاہے تو اسے ان لوگوں کی پیروی کرنا چاہیے جو فوت ہو چکے ہیں کیونکہ زندہ فتنے سے محفوظ نہیں اور وہ (قابلِ اتباع فوت شدہ لوگ) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں وہ اُمت میں سب سے افضل تھے، اُن کے دل بہت نیک تھے ان کا علم نہایت عمیق تھا اور ان میں تکلفات بہت کم تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت اور دین کی اقامت کے لیے پسند فرمایا تھا پس تم ان کی فضیلت کو سمجھو اور پہچانو! ان کے آثار کی پیروی کرو اور جہاں تک ہو سکے ان کی عادات اور اخلاق کو مضبوطی سے پکڑو! وہ یقیناً راہِ مستقیم پر تھے۔''

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ○

جسٹس پیر محمد کرم شاہ صاحب
ایم اے آنرز (الازہر) سجادہ نشین بھیرہ

سرِ آغاز

ہمارے محترم ومکرم دوست جناب مولینا طالبؔ ہاشمی کا اسمِ گرامی آج کسی تعارف اور تعریف کا احتیاج مند نہیں۔ ہمارے دینی ادب اور بالخصوص اسلامی تاریخ کے موضوعات پر اُن کا نام نہ صرف مشہور اور معروف ہے بلکہ علمی حلقوں میں بہت حد تک مقبول اور ہر دلعزیز بھی ہو چکا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ جناب طالبؔ ہاشمی کا نام اور تاریخ اسلام کا موضوع آج لازم وملزوم کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں تو اس میں ہرگز کسی مبالغے کا شائبہ نہ ہوگا۔ اس دعوے کا ثبوت یہ ہے کہ جناب طالبؔ ہاشمی نے گزشتہ ربع صدی کے دوران میں تاریخ اسلام کے متعدد اہم پہلوؤں پر نہایت بلیغ پیرائے میں جو گرانقدر معلومات فراہم کی ہیں انہوں نے اُردو ادب کے دامن کو مالا مال کر دیا ہے۔

اس سے پیشتر اُن کے خامہ تحقیق سے جو قابلِ قدر تالیفات منظرِ عام پر آ چکی ہیں، ان میں .... تیس ۳۰ پروانے شمعِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے، خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم کے چالیس ۴۰ جان نثار رضی اللہ عنہم، سیرت حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ، سیرت حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، سیرت حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما، تذکارِ صحابیات رضی اللہ عنہن، سلطان نور الدین زنگی رحمۃ اللہ علیہ، سلطان ملک شاہ سلجوقی، الملک الظاہر بیبرس، تذکرۂ بابا فرید الدین مسعود گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ، حکایاتِ صوفیہ، حکایات سعدی رحمۃ اللہ علیہ، حکایاتِ رومی رحمۃ اللہ علیہ، اخلاقِ پیغمبری، ارشاداتِ دانائے کونین صلی اللہ علیہ وسلم، سوزِ جامی رحمۃ اللہ علیہ، سفر نامہ آخرت، تذکرہ خواجہ

اجمیری رحمۃ اللہ علیہ، تذکرہ شاہِ جیلاں رحمۃ اللہ علیہ، معجزاتِ سرورِ کونین ﷺ، سیرت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، یہ تیرے پُر اسرار بندے، صحابیات رضی اللہ عنہن و عارفات رضی اللہ عنہن، اور ابو یوسف یعقوب المنصور باللہ شامل ہیں۔

زیرِ نظر کتاب ''رحمتِ دارین ﷺ کے سو ۱۰۰ شیدائی رضی اللہ عنہم'' سرورِ کائنات سرکارِ دو عالم، خیر البشر، رحمۃ للعلمین، شافع المذنبین، سیّد الانبیاء والمرسلین حضور محمد مصطفٰے احمدِ مجتبٰے ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مبارک زندگیوں اور اُن کے واقعات و حالات کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ موضوع اپنی اہمیت کے اعتبار سے جس قدر وسیع اور وقیع ہے۔ اس سے کون مسلمان بے خبر ہوگا جبکہ اس دانائے سُبل، مولائے کل اور ختم الرسل ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ:

اَصْحَابِیْ كَالنُّجُوْمِ بِاَيِّهِمِ اقْتَدَيْتُمْ اِهْتَدَيْتُمْ

''میرے سب ساتھی ستاروں کی مانند ہیں۔ سو تم اُن میں سے کسی کی پیروی کرو گے، ہدایت پاؤں گے۔''

ان سطور میں جناب طالبؔ ہاشمی کی جن کتابوں کے نام سامنے آئے ہیں، اُن میں سے تیس ۳۰ پروانے شمعِ رسالت ﷺ کے، خیر البشر ﷺ کے چالیس ۴۰ جان نثار رضی اللہ عنہم، سیرتِ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ، سیرتِ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور سیرت حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مبارک تذکروں ہی کے موضوع پر ہیں۔ زیرِ نظر کتاب کا موضوع بھی اصحابِ رسول ﷺ کے حالاتِ مبارکہ ہیں۔

یہ ایک ایسا موضوع ہے، جس کی اہمیت اپنی جگہ پر اس قدر واضح ہے کہ اس کے ذکر کی زیادہ ضرورت محسوس نہیں ہونی چاہیے لیکن یہ پہلو کس قدر وجہ تاسف ہے کہ اس سے پیشتر اس پر اس قدر توجہ نہیں دی گئی جس قدر اس کی ضرورت تھی۔ خاص طور پر ہماری قومی زبان اُردو میں اس سلسلے میں جناب طالبؔ ہاشمی سے پہلے زیادہ کام نہیں کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس نہایت اہم اور مہتم بالشان موضوع کا مطالعہ کرنے اور خصوصاً

تحقیق کے اشتیاق مندوں کو عربی مآخذ کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا اور ظاہر ہے کہ عربی کتابوں سے براہِ راست استفادہ کر سکنے والوں کی تعداد ہمارے یہاں معدود اور محدود ہے۔

عربی میں اس موضوع پر جو قابلِ ذکر کتب موجود ہیں اُن میں سے ''اُسد الغابہ''، ''طبقات الکبیر''، ''الاصابہ فی تمییز الصحابہ'' اور ''الاستیعاب فی معرفتہ الاصحاب'' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اُردو میں جناب طالبؔ ہاشمی سے پہلے ہمارے وطنِ عزیز میں کسی نے اس سلسلے میں اس پیمانے پر کام نہیں کیا۔ اس سلسلے میں جو تھوڑا بہت کام ہوا ہے، وہ بھارت میں ہوا ہے۔ پاکستان میں یہ سعادت صرف اور صرف جناب طالب ہاشمی کے حصے میں آئی ہے۔ اس اعتبار سے جناب طالب ہاشمی اپنی ذات میں ایک ادارہ ہیں۔ اُن کی یہ کتابیں پڑھنے کے بعد اس حقیقت کا اندازہ کرنے میں زیادہ مشکل پیش آئے گی کہ وہ اس میدان میں کس قدر نمایاں اور کس درجہ قابلِ قدر کام کر چکے ہیں۔ جناب طالب ہاشمی نے خاص طور پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور صحابیات رضی اللہ عنہن کے حالاتِ زندگی فراہم کرنے میں جس قدر تحقیق اور کاوش و کوشش سے کام لیا ہے۔ اس کے جزئیات اور تفاصیل کا اندازہ کر کے موضوع سے اُن کے قلبی لگاؤ کا اندازہ مشکل نہیں۔ اس سلسلے میں جناب طالب ہاشمی کی ہر کتاب اپنے موضوع پر معلومات کا ایسا دائرۃ المعارف ہے جس میں سراسر افادیت ہی افادیت ہے۔ اس میں مشامِ جان کو معطر کرنے والی خوشبو بھی ہے اور قلب و نظر کو جلا بخشنے کا سامان بھی۔

میں جناب طالبؔ ہاشمی کے اسلوب تحریر اور اُن کی کتابوں کی زبان و بیان کے بارے میں صرف اس قدر گواہی دینا چاہتا ہوں کہ وہ سادہ، آسان اور دلکش ہے۔ وہ اس انداز سے لکھتے ہیں کہ کہیں اغلاق یا ابہام کا شائبہ تک نہیں ہوتا اور ہر بات آئینہ ہوتی چلی جاتی ہے۔

جناب طالب ہاشمی کی ہر کتاب اور خصوصاً صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالاتِ مبارکہ پر ان کی تالیفات جس بے پناہ مطالعے اور عرق ریزی سے معرضِ وجود میں آئی ہیں، اُن کا اقتضاء ہے کہ ہمارے اہلِ وطن ان کے مطالعے سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کریں۔ خاص طور پر مسلمان طلباء و طالبات کی تعمیرِ سیرت اور تشکیلِ کردار کے لیے ہمارے تعلیمی اداروں کے کتب خانوں میں اس قسم کی کتابوں کا موجود ہونا بہت زیادہ ضروری ہے۔

آخر میں جناب طالب ہاشمی اور ان کی علمی کاوشوں کے سلسلے میں میری دلی دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کی محنت و کوشش کو زیادہ سے زیادہ بار آور فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

محمد کرم شاہ
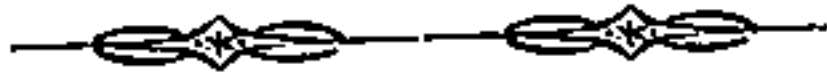
بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی صاحب

حرفِ چند

محترمی جناب طالبؔ ہاشمی صاحب کا غائبانہ تعارف تو بہت پہلے کا ہے گو حتمی مدت یاد نہیں تاہم اندازہ ہے کہ ۸/۱۰ سال تو یقیناً ہو رہے ہیں جب سے مختلف جرائد و رسائل میں حضرات صحابہ کرام علیہم الرضوان سے متعلق ان کے طویل وہ مختصر مقامات پڑھ رہا ہوں۔ ہر مقالہ متانت و سنجیدگی کا شاہکار ہوتا ہے اور ہم میں صحابہ علیہم الرضوان سے کمال درجہ کی عقیدت و شیفتگی کے ساتھ ساتھ تحقیقی رنگ نمایاں ہوتا ہے...... مقالات کے علاوہ ان کی ایک آدھ کتاب بھی اس زمانہ میں نظر سے گزری اور ۴/۵ برس سے ملاقات بھی ہے اور نیاز مندی بھی۔ نیاز مندی کا بڑا سبب یہی ہے کہ وہ اپنی مشکل ترین منصبی ذمہ داریوں کے باوصف ''جماعتِ حقہ راشدہ'' حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ثنا خواں اور ان کے نقوش ہائے سیرت اجاگر کرنے میں منہمک ہیں۔ حضرت ابوزرعہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے بقول صحابہ رضی اللہ عنہم ہی تو ہمارا سرمایہ ہیں کہ نزولِ قرآن کے عینی گواہ صرف وہ ہیں اور ان کی بات پر اعتماد کیے بغیر اسلام کی عمارت قائم نہیں رہتی...... چنانچہ دیکھا گیا کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر اب تک جتنے ملحد، بے دین اور بدعتی طبقات پیدا ہوئے، ان سب نے اپنے تیر و نشتر کی ابتداء کسی نہ کسی ذریعہ سے اس جماعتِ مقدسہ سے کی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے جن نفوسِ قدسیہ کو اپنے آخری نبی علیہ السلام والصلوٰۃ کی صحبت و رفاقت کا شرف بخشا وہ ظاہر ہے لاوارث نہیں...... قدرت ہر زمانے میں ایسے لوگ پیدا کر دیتی ہے جو اپنی تمام تر کاوشوں کا محور ان نفوسِ قدسیہ کو بنا کر ان کی

سیرتِ مبارکہ اور حیاتِ مقدسہ کی محققانہ انداز سے تشہیر کرنے میں لگ جاتے ہیں اور جن کو یہ توفیق ہو جائے ان کی خوش نصیبی وسعادت مندی کا کیا ٹھکانہ؟ نبی مکرم علیہ السلام کا ارشادِ گرامی ہے:

"جب بدعات وفتن کا ظہور وشیوع ہو جائے اور لوگ میرے اصحاب کو کوسنے لگیں تو اہلِ علم پر ان کا دفاع لازم ہے ورنہ وہ اللہ تعالیٰ ملائکہ عظام اور تمام انسانوں کی لعنت کا مورد بن جائیں گے اور قیامت کے دن ان کی کوئی بھی نیکی قابل قبول نہیں ہوگی۔"

اور ظاہر ہے کہ جن کی وساطت سے نیکیوں کا تصوّر نصیب ہوا جب ان کی عزت کا تحفظ نہ ہوگا تو نیکی قبول کیسے ہوگی؟...... اس لیے وہ حضرات بڑے ہی سعادت منداور خوش قسمت ہیں جو مصلحتوں سے ماورا ہو کر ان بزرگوں کی سیرت نگاری کا فریضہ انجام دینے میں لگ جائیں...... طالب ہاشمی صاحب ایسے ہی حضرات میں سے ہیں اور ان کی قسمت پر جتنا رشک کیا جائے کم ہے۔ موصوف تاریخ وسیر کے بنیادی ذخیروں سے جان نثارانِ مصطفیٰ ﷺ کے حالات جمع کرتے ہیں، کوثر وتسنیم میں ڈھلی ہوئی زبان استعمال میں میں لاتے ہیں اور ایسا حسین گلدستہ بنا کر پیش کر دیتے ہیں کہ "دامنِ دل می کشد" والی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے...... محض اس پاکیزہ موضوع پر ان کی چھ کتابیں سارے ملک کے اہلِ علم سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ یعنی خیر البشر ﷺ کے چالیس ۴۰ جان نثار، شمعِ رسالت ﷺ کے تیس ۳۰ پروانے، تذکارِ صحابیات رضی اللہ عنہن، سیرت حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، سیرت حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ، اور سیرت حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما۔

اب یہ ساتویں کتاب آ رہی ہے جس میں رحمتِ دارین کے سوشیدائیوں کا ذکر ہے ...... اس کے لیے چند سطور لکھنے کا احقر کو حکم ہوا تو اپنی نااہلی کے باوصف آمادہ ہو گیا...... مقصد محض یہ ہے کہ ان بلانوشانِ محبت کی سیرت وکردار پڑھنے والے تاثراتی دنیا میں کھو

کر جب مرتب و مصنف کے لیے دستِ دعا بلند کریں گے تو ان سطور کا راقم بھی تھوڑے بہت حصہ کا مستحق ہو کر اپنی اور اپنے اعزہ و احباب کی نجاتِ اُخروی کا امیدوار ہو سکے گا۔

بر کریماں کارہا دشوار نیست

خاکپائے اصحابِ نبی ﷺ

محمد سعید الرحمٰن علوی

۱۲ر صفر المظفر ۱۴۰۳ھ

۲۹ر نومبر ۱۹۸۲ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ ۔

عرضِ مؤلّف

قرآنِ حکیم کے بعد ہمارے لیے ہدایت ورہنمائی کا سرچشمہ صاحبِ قابَ قوسین، سیّدالانام خیرالخلائق رحمتِ دوعالم فخرِ موجودات حضور محمد مصطفےٰ ﷺ کی ذاتِ پاک اور آپ ﷺ کا اسوۂ حسنہ کا عملی نمونہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں جنھوں نے حضور پُرنور ﷺ کے جمالِ جہاں آرا سے اپنی آنکھیں روشن کیں اور جن کی تعلیم و تربیت اور تزکیہ وتصفیہ کے لیے خود سرورِ کونین ﷺ کو معلّم و مزکّی، استاذ ونگران مقرر کیا گیا۔ سورۂ آلِ عمران میں ارشاد ہوا ہے:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ

(سورۂ آلِ عمران، رکوع: ۱۷)

(تحقیق اللہ نے احسان کیا مومنوں پر جو بھیجا ان میں ایک رسول ان ہی میں سے کہ پڑھتا ہے ان پر اس کی آیتیں اور پاک کرتا ہے ان کو اور تعلیم کرتا ہے ان کو کتاب اور حکمت کی۔)

سیدالمرسلین ﷺ کے فیضِ صحبت اور تعلیم وتربیت کی بدولت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین عظمت کے پہاڑ اور راہِ حق کے جانباز سپاہی بن گئے۔ انہوں نے اقامتِ دین اور پرچمِ حق کی سربلندی کے لیے ایسی فقید المثال قربانیاں دیں کہ ان کا انفرادی اور اجتماعی کردار تا قیامت اُمّتِ مسلمہ کے لیے مشعلِ راہ بن گیا۔ ان نفوسِ قدسی کو اللہ تعالیٰ

نے اپنے محبوب اور پسندیدہ بندے قرار دیا اور ان کی مخالفت کو رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کے مترادف ٹھہرایا۔ سورۃ النساء میں فرمایا گیا ہے:

وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى (سورۃ النساء۔ رکوع:۱۳)

(اور جو مخالفت کرے رسول ﷺ کی جب کہ اس کے سامنے ہدایت کھل چکی ہو اور چلے مومنوں کی راہ چھوڑ کر، ہم اسے پھیر دیں گے جس طرف پھرتا ہے)

گویا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جس راستے پر چل رہے ہیں وہ رسول اللہ ﷺ کا راستہ ہے اور ان کی سیرت و کرداری اور اخلاق و اعمال رسولِ برحق ﷺ کی متابعت اور اُسوۂ حَسنہ کے عکاس ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درجات میں باہم فرق ہے لیکن ان کی صداقت، دیانت، اللہیت، عدالت ثقاہت اور ان کے اخلاص و تقویٰ پر تمام صحیح العقیدہ مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ انبیاء علیہم السّلام کے بعد اللہ کے ان پاکباز بندوں سے بہتر کسی انسان پر سورج طلوع نہیں ہوا اور ان کی صداقت و عدالت پر مکمل اعتقاد دین کا بنیادی تقاضا ہے ان کی محبت عین محبتِ رسول ﷺ ہے اور ان کی مخالفت عین مخالفتِ رسول ﷺ...... حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

''اللہ سے ڈرو اللہ سے ڈرو میرے صحابہ کے معاملہ میں، ان کو میرے بعد ہدفِ تنقید نہ بناؤ کیونکہ جس نے ان سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے ان سے بغض رکھا اس نے مجھ سے بغض رکھا اور جس نے ان کو اذیت پہنچائی اس نے اللہ کو اذیت پہنچائی اور جس نے اللہ کو اذیت پہنچائی قریب ہے کہ اللہ اس کو پکڑے۔''

سرورِ کونین ﷺ کے ان ارشاداتِ گرامی کے ساتھ صحیح بخاری کی یہ حدیث بھی ملاحظہ فرمایئے:

''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کسی شخص نے نبی ﷺ سے دریافت کیا، قیامت کب آئے گی۔ آپ ﷺ نے فرمایا، تم نے قیامت کے لیے کیا سامان مہیا کیا ہے۔ عرض کیا، میں تو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا، بس جس سے محبت رکھتے ہو اس کے ساتھ تمہارا حشر ہو گا۔

راوی (حضرت انس رضی اللہ عنہ) کہتے ہیں کہ نبی ﷺ کا یہ ارشاد سن کر ہم لوگوں کو اس قدر خوشی ہوئی کہ کبھی دوسری بات سے نہیں ہوئی۔ مجھے اُمید ہے کہ نبی ﷺ اور حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے محبت کے باعث میں ان کے ساتھ ہوں گا، اگرچہ میرے اعمال ان جیسے نہیں ہیں۔''

گویا صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے محبت قیامت کے دن شفیع المذنبین ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی معیت کی ضامن ہے۔ علامہ خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''الکفایہ فی فنون الروایہ'' میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل و مناقب میں بہت سی آیات و احادیث لکھنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

''یہ تمام دلائل (جو بیان کیے گئے) قطعی طور پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عادل ہونے کا تقاضا کرتے ہیں۔ اصحابِ رسول رضی اللہ عنہم میں سے کوئی ایک بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عادل قرار دیئے جانے کے بعد مخلوق کی تعدیل کا محتاج نہیں ہے۔ ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں اگر اللہ و رسول ﷺ کے وہ ارشادات بھی وارد نہ ہوئے ہوتے جن کا ہم نے ذکر کیا ہے اور جن میں ان کی مدح اور توصیف و توثیق کی گئی ہے۔ تب بھی ان کے جو حالات تھے یعنی اللہ کی راہ میں جہاد، ہجرت و نصرت، جان و مال کی قربانی، اللہ کی رضا کے لیے اپنے آباء اور اولاد کے قتل پر آمادہ ہو جانا اور دین کی خیر خواہی اور اللہ رسول کی وفاداری اور ایمان و یقین کی قوت...... تو جو شخص بھی ان کے

حالات کو پیشِ نظر رکھے گا وہ قطعی طور پر ان کے عادل ہونے اور ان کے پاک دامن ہونے کا فیصلہ کرے گا اور یہ حضرات تمام بعد میں آنے والوں سے افضل ہیں اس پر جمہور علماء کا اتفاق ہے۔"

مختصر یہ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رحمتِ دارین ﷺ کے فیضِ صحبت سے شرفِ انسانی کی جیتی جاگتی تصویر بن گئے تھے۔ وہ نہ صرف ارفع و اعلیٰ اخلاق، حسنِ معاملت، حسنِ معاشرت، زہد و اتقا اور خوفِ خدا کے پیکر تھے بلکہ عسکری اور انتظامی صلاحیتوں سے بھی پوری طرح بہرہ ور تھے۔ انہوں نے اپنی عظمتِ کردار کے جو نقوش صفحہ تاریخ پر مرتسم کیے انہیں ملتِ اسلامیہ دینی، علمی، اخلاقی سیاسی، عسکری ہر شعبہ حیات میں دنیا کے سامنے فخر کے ساتھ پیش کر سکتی ہے۔ ان نفوسِ قدسی نے فوز و فلاح کے جو چراغ روشن کیے ان کی روشنی میں ہم کسی وقت کے بغیر اپنی منزلِ مقصود کا رُخ متعین کر سکتے ہیں۔ یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل و مناقب، اخلاق و اعمال اور قابلِ رشک کارنامے ہی تھے جنھوں نے سب سے پہلے محدّثین اور علماء متقدمین کو ان کے حالات و سوانح محفوظ کرنے کی طرف متوجہ کیا۔ چنانچہ انہوں نے "سیرَ الصحابہ رضی اللہ عنہم" کے موضوع پر بہت سی گرانقدر تصانیف دنیا کے سامنے پیش کیں۔ ان میں سے مندرجہ ذیل کتابیں خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں:

اسماء الصحابہ رضی اللہ عنہم (امام بخاری) طبقات الکبیر (ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ کاتب الواقدی)، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (حافظ ابنِ عبدالبر القرطبی رحمۃ اللہ علیہ)، اُسدُ الغابہ فی معرفۃ الصحابہ (علّامہ عزالدین ابن الاثیر رحمۃ اللہ علیہ)، سیر اعلام النبلاء (علّامہ شمس الدین محمد الذہبی رحمۃ اللہ علیہ)، تجرید اسماء الصحابہ رضی اللہ عنہم (علّامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ)، الاصابہ فی تمییز الصحابہ (حافظ ابنِ حجر العسقلانی رحمۃ اللہ علیہ)

یہ تمام کتابیں عربی زبان میں ہیں۔ اردو زبان میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم و صحابیات رضی اللہ عنہن

کے حالات وسوانح کو ایک خاص نظم اور ترتیب کے ساتھ پیش کرنے کا اعزاز سب سے پہلے دارالمصنفین اعظم گڑھ (بھارت) کو حاصل ہوا۔ اس ادارے نے آج سے ساٹھ ستر سال پہلے ''سیر الصحابہ رضی اللہ عنہم'' اور ''سیر الصحابیات رضی اللہ عنہن'' کے موضوع پر متعدد بلند پایہ کتابیں شائع کیں جنھوں نے اہلِ علم (خصوصاً اردو دان طبقہ) سے بجا طور پر زبردست خراجِ تحسین وصول کیا۔ ان کتابوں کی افادیت اور اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے لیکن ان کا مطالعہ کرتے ہوئے دو باتیں میں نے شِدّت سے محسوس کیں۔ ایک یہ کہ ان کتابوں کی زبان عالمانہ ہے اور ایک خاص ذہنی سطح اور علمی قابلیت کے لوگ ہی ان سے استفادہ کر سکتے ہیں...... دوسری یہ کہ ان کتابوں کی پہلی اشاعت (ایڈیشن) کے مندرجات ہی کو حرفِ آخر سمجھ لیا گیا اور ان پر کبھی نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس نہ کی گئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلی اشاعت میں جو تسامحات رہ گئے وہ بعد کی اشاعتوں میں بھی موجود چلے آرہے ہیں۔ میں یہاں اس قسم کے تسامحات کی صرف چند مثالیں دینے پر اکتفا کروں گا۔

(۱) مہاجرین رضی اللہ عنہم حصہ دوم...... ترجمہ: حضرت شرحبیل بن حَسَنہ رضی اللہ عنہ

''ان کی ماں نے سفیان انصاری سے شادی کر لی تھی۔'' غلط ہے۔ صحیح یہ ہے کہ حضرت سفیان انصاری رضی اللہ عنہ نہیں تھے بلکہ مکہ کے رہنے والے تھے اور قریش کی شاخ بنو جمح سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا پورا نام سفیان بن معمر جمحی ہے۔ السابقون الاوّلون میں سے ہیں۔

(۲) سیر الصحابہ رضی اللہ عنہم حصہ ہفتم...... ترجمہ: حضرت عروہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ

''۸ھ میں جب آنحضرت ﷺ غزوۂ تبوک سے واپس ہو رہے تھے تو واپسی میں عروہ رضی اللہ عنہ بھی پیچھے ہو لیے اور مدینہ پہنچنے سے قبل آپ ﷺ سے مل کر مشرّف باسلام ہو گئے۔'' غلط

صحیح یہ ہے کہ حضرت عروہ رضی اللہ عنہ ۸ھ میں حضور ﷺ کے غزوۂ طائف سے واپسی

کے سفر میں مسلمان ہوئے۔

غزوۂ تبوک ۹ھ میں پیش آیا۔ اس سے پہلے حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کو ان کی قوم نے اسلام لانے کے "جرم" میں شہید کر ڈالا تھا۔

(۳) سیر الصحابہ رضی اللہ عنہم حصہ ہفتم...... ترجمہ حضرت کعب رضی اللہ عنہ و بجیر رضی اللہ عنہ

"باپ کا نام زبیر تھا۔ نسب نامہ یہ ہے کعب بن زبیر رضی اللہ عنہ"

حضرت کعب رضی اللہ عنہ کے باپ کا نام زہیر تھا (زہیر بن ابی سلمٰی عرب کا نامور شاعر) نہ کہ زبیر۔

(۴) سیر انصار رضی اللہ عنہم جلد اوّل...... ترجمہ حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ

"سیّد القرآء، سیّد الانصار اور سید المرسلین القاب ہیں۔"

اس فقرے میں "سید المرسلین" فاحش غلطی ہے۔ یہاں سیّد المسلمین ہونا چاہیے تھا۔

(۵) سیر انصار رضی اللہ عنہ جلد اوّل...... ترجمہ حضرت احیرم رضی اللہ عنہ

صحیح لفظ احیرم نہیں بلکہ اُصَیرِم (الاصَیرِم) ہے لیکن مضمون میں عنوان کے علاوہ ہر جگہ احیرم ہی لکھا گیا ہے۔

ان معروضات سے حاشا وکلا میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ دارالمصنفین کے مہتم بالشان کام کی تنقیص کی جائے یا اس کی اہمیت کو گھٹایا جائے بلکہ میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس کام کے یہ دو پہلو (جو اوپر بیان کیے گئے ہیں) میرے دل میں یہ تحریک پیدا کرنے کا باعث ہوئے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور صحابیات رضی اللہ عنہن کے حالات پیش کرنے کے لیے ایک خاص اُسلوبِ نگارش اختیار کیا جائے۔ ایسا اُسلوب جو عام فہم بھی ہو اور دلنشین بھی۔ اس کی تاثیر سے دل پگھل جائیں اور ان میں سبقت الی الخیر کا جذبہ موجزن ہو جائے۔

کئی سال تک یہ تحریک میرے دل میں پرورش پاتی رہی لیکن اس کو عملی صورت دینے میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی رکاوٹ پیش آ گئی۔

مملکتِ خداداد پاکستان کے قیام کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم و صحابیات رضی اللہ عنہن خیر البشر ﷺ کے انوارِ سیرت کو اس طرح پھیلایا جاتا کہ اس ملک کا گوشہ گوشہ ان سے جگمگا اٹھتا لیکن بدقسمتی سے ہوا یہ کہ وطنِ عزیز کے بعض طبقوں نے تحقیق کے پردے میں ان محسنین اُمت رضی اللہ عنہ کو ہدفِ طعن بنانے کا مشغلہ اختیار کرلیا۔ غضب یہ کہ ان میں کچھ ایسے لوگ بھی شامل ہوگئے جو اہلِ سُنّت ہونے کے دعویدار تھے۔ انہوں نے ناپختہ ذہن لوگوں کی نظروں میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مقام و مرتبہ گھٹانے کے لیے جو مذموم طریقہ اختیار کیا اسے دام ہمرنگِ زمین کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ یہ لوگ علمبردار تو بنتے تھے تحفظِ ناموسِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیکن فی الحقیقت وہ ناموسِ صحابہ رضی اللہ عنہم کو بگاڑنے کے درپے تھے۔ اس صورتِ حال نے مجھے بے تاب کردیا اور میں نے عزم بالجزم کرلیا کہ کسی بحث اور مناظرے میں الجھے بغیر اپنی تمام توانائیاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، صحابیات رضی اللہ عنہن، سلفِ صالحین اور اکابرِ اُمت کے انوارِ سیرت کو پھیلانے میں صرف کروں گا۔ چنانچہ آج سے چوبیس پچیس برس پہلے اللہ کا نام لے کر کام شروع کردیا۔ اس ذاتِ بے ہمتا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس سلسلے میں اب تک جو کچھ میرے قلم سے نکلا اسے میری توقع سے کہیں بڑھ کر مقبولیت حاصل ہوئی۔ قلبِ تپاں رکھنے والے مسلمانوں نے میری تالیفات کی جس ذوق و شوق سے پذیرائی کی اس نے مجھے ولولہ تازہ عطا کیا...... خاص سیرتِ صحابہ رضی اللہ عنہم و صحابیات رضی اللہ عنہن کے موضوع پر بتوفیقِ الٰہی اب تک میری چھ کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں ان کے نام یہ ہیں:

سیرت حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما، سیرت حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ، سیرت حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، تیس پروانے شمعِ رسالت ﷺ کے، تذکارِ صحابیات رضی اللہ عنہن، خیر البشر ﷺ کے چالیس جاں نثار رضی اللہ عنہم۔

زیرِ نظر کتاب اس سلسلے کی ساتویں کڑی ہے۔ اس میں سرورِ کونین ﷺ کے ایک سو سے زائد جاں نثاروں کے حالات ہیں۔ یہ ان ستر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علاوہ ہیں جن کے

حالات "تیس پروانے شمعِ رسالت کے" اور "خیر البشر ﷺ کے چالیس جان نثار" میں بیان کیے گئے ہیں۔ ابھی تک خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اور بہت سے دوسرے جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات معرضِ تحریر میں نہیں آ سکے۔ زندگی نے وفا کی اور اللہ تعالیٰ نے توفیق دی تو ان سب کے حالات بھی مناسب وقت پر ضبطِ تحریر میں آ جائیں گے......

میں حضرت علاّمہ پیر محمد کرم شاہ صاحب مدظلہ، اور مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی صاحب کا صمیمِ قلب سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کا پیش لفظ اور تعارف لکھنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ میری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو دنیا و آخرت میں اپنی بے پایاں رحمتوں سے نوازے۔

مجھے عالم فاضل محقق اور ادیب ہونے کا دعویٰ ہرگز نہیں ہے۔ میں ایک عاجز انسان ہوں اور اس خوش فہمی میں کبھی مبتلا نہیں ہوا کہ میری ہر جنبشِ قلم کسی قسم کے اعتراض اور حرف گیری سے پاک ہو سکتی ہے تاہم میں نے جہاں زبان کی نزاکتوں کا خیال رکھنے کی مقدور بھر کوشش کی ہے وہاں اس بات کا خیال بھی رکھا ہے کہ جو بات لکھوں وہ بلا سند اور بلا تحقیق نہ ہو اور ادب کی چاشنی حقائق پر غالب نہ آنے پائے۔ میں اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں؟ اس کا فیصلہ قارئینِ کرام ہی کر سکتے ہیں۔ بہر صورت قارئین کرام سے میری عاجزانہ استدعا ہے کہ اس کتاب میں انہیں جو تسامحات اور اسقام نظر آئیں وہ ان سے مجھے آگاہ فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں انہیں دور کیا جا سکے۔ یہ ان کا مجھ پر احسان ہوگا اور وہ عند اللہ ماجور ہوں گے۔

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَّسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا،

امیدوارِ مغفرت

طالب الہاشمی

۳ر ربیع الاوّل ۱۴۰۳ ہجری

مطابق ۲۰ر دسمبر ۱۹۸۲ء

سچے مومن

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ○ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ ؕ

جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جدو جہد کی اور جنہوں نے پناہ دی اور مدد کی وہی سچے مومن ہیں۔ ان کے لیے خطاؤں سے درگزر ہے اور بہترین رزق ہے اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور ہجرت کر کے آ گئے اور تمہارے ساتھ مل کر جدو جہد کرنے لگے وہ بھی تم ہی میں شامل ہیں۔ (سورہ الانفال)
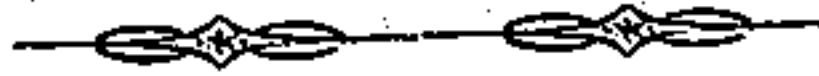
حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ

(امین الامت)

(۱)

۸ ہجری میں مکہ معظمہ پر پرچم اسلام بلند ہوا اور پھر غزوۂ حنین میں بنو ہوازن کو عبرتناک شکست ہوئی تو سارے قبائلِ عرب پر اسلام کی قوت و شوکت کی دھاک بیٹھ گئی اور عرب کے کونے کونے سے مختلف قبیلوں کے وفود جوق در جوق بارگاہِ رسالت ﷺ میں حاضر ہونے لگے۔ کوئی حلقہ بگوشِ اسلام ہونے کے لیے اور کوئی معاہدۂ صلح و امن کے لیے۔ ۹ ہجری میں تو اس کثرت سے وفود آئے کہ اس سال کا نام ہی ''عام الوفود'' (وفدوں کا سال) پڑ گیا۔ ان وفود میں اہلِ نجران کا وفد بھی تھا جس کو تاریخِ اسلام میں غیر معمولی شہرت حاصل ہے۔ نجران مکہ معظمہ سے یمن کی طرف سات منزل پر ایک وسیع ضلع تھا جہاں عیسائی عرب آباد تھے۔ انہوں نے نجران میں ایک عظیم الشان کلیسا بنا رکھا تھا جسے عرب بھر میں عیسائیوں کا سب سے بڑا مذہبی مرکز سمجھا جاتا تھا۔ اس کلیسا میں عیسائیوں کے دو بڑے مذہبی پیشوا رہتے تھے جن میں سے ایک کا لقب عاقب تھا اور دوسرے کا سیّد۔ ۹ ہجری میں ساٹھ آدمیوں پر مشتمل اہلِ نجران کا ایک وفد عاقب اور سیّد کی سرکردگی میں بڑی شان و شوکت سے مدینہ آیا۔ سرورِ عالم ﷺ ان لوگوں کے ساتھ بڑی عزت و تکریم سے پیش آئے اور ان کو نہایت بلیغ انداز میں اسلام کی دعوت دی۔ لیکن قبولِ حق کے بجائے انھوں نے کج بحثی شروع کر دی۔ اس پر بارگاہِ خداوندی سے حکم نازل ہوا کہ:

(اے رسول) جو شخص علم آنے کے بعد آپ سے جھگڑا کرتا ہے اس سے کہہ

دیں کہ آؤ ہم اپنی اولاد کو بلاتے ہیں تم اپنی اولاد کو بُلاؤ اسی طرح ہماری عورتیں اور تمہاری عورتیں، ہم خود بھی اور تم خود بھی جمع ہوں، پھر مباہلہ کریں اور خدا سے دُعا کریں کہ ہم میں جو جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو۔

(سورۂ آلِ عمران۔ع:۶)

اس حکم کے مطابق حضور ﷺ حضرت فاطمۃُ الزَّہرا رضی اللہ عنہا اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ و حسین رضی اللہ عنہ کو لے کر مباہلہ کے لیے نکلے تو نجران کے سرداروں میں سے ایک نے کہا کہ مباہلہ ہرگز نہ کرنا اس لیے کہ اگر وہ حقیقتاً نبی ہیں تو پھر ہم ہمیشہ کے لیے تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ چنانچہ اہلِ نجران نے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ ہم آپ ﷺ کی اطاعت کرتے ہیں آپ ﷺ ہم سے جو خراج چاہیں لے لیں ہم ہمیشہ دیتے رہیں گے۔ آپ ﷺ کسی امین آدمی کو ہمارے ساتھ کر دیجیے۔

حضور ﷺ نے فرمایا، "میں تمہارے ساتھ ایسے امین کو بھیجوں گا جو انتہا درجے کا (حقیقی معنوں میں) امانت دار ہے۔"

حضور ﷺ کا ارشاد سُن کر وہاں پر موجود تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نہایت شوق سے دیکھنے لگے کہ یہ شرف کس خوش بخت کو نصیب ہوتا ہے۔

رحمتِ عالم ﷺ نے اپنے ایک جاں نثار کی طرف شفقت بھری نظروں سے دیکھا اور ان کا نام لے کر فرمایا، "کھڑے ہو جاؤ"۔

کشیدہ قامت کے یہ نحیف و لاغر صاحب رسول جن کے چہرے پر نُور کی بارش ہو رہی تھی، ارشادِ نبوی ﷺ کی تعمیل میں فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔

حضور ﷺ نے ان صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اہلِ نجران سے مخاطب ہو کر فرمایا "هٰذَا اَمِيْنُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ" یہ اس اُمّت کے امین ہیں۔

یہ صاحب رسول ﷺ جن کو لسانِ رسالت ﷺ سے "امین الامۃ" کا مہتم بالشان لقب مرحمت ہوا سیّدنا حضرت ابوعُبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ تھے۔

(۲)

سیّدنا حضرت ابوعُبَیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ، خیر البشر ﷺ کے ان جاں نثاروں میں سے ہیں جن کا شمار ساطینِ اُمت میں ہوتا ہے۔ وہ السّابقون الاوّلون، مہاجرین اوّلین، اصحابِ بدر، اصحابِ عشرہ مبشّرہ اور اصحاب الشجرہ میں سے ایک ہیں۔ فی الحقیقت عہدِ رسالت ﷺ کا کوئی بڑے سے بڑا شرف ایسا نہیں جو ان کو حاصل نہ ہوا ہو۔ ان کے فضائل و مناقب اور کارہائے نمایاں کا تذکرہ پڑھ کر سرِ عقیدت بے اختیار ان کی عظمت کے سامنے خم ہو جاتا ہے۔

اصل نام عامر تھا لیکن انھوں نے اپنی کنیت ابوعُبَیدہ سے شہرت پائی۔ اسی طرح والد کا نام عبداللہ تھا لیکن وہ دادا کی نسبت سے ''ابن الجراح''...... مشہور ہوئے۔

حضرت ابوعُبَیدہ رضی اللہ عنہ کا لقب ''امین الأمۃ'' ہے جو انھیں لسانِ رسالت ﷺ سے عطا ہوا اور ''امین'' وہ لقب ہے جو قرآنِ حکیم میں بڑے بڑے اولوالعزم پیغمبروں کے نام کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ خاندانی تعلق ''بنو فہر'' سے تھا جو بقول ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ قریش کی آخری شاخ ہے۔ سلسلہ نسب یہ ہے:

عامر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بن جراح بن ہلال بن اہیب بن ضبۃ بن حارث بن فہر۔ فہر پر سلسلہ نسب رسولِ اکرم ﷺ سے مل جاتا ہے۔

والدہ کا نام امیمہ رضی اللہ عنہا بنتِ غنم فہریہ تھا۔ ان کو بھی قبولِ اسلام اور صحابیت کا شرف حاصل ہوا۔

بروایت ابنِ اسحاق رحمۃ اللہ علیہ، حضرت ابوعُبَیدہ رضی اللہ عنہ ہجرتِ نبوی سے ۲۳ سال قبل پیدا ہوئے لیکن واقدی کا بیان ہے کہ وہ ہجرت سے چالیس سال قبل پیدا ہوئے۔ ابنِ مندہ رحمۃ اللہ علیہ نے واقدی کے بیان کو درست تسلیم کیا ہے اور جمہور اہلِ سیَر نے بھی اسی روایت کو ترجیح دی ہے۔

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے بعثتِ نبوی کے ابتدائی زمانے میں قبولِ اسلام کا شرف

حاصل کیا۔ اس وقت تک معدودے چند بزرگوں ہی نے دعوتِ حق قبول کی تھی اور رسولِ اکرم ﷺ نے ابھی دارِ ارقم میں قیام نہیں فرمایا تھا۔ ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضرت ابوعبیدہ صدیق رضی اللہ عنہ اُمت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی دعوت و تبلیغ پر سعادت اندوزِ اسلام ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دعوتِ حق قبول کرنا آگ سے کھیلنے کے مترادف تھا۔ اس دعوت پر لبیک کہنے والے مشرکین کے ظلم وجور کا ہدف بن جاتے تھے اور ان پر جینا دوبھر ہو جاتا تھا۔ قبولِ حق کے بعد حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بھی بلاکشانِ اسلام کی صف میں شامل ہو گئے۔ جب حضور ﷺ نے مظلوم صحابہ رضی اللہ عنہم کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دی تو بقول ابنِ اسحاق رحمۃ اللہ علیہ اور واقدی رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بھی حبشہ جانے والے مہاجرین کے دوسرے قافلے میں شامل ہو گئے اور وہاں کئی سال تک غریب الوطنی کی زندگی گزارتے رہے۔ بالآخر حضور ﷺ کی ہجرت الی المدینہ سے کچھ عرصہ پہلے مکہ واپس آگئے۔ ۱۳ بعدِ بعثت میں سرورِ عالم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کا اِذن دیا تو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بھی دوسرے مہاجرین کے ہمراہ ارضِ مکہ کو الوداع کہہ کر مدینہ آگئے۔ واقدی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ ہجرت کے بعد انہوں نے کچھ عرصہ قباء میں حضرت کلثوم بن الہدم رضی اللہ عنہ کے مکان میں قیام کیا۔

(۳)

مدینہ منورہ میں نزولِ اجلال فرمانے کے چند ماہ بعد سرورِ عالم ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے مابین مواخاۃ قائم کرائی تو ابنِ اسحاق اور حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ کے بقول آپ ﷺ نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا انصاری بھائی سیّد الاوس حضرت سعد بن مُعاذ رضی اللہ عنہ کو بنایا۔ اکثر مورخین نے اسی روایت کو اپنایا ہے لیکن صحیح مسلم میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ اور ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے درمیان مواخاۃ قائم کی۔

(کتاب الفضائل باب مواخاۃ النبی ﷺ)

قرائن سے یہی روایت صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ تقریبِ مواخاۃ، راوی یعنی حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی کے مکان پر منعقد ہوئی تھی اور حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ ان کے سوتیلے باپ تھے۔

غزوات کا آغاز ہوا تو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ راہِ حق کے سرفروش سپاہی ثابت ہوئے۔ انہوں نے ہر معرکے میں جانبازی اور فداکاری کا حق ادا کر دیا اور اپنے جوشِ ایمانی کے بے مثال نقوش صفحہ تاریخ پر ابدالآباد تک کے لیے ثبت کر دیئے۔

صحیح بخاری میں اصحابِ بدر کی فہرست میں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا نام نہیں ہے۔ لیکن ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ، ابنِ عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ، ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ اور بعض دوسرے اہلِ سیَر نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کفر و حق کے معرکہ اوّل میں نہ صرف شریک تھے بلکہ انہوں نے لڑائی میں اپنے باپ عبداللہ بن جراح کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا جو مشرکینِ مکہ کی طرف سے مسلمانوں سے لڑنے آیا تھا۔ بعض دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی اس موقع پر راہِ حق میں اپنے قریبی عزیزوں کو قتل کیا۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ ایسے ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نازل ہوا:

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ؕ (سورہ مجادلہ رکوع:۳)

(تو ایسی کوئی قوم نہ پائے گا جو اللہ تعالیٰ اور یومِ آخرت پر بھی ایمان لاتی ہو اور اللہ اور اس کے رسول کے مخالفین سے بھی محبت رکھتی ہو خواہ ایسے لوگ ان کے باپ ہوں یا بیٹے یا بھائی ہوں یا ان کے خاندان میں سے ہوں۔ یہی (مومن) ہیں۔ جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان نقش کر دیا ہے اور اپنے فیضانِ غیبی سے ان کی مدد کی ہے۔)

۳ ہجری میں غزوۂ اُحد پیش آیا تو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اس میں نہایت جوش و وارفتگی سے دادِ شجاعت دی اور شروع سے اخیر تک ایسی استقامت کا مظاہرہ کیا کہ اس غزوہ کے ابطالِ خاص میں شمار ہوئے۔ جب ایک اتفاقی غلطی سے لڑائی کا پانسہ پلٹ گیا اور سرورِ عالم ﷺ زخمی ہو گئے تو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بے تاب ہو گئے اور اپنے عشقِ رسول ﷺ کا حیرت انگیز ثبوت دیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

> ''میں نے دیکھا کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کو اکیلا پا کر مشرق کی جانب سے ایک پرندے کی طرح فضا میں پرواز کرتا ہوا تیزی سے حضور ﷺ کی طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ میں بھی آپ ﷺ کی حفاظت کے لیے تیزی سے بھاگا اور کہا کہ الٰہی خیر ہو۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہ شخص جو مجھ سے پہلے پہنچ چکا ہے، ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ ہے۔ اس موقع پر ایک کافر کے وار سے خود کی کڑیاں رسول اللہ ﷺ کے رخسارِ مبارک میں دھنس گئی تھیں ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر یہ کڑیاں اپنے دانتوں سے پکڑ کر کھینچیں یہاں تک کہ وہ باہر آ گئیں لیکن اس کوشش میں ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے سامنے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔''

(طبقات ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ)

غزوۂ اُحد کے بعد حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے غزوۂ احزاب میں دادِ شجاعت دی اور پھر بنو قریظہ کی سرکوبی میں سرگرم حصہ لیا۔

ربیع الثانی ۶ ھ میں سرورِ عالم ﷺ نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو قبیلہ ثعلبہ و انمار کی سرکوبی پر مامور فرمایا، یہ لوگ اکثر اطرافِ مدینہ میں غارت گری کرتے رہتے تھے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے چالیس مجاہدین کے ساتھ ان غارت گروں کے مرکزی مقام ذی القصّہ پر چھاپا مارا۔ ان لوگوں کو مقابلے کی ہمت نہ پڑی اور وہ بھاگ کر پہاڑوں میں چھپ گئے البتہ ایک آدمی مسلمانوں کے ہاتھ اسیر ہو گیا۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اس کو

مدینہ لائے تو اس نے برضاء و رغبت اسلام قبول کر لیا۔ اسی سال حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو حدیبیہ کے مقام پر بیعتِ رضوان میں شریک ہونے کا عظیم الشان شرف حاصل ہوا۔ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ صلح نامہ حدیبیہ پر جن اصحاب نے بطور گواہ اپنے دستخط کیے حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ بھی ان میں شامل تھے۔

اوائل ۷ھ میں حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے غزوۂ خیبر میں سرورِ عالم ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا اور لڑائی مین اپنی تلوار کے خوب جوہر دکھائے۔ غزوۂ خیبر کے کچھ عرصہ بعد حضور ﷺ کو خبر ملی کہ قبیلہ قضاعہ کے لوگ مدینہ منورہ پر حملہ آور ہونے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ حضور ﷺ نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو تین سو مجاہدین کے ساتھ ان کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ حضرت عمرو رضی اللہ عنہ نے بنو قضاعہ کے علاقے میں پہنچ کر ''سلاسل'' نامی ایک چشمے پر قیام کیا اور وہاں سے حضور ﷺ کو پیغام بھیجا کہ دشمن کی تعداد بہت زیادہ ہے اس لیے کمک بھیجی جائے۔ سرورِ عالم ﷺ نے پیغام ملتے ہی دو سو مجاہدین حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں مدد کے لیے روانہ کر دیئے۔ ان مجاہدین میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے عظیم المرتبت بزرگ بھی شامل تھے۔ جب یہ کمکی فوج حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی فوج سے مل گئی تو تمام لشکر کی امارت کا سوال پیدا ہوا۔ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ اگرچہ اپنے مرتبے اور شان کے لحاظ سے پوری طرح امارت کے مستحق تھے لیکن جب حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے اصرار کیا کہ میں ہی ساری فوج کی قیادت کروں گا تو حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے خوش دلی سے ان کی قیادت قبول کر لی۔ اور ان کی زیرِ امارت نہایت بہادری سے دشمنوں کے خلاف لڑے یہاں تک کہ انھیں شکست ہو گئی۔ جب مظفر و منصور مدینہ واپس آئے اور حضور ﷺ نے امارت کے اختلاف اور ان کی اطاعت کی کیفیت سُنی تو فرمایا:

رحمہ اللہ ابا عبیدہ ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ پر اللہ کی رحمت ہو۔ (مدارج النبوۃ جلد ۲)

تاریخ میں یہ واقعہ ''سریّہ ذات السلاسل'' کے نام سے مشہور ہے۔

رجب ۸ ہجری میں سرورِ عالم ﷺ نے حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو تین سو سواروں کے ساتھ ساحلِ بحر کی طرف بھیجا کہ قریش کے قافلوں کی نقل و حرکت کا پتہ چلائیں۔ تاریخ میں یہ مہم سریہ سیف البحر یا سریہ خبط کے نام سے مشہور ہے۔ سیف البحر (سمندر کا کنارہ) اس لیے کہ مجاہدین کو سمندر کے ساحل پر قیام کرنا پڑا اور خبط اس لیے کہ اس مہم میں سامانِ رسد ختم ہو جانے کے باعث مجاہدین کو درختوں کے پتوں پر گزارہ کرنا پڑا اور جو پتے لکڑی وغیرہ مار کر درختوں سے جھاڑے جاتے ہیں انہیں خبط کہتے ہیں۔ ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے ماتحت لشکر میں حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ صحیح بخاری میں حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہما نے اس مہم کا حال اس طرح بیان کیا ہے:

''رسول اللہ ﷺ نے ایک مہم ساحل کی طرف بھیجی اور اس پر ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کو امیر بنایا، ۳۰۰ آدمی تھے۔ ہم چلے کچھ راستہ طے ہوا تھا کہ زادِ راہ ختم ہو گیا صرف کھجور کی دو تھیلیاں بچیں، ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ روزانہ ہم کو تھوڑی تھوڑی کھجوریں دیتے تھے یہاں تک کہ صرف ایک ایک کھجور پر نوبت آ گئی۔ بھوک کی سخت تکلیف ہوئی تو ہم نے درختوں کے پتے جھاڑ جھاڑ کر کھائے۔ ایک شخص نے تین اونٹ ذبح کرائے، پھر تین اونٹ ذبح کرائے۔ تیسرے دن بھی تین اونٹ ذبح کرائے پھر ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے ان کو منع کر دیا۔ سمندر کے کنارے اثنائے قیام میں ایک دن ٹیلے کے برابر ایک بہت بڑی مچھلی نکلی اس کو عنبر کہتے ہیں۔ ہم نے نصف ماہ (یا ۱۸ دن) اس کو کھایا اور اس کا تیل ملا یہاں تک کہ ہم توانا ہو گئے۔ پھر ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے اس کی دو پسلیاں کھڑی کرائیں اور ایک اونٹ پر کجاوہ رکھوا کر لشکر کے سب سے طویل شخص کو اس پر بٹھایا۔ وہ شخص اونٹ پر بیٹھے بیٹھے ان پسلیوں کے نیچے سے نکل گیا۔ جب ہم واپس مدینہ آئے اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں یہ واقعہ بیان کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے رزق بھیج دیا اس کو کھانا چاہیے تھا، اگر تمہارے پاس ہو تو ہم کو بھی کھلاؤ۔ ایک شخص (کچھ

گوشت) لے آیا اور آپ ﷺ نے اسے تناول فرمایا۔''

اس روایت میں اونٹ ذبح کرانے والے جن صاحب کا ذکر ہے وہ حضرت قیس بن سعد انصاری رضی اللہ عنہما تھے جو بالطبع نہایت کشادہ دست اور فیاض تھے۔

رمضان ۸ ہجری میں حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے غزوۂ الفتح میں سرورِ عالم ﷺ کی ہمرا کابی کا شرف حاصل کیا۔ صحیح مسلم کی ایک روایت کے مطابق مکہ میں داخل ہونے والے لشکر کے ایک حصے کی امارت حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے سپرد تھی۔ یہ حصہ فوج زرہ پوش مجاہدین پر مشتمل تھا۔ فتح مکہ کے بعد حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے حنین اور طائف کے معرکوں میں اپنی شجاعت کے جوہر دکھائے اور جانبازی کا حق ادا کر دیا۔

۹ ہجری میں وفدِ نجران کی آمد کے موقع پر حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو بارگاہِ رسالت ﷺ سے ''امین الامۃ'' کا عظیم الشان لقب مرحمت ہوا جس میں کوئی اور ان کا شریک و سہیم نہیں ہے۔ بعض روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ نجران کا وفد دو مرتبہ دربارِ نبوت میں حاضر ہوا۔ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو دوسرے وفدِ نجران کی آمد کے موقع پر ''امین الامۃ'' کا لقب عطا ہوا۔ صحیح مسلم میں اہلِ نجران کی زبانی بیان کیا گیا ہے کہ ''ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ ہمیں سنّت اور اسلام کی تعلیم دیتے تھے۔'' اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہلِ نجران نے اسلام قبول کر لیا تھا اور حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ ان کو احکامِ دین کی تعلیم بھی دیتے تھے اور ان سے صدقات بھی وصول کرتے تھے۔ اسی سال نجران سے واپسی کے بعد حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو بحرین جانا پڑا۔ اسی سلسلہ میں صحیح بخاری میں حضرت عمرو بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو محصّلِ جزیہ بنا کر بحرین بھیجا۔ حضور ﷺ نے اہلِ بحرین سے صلح کر لی تھی اور ان پر علاء بن الحضرمی رضی اللہ عنہ کو امیر بنایا تھا۔ ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ بحرین سے مال لے کر آئے۔ انصار کو ان کی مراجعت کی خبر ملی تو فجر کی نماز حضور ﷺ کے ساتھ پڑھی جب آپ ﷺ نماز پڑھ چکے تو انصار کا (غیر معمولی) مجمع دیکھ کر متبسّم ہو گئے اور فرمایا، شاید تم لوگوں کو ابو عبیدہ کے آنے کی اطلاع ہو گئی ہے۔

انہوں نے عرض کیا، ہاں یا رسول اللہ، حضور ﷺ نے فرمایا، بشارت ہو کہ آج تمہیں خوش کر دوں گا لیکن خدا کی قسم مجھے تمہارے فقر و افلاس کا خوف نہیں ہے البتہ یہ خوف ضرور ہے کہ جس طرح پہلی قوموں پر دنیا کشادہ دی گئی اور باہمی منافست اور حسد و طمع نے ان کو ہلاک کر دیا، اسی طرح تم پر بھی دنیا کشادہ کر دی جائے اور تم بھی باہمی منافست میں مبتلا ہو کر برباد نہ ہو جاؤ۔

۱۰ھ ہجری میں حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے حجۃ الوداع میں سرورِ عالم ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔

(۴)

۱۱ھ ہجری میں سرورِ عالم ﷺ نے رحلت فرمائی تو حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ پر کوہِ غم ٹوٹ پڑا تاہم انہوں نے بڑے صبر اور حوصلے سے کام لیا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضور ﷺ کے وصال کے فوراً بعد انصار نے سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہو کر خلافت کا سوال اٹھایا تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ انصار سے گفتگو کے لیے ان کے پاس تشریف لے گئے۔ اثنائے گفتگو میں حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے انصار سے مخاطب ہو کر فرمایا:

> "اے گروہِ انصار تم نے سب سے پہلے اسلام کی امداد و اعانت کی اب تم ہی افتراق و اختلاف کی بنیاد نہ رکھو۔"

جب دونوں طرف سے تقریریں ہو چکیں تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا، میں تمہارے لیے ان دو شخصوں (حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ) میں سے کسی ایک کو پسند کرتا ہوں تم ان دونوں میں سے کسی ایک کی بیعت کر لو، لیکن ان دونوں بزرگوں نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں بارِ خلافت اٹھانے سے انکار کر دیا اور بڑھ کر سب سے پہلے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی۔ ان کے بعد سارا مجمع بیعت کے لیے ٹوٹ پڑا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مسند آرائے خلافت ہونے کے معاً بعد سارے عرب میں فتنہ ارتداد کے شعلے بھڑک اٹھے۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس ہولناک فتنے کا بڑی ثابت قدمی سے مقابلہ کیا اور دس ماہ کے اندر اندر اس کا استیصال کر دیا۔ اس پُر آشوب دَور میں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ برابر خلیفۃ الرسول رضی اللہ عنہ کے دست و بازو بنے رہے۔ فتنہ ارتداد کے فرد ہونے کے کچھ عرصہ بعد شام اور ایران سے معرکہ آرائیوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ ۱۳ھ کے آغاز میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے شام پر مختلف اطراف سے لشکر کشی کا اہتمام کیا اس سلسلہ میں انہوں نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو حمص کی طرف، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو فلسطین کی طرف، حضرت شُرَحْبیل بن حَسنہ رضی اللہ عنہ کو اردن کی طرف اور حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کو دمشق کی طرف بڑھنے کا حکم دیا اور ساتھ ہی ہدایت فرمائی کہ اگر میدانِ کارزار میں تم سب کو یکجا ہونا پڑے تو تم سب کے سپہ سالار ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ ہوں گے۔ حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما اور حضرت شُرَحْبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ کی فوجوں کی روانگی کے بعد حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے سات ہزار مجاہدین کے ساتھ مُعَرقۃ کے راستے حمص کا رُخ کیا۔ حضرت ابُوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ ''ثنیۃ الوداع'' تک ان کی مشایعت کے لیے تشریف لے گئے جب وہ چلنے لگے تو صِدّیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے انہیں بدیں الفاظ وصیّت کی:

''ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اچھے عمل کرنا، مجاہد بن کر رہنا، شہید کی موت مرنا، اللہ تعالیٰ تمہارا اعمال نامہ تمہارے دائیں ہاتھ میں دے اور دنیا و آخرت میں تمہاری آنکھیں ٹھنڈی ہوں، خدا کی قسم مجھے اُمید ہے کہ تم ان لوگوں میں سے ہو جو اللہ سے بہت زیادہ ڈرتے ہیں جو دنیا سے مطلق کوئی لگاؤ نہیں رکھتے، جو آخرت کے طالب ہیں، اللہ نے تم پر بڑا فضل کیا ہے کہ تم مسلمانوں کی فوج لے کر اللہ کے دشمنوں سے جنگ کرنے جا رہے ہو۔ لہٰذا جو لوگ اللہ کے منکر ہیں، اس کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتے ہیں،

جھوٹے خداؤں کو پوجتے ہیں، ان سب سے جہاد کرنا۔''

(۵)

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ شام میں داخل ہوئے تو انہوں نے کیل کانٹے سے لیس رومیوں کے بڑے بڑے جمگھٹوں کو ہر جگہ جنگ کے لیے تیار پایا۔ ان کے مقابلے میں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی جمعیت آٹے میں نمک کے برابر تھی تاہم حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اسی مختصر لشکر کے ساتھ بُصریٰ اور مآب کو تسخیر کرتے ہوئے جابیہ پہنچ گئے اور وہاں سے ہرقل کی زبردست جنگی تیاریوں کا حال دربارِ خلافت میں لکھ بھیجا۔ حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا خط ملتے ہی ایک طرف تو مدینہ منوّرہ سے امدادی افواج روانہ کر دیں اور دوسری طرف حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو جو عراق میں ایرانیوں کے خلاف مصروفِ جہاد تھے، حکم بھیجا کہ تم اپنی لشکر کو لے کر عراق سے شام پہنچ جاؤ۔ ساتھ ہی حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ، حضرت شُرَحْبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو پیغام بھیجا کہ وہ بھی اپنی فوجیں لے کر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچ جائیں۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے پاس امدادی افواج پہنچ گئیں اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بھی ان سے آن ملے تو انہوں نے سب سے پہلے اجنادین کا رُخ کیا جہاں رومیوں کا ایک زبردست لشکر مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔ ۲۸ جمادی الاولیٰ ۱۳ھ کو اجنادین کے قریب فریقین کے درمیان گھمسان کا رَن پڑا۔ رومیوں نے پُر زور مزاحمت کی لیکن مسلمانوں کے جوشِ ایمان کے سامنے ان کی کچھ پیش نہ چلی اور وہ میدانِ جنگ میں اپنے تین ہزار آدمی کٹوا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ مسلمانوں نے رومیوں کا تعاقب کیا تو راستے میں انھیں ایک تنگ گھاٹی ملی جس میں سے صرف ایک ایک آدمی گزر سکتا تھا۔ جو مسلمان اس مقام سے پار ہو گئے ان سے رومی لڑنے لگے۔ مجاہدین میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے بھائی حضرت ہشام بن العاص رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ وہ سابقون الاوّلون میں سے تھے اور دو ہجرتوں سے ممتاز تھے۔ جونہی اس تنگ

گھاٹی سے گزرنے لگے ایک رومی کے تیر سے شہید ہو کر گر گئے۔ اب جو مسلمان وہاں پہنچتا تھا، حضرت ہشام رضی اللہ عنہ کی لاش پر گھوڑا لے جانا گوارا نہ کرتا تھا اور وہیں رُک جاتا تھا۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے یہ کیفیت دیکھی تو انہوں نے مسلمانوں کو للکار کر کہا:

''مسلمانو! اللہ تعالیٰ نے ہمارے بھائی کو رتبہ شہادت پر فائز کیا اور اس کی روح کو اٹھا لیا۔ یہاں تو اب صرف اس کا جسم ہے اس لیے تم لوگ ان کی لاش پر سے گھوڑے لے جاؤ اور گھاٹی کے پار مسلمانوں کی مدد کو پہنچو۔''

یہ کہہ کر انھوں نے اپنا گھوڑا بڑھایا ساتھ ہی دوسرے لوگ بھی چل پڑے۔ حضرت ہشام رضی اللہ عنہ کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے لیکن مسلمانوں نے رومی بھگوڑوں کے بھی پرخچے اڑا کر رکھ دیئے۔ اختتامِ جنگ پر حضرت ہشام رضی اللہ عنہ کی لاش کے ٹکڑوں کو بورے میں بھر کر سپردِ خاک کیا گیا۔

معرکہ اجنادین کے بعد حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے دمشق کا محاصرہ کر لیا۔ دمشق کا محاصرہ ابھی جاری تھا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے وفات پائی اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ مسند نشینِ خلافت ہوئے۔ عہدِ فاروقی کے اوائل ہی میں ایک دن حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ فصیل پھاند گئے اور شہر کے دروازے کھول دیئے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اپنی فوج کے ساتھ تیار کھڑے تھے وہ فوراً شہر کے اندر داخل ہو گئے۔ اہل شہر نے ہتھیار ڈال دیئے اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر لی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو اس کا علم نہ تھا اور وہ شہر کے دوسرے حصّے میں عیسائیوں سے لڑتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ شہر کے وسط میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا سامنا ہوا تو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو بتایا کہ میں نے اہلِ شہر کو امان دے دی ہے اس لیے تم بھی اپنا ہاتھ روک لو۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اسی وقت تلوار نیام میں ڈال لی۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے مفتوحہ حصہ شہر کو بھی معاہدہ صلح میں شامل کر لیا اور دمشق پر پرچم اسلام بلند کر دیا۔

بعض مورخین نے لکھا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عنانِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی (۱۳ھ میں) حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو سپہ سالاری کے عہدے سے معزول کر دیا۔ اور ان کی جگہ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو شام کا سپہ سالارِ اعظم مقرر کیا۔ لیکن علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ اور کچھ دوسرے مورخین اس طرف گئے ہیں کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی معزولی ۱۷ھ میں ہوئی۔ فریقین کے اپنے اپنے مآخذ اور دلائل ہیں۔ اصل میں نہ صرف حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے سالِ عزل بلکہ اس دور کی بہت سی مشہور جنگوں کے سالِ وقوع کے بارے میں بھی مورخین میں سخت اختلاف ہے۔ یہ دورِ حاضر کے مورخین کی اپنی صوابدید اور تحقیق پر منحصر ہے کہ وہ کونسی روایات کو ترجیح دیتے ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ شام کے معرکوں میں حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی اصل حیثیت کیا تھی، حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں بزرگوں نے شام کے تمام معرکے باہمی تعاون و اشتراک سے سر کیے اور دونوں ہی اپنی شجاعت، جوانمردی، تدبیر و حکمت اور قائدانہ صلاحیتوں کے لیے سزاوارِ تحسین ہیں۔

دمشق کی شکست نے رومیوں کو سخت مشتعل کر دیا اور وہ اردن کے ایک شہر بیسان میں جمع ہو کر زبردست جنگی تیاریوں میں مشغول ہو گئے۔ مسلمانوں کو اطلاع ملی تو انھوں نے حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں بیسان کا رُخ کیا اور اس کے سامنے فحل کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ لڑائی سے پہلے فریقین کے درمیان سفیروں کے ذریعے گفت وشنید ہوتی رہی لیکن اس کا کچھ نتیجہ نہ نکلا بالآخر رومیوں نے اپنا سفیر سردارِ فوج حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ سے براہِ راست گفتگو کے لیے بھیجا۔ رومی سفیر اسلامی لشکر میں پہنچا تو سب مسلمانوں کو ایک ہی رنگ میں ڈوبے پایا۔ اس نے امیرِ لشکر کے بارے میں پوچھا تو اسے بتایا گیا کہ وہ سامنے بیٹھے ہیں۔ اس وقت حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ فرشِ زمین پر بیٹھے تیروں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔ ان کے لباس اور عام مجاہدین کے لباس میں مطلق کوئی فرق نہ تھا۔ قاصد نے متحیر ہو کر حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا، کیا آپ ہی فوج

کے سردار ہیں؟ انہوں نے کہا، ہاں۔ قاصد نے کہا، اگر آپ کی فوج لڑے بھڑے بغیر واپس چلی جائے تو ہم ہر شخص کو دو دو اشرفیاں دیں گے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے قاصد کی پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ اس پر وہ برہم ہو گیا اور دھمکی دے کر واپس چلا گیا۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اسی وقت فوج کو کمر بندی کا حکم دے دیا۔ تیسرے دن دونوں فوجوں کے درمیان خونریز لڑائی شروع ہو گئی۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ قلبِ فوج میں تھے اور ایک ایک صف میں جا کر مسلمانوں کی ہمت بندھاتے تھے۔ پچاس ہزار رومیوں کے مقابلے میں مسلمانوں کی تعداد نصف سے بھی کم تھی لیکن انھوں نے مردانہ وار دشمن پر ایسے تابڑ توڑ حملے کیے کہ چند گھنٹوں کے اندر اندر اس کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ اس طرح فحل اور بَیسان مسلمانوں کے زیرِ نگین ہو گئے۔ اس کے بعد حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر مَرج الرّوم پر قبضہ کر لیا اور پھر حمص کا رُخ کیا۔ اہلِ حمص چند ماہ قلعہ بند ہو کر مقابلہ کرتے رہے لیکن جب انھیں کسی طرف سے کمک کی اُمید نہ رہی تو جزیہ ادا کرنے کا وعدہ کر کے مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی۔ حمص کے بعد حماۃ، شیزر، معرۃ النعمان اور کئی دوسرے مقامات بھی یکے بعد دیگرے مسخر ہو گئے۔ اب حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ رومیون کے ایک مضبوط گڑھ لاذقیہ کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کا سختی سے محاصرہ کر لیا۔ علامہ بلاذُری نے ''فتوح البلدان'' میں لکھا ہے کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو محاصرہ لاذقیہ کے دوران میں ایک انوکھی تدبیر سوجھی۔ انہوں نے لاذقیہ کے آس پاس بہت سے پوشیدہ غار کھدوائے اور بظاہر محاصرہ اٹھا کر حمص کی طرف کوچ کر دیا۔ اہلِ لاذقیہ نے مطمئن ہو کر شہر کا دروازہ کھول دیا۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اسی رات کو اپنی فوج کے ساتھ پلٹ کر غاروں میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ جونہی سپیدۂ سحر نمودار ہوا، آناً فاناً غاروں سے نکل کر شہر میں گھس گئے۔ انھیں دیکھ کر رومیوں پر سکتہ طاری ہو گیا اور انھوں نے کسی مزاحمت کے بغیر ہتھیار ڈال دیئے۔ لاذقیہ کی تسخیر کے بعد حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ حمص واپس آ گئے اور رجب ۱۵ھ تک (جس مہینے میں یرموک کی فیصلہ کن جنگ پیش آئی) وہیں مقیم رہے۔

(۶)

رومیوں کی پے در پے شکستوں نے ہرقل (قیصرِ روم) کو چونکا دیا۔ اس نے پختہ ارادہ کرلیا کہ مسلمانوں کو ہر قیمت پر شام سے نکال دیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے اس نے اپنے تمام مقبوضات آرمینیہ، الجزیرہ، قسطنطنیہ وغیرہ سے فوجیں طلب کیں جو سب انطاکیہ میں جمع ہو گئیں۔ یہ جرار لشکر جس میں بڑے بڑے آزمودہ کار جنگجو شامل تھے انطاکیہ سے روانہ ہوا۔ تو مسلمانوں نے باہمی مشورے سے فیصلہ کیا کہ شام کے جن جن شہروں پر ان کا قبضہ ہو چکا ہے وہاں سے فوجیں ہٹالی جائیں اور یہ ساری فوجیں سمٹ کر ایک جگہ جمع ہو جائیں ساتھ ہی دربارِ خلافت سے کمک طلب کر لی جائے۔ اس فیصلے کے مطابق مسلمانوں نے دمشق حمص وغیرہ شہروں کو خالی کیا تو وہاں کے باشندوں کو جزیے کی وہ ساری رقم واپس کر دی جو ان سے وصول کی گئی تھی۔ کیونکہ اب وہ ان شہروں کے باشندوں کی حفاظت نہیں کر سکتے تھے۔ پابندی عہد اور رواداری کی ایسی مثال دنیا کی کسی اور قوم کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ مسلمانوں کا یہی اخلاق تھا جس نے بدترین دشمنوں کے دل بھی موہ لیے۔ کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے رومیوں کو جزیہ واپس کیا تو وہ روتے تھے اور دعائیں کرتے تھے کہ خدا تمھیں پھر واپس لائے۔

تمام مسلمان فوجیں شام کے شہروں سے نکل کر دریائے یرموک کے کنارے ایک مقام پر جمع ہو گئیں۔ اسی اثناء میں دارالخلافہ سے کمک بھی آ پہنچی لیکن اب بھی سارے مسلمانوں کی تعداد ملا کر تیس اور چالیس ہزار کے درمیان تھی جب کہ رومی لشکر تقریباً دو لاکھ جنگجوؤں پر مشتمل تھا۔ پہلے دونوں طرف سے قاصد آتے جاتے رہے۔ رومیوں نے چاہا کہ مسلمان روپیہ لے لیں اور واپس چلے جائیں لیکن مسلمانوں کا مقصد حصول زر نہیں تھا اس لیے وہ اس پر آمادہ نہ ہوئے۔ چنانچہ دونوں فوجوں میں لڑائی کا آغاز ہو گیا۔ رومی اس معرکے میں نہایت بے جگری سے لڑے۔ انھوں نے مسلمانوں پر بار بار خوفناک حملے کیے اور ایک دفعہ تو انھیں پیچھے دھکیلنے میں بھی کامیاب ہو گئے لیکن مسلمان افسروں کی سر

فروشی اور مہارتِ جنگ نے صورتِ حال کو سنبھال لیا اور انہوں نے رومیوں پر اس غضب کا جوابی حملہ کیا کہ ان میں افراتفری مچ گئی۔ ان کے تقریباً ستر ہزار آدمی میدانِ جنگ میں کھیت رہے جو زندہ بچ گئے وہ بھاگ نکلے۔ یرموک کی اس عظیم الشان فتح نے شام کی قسمت کا بڑی حد تک فیصلہ کر دیا۔ ہرقل بھاگ کر قسطنطنیہ چلا گیا اور پھر کبھی اس کو شام کی طرف منہ کرنے کی جرات نہ ہوئی۔ یرموک کی فتح کے بعد مسلمانوں کا سیلِ رواں قِنسرین کی طرف بڑھا اور اسے تسخیر کرتے ہوئے حلب اور انطاکیہ تک جا پہنچا۔ ان شہروں پر پرچم اسلام بلند کرنے کے بعد حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بیت المقدس کی طرف روانہ ہوئے جس کو حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے پہلے ہی محاصرہ میں لے رکھا تھا۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بیت المقدس پہنچے تو عیسائیوں نے ہمت ہار دی اور صلح کی درخواست کی لیکن اس کے ساتھ یہ شرط رکھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود بیت المقدس آئیں اور اپنے ہاتھوں سے معاہدۂ صلح کی تکمیل کریں۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ بیت المقدس کی بلا کشت وخون فتح کا انحصار آپ کی یہاں تشریف آوری پر ہے۔ امیر المومنین رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا خط ملا تو وہ چند مہاجرین وانصار کے ساتھ بیت المقدس تشریف لے گئے۔ جابیہ کے مقام پر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ، حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما اور دوسرے افسرانِ فوج نے امیر المومنین کا استقبال کیا، وہیں عیسائیوں کے نمائندے بھی پہنچ گئے اور معاہدۂ صلح معرضِ تحریر میں لانے کی درخواست کی۔ معاہدہ لکھا گیا اور اس پر فریقین کے دستخط ہو گئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ جابیہ سے چل کر بیت المقدس پہنچے اور شہر کے اندر داخل ہو کر اس جگہ نماز پڑھی جہاں آج کل مسجدِ عمر رضی اللہ عنہ ہے۔ بیت المقدس کے اثنائے قیام میں ایک دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ سے فرمائش کی کہ آج اذان دو، حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے کہا، میں عہد کر چکا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد کبھی اذان نہ دوں گا لیکن آج آپ کا ارشاد بجا لاتا ہوں۔ یہ کہہ کر اذان دینی شروع کی تو صحابہ رضی اللہ عنہم کو رسول

اللہ ﷺ کا مبارک زمانہ یاد آ گیا اور ان پر رقت طاری ہو گئی۔ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ روتے روتے بے تاب ہو گئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ہچکی بندھ گئی۔ بیت المقدس کی فتح کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو سارے شام کا والی مقرر کیا۔ انھوں نے امیرِ لشکر اور والیِ شام دونوں حیثیتوں میں اپنے فرائضِ مفوضہ نہایت حسن وخوبی سے انجام دیئے اور لوگوں پر اپنی عسکری اور انتظامی صلاحیتوں کا سکہ بٹھا دیا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ حضرت ابُو عبیدہ رضی اللہ عنہ کی ہدایت پر شام کے کئی شہروں میں حلقہ ہائے درس قائم ہوئے جن میں صحابہ رضی اللہ عنہم لوگوں کو قرآنِ حکیم کی تعلیم دیتے تھے اور فقہی مسائل بتاتے تھے۔ ایک مرتبہ حجاز میں ایسا زبردست قحط پڑا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اپنے تمام گورنروں سے غلّہ طلب کرنا پڑا۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی تو انھوں نے غلّے سے لدے ہوئے چار ہزار اونٹ مدینہ منوّرہ بھجوائے۔ (ایک روایت کے مطابق وہ خود یہ اونٹ لے کر بارگاہِ خلافت میں حاضر ہوئے۔)

اواخر ۱۷ھ میں رومیوں نے بڑے ساز و سامان کے ساتھ حمص پر یلغار کر دی۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اِدھر اُدھر سے فوجیں جمع کر کے رومیوں کا پُر زور مقابلہ کیا اور ایک مختصر لیکن خونریز لڑائی کے بعد انھیں شکست فاش دے کر بھگا دیا۔ یہ آخری معرکہ تھا جو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو اپنی زندگی میں پیش آیا۔ اس کے بعد رومیوں کو کبھی مسلمانوں کی طرف پیش قدمی کرنے کی جرات نہ ہوئی۔

۱۸ھ ہجری میں شام اور عراق میں طاعون کی خوفناک وبا پھیل گئی۔ تاریخ اسلام میں یہ وبا ''طاعونِ عمواس'' کے نام سے مشہور ہے۔ مسلمانوں کو اس وبا سے سخت نقصان پہنچا اور ان کے ہزاروں آدمی اس میں مبتلا ہو کر فوت ہو گئے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اس وبا کی خبر پہنچی تو انہیں سخت تشویش پیدا ہوئی اور وہ اس کی تدبیر وانتظام کے لیے خود شام تشریف لے گئے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور فوج کے دوسرے افسروں نے سرغ کے

مقام پر امیر المومنین سے ملاقات کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان اصحاب سے مشورہ کیا تو اکثر کی رائے یہ تھی کہ اس مقام (عمواس) سے ہٹ جانا چاہیے لیکن حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو اس رائے سے اختلاف تھا۔ چنانچہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منادی کرائی کہ کل ساری فوج میرے ساتھ یہاں سے کوچ کرے گی تو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو بہت غصہ آیا اور انھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر کہا:

''اے عمر رضی اللہ عنہ کیا آپ تقدیرِ الٰہی سے بھاگ رہے ہیں؟''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا:

''ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کاش یہ بات تمہارے سوا کسی اور کے منہ سے نکلی ہوتی، میں تقدیر الٰہی سے تقدیرِ الٰہی ہی کی طرف بھاگتا ہوں۔ تم خود ہی بتاؤ کہ اگر کچھ اونٹوں کے ساتھ تمہارا گزر کسی ایسی وادی سے ہو جس کے دو کنارے ہوں ایک بنجر اور ویران۔ دوسرا سر سبز و شادات۔ تو کیا سر سبز و شاداب حصے میں اونٹوں کو چرانا تقدیرِ الٰہی کے موافق نہ ہو گا؟''

بایں ہمہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اپنی رائے پر قائم رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مدینہ منورہ واپس جا کر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو خط لکھا جس میں ان کو مدینہ منورہ آنے کے لیے کہا گیا تھا۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سمجھ گئے کہ امیر المومنین انہیں وبازدہ علاقے سے نکالنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے جواب میں لکھ بھیجا:

''امیر المومنین آپ مجھے جس غرض کے لیے مدینہ بلانا چاہتے ہیں میں اسے سمجھ گیا۔ میں مسلمانوں کی فوج میں ہوں اور میرا دل ان سے جدا ہونے کو نہیں چاہتا اس لیے مجھے یہیں رہنے دیں۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ خط پڑھ کر بے اختیار رو پڑے اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو ایک اور خط روانہ کیا جس میں لکھا کہ اس وقت فوج جس مقام پر ہے وہ مرطوب اور نیچا ہے اس لیے لشکر کو لے کر کسی اونچی جگہ منتقل ہو جایئے۔

حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے اس حکم کی تعمیل کی اور فوج کو لے کر جابیہ منتقل ہو گئے لیکن یہاں پہنچتے ہی ان پر بیماری کا حملہ ہو گیا۔ جب مرض نے شدّت اختیار کی تو انہوں نے حضرت معاذ بن جبل انصاری رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین مقرر فرمایا اور لوگوں کو اللہ کی اطاعت اور اتحاد اتفاق کی وصیّت کرتے ہوئے اپنے جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔ اس وقت ان کی عمر اٹھاون برس کی تھی۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے تجہیز و تکفین کا سامان کیا اور مسلمانوں کے سامنے نہایت پُر درد خطبہ دیا جس میں فرمایا:

''مسلمانو! تم پر آج ایک ایسے شخص کی جدائی کی مصیبت آپڑی ہے جس کی مثل میں نے خدا کے بندوں میں سے کسی کو نہیں دیکھا۔ وہ سب سے بڑھ کر درگزر کرنے والے تھے۔ سب سے زیادہ غل وغش سے پاک تھے۔ مسلمانوں کے سب سے زیادہ خیر اندیش تھے اور ان پر سب سے بڑھ کر شفیق تھے اس لیے تم سب ان کے واسطے رحمت اور مغفرت کی دعا کرو۔ خدا کی قسم اب ان جیسا کوئی شخص تمہارا سردار نہ ہوگا۔''

اس کے بعد حضرت مُعاذ رضی اللہ عنہ نے نمازِ جنازہ پڑھائی، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اور حضرت ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ قبر میں اترے اور اسلام کے اس آفتابِ جہانتاب کو سپردِ خاک کر دیا۔

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی جائے مدفن کے بارے میں اختلاف ہے۔ حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ''الاصابہ'' میں ایک جگہ ان کی قبر فحل میں بتائی ہے اور ایک دوسرے مقام پر ان کا مدفن بَیسان میں بتایا ہے۔ ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ''اُسد الغابہ'' میں ان کی جائے تدفین ''عمواس'' بتائی ہے جو رملہ سے بیت المقدس کی جانب چار فرسخ کی مسافت پر واقع ہے لیکن انہوں نے ''بَیسان'' والی روایت کو بھی ردّ نہیں کیا۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی خانگی زندگی کے حالات بہت کم معلوم ہیں۔ ایک روایت کے مطابق انھوں نے صرف ایک نکاح کیا تھا، اہلیہ کا نام ہند رضی اللہ عنہا بنت جابر تھا ان سے دو لڑکے یزید اور عمیر پیدا ہوئے لیکن

دونوں لاولد فوت ہوئے۔

ایک اور روایت میں ان کی دو بیویوں کا ذکر بھی آیا ہے تاہم ان کی نسل آگے نہ چلنے پر سب کا اتفاق ہے۔

حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ سے مروی چند احادیث بھی کتابوں میں ملتی ہیں۔ ان کے راویوں میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما، حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ اور حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابہ شامل ہیں۔

(۷)

فضائل و محاسن اور اخلاق و عادات کے اعتبار سے حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نہایت ارفع و اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔ سبقت فی الاسلام، راہِ حق میں بلاکشی، حُبِّ رسول، شوقِ جہاد، جوانمردی، زہد و استغناء، اخلاق و ایثار، حلم و شفقت اور تدبیر و فراست ان کی کتابِ سیرت کے سب سے درخشاں ابواب ہیں۔ ان کی یہی اوصاف و محاسن تھے جن کی بدولت انہیں بارگاہِ رسالت میں درجہ تقرّب حاصل ہو گیا تھا۔ انہوں نے نہ صرف عہدِ رسالت کا ہر شرف حاصل کیا بلکہ "امین الامت" کے منفرد لقب سے بھی مشرف ہوئے۔ ان کو وجودِ مبارک ایسے عظیم الشّان مناقب اور اخلاقِ فاضلہ کا مظہر تھا کہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان کی دل سے تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ جب وہ مجاہدین کو لے کر شام کے لیے روانہ ہونے لگے تو حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ نے عرب کے مشہور شہسوار حضرت قیس بن مکشوح کو مخاطب کر کے فرمایا:

> "میں تم کو ابو عبیدہ الامین رضی اللہ عنہ کی قیادت میں بھیج رہا ہوں جو ایسے آدمی ہیں کہ ان کے ساتھ کوئی زیادتی بھی کرتا ہے تو وہ اسے برداشت کر لیتے۔ جو ان کے ساتھ برائی کرتا ہے اس کو معاف کر دیتے ہیں جو ان سے تعلق توڑتا ہے وہ اس سے تعلق پیدا کرتے ہیں۔ مسلمانوں پر نہایت شفیق ہیں اور کافروں پر بہت سخت اس لیے تم لوگ کسی معاملے میں ان کی نافرمانی یا

مخالفت نہ کرنا، وہ تمہیں جو حکم دیں گے تمہاری بھلائی کے لیے دیں گے۔"

طبقاتِ ابن سعد میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی خدمت میں چار سو دینار اور چار ہزار درہم بھیجے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اپنے حصے کی تمام رقم فوج میں تقسیم کر دی اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے بھی چند درہم و دینار کے سوا جو انہوں نے اپنے اہلیہ کے کہنے پر گھریلو ضروریات کے لیے رکھ لیے تھے، تمام رقم مستحقین میں تقسیم کر دی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو بے اختیار ان کی زبان پر یہ الفاظ جاری ہو گئے:

"الحمد للہ کہ مسلمانوں میں ایسے بھی موجود ہیں جن کی نظروں میں سیم وزر کی کچھ حقیقت نہیں۔"

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے نزدیک حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی بے انتہا قدر و منزلت تھی اور وہ انہیں اپنا بھائی کہا کرتے تھے۔ امیر المومنین ۱۷ہجری میں بیت المقدس تشریف لے گئے تو ان کے استقبال کے لیے سردارانِ فوج کا سیلاب امڈ آیا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان میں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو نہ پایا تو پوچھا، این اخی؟ میرے بھائی کہاں ہیں؟ لوگوں نے پوچھا امیر المومنین آپ کس کے بارے میں پوچھ رہے ہیں؟ فرمایا، ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں۔ اتنے میں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اپنی اونٹنی پر سوار آ پہنچے۔ دوسرے اصحاب میں سے اکثر نے فتوحات کے بعد اپنا معیارِ زندگی قدرے بدل لیا تھا لیکن حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے زیب بدن وہی سادہ اور معمولی لباس تھا جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں مدینہ منورہ سے چلتے وقت دیکھا تھا۔ میرے بھائی میرے بھائی کہتے ہوئے ان سے بغل گیر ہو گئے۔ پھر مزاج پُرسی کے لیے ان کی جائے قیام پر تشریف لے گئے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ تلوار ڈھال اور اونٹ کے کجاوے کے سوا وہاں کسی قسم کا سامانِ آسائش نہیں تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی آنکھیں نم ہو گئیں اور انہوں نے فرمایا: "ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کاش تم ضروری سامان تو گھر میں رکھ لیتے۔" انھوں نے

بے نیازی سے جواب دیا: ''امیر المومنین ایک مجاہد کے لیے یہی سامان کافی ہے۔''

بیت المقدس کے اثنائے قیام میں ایک دن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ سے ازراہِ خوش طبعی و بے تکلفی کہا۔ ''بھئی اور لوگ تو میری دعوت کر چکے ہیں لیکن تم نے مجھے مدعو نہیں کیا۔ آج تم بھی میری دعوت کر دونا!''

حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''امیر المومنین میں اس خیال سے خاموش تھا کہ شاید آپ کو میری دعوت پسند نہ آئے ورنہ میں اپنے غریب خانہ پر ہر وقت آپ کے لیے چشم براہ ہوں۔''

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ان کی جائے قیام پر تشریف لے گئے تو حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے روٹی کے چند سوکھے ٹکڑے امیر المومنین کے سامنے لا کر رکھ دیئے اور عرض کی:

''امیر المومنین میری تو یہی خوراک ہے دونوں وقت روٹی کے یہ سوکھے ٹکڑے پانی میں بھگو کر کھا لیتا ہوں۔''

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ رونے لگے اور فرمایا: ''شام میں آ کر سب ہی بدل گئے لیکن ابو عبیدہ ایک تم ہو کہ اپنی اُسی وضع پر قائم ہو۔''

ایک اور موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''کسی کے منہ پر تعریف کرنا ممدوح کی گردن پر چھری چلانے کے مترادف ہے لیکن اے ابو عبیدہ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ تمہارے سوا ہم میں سے ہر ایک نے اپنے آپ کو کچھ نہ کچھ بدل لیا ہے۔''

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو ان کی وفات سے پہلے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جانشین مقرر کرنے کا مشورہ دیا تو انھوں نے فرمایا کاش ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ زندہ ہوتے تو خلافت کے لیے میں ان کا نام تجویز کرتا، قیامت کے دن مجھ سے اس کے بارے میں سوال ہوتا تو میں عرض کرتا، الٰہی میں نے تیرے نبی ﷺ کو اس شخص کے بارے میں یہ فرماتے سُنا تھا

کہ "یہ (ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ) اس اُمت کا امین ہے۔"

صحیح مسلم کی ایک روایت کے مطابق حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے نزدیک حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کا یہ مرتبہ تھا کہ وہ ان کی مخالفت کو مکروہ سمجھتے تھے۔

مُسند احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ میں حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کی عبرت پذیری کے سلسلے میں ایک روایت ہے کہ ایک دن رو رہے تھے کسی شخص نے پوچھا کہ آپ کیوں روتے ہیں؟ کہنے لگے، اس لیے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے فتوحاتِ شام وغیرہ اور مسلمانوں کے تموّل کا تذکرہ فرمایا تھا اور کہا تھا کہ ابو عبیدہ اگر تم وہ زمانہ پاؤ تو صرف تین خادم رکھنا۔ ایک اپنی خدمت کے لیے۔ ایک اہل وعیال کی نگہداشت کے لیے اور ایک سفر میں ساتھ لے جانے کے لیے۔ اسی طرح سواری کے لیے تین جانور کافی ہوں گے ایک سامان کے لیے، ایک تمہارے لیے اور ایک غلام کے لیے لیکن آج میں دیکھ رہا ہوں کہ گھر میں غلام ہی غلام ہیں اور اصطبل جانوروں اور گھوڑوں سے بھرا پڑا ہے۔ آہ میں رسول اللہ ﷺ سے کس طرح ملوں گا؟ آپ ﷺ نے وصیت فرمائی تھی کہ تم میں سے وہ مجھے سب سے زیادہ محبوب ہوگا جو مجھے اس حال میں ملے جس حال میں اسے میں چھوڑ جاؤں گا۔

مولانا سعید انصاری نے "سیر الصحابہ" میں لکھا ہے کہ "مُسند" کی یہ روایت سند کے لحاظ سے قابلِ اطمینان نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک بھی یہ بات قرینِ قیاس نہیں ہے کہ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے زُہد واستغنا نے کبھی انہیں اپنا گھر غلاموں اور اونٹ گھوڑوں سے بھرنے کی اجازت دی ہو۔

شام کا ہمہ مقتدر والی اور سپہ سالارِ اعظم ہونے کے باوجود حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے انکسار کی یہ کیفیت تھی کہ نہ کبھی امتیازی لباس پہنا اور نہ کبھی اونچی جگہ کو نشست گاہ بنایا۔ معمولی لباس میں سپاہیوں کے درمیان فرشِ خاک پر بیٹھ جاتے تھے۔ رومیوں کے سفیر آتے تھے تو دریافت کیے بغیر وہ یہ نہیں جان سکتے تھے کہ مسلمانوں کا امیر کون ہے۔ غرض انہوں نے انکسار اور مساوات کی حیرت انگیز مثال قائم کر دی تھی۔

ایک مرتبہ ایک مسلمان سپاہی نے دشمن کے ایک سپاہی کو پناہ دے دی۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے اس کو ماننے میں عذر کیا کہ یہ پناہ ایک سپاہی نے دی ہے۔ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو انھوں نے فرمایا! میں اس مسلمان مجاہد کی دی گئی پناہ کو رد نہیں کرسکتا کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ مسلمانوں کا ہر فرد سب کی طرف سے پناہ دے سکتا ہے۔

اس انکسار اور تواضع کے باوجود وہ نصیحت و تلقین اور حق گوئی سے کبھی باز نہ رہتے تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مسندِ خلافت پر بیٹھنے کی اطلاع ملی تو انہیں شام سے ایک پُر اثر خط لکھا جس میں انھیں روزِ آخرت کا خوف دلایا اور عدل و انصاف کی تلقین کی۔

سچ تو یہ ہے کہ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کی زندگی ایک نمونہ کی زندگی تھی، اس کے جس پہلو پر بھی نظر ڈالیں وہ مطلعِ انوار نظر آتا ہے اور امتِ مسلمہ کو اپنی منزلِ مقصود متعین کرنے کی راہ دکھاتا ہے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

حضرت سعد بن ابی وقّاص رضی اللہ عنہ

﴿شہسوارِ اسلام﴾

(۱)

رحمتِ عالم ﷺ نے ہجرت کے بعد مدینہ منوّرہ میں نزولِ اجلال فرمایا تو مسلمانوں اور بالخصوص اُن مہاجرین کو، جو مکہ میں تیرہ برس تک کفار کے ظلم وستم کی چکّی میں پستے رہے تھے، کسی قدر چین کا سانس لینا نصیب ہوا لیکن یہودِ مدینہ اور مشرکینِ مکہ کو مسلمانوں کا مدینہ منورہ میں امن وامان سے رہنا ایک آنکھ نہ بھایا اور انہوں نے اہل حق کے خلاف ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔ قریش مکہ نے اپنے دل کے جلے پھپھولے یوں پھوڑے کہ رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی کو ایک تند وتیز خط لکھ کر دھمکی دی کہ تم نے ہمارے آدمی کو اپنے ہاں پناہ دی ہے، اس کو قتل کر ڈالو یا مدینہ سے نکال دو ورنہ ہم مدینہ پر حملہ کر کے تمہیں نیست ونابود کر دیں گے۔ عبداللہ کا بس چلتا تو وہ ضرور قریشِ مکہ کے کہنے کے مطابق عمل کرتا لیکن جب اسے اس قسم کی حرکت کے نتائج وعواقب سے آگاہ کیا گیا تو وہ خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ یہ بڑا پُر خطر زمانہ تھا۔ دشمنانِ اسلام مدینہ پر حملہ کے لیے پَر تول رہے تھے۔ اس لیے ہر وقت چوکنا رہنے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے معمول بنا لیا تھا کہ رات کو بھی ہتھیار باندھ کر سوتے تھے اور باری باری جاگ کر پہرہ دیا کرتے تھے۔ کاشانہ نبوی کو تو وہ کسی وقت بھی غیر محفوظ حالت میں نہیں چھوڑتے تھے اور دن ہو یا رات کوئی نہ کوئی صاحب رسول رضی اللہ عنہ ہتھیار باندھ کر کاشانہ نبوی ﷺ کے پہرے پر ضرور کھڑے ہوتے۔

اسی زمانے کا واقعہ ہے کہ ایک رات حضور ﷺ کی نیند اچاٹ ہوگئی۔ اتفاق سے اس وقت کوئی شخص پہرے پر موجود نہیں تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا، کاش کوئی رجل صالح (نیک آدمی) آج پہرے پر ہوتا۔ اتنے میں ہتھیاروں کی جھنکار سنائی دی۔ حضور ﷺ نے پوچھا، کون؟ جواب ملا، یارسول اللہ میں سعد ہوں۔ فرمایا، کس لیے آئے ہو، عرض کیا، میرے دل میں حضور ﷺ کی نسبت خوف پیدا ہوا اس لیے پہرہ دینے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔

سرور عالم ﷺ یہ جواب سُن کر خوش ہوگئے، حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے لیے دعا کی اور پھر استراحت فرمائی...... یہ سعد رضی اللہ عنہ جن کو بارگاہِ رسالت سے "رجلِ صالح" کا عظیم لقب مرحمت ہوا، ابی وقاص مالک بن وہیب کے فرزند اور قریش کی ایک معزز شاخ بنو زہرہ کے چشم و چراغ تھے۔

(۲)

سیّدنا حضرت ابو اسحٰق سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اصحابِ عشرہ مبشرہ میں سے ایک ہیں اور تاریخِ اسلام کی مہتم بالشان ہستیوں میں شمار ہوتے ہیں جو شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دربار میں نہایت ارفع و اعلیٰ مقام پر فائز ہیں۔ سلسلہ نسب یہ ہے:

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ مالک بن وہیب بن عبد مناف بن زہرہ بن کلاب بن مرّہ۔

پانچویں پشت میں کلاب بن مرّہ پر ان کا سلسلہ نسب رسولِ اکرم ﷺ کے نسب نامہ سے مل جاتا ہے۔ حضور ﷺ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ بھی قبیلہ بنو زہرہ سے تھیں اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے والد ابو وقاص مالک کی چچا زاد بہن تھیں۔ اس لحاظ سے ابو وقاص مالک رشتہ میں حضور ﷺ کے ماموں ہوتے تھے اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ ماموں زاد بھائی...... حضور ﷺ کبھی کبھی ازراہِ محبت و شفقت (ننھیالی رشتہ کی وجہ سے) حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو بھی ماموں کہہ کر پکارتے تھے۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی والدہ کا نام حمنہ بنتِ سفیان بن اُمیہ تھا اور وہ بنو اُمیہ سے تعلق رکھتی تھیں۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ ہجرتِ نبوی سے تقریباً تیس برس قبل مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے۔ سرورِ عالم ﷺ کی بعثت کے وقت حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا عنفوانِ شباب تھا اور انہوں نے عمر کی صرف سترہ یا انیس منزلیں طے کی تھیں تاہم اللہ تعالیٰ نے انہیں نہایت سعید فطرت عطا کی تھی۔ جونہی ان کے کانوں میں دعوتِ توحید کی آواز پڑی انہوں نے بلا تامّل اس پر لبیک کہا اور ''سابقون الاوّلون'' کی مقدس جماعت میں شامل ہو گئے۔ ایک روایت کے مطابق اسلام لانے والے بالغ مردوں میں وہ تیسرے مسلمان تھے اور بعض روایات کے مطابق ان سے قبل چھ سات بزرگ سعادت اندوزِ اسلام ہو چکے تھے۔ بہر صورت وہ ان چند نفوسِ قدسی میں سے ہیں جن کو دعوتِ حق کے ابتدائی سات دنوں کے اندر لوائے توحید تھامنے کا شرف حاصل ہوا۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی والدہ حمنہ کو اپنے آبائی مذہب سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا اس کو بیٹے کے قبولِ اسلام کا حال سن کر اس قدر رنج ہوا کہ کھانا پینا بولنا چالنا سب ترک کر دیا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ ماں سے بے پناہ محبت کرتے تھے اور اپنی ماں کو آزردہ دیکھنا ان کے لیے ایک بہت بڑی آزمائش تھی لیکن وہ اس آزمائش میں پورے اترے۔ ماں تین دن تک بھوکی پیاسی رہی، یہی اصرار تھا کہ یہ نیا دین ترک کر دو لیکن سعد رضی اللہ عنہ کا ایک ہی جواب تھا:

> ''ماں تم مجھے بے حد عزیز ہو لیکن تمہارے قالب میں خواہ ہزار جانیں ہوں اور ایک ایک کر کے ہر جان نکل جائے تب بھی اسلام کو نہ چھوڑوں گا۔''

بارگاہِ خداوندی میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی شانِ استقلال ایسی مقبول ہوئی کہ عامۃ المسلمین کے لیے یہ فرمانِ الٰہی نافذ ہو گیا۔

وَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ط

(اور اگر ماں باپ تجھ کو میرے ساتھ شرک پر مجبور کریں جس کی تجھ کو خبر نہیں تو اس میں اُن کا کہا مت مان۔ (۲۹-۸)

قبولِ اسلام کے بعد والدہ کی ناراضی کے علاوہ اور بھی کوئی ایسی سختی اور مصیبت نہ تھی جو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے مشرکین کے ہاتھوں نہ جھیلی ہو۔ انہوں نے کفار سے گالیاں کھائیں، طعنے سہے اور جسمانی اذیتیں برداشت کیں لیکن کیا مجال کہ ان کے پائے استقلال میں ذرّہ برابر لغزش آئی ہو۔

دعوتِ حق کے آغاز میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کفار کی شر انگیزی سے بچنے کے لیے مکہ کے قریبی پہاڑوں کی سنسان گھاٹیوں میں چھپ کر خدائے واحد کی عبادت کیا کرتے تھے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ بھی انہی نفوسِ قدسی میں شامل تھے۔ ایک دن وہ چند دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ ایک ویران گھاٹی میں نماز پڑھ رہے تھے کہ چند مشرکین ادھر آ نکلے۔ وہ مسلمانوں پر پہلے تو آوازے کسنے لگے اور پھر ان پر حملہ کر دیا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی اُٹھتی جوانی تھی، انہیں جوش آ گیا، پاس ہی اونٹ کی ایک ہڈی پڑی تھی اسے اٹھا کر مشرکین پر پل پڑے۔ ایک مشرک کا سر پھٹ گیا اور اس میں سے خون بہنے لگا۔ اب ان شریروں نے وہاں سے بھاگنے ہی میں اپنی خیریت سمجھی۔ علامہ ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے حق کی حمایت میں خونریزی کی۔

ہجرت سے قبل حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی زندگی کا سب سے بڑھ کر تابناک باب وہ ہے جس میں وہ تین سال (۷ھ سے ۱۰ھ) تک سرورِ کائنات ﷺ کی رفاقت میں شعبِ ابی طالب میں محصور رہے۔ شعب ابی طالب کی محصوری اگرچہ بنی ہاشم اور بنو مُطّلِب سے مخصوص تھی لیکن حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ہاشمی اور مُطّلبی نہ ہونے کے باوجود محض اللہ اور اللہ کے رسول کی خاطر بنو ہاشم اور بنو مُطّلِب کا ساتھ دیا اور ان کے ساتھ تین سال تک ہولناک مصائب برداشت کرتے رہے۔ اس زمانے میں بے کس محصورین بعض اوقات درختوں اور جھاڑیوں کی پتیاں اُبال اُبال کر اپنا پیٹ بھرتے تھے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا

بیان ہے کہ ایک دفعہ رات کو انہیں سوکھے ہوئے چمڑے کا ایک ٹکڑا کہیں سے مل گیا۔ انہوں نے اسے پانی سے دھویا، پھر آگ پر بھونا، کوٹ کر پانی میں گھولا اور ستو کی طرح پی کر اپنے پیٹ کی آگ بجھائی۔

(۳)

۱۱ بعدِ بعثت میں اہل یثرب کو اسلام کی طرف مائل کر دیا۔ چنانچہ اس سال چھ سلیم الطبع خزرجی سعادت اندوزِ اسلام ہو کر یثرب واپس گئے۔ اگلے سال یثرب کے بارہ آدمیوں نے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر قبولِ اسلام کا شرف حاصل کیا اس سے اگلے سال پچھتر حق پرست یثرب سے مکہ پہنچے اور رحمتِ عالم ﷺ کے دستِ حق پرست پر اس عہد کے ساتھ بیعت کی کہ آپ ﷺ یثرب تشریف لائیں تو ہم اپنی جانوں، مالوں اور اولادوں کے ساتھ آپ کی حفاظت کریں گے۔ یہ بیعت ''بیعتِ عقبہ کبیرہ'' کہلاتی ہے۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یثرب کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ارضِ مکہ کو الوداع کہہ کر یثرب چلے گئے ان مہاجرین میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ اور ان کے نوعمر بھائی عمیر رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ یثرب پہنچ کر حضرت سعد رضی اللہ عنہ اور عمیر رضی اللہ عنہ اپنے بڑے بھائی عتبہ بن ابی وقاص کے مکان میں فرد کش ہوئے۔ عتبہ نے جنگِ بعاث سے قبل مکہ میں ایک شخص کو قتل کر دیا تھا اور قصاص کے خوف سے بھاگ کر یثرب میں پناہ لی تھی۔ عتبہ اگرچہ مشرک تھے لیکن انہوں نے نہایت خوش دلی سے اپنے دونوں حق پرست بھائیوں کو اپنے ہاں ٹھہرایا۔ بدقسمتی سے عتبہ کافی عرصہ تک کفر و شرک کی ظلمتوں میں بھٹکتے رہے لیکن ان کی اسلام دشمنی نے چھوٹے بھائیوں کو ذرہ برابر بھی متاثر نہ کیا اور شروع سے لے کر آخیر تک اسلام سے ان کی والہانہ شیفتگی برقرار رہی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی ہجرت کے تھوڑے عرصے بعد سرورِ عالم ﷺ نے بھی یثرب کو اپنے قدومِ میمنت لزوم سے مشرف فرمایا اور یہ قدیم شہر یثرب سے ''مدینۃ النبی ﷺ'' بن گیا۔

ہجرت کے بعد مسلمانوں کو کسی قدر طمانیت نصیب ہوئی اور وہ کفار کی ایذا رسانی سے محفوظ ہو گئے تاہم مشرکین مکہ کے حملہ کا خطرہ ہر وقت موجود تھا۔ اسی خطرے کے پیشِ نظر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہر وقت مسلح رہتے تھے اور کاشانہ نبوی پر باقاعدگی سے پہرہ دیا کرتے تھے، اسی زمانے میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو بھی بعض موقعوں پر پہرہ دینے کی سعادت نصیب ہوئی۔ مدینہ پر حملہ کے تدارک اور مشرکین مکہ کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کے لیے حضور ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم کی چھوٹی چھوٹی مسلح جماعتیں وقتاً فوقتاً مکہ کی طرف روانہ فرماتے رہتے تھے۔ ان مہمات کو سرایا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جنگِ بدر سے پہلے جو سرایا پیش آئے ان میں سے سریہ عبیدہ رضی اللہ عنہ بن حارث، سریہ حمزہ رضی اللہ عنہ اور سریہ عبداللہ بن جحش میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ ایک عام مجاہد کی حیثیت سے شریک ہوئے اور ایک سریہ میں آٹھ مجاہدین کی قیادت کی۔ اس مہم کو ان کے نام کی نسبت سے ''سریہ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ'' کہا جاتا ہے۔ اس میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ اپنے آٹھ ساتھیوں کے ہمراہ قریش کی نقل و حرکت کا پتہ چلانے خرار کے مقام تک گئے لیکن مشرکین سے مڈبھیڑ نہ ہوئی۔

ابنِ ہشام کا بیان ہے کہ سریہ عبیدہ رضی اللہ عنہ بن حارث میں بھی اگرچہ کشت و خون تک نوبت نہ پہنچی لیکن حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے قریش کی طرف ایک تیر چلا ہی دیا۔ صحیح بخاری میں خود حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں پہلا عرب ہوں جس نے راہِ خدا میں تیر چلایا۔

اسی زمانے میں بعض مہمات میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو خود سرورِ عالم ﷺ کی معیت کا شرف بھی نصیب ہوا، یہ سخت تنگدستی کا دور تھا۔ صحیح بخاری میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی معیت میں غزوہ کرتے تھے اور ہمارے پاس درخت کے پتوں کے سوا کھانے کی کوئی چیز نہیں ہوتی تھی، یہاں تک کہ ہمارا فضلہ ایسا ہوتا تھا جیسا اونٹ یا بکری کا ہوتا ہے۔ اس میں کوئی خلط نہیں ہوتی تھی (یعنی مینگنیاں ہوتی تھیں)۔

طبری نے غزوۂ بواط (بواۃ) میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی شرکت کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔ یہ غزوہ ربیع الاوّل ۲ھ میں پیش آیا۔ اس میں دو سو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور ﷺ کے ہمرکاب تھے۔ ان میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے اور حضور ﷺ نے انہیں لشکر کا سفید جھنڈا مرحمت فرمایا تھا۔ یہ مقدس لشکر قریش کے ایک بڑے قافلے سے نبرد آزما ہونے کے لیے بواط کے مقام تک گیا لیکن قریش کا قافلہ جس میں دو سو آدمی اور ڈھائی ہزار اونٹ تھے، بچ کر نکل گیا۔

(۴)

رمضان المبارک ۲ھ میں بدر کے میدان میں کفر وحق کا معرکۂ اوّل پیش آیا تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اس میں والہانہ جوش وخروش سے حصّہ لیا۔ اثنائے جنگ میں ان کا مقابلہ قریش کے نامی بہادر سعید بن عاص سے ہو گیا، انہوں نے آناً فاناً سعید کو خاک و خون میں لوٹا دیا اور اس کی مشہور تلوار ذوالکتیفہ پر قبضہ کر لیا۔ یہ تلوار لے کر وہ رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت تک مالِ غنیمت کے بارے میں کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا اس لیے حضور ﷺ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ یہ تلوار جہاں سے اٹھائی ہے وہیں رکھ دو۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے فوراً تعمیل ارشاد کی لیکن ان کی اس تلوار کے نہ ملنے پر بڑا املال ہوا۔ ابھی وہ کچھ ہی دُور گئے تھے کہ سورۂ انفال نازل ہوئی جس میں یہ حکم تھا:

فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا

(تو جو تم نے لوٹا ہے اب کھاؤ کہ حلال طیّب ہے)

حضور ﷺ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو بُلا بھیجا اور فرمایا کہ جاؤ اور اپنی تلوار لے لو۔

غزوۂ بدر میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے نو عمر بھائی عمیر رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے رتبہ شہادت پر فائز کیا، حضرت سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ لڑائی سے پہلے میں نے عمیر کو دیکھا کہ اِدھر اُدھر چھپتا پھرتا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا، عمیر کیا بات ہے؟ کہنے لگا، بھائی جان

میری عمر کم ہے اس لیے ڈرتا ہوں کہ کہیں رسول اللہ ﷺ مجھے لڑائی میں حصہ لینے سے روک نہ دیں حالانکہ میری دلی تمنا ہے کہ میں راہِ حق میں لڑوں شاید اللہ تعالیٰ مجھے شہادت نصیب فرمائے...... عمیر رضی اللہ عنہ کا خدشہ درست ثابت ہوا۔ حضور ﷺ نے اُن کی کم عمری کی وجہ سے واپس جانے کا حکم دیا۔ عمیر رضی اللہ عنہ رونے لگے۔ حضور ﷺ کو ان کے شوق اور رونے کا حال معلوم ہوا تو آپ ﷺ نے ان کو لڑائی میں شریک ہونے کی اجازت دے دی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ عمیر کے چھوٹے ہونے اور تلوار کے بڑا ہونے کی وجہ سے میں اس کے تسموں میں گرہیں لگاتا تھا کہ اونچی ہو جائے۔ عمیر رضی اللہ عنہ لڑائی میں مردانہ وار لڑے اور دشمن کے نامور پہلوان عمرو بن عبدِ ودّ کے ہاتھوں جامِ شہادت پیا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو عمیر رضی اللہ عنہ سے بے پناہ محبت تھی اُن کی شہادت ان کے لیے صدمہ جانکاہ سے کم نہ تھی لیکن وہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ پڑھ کر خاموش ہو گئے۔ لڑائی میں مشرکین کو عبرت ناک شکست ہوئی۔ ان کے ستر (۷۰) آدمی قتل ہوئے اور ستر (۷۰) کو مسلمانوں نے قیدی بنالیا۔ ان میں سے تین آدمیوں (حارث بن وحرہ، سالم بن شماخ اور فاکہہ) کو تنہا حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے قیدی بنایا۔

جنگِ اُحد (۳ ہجری) میں جب ایک اتفاقی غلطی سے لڑائی کا پانسہ پلٹ گیا اور مسلمانوں میں انتشار پھیل گیا تو حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ان چند اصحاب میں تھے جو شروع سے اخیر تک رحمتِ عالم ﷺ کی سپر بنے رہے۔ وہ ایک ماہر قدر انداز تھے۔ کفار بار بار حضور پر نرغہ کرتے تھے اور سعد رضی اللہ عنہ اپنے تیروں سے ان کا منہ پھیر دیتے تھے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ اس نازک وقت میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے پہلو میں کھڑے تھے۔ حضور ﷺ اپنے ترکش سے تیر نکال نکال کر انہیں دیتے تھے اور فرماتے تھے:

یَا سَعۡدَ اِرۡمِ فِدَاکَ اَبِیۡ وَاُمِّیۡ

(اے سعد تیر چلا، میرے ماں باپ تجھ پر فدا ہوں)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ، سے روایت ہے کہ میں نے سعد رضی اللہ عنہ کے سوا کسی اور کے حق میں ایسے الفاظ رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے نہیں سُنے۔

علامہ ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ غزوہ اُحد کے دن حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ایک ہزار تیر چلائے تھے۔ اثنائے جنگ میں ایک مشرک ابوسعید بن ابی طلحہ (یا بروایتِ دیگر طلحہ بن ابی طلحہ) مسلمانوں پر بڑھ چڑھ کر حملے کر رہا تھا، حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے تاک کر اس کے حلق میں ایسا تیر مارا کہ اس کی زبان کُتے کی طرح باہر نکل آئی اور وہ تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ ایک اور مشرک نے بھی اتنے تند و تیز حملوں سے مسلمانوں پر آفت ڈھا رکھی تھی۔ حضور ﷺ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ اس کو اپنے تیر کا نشانہ بناؤ۔ اتفاق سے اس وقت ترکش میں کوئی تیر نہ بچا تھا تاہم حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے پھل کے بغیر ایک تیر اٹھا کر ایسی مہارت سے اس مشرک کی پیشانی پر مارا کہ وہ بدحواس ہو کر پیچھے کی طرف گر گیا اور برہنہ ہو گیا۔ حضور ﷺ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی ماہرانہ قدر اندازی اور اس مشرک کی بدحواسی پر بے اختیار ہنس پڑے۔ (بعض روایتوں کے مطابق یہ واقعہ غزوۂ احزاب میں پیش آیا)۔

علامہ ابن اثیر رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ جنگِ اُحد سے ایک دن پہلے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ ایک جگہ اکٹھے ہوئے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے دعا مانگی:

> "الٰہی کل جو دشمن میرے مقابلے میں آئے وہ بڑا بہادر اور غضب ناک ہو اور مجھے اتنی طاقت دے کہ میں تیری راہ میں اس کو قتل کروں۔"

حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے آمین کہا پھر انہوں نے یوں دُعا مانگی:

> "الٰہی کل میرا مقابلہ ایسے دُشمن سے ہو جو نہایت جنگجو اور غصہ ور ہو۔ مجھے اس کے ہاتھ سے شہادت نصیب ہو اور وہ میرے کان ناک کاٹ ڈالے۔ جب میں تجھ سے ملوں اور تو مجھ سے پوچھے کہ اے عبداللہ یہ تیرے کان

ناک کیوں کاٹے گئے تو میں کہوں کہ اے اللہ تیرے لیے اور تیرے رسول ﷺ کے لیے۔''

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے بھی ان کی دُعا پر ''آمین'' کہا۔ دونوں کی دُعائیں سچے دل سے نکلی تھیں۔ اس لیے فوراً دِراجابت پر پہنچیں۔ لڑائی میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ایک نامی مشرک کو قتل کیا اور حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے ابنِ اخنس ثقفی کے ہاتھ سے جامِ شہادت پیا۔ مشرکین نے ان کی لاش کا مُثلہ کیا اور کان ناک ہونٹ کاٹ کر دھاگے میں پروئے۔ لڑائی کے بعد حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا گزر ان کی لاش میں ہوا تو بے اختیار ان کے منہ سے نکلا:

''خدا کی قسم عبداللہ کی دُعا میری دُعا سے بہتر تھی۔''

یہ ان کے سوزِ دروں کا اظہار تھا کہ عبداللہ رضی اللہ عنہ تو رتبہ شہادت پر فائز ہوئے اور میں اس سے محروم رہا۔

غزوۂ اُحد میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے بڑے بھائی عتبہ نے مشرکین کا ساتھ دیا اور بڑے جوش و خروش سے مسلمانوں کے خلاف لڑے۔ ایک موقع پر عتبہ نے حضور ﷺ پر ایک پتھر پھینکا جس سے آپ ﷺ کا چہرۂ مبارک زخمی ہو گیا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو عتبہ کی یہ حرکت مدت العمر یاد رہی، فرمایا کرتے تھے ''خدا کی قسم عتبہ سے زیادہ میں کسی شخص کے خون کا پیاسا نہیں ہوا۔''

بدر اور اُحد کے بعد حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے احزاب، خیبر، فتح مکہ، حنین، طائف اور تبوک میں بھی رحمتِ عالم ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا اور ہر معرکے میں اپنی شمشیر خاراشگاف کے جوہر دکھائے۔

۶ھ میں انہیں بیعتِ رضوان کرنے والے ان چودہ سو صحابہ رضی اللہ عنہم میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا جنہیں بارگاہِ الٰہی سے اصحاب الشجرہ کا لقب مرحمت ہوا اور کھلے لفظوں میں جنت کی بشارت دی گئی۔

سنہ ۱۰ ہجری میں رحمتِ عالم ﷺ حجۃ الوداع کے لیے مکہ معظمہ تشریف لے گئے تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ بھی حضور ﷺ کے ہمرکاب تھے۔ مکہ پہنچ کر حضرت سعد رضی اللہ عنہ سخت علیل ہو گئے۔ حضور ﷺ نے ان کی شدید علالت کا حال سُنا تو عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ زندگی سے مایوس ہو چکے تھے، حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کی: ''یارسول اللہ ﷺ میں مالدار آدمی ہوں اور ایک بیٹی کے سوا کوئی وارث نہیں ہے، اگر آپ ﷺ اجازت دیں تو میں اپنا دو تہائی مال صدقہ کر دوں اور ایک تہائی بیٹی کے لیے چھوڑ دوں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں'' عرض کی ''اگر دو تہائی نہیں تو نصف ہی سہی۔'' حضور ﷺ نے پھر نفی میں جواب دیا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا کہ پھر ایک تہائی صدقہ کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا، ایک تہائی بھی بہت ہے اگر تم اپنے وارثوں کو مالدار اور تونگر چھوڑو تو یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ مفلس ہوں اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔

اس کے بعد حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اشکبار ہو کر عرض کی ''یارسول اللہ میں مکہ میں مر رہا ہوں حالانکہ میں راہِ حق میں اس سرزمین کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ چکا ہوں۔ حضور ﷺ نے ان کو دلاسا دیا اور ان کے چہرے پیشانی اور شکم پر دستِ مبارک پھیر کر دعا فرمائی، اے اللہ سعد رضی اللہ عنہ کو شفا دے اور اس کی ہجرت کو کامل کر۔

رحمتِ دوعالم ﷺ کی دُعا حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے لیے آبِ حیات ثابت ہوئی اور ان کی طبیعت اسی وقت سے بحال ہونے لگے یہاں تک کہ وہ بالکل تندرست ہو کر مدینہ واپس گئے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے دستِ مبارک کی ٹھنڈک آج تک اپنے جگر میں محسوس کرتا ہوں۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے علاج کے لیے حضور ﷺ نے مشہور طبیب حارث بن کلدہ کو بُلا بھیجا۔ اس نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے لیے کھجور اور السی کے آٹے کا حریرہ تجویز کیا چنانچہ وہ اسی حریرے کے استعمال سے صحت یاب ہو گئے۔ صحیح

بخاری میں ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی عیادت کے موقع پر ان سے مخاطب ہو کر یہ الفاظ بھی ارشاد فرمائے:

''اے سعد شاید خدا تم کو (بسترِ مرض) سے اٹھائے اور تم سے کچھ لوگوں کو نفع اور کچھ کو نقصان پہنچے۔''

حضور ﷺ کی یہ بشارت حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے حق میں یوں پوری ہوئی کہ وہ صحت یاب ہو گئے اور چند سال بعد ان کی قیادت میں مجاہدین اسلام نے مجوسی ایران کی قوّت کو پاش پاش کر ڈالا۔

(۵)

۱۱ ھ ہجری میں سرورِ عالم ﷺ نے رحلت فرمائی اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سریر آرائے خلافت ہوئے تو حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے بلا تامّل ان کی بیعت کر لی۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے فضائل اور صلاحیتوں کے معترف اور مدّاح تھے۔ انہوں نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو بنو ہوازن کا عامل مقرر کر دیا۔

۱۳ ھ میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ مسندِ خلافت پر بیٹھے تو انہوں نے بھی حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو اس منصب پر برقرار رکھا لیکن قدرت انہیں اس سے کسی عظیم تر مقصد کے لیے منتخب کر چکی تھی...... صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ایران کی زبردست مجوسی سلطنت سے مسلمانوں کی کشمکش کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس کشمکش کا پہلا دور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات پر ختم ہو گیا، یہ کم و بیش ایک برس کی مدت پر محیط تھا۔ اس عرصے میں عرب اور ایران کی سرحد پر آباد بنو شیبان کے سردار مثنیٰ بن حارثہ رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ایرانیوں کو تابڑ توڑ شکستیں دیں لیکن ۱۳ھ میں جب حضرت خالد رضی اللہ عنہ شام میں اسلامی فوجوں کی قیادت کرنے عراقِ عرب سے رخصت ہوئے تو اہلِ ایران مسلمانوں کا قلع قمع کرنے کے لیے متحد ہو گئے اور اس مقصد کے لیے زور شور سے جنگ کی تیاریاں کرنے لگے۔ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ نے

مدینہ پہنچ کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ان حالات کی اطلاع دی تو انہیں مسلمانوں کی سلامتی کے بارے میں سخت تشویش پیدا ہوگئی۔ اس وقت وہ سخت علیل تھے بلکہ زندگی کے آخری مراحل طے کر رہے تھے۔ اسی حالت میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو وصیّت کی کہ ''اے عمر میرا پیمانہ زندگی لبریز ہو چکا ہے، مجھے اُمید نہیں کہ میں آج شام تک زندہ رہوں، میرے مرنے کے بعد تم کل ہی مثنیٰ کو مدد دے کر عراق روانہ کر دینا۔'' اس وصیّت کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے پیک اجل کو لبیک کہا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالتے ہی حضرت مثنیٰ کی مدد کے لیے حضرت ابوعبید ثقفی رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں ایک ہزار سرفروشوں کی فوج روانہ کر دی۔ راستے میں کئی عرب قبائل جہاد میں شرکت کا شرف حاصل کرنے کے لیے ان کے ساتھ شامل ہو گئے اس طرح ابوعبید رحمۃ اللہ علیہ کے لشکر کی تعداد کئی ہزار تک پہنچ گئی۔ حضرت ابوعبیدہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایرانیوں کو نمارق، کسکر اور کچھ دوسرے معرکوں میں شکست دے کر عراق عرب کے خاصے بڑے رقبے پر قبضہ کر لیا۔ ان شکستوں کی خبر سن کر ایرانی وزیرِ اعظم رستم بن فرخزاد سخت برہم ہوا اور اس نے ایک جہاندیدہ افسر بہمن جادویہ کو ایک زبردست لشکر دے کر مسلمانوں کے مقابلے کے لیے بھیجا۔ یہ لشکر دریائے فرات کے کنارے ''قِس ناطف'' کے مقام پر خیمہ زن ہوا۔ اُدھر سے حضرت ابوعبید رحمۃ اللہ علیہ نے فرات کے دوسرے کنارے پر ایک مقام مروحہ میں قیام کیا۔ بہمن جادویہ نے انہیں پیغام بھیجا کہ تم دریا کے اس پار اتر کر آؤ گے یا ہم آئیں۔ بدقسمتی سے ابوعبیدہ رحمۃ اللہ علیہ یہ اندازہ نہ کر سکے کہ دوسری طرف میدان بہت تنگ ہے اور مسلمانوں کے لیے وہاں صف بندی کرنا مشکل ہے۔ وہ جوشِ شجاعت میں اپنی فوج کے ہمراہ دریا کے پار اتر گئے۔ لڑائی کا آغاز ہوا تو ایرانی لشکر کے تین سو جنگی ہاتھیوں نے قیامت ڈھا دی اور مردانہ وار لڑنے کے باوجود مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے۔ اسی افراتفری میں کسی نے دریا کا پُل توڑ دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد دریا میں غرق ہوگئی اور بہت سے میدانِ جنگ میں شہید ہو گئے، جن میں حضرت

ابو عبیدہ رحمۃ اللہ علیہ بھی شامل تھے۔ یہ افسوس ناک واقعہ تاریخ میں "معرکہ جسر" یعنی "پل کی لڑائی" کے نام سے مشہور ہے۔ حضرت مثنیٰ بن حارثہ شیبانی رضی اللہ عنہ نے بہت جلد جسر کی شکست کا بدلہ لے لیا اور اگلے سال (رمضان ۱۴ھ میں) بویب کے مقام پر ایرانیوں کو عبرتناک شکست دی۔ اس لڑائی میں ایک لاکھ سے زیادہ ایرانی میدانِ جنگ میں کام آئے۔ معرکہ بویب مسلمانوں کے نزدیک معرکہ جسر کا بھرپور جواب تھا لیکن اس نے مجوسی ایران کی غیرت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ انہوں نے ملکہ پوران دخت کو معزول کر کے ایک نوجوان شہزادے یزدگرد کو تخت پر بٹھایا اور خواص و عوام سب متحد ہو کر مسلمانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ جن علاقوں پر مسلمانوں نے قبضہ کر لیا تھا وہاں بھی بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے اور مسلمان چاروں طرف سے خطرات میں گھر گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان حالات کی خبر پہنچی تو انہوں نے مثنیٰ رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ ساری فوج کو سمیٹ کر سرحد عرب کی طرف ہٹ آؤ چنانچہ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ اپنی فوجوں کو سمیٹ کر مقام ذوقار میں مقیم ہو گئے۔ اُدھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تمام عرب میں منادی کرا دی کہ لوگ جہاد کے لیے تیار ہو کر آئیں۔ تھوڑے ہی عرصے میں مدینہ منورہ میں ہر طرف سے شوقِ جہاد سے سرشار آدمیوں کا سیلاب اُمڈ آیا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے بھی بنو ہوازن کے تین ہزار مجاہدین روانہ کیے۔ بقول علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے آدمیوں میں ایک ایک شخص تیغ و علم کا مالک تھا (الفاروق)۔ اس لشکر کو دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ بہت مسرور ہوئے اور ارادہ کیا کہ اس فوج کے ساتھ ایرانیوں کے مقابلے پر نکلیں لیکن صحابہ رضی اللہ عنہم نے روکا اور کہا کہ آپ کا مدینہ میں رہنا ہی مناسب ہے۔ اب سوال پیدا ہوا کہ اس عظیم مہم کی قیادت کس کے سپرد کی جائے۔ تمام اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم اس مسئلہ پر آپس میں بڑی سرگرمی سے صلاح مشورہ کرنے لگے۔ یکایک حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ بول اٹھے "میں نے پالیا، میں نے پالیا۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا، وہ کون؟

حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔ ''سعد بن مالک (ابی وقاص)
سب نے ان کی رائے سے اتفاق کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی وقت خط لکھ کر حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو نجد سے بلا بھیجا۔ چند دن بعد وہ مدینہ منوّرہ پہنچے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایران جانے والی فوجوں کی قیادت ان کے سپرد کی اور علم امارت ان کے ہاتھ میں دیتے ہوئے نصیحت کی کہ اے سعد ہر حال میں اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے احکام پر عمل کرنا، اس کے علاوہ انہوں نے اور بھی بہت سی بیش بہا ہدایتوں سے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو نوازا جو آگے چل کر قدم قدم پر ان کے کام آئیں۔

(۶)

حضرت سعد رضی اللہ عنہ چار ہزار سرفروشوں کے ساتھ مدینہ منوّرہ سے روانہ ہوئے اور اٹھارہ منزلیں طے کرنے کے بعد ثعلبہ کے مقام پر خیمہ زن ہوئے۔ یہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بھیجے ہوئے مزید فوجی دستے ان کے ساتھ آ کر مل گئے۔ اس طرح ان کے لشکر کی تعداد بائیس ہزار تک پہنچ گئی۔ ان دنوں حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ آٹھ ہزار فوج کے ساتھ ذوقار میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی آمد کے منتظر تھے۔ ابھی حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ثعلبہ سے کوچ نہیں کیا تھا کہ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کو خالق حقیقی کی طرف سے بلاوا آ گیا، انہوں نے معرکہ جسر میں جو زخم کھائے تھے ان کے ٹانکے کھل گئے اور کسی علاج سے مندمل نہ ہوئے۔ زخموں کا یہی بگاڑ ان کی موت کا بہانہ بن گیا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ ثعلبہ سے چل کر شراف پہنچے تو حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کی آٹھ ہزار فوج بھی ان سے آ ملی۔ مثنیٰ رضی اللہ عنہ کے بھائی معنیٰ رضی اللہ عنہ بھی اپنی بیوہ بھاوج سلمٰی کے ساتھ اس لشکر میں موجود تھے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو مثنیٰ رضی اللہ عنہ کی رحلت کی خبر سن کر بے پناہ صدمہ ہوا۔ انہوں نے تالیفِ قلب کے لیے مثنیٰ رضی اللہ عنہ کی بیوہ سلمٰی رضی اللہ عنہا سے نکاح کر لیا، اور معنیٰ رضی اللہ عنہ کو ہدایت کی کہ وہ مثنیٰ رضی اللہ عنہ کے بچوں کی اچھی طرح سے غور و پرداخت کریں۔ شراف میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے فوج کا جائزہ لیا تو وہ تیس ہزار کے قریب ٹھہری۔ شراف سے کوچ کر کے حضرت سعد رضی اللہ عنہ

عذیب پہنچے جو ایرانیوں کی ایک سرحدی چوکی تھی۔ اس کے محافظ ایرانی سپاہی مسلمانوں کی آمد کی خبر سُن کر بغیر مقابلہ کیے بھاگ کھڑے ہوئے۔ عذیب میں چند دن قیام کرنے کے بعد حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے قادسیہ کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ یہ ایک نہایت سرسبز اور شاداب جگہ تھی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو اسی جگہ خیمہ زن ہونے کا حکم بھیجا تھا اور یہ ہدایت بھی کی تھی کہ وہ چند صائب الرائے اور وجیہ آدمیوں کو سفیر بنا کر شاہِ ایران کے پاس بھیجیں جو اس کو جزیہ یا اسلام قبول کرنے کی دعوت دیں۔ چنانچہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حضرت نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہ کی قیادت میں چودہ آدمیوں کی ایک سفارت مدائن روانہ کی۔ اس سفارت کے تمام اراکین وجاہت، شجاعت اور تقریر و گفتگو میں چوٹی کے لوگ تھے۔ وہ عرب کے سادہ روایتی لباس میں ملبوس گھوڑوں کی ننگی پیٹھ پر سوار مدائن پہنچے تو ایرانی انہیں دیکھ دیکھ کر حیران ہوتے تھے کہ یہ لوگ کس ہیئت کذائی میں اپنے ملک کی نمائندگی کرنے آئے ہیں۔ یزدگرد کو اسلامی سفارت کی آمد کی اطلاع ملی تو اس نے بڑی شان و شوکت سے دربار سجایا اور عرب سفیروں کو بُلا بھیجا۔ ان لوگوں نے دربار میں پہنچ کر یزدگرد سے نہایت بے باکانہ گفتگو کی اور اس کی اسلام یا جزیہ قبول کرنے کی دعوت دی۔ اس پر یزدگرد غضبناک ہوگیا اور اس نے چلّا کر کہا:

> ''تم بھوکے ننگے لوگ ہمارے ملک کو لوٹنا چاہتے ہو۔ میں تمہارے لیے اتنا کرسکتا ہوں کہ تمہارے اونٹوں پر غلّہ اور چھوہارے لادوں اور عرب پر ایسا حاکم مقرر کردوں جو تم لوگوں کی آسائش کا خیال رکھے۔ اس کے علاوہ اگر تم کچھ چاہتے ہو تو ذلت اور نامرادی کی موت کے سوا کچھ نہ ملے گا۔''

اس کے جواب میں سفارت کے ایک رکن حضرت قیس بن زرارہ رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر کہا:

> ''اے بادشاہ ہم سب شرفائے عرب ہیں تمہاری اہانت آمیز باتیں اس قابل نہیں کہ ان کا جواب دیا جائے تاہم سن لو کہ ہم واقعی خدا کی بدترین

مخلوق تھے لیکن اللہ نے ہم پر اپنا فضل کیا اور ہمارے درمیان ایک پیغمبر ﷺ بھیجا جس نے ہمیں ہدایت کا راستہ دکھایا، اگر تم بھی یہ ہدایت قبول کرلو تو ہمارے بھائی بن جاؤ گے ورنہ جزیہ یا تلوار ایک چیز تمہیں قبول کرنی ہوگی۔"

اب یزدگرد کا پیمانہ صبر لبریز ہوگیا، اس نے خاک دھول منگوا کر مسلمانوں کے آگے پھینک دی اور کڑک کہا، "تمہیں یہ خاک نہ ملے گی خاک۔ اس کو اٹھاؤ اور یہاں سے نکل جاؤ۔"

حضرت عاصم بن عمرو رضی اللہ عنہ نے مٹی اپنی چادر میں ڈال لی اور دوسرے ارکانِ سفارت کے ساتھ شاداں و فرحاں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی خدمت میں واپس گئے۔ انہوں نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو مبارک باد دی کہ اے امیر دشمن نے خود اپنی زمین ہم کو دے دی ہے، انشاء اللہ اب ہم ضرور سرزمینِ ایران پر قابض ہوں گے۔

اُدھر اس سفارت کے آنے سے پہلے ہی یزدگرد کا سپہ سالار رستم ایک جرار لشکر کے ساتھ ساباط پہنچ چکا تھا۔ سفارت کے مدائن سے جاتے ہی یزدگرد نے رستم کو حکم بھیجا کہ ساباط سے چل کر قادسیہ پہنچو اور مسلمانوں کو پیس ڈالو۔ یہ حکم ملتے ہی رستم نے ایک لاکھ اسّی ہزار فوج اور تین سو جنگی ہاتھیوں کیساتھ ساباط سے قادسیہ کی طرف اس شان سے کوچ کیا کہ اس کی فوج کا ایک ایک سپاہی زرہ پوش تھا، خیمے زری اور بادلے کے تھے جن کو دیکھ کر نگاہیں خیرہ ہوتی تھیں، جنگی ہاتھیوں کے قدموں کی دھمک سے زمین کانپ کانپ جاتی تھی۔ خود رستم کا تخت سونے کا تھا جس پر سنہری چتر سایہ کیے ہوئے تھا۔ غرض اس شان و شوکت سے رستم قادسیہ کے سامنے عتیق کے مقام پر خیمہ زن ہوا، وہ ایک تجربہ کار جرنیل تھا اور مسلمانوں کے جوشِ جہاد کا بخوبی اندازہ کر چکا تھا اس لیے وہ اپنی زبردست عسکری قوت کے باوجود چاہتا تھا کہ لڑائی ٹل جائے۔ چنانچہ اس نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو پیغام بھیجا کہ اپنا کوئی معتمد میرے پاس صلح کی گفتگو کے لیے بھیجو۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ

نے اس کی خواہش پر تین یا چار سفارتیں روانہ کیں لیکن صلح کی بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ مسلمان سفیروں کی صاف سادہ اور دوٹوک باتوں نے رستم کو شعلہ جوالہ بنا دیا اور آخری سفارت کو اس نے یہ اعلان کر کے رخصت کر دیا کہ کل ہم مسلمانوں کو کچل ڈالیں گے۔

(۷)

دوسرے دن رستم بڑے جاہ و جلال کے ساتھ دریائے فرات سے پار اترا اور مسلمانوں کے سامنے صف آرائی کی۔ اس وقت دو لاکھ جنگجو اس کے جھنڈے تلے جمع تھے۔ دوسری طرف اسلامی لشکر کی تعداد تیس ہزار کے لگ بھگ تھی لیکن مسلمانوں کے جوشِ جہاد کا یہ عالم تھا کہ صفوں سے نکلے پڑتے تھے۔ بدقسمتی سے اس نازک موقع پر حضرت سعد رضی اللہ عنہ ایک مرض کی وجہ سے لڑائی میں بذاتِ خود شریک ہونے سے معذور ہو گئے۔ یہ مرض کیا تھا؟ بعض نے لکھا ہے کہ وہ عرق النساء میں مبتلا تھے اور بعض کا بیان ہے کہ ان کی رانوں میں دنبل کے پھوڑے نکلے ہوئے تھے اس لیے گھوڑے پر سوار نہیں ہو سکتے تھے اور پیدل چلنا پھرنا بھی دشوار تھا۔ اس معذوری کے باوجود انہوں نے ارادہ کر لیا کہ اپنی فوج کو خود لڑائیں گے۔ میدانِ جنگ کے قریب ہی زمانہ قدیم کا ایک محل تھا وہ اس کی دوسری منزل میں تکیہ کے سہارے اس طرح بیٹھ گئے کہ سارا میدانِ جنگ نظروں کے سامنے تھا۔ اب انہوں نے فوج کے ایک افسر خالد بن عرفطہ رضی اللہ عنہ کو اپنے پاس بلایا اور فرمایا: ''خالد تم میری حالت دیکھ رہے ہو کہ بمشکل حرکت کر سکتا ہوں، دشمن سر پر آ پہنچا ہے اور لڑائی کو ٹالنا ممکن نہیں۔ میدانِ جنگ میں تم میری نیابت کرو گے۔ وقفہ وقفہ کے بعد میں کاغذ کے پرزوں پر ہدایات لکھ کر تمہاری طرف بھیجتا رہوں گا انہی کے مطابق فوج کو لڑانا'' اس کے ساتھ ہی انہوں نے فوج کے علمبرداروں کو پیغام بھیجا کہ ''میں اس بیماری کی وجہ سے لڑائی میں عملی حصہ نہیں لے سکتا۔ خالد بن عرفطہ رضی اللہ عنہ کو میں نے اپنا نائب مقرر کیا ہے اس کے حکم کو میرا حکم سمجھو اور اس کی اطاعت کرو۔'' حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا حکم مجاہدین کو سنایا گیا تو سب نے سر تسلیم خم کر دیا۔

لڑائی کے آغاز سے پہلے ایک طرف رستم اور دوسرے ایرانی امراء اپنے لشکر کا جذبہ قومی ابھار رہے تھے تو دوسری طرف عرب کے مشہور شعراء وخطباء تمام لشکرِ اسلام میں پھیل گئے تھے اور اپنی رجز خوانی سے مجاہدین میں ہیجان برپا کر دیا تھا ساتھ ہی قاریوں نے خوش الحانی سے سورۂ انفال کی تلاوت شروع کر دی تھی جس کی تاثیر نے دلوں کو گرما دیا تھا اور ہر مسلمان شوقِ شہادت سے بے تاب ہو گیا تھا۔

ایرانیوں نے سب سے پہلے اپنے جنگی ہاتھیوں کو مسلمانوں کی طرف دھکیلا۔ ہاتھیوں کی خوفناک یلغار کو قبیلہ بجیلہ کے جانبازوں نے روکا۔ بہت سے بجلی مجاہدین جانوں پر کھیل گئے لیکن یہ یلغار نہ رک سکی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے یہ کیفیت دیکھ کر بنو اسد کو حکم بھیجا کہ بنو بجیلہ کی مدد کے لیے پہنچو۔ بنو اسد مردانہ وار ہاتھیوں کی طرف بڑھے لیکن وحشی ہاتھیوں نے انہیں بھی پیچھے دھکیل دیا۔ اب حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے بنو تمیم کو، جو نیزہ بازی اور قدر اندازی میں بے پناہ مہارت رکھتے تھے، پیغام بھیجا کہ اے بنی تمیم آج تمہارے کمالِ فن کا مظاہرہ ہے آگے بڑھ کر اپنے بھائیوں کی مدد کو پہنچو۔ بنو تمیم نے تکبیر کا نعرہ لگا کر اس جوش سے حملہ کیا کہ ہاتھیوں کے منہ پھیر دیئے اور ان کے سواروں کو اپنے نیزوں اور تیروں سے نیچے گرا دیا۔ اب دونوں فوجوں میں دست بدست اس گھمسان کی جنگ ہوئی کہ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ مشہور مرثیہ گو صحابیہ حضرت خنساء رضی اللہ عنہا بھی اپنے چار فرزندوں کے ساتھ جہاد میں حصہ لینے قادسیہ آئی تھیں، جس وقت لڑائی کا تنور پوری طرح گرم ہوا انہوں نے اپنے بیٹوں کو حکم دیا کہ "میرے بچو جاؤ اور آخری دم تک راہِ حق میں لڑو......" ماں کا حکم سنتے ہی چاروں بھائی گھوڑوں کی باگیں اٹھائے رجز پڑھتے ہوئے میدانِ جنگ میں کود پڑے اور نہایت بے جگری سے لڑتے ہوئے یکے بعد دیگرے شہید ہو گئے۔ حضرت خنساء رضی اللہ عنہا نے ان کی شہادت کی خبر سنی تو فرمایا:

"خدا کا شکر ہے کہ میرے فرزندوں نے میدانِ جنگ سے پیٹھ نہیں پھیری اور اللہ نے ان کی شہادت کا شرف مجھے بخشا۔ اس ذاتِ رحیم سے اُمید ہے

کہ وہ اپنی رحمت کے سائے میں میرے بچّوں کے ساتھ مجھے بھی جگہ دے گا۔"

اسی طرح اور بھی بہت سے مجاہدین نے شوقِ شہادت کی حیرت انگیز مثالیں پیش کیں۔ رات کی تاریکی جب گہری ہوگئی تو دونوں لشکر زخموں سے چُور چُور ایک دوسرے سے جُدا ہوئے۔ قادسیہ کی جنگ کا یہ پہلا دن یوم الارماث کہلاتا ہے اس دن پانچ اور چھ سو کے درمیان مسلمان شہید ہوئے اور ہزار ہا ایرانی ہلاک ہوئے۔

دوسرے دن طبلِ جنگ پر چوٹ پڑے ہی تھی کہ حضرت قعقاع بن عمرو تمیمی رضی اللہ عنہ شام سے ایک ہزار جانبازوں کے ساتھ پہنچ گئے۔ انہیں حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی مدد کے لیے بھیجا تھا۔ اس کمک کے پہنچ جانے سے مسلمانوں کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ معرکہ کارزار گرم ہوا تو پہلے دن کی طرح ہاتھیوں نے پھر مسلمانوں پر قیامت ڈھادی۔ حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ نے اس مصیبت کے تدارک کے لیے یہ تجویز سوچی کہ اونٹوں پر بڑی بڑی جھولیں ڈال کر انہیں بھی ہاتھیوں کی طرح مہیب بنادیا۔ ایرانیوں کے گھوڑے انہیں دیکھ دیکھ کر بدکتے اور مسلمان ان کے سواروں کو اپنے نیزوں پر رکھ لیتے۔ رستم نے اب پیدل فوجوں کو سواروں کی مدد کے لیے آگے بڑھایا۔ یہ فوجیں آندھی اور طوفان کی طرح مسلمانوں پر حملہ آور ہوئیں۔ مسلمانوں نے بڑی ہمت سے اس طوفانی حملے کو روکا لیکن مشکل یہ تھی کہ مدائن سے ایرانی فوجوں کو برابر تازہ کمک پہنچ رہی تھی۔ عین اس موقع پر حضرت ہاشم بن عتبہ رضی اللہ عنہ پانچ ہزار جوانوں کی امدادی فوج کے ساتھ شام سے قادسیہ پہنچ گئے۔ اس تائیدِ غیبی نے مسلمانوں کے حوصلے دوچند کردیے لیکن ایرانیوں کا ٹڈی دل کسی طرح کم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ اس وقت ایک عجیب واقعہ ہوا..... قبیلہ بنوثقیف کے نامور بہادر ابومحجن رضی اللہ عنہ شراب نوشی کے جرم میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی اقامت گاہ کے قریب دست و پابستہ ایک کوٹھڑی میں مقید تھے..... وہ قید خانے کے سوراخوں سے لڑائی کا منظر دیکھ کر سخت بے قرار ہو رہے تھے اور

جوشِ شجاعت میں اپنے ہونٹ بار بار دانتوں میں دباتے تھے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی اہلیہ سلمٰی رضی اللہ عنہا قریب ہی تھیں، ان سے التجا کی کہ اس وقت مجھے چھوڑ دو شہید ہو گیا تو بہتر ورنہ خود ہی آ کر بیڑیاں پہن لوں گا۔ سلمٰی رضی اللہ عنہا نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے عتاب کے ڈر سے انکار کر دیا۔ ان کے انکار پر حضرت ابو محجن سخت شکستہ خاطر ہوئے اور جہاد سے اپنی محرومی پر نہایت درد انگیز اشعار پڑھنے لگے۔ یہ اشعار سن کر سلمٰی رضی اللہ عنہا کا دل پسیج گیا اور انہوں نے ابو محجن رضی اللہ عنہ کو نہ صرف رہا کر دیا بلکہ گھوڑا اور ہتھیار بھی دے دیئے۔ ابو محجن رضی اللہ عنہ منہ سر پر کپڑا لپیٹ کر گھوڑا دوڑاتے دشمن کی صفوں پر بجلی کی طرح گرے اور انہیں درہم برہم کر دیا۔ ان کے جوش اور وارفتگی کا یہ عالم تھا کہ کبھی میدانِ جنگ کے ایک کنارے پر ہوتے اور کبھی دوسرے پر۔ مسلمان حیران تھے کہ معلوم نہیں یہ نقاب پوش کون ہے؟ شاید خدا نے مسلمانوں کی مدد کے لیے کوئی فرشتہ نازل کیا ہے۔ خود حضرت سعد رضی اللہ عنہ ابو محجن رضی اللہ عنہ کی بہادری دیکھ کر تعجب کر رہے تھے کہ اس بہادر کے لڑنے کا انداز تو ابو محجن رضی اللہ عنہ کا ہے لیکن وہ تو اس وقت قید میں ہے۔ شام تک میدانِ رزم گرم رہا۔ جب اندھیرا گہرا ہوا اور دونوں فوجیں اپنی اپنی قیام گاہوں کو لوٹیں تو حضرت ابو محجن رضی اللہ عنہ نے بھی واپس آ کر اپنی بیڑیاں خود ہی پہن لیں۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ بالا خانے سے نیچے اترے اور سلمٰی کو جنگ کے حالات بتاتے ہوئے فرمایا، ''آج اللہ نے میدانِ جنگ میں ایک عجیب شخص کو بھیج دیا جس نے منہ پر نقاب ڈال رکھا تھا اور ابلق گھوڑے پر سوار تھا۔ اس نے دشمنوں کا منہ پھیر دیا۔ اگر میں نے ابو محجن کو قید میں نہ ڈالا ہوتا تو میں سمجھتا کہ وہی ہے۔''

یہ سن کر سلمٰی رضی اللہ عنہا نے سارا قصہ بلا کم و کاست عرض کر دیا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ بے حد متاثر ہوئے اور چشم پُر آب ہو کر فرمایا، ''خدا کی قسم میں ایسے مجاہد کو قید میں نہیں رکھ سکتا۔'' یہ فرما کر فوراً حضرت ابو محجن رضی اللہ عنہ کو رہا کر دیا۔ وہ بھی مردِ مومن تھے، رہا ہوتے ہی حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے کہا، ''اے امیر خدا کا خوف مجھے شراب نوشی سے باز نہ رکھ سکا لیکن

آج میں خدا کے خوف سے عہد کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔"

جنگِ قادسیہ کا دوسرا دن یوم الاغواث کہلاتا ہے۔ اس دن ہزار ایرانی مقتول ہوئے اور دو ہزار مسلمانوں نے جامِ شہادت پیا۔

تیسرے دن علی الصباح دونوں فوجیں پھر ایک دوسرے سے گتھ گئیں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ آج لڑائی کا فیصلہ کر کے رہیں گے۔ چنانچہ ان کی ہدایات کے مطابق مسلمان بڑھ بڑھ کر ایرانیوں پر نہایت تند و تیز حملے کر رہے تھے لیکن یوم الارمات کی طرح آج بھی ایرانیوں کے ہاتھیوں نے بڑی تباہی مچائی اور مسلمانوں کو فیصلہ کن ضرب لگانے سے باز رکھا۔ دو کوہ پیکر ہاتھی ایک سفید اور ایک چتکبرا اسب ہاتھیوں کے سردار تھے اور بڑی آفت ڈھا رہے تھے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے بنو تمیم کو پیغام بھیجا کہ تم سفید ہاتھی کو نرغے میں لے کر اسکی آنکھیں اور سونڈ بے کار کر دو۔ ایسا ہی پیغام انہوں نے چتکبرے ہاتھی کے بارے میں بنو اسد کے جاں بازوں حمال اور ربیل کو بھیجا۔ تمیمی سرفروش حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا پیغام ملنے پر سفید ہاتھی پر حملہ آور ہوئے۔ یہ ہاتھی سدھایا ہوا تھا جو مجاہد اس کی طرف بڑھتا اسے اپنی سونڈ میں لپیٹ کر یا پاؤں کے نیچے مسل کر شہید کر دیتا۔ اس طرح کئی مجاہدوں نے یکے بعد دیگرے جامِ شہادت پیا۔ آخر قعقاع رضی اللہ عنہ اور عاصم رضی اللہ عنہ اس ہاتھی کی طرف بڑھے اور نہایت پھرتی سے اس کی سونڈ کاٹ ڈالی اور آنکھیں بیکار کر دیں۔ دوسری طرف چتکبرے ہاتھی کا بھی حمال اور ربیل کے ہاتھوں یہی حشر ہوا۔ دونوں ہاتھی درد کی شدت سے چنگھاریں مارتے ہوئے پیچھے کی طرف بھاگے تو دوسرے ہاتھی بھی ان کے پیچھے ہو لیے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہاتھیوں کی مصیبت سے مسلمانوں کو نجات دی۔ اب شام ہو چکی تھی لیکن حضرت سعد رضی اللہ عنہ لڑائی کا فیصلہ کرنے پر تلے ہوئے تھے انہوں نے اپنی فوج کو از سرِ نو مرتب کیا اور پھر اسے ایرانیوں پر فیصلہ کن حملہ کرنے کا حکم دیا۔ جوشِ شجاعت سے سرشار مجاہدین نے ایرانیوں پر ایسا جان توڑ حملہ کیا کہ ان کے قدم لڑکھڑا گئے۔ حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ، عاصم رضی اللہ عنہ، عمرو

بن معدی کرب رضی اللہ عنہ، قیس بن اشعث رضی اللہ عنہ اور ان کے جانباز ساتھیوں نے ایرانیوں کے قلبِ لشکر کو اُلٹ ڈالا اور رستم کے تخت تک پہنچ گئے۔ رستم کے زرہ پوش حفاظتی دستے نے شدید مزاحمت کی لیکن مسلمان سرفروشوں نے اس کے پرخچے اڑا دیئے۔ رستم شدید زخمی ہو کر بھاگ کھڑا ہوا اور دریا میں چھلانگ لگا دی۔ ہلال بن علقمہ نامی ایک مجاہد نے اس کی ٹانگ پکڑ کر باہر گھسیٹ لیا اور اس کا سر کاٹ لیا۔ پھر وہ رستم کے تخت پر چڑھ گئے اور زور سے پکارے "میں نے رستم کو قتل کر دیا ہے۔" اس آواز کے سنتے ہی ایرانیوں کے ہوش و حواس بالکل جاتے رہے اور وہ بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح ہو گئے۔ جس رات کو یہ خونیں معرکہ سر ہوا اسے "لیلۃ الہریر" کہتے ہیں۔ اس سے پہلا یعنی جنگ کا تیسرا دن یوم العماس کے نام سے مشہور رہے۔ اس لڑائی میں تیس (۳۰) ہزار ایرانی ہلاک ہوئے اور انہیں ایسی عبرت ناک شکست ہوئی کہ تختِ کسریٰ کی بنیادیں ہل گئیں۔ ایرانیوں کا قومی پرچم "درفشِ کادیانی" بھی اسی جنگ میں مسلمانوں کے ہاتھ آیا اور مالِ غنیمت کا تو کوئی شمار ہی نہ تھا۔ مسلمان شہداء کی مجموعی تعداد آٹھ ہزار کے لگ بھگ تھی۔

(۸)

قادسیہ کی عظیم الشان فتح کے بعد حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے بابل تک ایرانیوں کا تعاقب کیا اور آس پاس کے سارے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ ایران کا پایہ تخت مدائن یہاں سے قریب ہی تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ہدایت کے مطابق حضرت سعد رضی اللہ عنہ مدائن کی طرف بڑھے۔ راستے میں ایرانیوں نے جگہ جگہ مزاحمت کی اور کئی چھوٹے چھوٹے معرکے ہوئے لیکن بلند حوصلہ مجاہدین یلغار کرتے ہوئے مدائن تک جا پہنچے اور اس کے مغربی حصے (بہرہ شیر) کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ دو ماہ تک جاری رہا۔ آخر سارے ایرانی خاص مدائن میں جو دریائے دجلہ کے مشرقی کنارے پر آباد تھا، سمٹ کر جمع ہو گئے۔ انہوں نے دریا کا پُل توڑ دیا اور تمام کشتیاں دوسرے کنارے کی طرف لے گئے۔ اس وقت دریا میں خوفناک طغیانی آئی ہوئی تھی اور اس کو پار کرنا بظاہر ناممکن نظر آتا تھا۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے یہ کیفیت دیکھی تو اللہ کا نام لے کر اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ دوسرے مجاہدین نے بھی ان کی پیروی کی گویا۔

بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

دریائے دجلہ کے پھنکارتے ہوئے پانی پر مجاہدین رکاب سے رکاب ملائے اس طرح بڑھ رہے تھے گویا صحنِ چمن میں گلگشت کر رہے ہوں۔ ایرانی یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ کچھ دیر تک ٹکٹکی باندھے مسلمانوں کو دیکھتے رہے اور پھر ''دیواں آمدند۔ دیوان آمدند'' (دیو آ گئے۔ دیو آ گئے) کہتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے۔ یزدگرد اپنا حرم اور خزانے کا ایک حصہ پہلے ہی حلوان بھیج چکا تھا اب خود بھی مدائن کے در و دیوار پر حسرت کی نظر ڈالتا بھاگ نکلا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ مدائن میں داخل ہوئے تو ہر طرف عبرتناک سناٹا چھایا ہوا تھا اور کسریٰ کے پُرشکوہ محلات، دوسری عظیم الشان عمارتیں اور سرسبز و شاداب باغات زبانِ حال سے دنیائے دوں کی بے ثباتی کا اعلان کر رہے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی زبان پر بے اختیار یہ آیات جاری ہو گئیں۔

كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ۝ وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ ۝ كَذٰلِكَ ۖ وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ۝ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ ۝

(سورۂ دخان)

(اگلے لوگ بہت سے باغات اور چشمے اور کھیت اور عمدہ مکانات اور نعمتیں چھوڑ گئے جن میں وہ عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے تھے۔ یونہی ہونا تھا اور ہم نے ایک دوسری قوم کو ان کا وارث بنا دیا۔ پس نہ ان پر آسمان رویا اور نہ زمین اور نہ انہیں مہلت دی گئی)

مدائن سے مسلمانوں کو کروڑوں دینار کا مالِ غنیمت حاصل ہوا۔ اس میں ایسی ایسی نادر و نایاب چیزیں شامل تھیں کہ عقلِ انسانی انہیں دیکھ کر دنگ رہ جاتی تھی ان میں کچھ

کے نام یہ ہیں:

نوشیرواں کا زرنگار تاج، شاہانِ سلف کے جڑاؤ خنجر، زرہین، خُود، اور تلواریں۔ خالص سونے کا ایک بلند و بالا گھوڑا جس کے سینے پر یاقوت جڑے ہوئے تھے۔ اس پر سونے کا بنا ہوا ایک سوار تھا جس کے سر پر ہیروں کا تاج تھا۔ اسی طرح کی ایک طلائی اونٹنی اور اس کا طلائی سوار۔ ایوانِ کسریٰ کا طلائی فرش جس کا رقبہ ساٹھ مربع گز تھا اور جو بیش قیمت جواہرات سے آراستہ تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

مسلمانوں نے اس قیمتی مالِ غنیمت کے جمع کرنے میں ایسی دیانت داری کا ثبوت کہ تاریخِ عالم اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اگر کسی مجاہد کو ایک معمولی سوئی ملی یا بیش قیمت جواہر، اس نے بلا تامّل اسے امیر کے پاس جمع کرا دیا۔ یہ وہی عرب تھے جن پر اہلِ ایران بھوکے اور ننگے کی پھبتی کسا کرتے تھے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ مدینہ منورہ روانہ کر دیا۔ اور باقی سب مجاہدین میں تقسیم کر دیا۔

مدائن کی فتح کے بعد مسلمانوں نے آگے بڑھ کر جلولا، حلوان، تکریت، موصل، ہیت اور ماسبذان وغیرہ بھی فتح کر لیے اور عراقِ عرب کی آخری حد تک ان کا استیلا ہو گیا۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو مفتوحہ علاقے کا والی بنا کر اس کے نظم و نسق کی طرف توجہ کرنے کا حکم دیا۔

(۹)

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے مدائن کو اپنا مستقر بنا کر امارت کے فرائض ایسی لیاقت اور عدل کے ساتھ انجام دیئے کہ تمام رعایا گرویدۂ احسان ہو گئی۔ مسلمانوں کے پاکیزہ اور پسندیدہ نے ایرانیوں کے دل موہ لیے اور وہ دھڑا دھڑ اسلام قبول کرنے لگے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے نہایت قلیل عرصے میں مفتوحہ علاقے کی مردم شماری اور زمین کی پیمائش کرائی۔ زمین کے اصل مالکوں کا قبضہ اس پر برقرار رکھا اور دُور افتادہ زمین پر مستحق اور اہل لوگوں کو قابض ہونے کی اجازت دی۔ مالیہ اور جزیہ کے نہایت منصفانہ قوانین وضع

کیے اور رفاہِ عام کے بے شمار کام کرائے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں تمام ملک میں امن وامان اور خوشحالی کا دَور دَورہ ہو گیا۔ اس طرح اپنے حسنِ انتظام سے حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ثابت کر دیا کہ وہ صرف ایک قابل سپہ سالار ہی نہیں بلکہ بہترین گورنر بھی ہیں۔

مدائن میں مسلمانوں کے قیام کو جب ایک عرصہ گزر گیا تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے محسوس کیا کہ وہاں کی آب وہوا مسلمانوں کو راس نہیں آئی۔ انہوں نے یہ کیفیت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لکھ بھیجی۔ وہاں سے حکم موصول ہوا کہ سرحدِ عرب کے اندر کوئی مناسب جگہ تلاش کر کے ایک نیا شہر آباد کرو جہاں کی آب و ہوا خوشگوار ہو۔ چنانچہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ۱۷ھ میں کوفہ کا شہر آباد کیا اور دارالامارت بھی مدائن سے کوفہ منتقل کر دیا۔ کوفہ آ کر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے رفاہِ عام کے کاموں پر اور زیادہ توجہ دی، چھوٹی چھوٹی نہریں کھدوا کر پانی کہ بہم رسانی کا نہایت عمدہ انتظام کیا، بہت سے پُل اور مسافر خانے بنوائے اور اپنے ذاتی سرمائے سے کئی مکاتب اور مدارس قائم کیے۔ فوج میں تنخواہ کی تقسیم کا نہایت عمدہ انتظام کیا اور کوفہ کو فوج کی تعداد اور سامانِ حرب وضرب کے لحاظ سے عالمِ اسلام کی سب سے بڑی چھاؤنی بنا دیا۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے قیامِ کوفہ کے دوران میں اہلِ کوفہ کی ایک جماعت ان کی مخالف ہو گئی اور اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس شکایت کی کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ اچھی طرح نماز نہیں پڑھاتے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کو بھیج کو تحقیق کروائی تو یہ الزام بالکل بے بنیاد اور لغو ثابت ہوا تاہم ۲۱ھ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو ملکی مصالح کی بناء پر منصبِ امارت سے سبکدوش کر دیا اور وہ مدینہ منورّہ واپس آ گئے۔

سنہ ۲۳ھ میں ایک مجوسی غلام ابولولو فیروز نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر قاتلانہ حملہ کیا زخم اتنے شدید تھے کہ ان کی جانبری کی کوئی امید نہ رہی۔ چنانچہ لوگوں نے ان سے درخواست کی کہ آپ اپنا جانشین نامزد کر دیں۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے سوچ بچار کے بعد چھ اکابر صحابہ

کے نام لیے کہ یہ لوگ اپنے میں سے جسے چاہیں خلیفہ منتخب کر لیں۔ ان میں سے ایک حضرت سعد رضی اللہ عنہ تھے۔ دوسرے پانچ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر بن العوی رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ تھے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے وفات سے پہلے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی نسبت خصوصیت سے یہ الفاظ ارشاد فرمائے:

"میں نے سعد رضی اللہ عنہ کو (فرائض سے) کوتاہی یا خیانت کی بناء پر معزول نہیں کیا۔ اگر سعد رضی اللہ عنہ خلافت کے لیے منتخب ہو جائیں تو وہ اس کے اہل ہیں اور اگر وہ منتخب نہ ہوں تو جو خلیفہ بنایا جائے وہ ان سے مدد لے۔"

فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد مجلسِ شوریٰ نے بحث و تمحیص کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ان کا جانشین منتخب کیا۔ انہوں نے مسندِ خلافت پر بیٹھتے ہی حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو دوبارہ کوفہ کا والی مقرر کر دیا۔ اس بار وہ اس منصب پر تین سال تک فائز رہے۔ ۲۶ھ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ مہتمم بیت المال سے اختلاف پیدا ہو جانے پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی انہیں امارت سے سبکدوش کر دیا۔ اس کے بعد حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے سیاستِ ملکی سے یکسر قطعِ تعلق کر لیا اور مدینہ منورہ سے دس میل کے فاصلے پر مقامِ عقیق میں عزلت گزین ہو گئے۔ ان کے قیامِ عقیق کے طویل زمانے میں عالمِ اسلام میں بڑے بڑے اتار چڑھاؤ اور فساد و فتن برپا ہوئے مگر وہ ان سب سے الگ رہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت کے آخری دنوں میں جب مفسدین نے کاشانہ خلافت کا محاصرہ کر لیا تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ عقیق سے مدینہ تشریف لائے اور باغیوں کو مقدور بھر سمجھانے کی کوشش کی لیکن ان لوگوں نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی نصیحت کا کوئی اثر قبول نہ کیا اور وہ مایوس ہو کر عقیق واپس آ گئے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی مظلومانہ شہادت کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ، سریر آرائے خلافت ہوئے تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے بلا تامل ان کی بیعت کر لی۔ لیکن جمل اور صفین کی لڑائیوں میں سے انہوں نے کسی میں

حِصّہ نہیں لیا۔ جنگِ جمل میں لوگوں نے انہیں ساتھ چلنے کی دعوت دی تو فرمایا: ''مجھے ایسی تلوار بتاؤ جو کافر اور مسلم میں امتیاز رکھے۔''

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ''البدایہ والنہایہ'' میں لکھا ہے کہ زمانہ فتنہ میں ایک دفعہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے بھتیجے ہاشم بن عتبہ رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا کہ اگر آپ اس وقت خلافت کا دعویٰ کر دیں تو ایک لاکھ تلواریں آپ کی حمایت کے لیے تیار ہیں۔'' انہوں نے جواب دیا۔ ''بھتیجے ان ایک لاکھ تلواروں میں سے میں صرف ایک ایسی تلوار چاہتا ہوں جو کافر پر تو چلے لیکن کسی مسلمان پر نہ چلے۔''

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو عقیق کی خانہ نشینی کی زندگی بسر کرتے ہوئے جب ایک طویل عرصہ گزر گیا تو ضعیفِ پیری ان پر غالب آنا شروع ہوا، قوائے بدنی مضمحل ہو گئے اور آنکھوں کی بصارت نے جواب دے دیا۔ آخر خالقِ حقیقی کا بلاوا آ پہنچا اور ۵۵ ہجری میں انہوں نے پیکِ اجل کو لبیک کہا...... جنازہ مدینہ منوّرہ لایا گیا تو وہاں کہرام مچ گیا۔ اور ہر طرف سے لوگ جنازہ میں شرکت کے لیے اُمڈ آئے۔ والی مدینہ مروان بن الحکم نے امہات المومنین رضی اللہ عنہن کے حجروں کے سامنے نمازِ جنازہ پڑھائی اور پھر اسلام کے اس بطلِ جلیل کو جنت البقیع میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے مختلف اوقات میں متعدد نکاح کیے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اولادِ کثیر سے نوازا۔ اہلِ سِیَر نے ان کے اٹھارہ لڑکوں اور اٹھارہ لڑکیوں کے نام تخصیص کے ساتھ لکھے ہیں۔

ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا حلیہ اس طرح لکھا ہے، قد کوتاہ، سر بڑا، ناک چپٹی جسم فربہ، بال گھنے، ہاتھ کی انگلیاں موٹی اور مضبوط۔

(۱۰)

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا چمنِ اخلاق گلہائے رنگارنگ سے آراستہ تھا۔ سبقت فی الاسلام، حُبِّ رسول، تحملِ شدائد، غیرتِ دینی، اتباعِ سنّت، زہد و تقویٰ، شجاعت، تواضع

، ایثار، سخاوت، انکسار اور حق گوئی و بے باکی ان کے مخصوص اوصاف تھے۔ انہوں نے اس وقت دعوتِ حق پر لبیک کہا جب ایسا کرنا تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف تھا۔ قبولِ اسلام کے بعد ذاتِ رسالت مآب ﷺ کی محبت اور اطاعت کو اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنالیا، ہر وقت اپنی جان حضور ﷺ پر قربان کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ اس والہانہ محبت کی بدولت ان کو بارگاہِ نبوی میں خصوصی تقرب حاصل ہو گیا تھا۔ ایک مرتبہ حضور ﷺ نے ان کے حق میں دُعا کی:

''الٰہی اس کی دُعا قبول فرمایا کر اور اس کی تیر افگنی درست رکھ۔''

اس مُبارک دُعا کی بدولت اللہ تعالیٰ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو مستجاب الدعوات بنا دیا تھا، لوگ ان سے دُعائے خیر کے خواہاں رہتے تھے اور ان کی بددُعا سے ڈرتے تھے۔ وہ بیمار ہوتے تو حضور ﷺ بہ نفسِ نفیس ان کی عیادت کے لیے تشریف لے جاتے۔ تحملِ شدائد صحابہ کا خاص وصف تھا انہوں نے راہِ حق میں ایسی ایسی مصیبتیں جھیلیں کہ انسان ان کے تصوّر سے بھی کانپ اٹھتا ہے۔ السابقون الاوّلون تو خاص طور پر مشرکین کا ہدفِ ستم بنے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ بھی اسی مقدّس جماعت کے ایک رکن تھے۔ وہ کئی سال تک مکہ میں دوسرے مسلمانوں کے ساتھ ہر قسم کے مصائب برداشت کرتے رہے یہاں تک کہ شعبِ ابی طالب میں بھی تین سال تک محصوری کے زہرہ گداز مصائب رضا کارانہ جھیلتے رہے۔ حالانکہ یہ محصوری صرف بنو ہاشم اور بنو مُطلب کے لیے مخصوص تھی۔ غیرت دینی کا یہ عالم تھا کہ ہولناک خطرات کے باوجود راہِ حق میں سب سے پہلے ایک دشمنِ اسلام کی سرکوبی کی۔ اسی طرح اللہ کے راستے میں سب سے پہلے تیر چلایا۔ عتبہ بن ابی وقاص ان کے بڑے بھائی اور محسن تھے لیکن جب عتبہ نے جنگِ اُحد میں حضور ﷺ کو زخمی کیا تو وہ ان کے جانی دشمن ہو گئے۔ اتباعِ سُنّت کا اس قدر اہتمام تھا کہ ہر کام میں حضور ﷺ کے احکام اور طریقہ کو پیشِ نظر رکھتے۔ فرمایا کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ ہمارے لیے تقلید کا بہترین نمونہ ہے۔ زہد و تقویٰ کہ یہ کیفیت تھی کہ ساری عمر

کبھی کسی مال دار آدمی سے کوئی تحفہ یا ہدیہ قبول نہیں کیا اور نہ کبھی کوئی ایسا لقمہ کھایا جس کے پاک ہونے میں ذرا بھی شبہ ہو۔ غیبت کو سخت ناپسند کرتے تھے اور کسی کو اجازت نہیں دیتے تھے کہ ان کے سامنے کسی دوسرے مسلمان کی برائی بیان کرے۔ لوگوں کو ہمیشہ حق گوئی کی تلقین کرتے تھے اور ریاکاری سے بچنے کی ہدایت کرتے تھے۔ اپنی اولاد کو اکثر قناعت اختیار کرنے کی وصیّت کرتے تھے۔

شوقِ جہاد اور شجاعت حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی زندگی کے نمایاں پہلو تھے۔ غزوۂ بدر اور اس کے بعد معرکہ اُحد میں انہوں نے جس جوش اور فداکاری کا مظاہرہ کیا، سیّد المرسلین ﷺ نے اس کی برملا تحسین فرمائی۔ بعد کے غزوات میں بھی ان کی شجاعت اور جانبازی کی یہی کیفیت رہی۔ ان کا یہی وصف مہمِ عراق کی قیادت کے لیے ان کے انتخاب کا باعث ہوا۔ جنگِ قادسیہ میں وہ علالت کے باعث عملی طور پر لڑائی میں شریک نہ ہو سکے' تاہم جب وہ بستر پر لیٹے لیٹے مجاہدین کو جانبازیاں کرتے دیکھتے تھے تو جذبہ شجاعت سے مجبور ہو کر بار بار کروٹیں بدلتے تھے۔

بعض مورخین نے لکھا ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے شوقِ جہاد اور شجاعت کی بناء پر لوگ ان کو فارس الاسلام (شہسوارِ اسلام) کہہ کر پکارتے تھے۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ دینی اور دنیوی ہر لحاظ سے بڑے اونچے رتبے پر فائز تھے لیکن طبیعت میں تواضع، انکسار، حلم اور ضبط و تحمل کا مادہ حد سے زیادہ تھا۔ غریبوں کے ساتھ بیٹھنے اور ان کی مدد کرنے میں خوشی محسوس کرتے تھے۔ کسی مزدور کو بوجھ کے نیچے دبا دیکھتے تو اس کا بوجھ اٹھا کر منزل پر پہنچا آتے۔ کسی کو راستہ سے بھٹکا ہوا دیکھتے تو اس کو ساتھ لے کر منزل مقصود تک پہنچا آتے۔ گو انہوں نے عقیق میں ایک عمدہ مکان تعمیر کرایا تھا لیکن مزاج کی سادگی میں مطلق فرق نہ آیا تھا۔ سادہ سے سادہ غذا کھاتے اور سادہ سے سادہ لباس پہنتے تھے۔ عبادت سے فارغ ہوتے تو اپنے مویشی چرانے جنگل کی طرف نکل جاتے۔ زمانہ امارت میں حاجت مندوں کے وظائف خود جا کر تقسیم کرتے تھے۔

اپنے چھوٹے چھوٹے کام خود کر لیتے تھے اور کسی خادم یا غلام کو تکلیف نہیں دیتے تھے۔
فیاضی اور انفاق فی سبیل اللہ بھی ان کا نمایاں وصف تھا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کوئی سائل ان کے در سے محروم گیا ہو۔ غرباء اور مساکین کے لیے ان کے گھر کے دروازے ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ مساجد اور مکاتب کی تعمیر کے لیے دل کھول کر عطیے دیتے تھے۔
اگر فوج کا کوئی سپاہی ایسی حالت میں شہید ہو جاتا کہ اس کے ذِمّہ کوئی قرض ہوتا تو اس کا قرض اپنی گرہ سے ادا کر دیتے تھے۔ ان میں ایثار اور استغناء کا وصف بھی بدرجہ اتم پایا جاتا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وصیّت کی رو سے وہ بھی خلافت کے اہل تھے لیکن وہ اپنے حقِ خلافت سے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے حق میں دست بردار ہو گئے۔
ایامِ فتن میں ایک دفعہ ان کے بیٹے عمرو (یا عامر) نے انہیں گوشہ تنہائی سے نکلنے اور خود خلافت کا دعویٰ کرنے کی ترغیب دی تو سخت ناراض ہوئے اور اس کی چھاتی پر ہاتھ مار کر فرمایا:

> ''میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ اللہ پرہیز گار، بے غرض اور مخفی بندہ کو محبوب رکھتا ہے۔''

حق بات کہنے میں وہ کسی بڑی سے بڑی شخصیّت کی پروا نہیں کرتے تھے۔ ایک بار امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے ملنے گئے تو ''السّلام علیك ایّھا الملك'' کہہ کر خطاب کیا۔ وہ بولے۔ ''اگر آپ امیر المومنین کہتے تو کیا حرج تھا؟ فرمایا۔ ''خدا کی قسم جس طرح آپ کو یہ حکومت ملی ہے اس طریقہ سے اگر یہ مجھے مل رہی ہوتی تو میں اس کا لینا ہرگز پسند نہ کرتا۔''

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''سعد رضی اللہ عنہ میں شجاعت اور لطافتِ طبع کے ساتھ رقت قلب بھی تھی۔'' چنانچہ وہ کسی کو تکلیف میں دیکھتے تو آنکھیں اشکبار ہو جاتیں۔ عبادت کے بعد دُعا مانگتے تو آنکھیں نم ہو جاتیں۔ اکثر اشکبار ہو کر فرماتے۔
''یہ فانی زندگی جلد ختم ہونے والی ہے اور ہم دنیا کی لذّتوں میں محو ہیں۔''

(۱۱)

اربابِ سِیَر نے حضرت سعد ؓ کے دوسرے اوصاف ومحاسن کے علاوہ ان کے ذوقِ عبادت، خوفِ خدا اور علم وفضل کا ذکر بھی خصوصیت سے کیا ہے۔ ان پر ہر وقت خشیتِ الٰہی کا غلبہ رہتا تھا، نہایت کثرت سے روزے رکھتے تھے اور رات کا بیشتر حصہ یادِ الٰہی میں گزارتے تھے۔ نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو خوفِ الٰہی سے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا اور چہرے کا رنگ متغیّر ہو جاتا۔ نمازِ تہجد کا خاص التزام تھا۔ اکثر آدھی رات کے بعد مسجدِ نبوی میں جا کر نہایت خشوع وخضوع سے نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ نماز کے بعد نہایت عجز والحاح سے دعا مانگتے تھے کہ ''الٰہی میرے گناہوں کو بخش دے اور مجھے اپنی مخلوق کی خدمت کرنے کی توفیق دے۔'' رمضان المبارک آتا تو ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہتی اس مقدّس مہینے میں رات دن عبادت کے سوا کوئی شغل نہ ہوتا، رات کے آخری حصّے میں خوفِ خدا سے اس قدر روتے کہ ریش مبارک اور جائے نماز آنسوؤں سے تر ہو جاتی۔ قرآنِ حکیم سے غیر معمولی شغف وانہماک تھا، تلاوتِ قرآن میں کبھی ناغہ نہیں آنے دیتے تھے، ایسی خوش الحانی اور ورد کے ساتھ قرآنِ حکیم کی تلاوت کرتے تھے کہ سننے والوں پر محویت کا عالم طاری ہو جاتا تھا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن سائب ؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت سعد ؓ ان کے پاس تشریف لائے اور فرمایا۔ ''عبدالرحمٰن میں نے سنا ہے کہ تم قرآن کی قرات خوش الحانی سے کرتے ہو، میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ قرآن غم (عبرت) کے لیے نازل ہوا ہے۔ اس لیے جب پڑھو تو روؤ اگر روتے نہیں تو تمہاری صورت سے عبرت پذیری کا اظہار ہو اور اس کو خوش الحانی کے ساتھ پڑھو۔''

حضرت سعد ؓ کو بارگاہِ رسالت ﷺ میں جو تقرّبِ خصوصی حاصل تھا اس نے ان کا پایہ علم وفضل بہت بلند کر دیا تھا۔ وہ سالہا سال تک نبوّت کے سرچشمہ علم وعرفان سے فیض یاب ہوئے۔ اس کا یہ اثر ظاہر ہوا کہ حضور ﷺ کے وصال کے بعد وہ ان صحابہ

کبار رضی اللہ عنہم میں شمار ہوئے جو علم وفن کا مرجع تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں تفقہ فی الدین کا خاص ملکہ عطا کیا تھا اور وہ فقہائے صحابہ کی اس صف سے تعلق رکھتے تھے جس میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ، حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ جیسے اساطینِ اُمت شامل ہیں۔ ان کا دامن بیشمار علمی جواہر ریزوں سے پُر تھا۔ لوگ جوق در جوق ان سے مسائل پوچھنے آتے اور وہ سب کو مطمئن کر کے واپس بھیجتے۔ اگر کسی مسئلہ کا علم نہ ہوتا تو اپنے ہمعصر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی پوچھنے میں کوئی عار محسوس نہ کرتے۔ اگرچہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ حدیث بیان کرنے میں بہت محتاط تھے پھر بھی ان سے دوسو پندرہ احادیث مروی ہیں۔ ان میں پندرہ متفق علیہ، پندرہ میں بخاری اور آٹھ میں مسلم منفرد ہیں۔

شہسوارِ اسلام حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بلاشبہ تاریخِ اسلام کی ایک جامعِ کمالات وصفات شخصیت ہیں۔ ان کی سیرت اپنے اندر بے شمار پہلوئے اتباع رکھتی ہے۔ اسلامی زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا گوشہ ہو جس کے متعلق ان کا کردار اور طرزِ عمل کوئی اعلیٰ وارفع نمونہ پیش نہ کرتا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں عشقِ رسول ﷺ، صبر واستقلال اور شجاعت جیسے اوصاف کے علاوہ تدبیر وسیاست، انتظامِ سلطنت اور قیادتِ جہاد جیسی صلاحیتوں سے بھی بہرہ ور کیا تھا۔ اسلام کو جہاں اور جس طرح کی ضرورت ہوئی انہوں نے اپنی تمام صلاحیتوں کا نذرانہ فوراً پیش کر دیا۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ
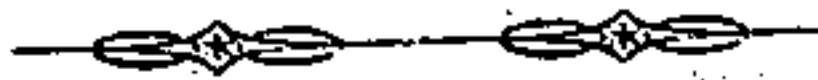
حضرت عبدالرحمٰن بن عوف الزہری رضی اللہ عنہ

(۱)

شعبان ۶ھ ہجری میں رحمتِ عالم ﷺ کو بنوکلب کی طرف ایک مہم بھیجنے کی ضرورت پیش آئی۔ یہ قبیلہ دومتہ الجندل کے قریب آباد تھا اور خاصا طاقتور تھا۔ حضور ﷺ چاہتے تھے کہ اس مہم کی قیادت کسی ایسے شخص کے سپرد کی جائے جو تبلیغ کا فریضہ بھی بطریقِ احسن انجام دے سکے اور اگر لڑنے بھڑنے کی نوبت آئے تو اس سے بھی عہدہ برآ ہو سکے۔ اس مقصد کے لیے حضور ﷺ کی نظرِ انتخاب اپنے ایک ایسے جان نثار پر پڑی جو آغازِ بعثت سے لے کر اب تک ہر موقع پر راہِ حق میں اپنی جاں سپاری کا عملی ثبوت پیش کر چکے تھے۔ آپ ﷺ نے ایک آدمی بھیج کر انہیں طلب فرمایا۔ تھوڑی ہی دیر میں سرخ و سپید رنگ اور طویل قامت کے ایک بارعب شخص بارگاہِ رسالت ﷺ میں حاضر ہو گئے۔ ان کی دراز ریش اور سر پر کانوں کے نیچے تک گھونگھر دار کاکلیں ان کی وجاہت کو دوبالا کر رہی تھیں۔ انہوں نے آتے ہی عرض کیا:

”یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان، اس غلام کو کیسے یاد فرمایا، زہے قسمت کہ کوئی خدمت اس کے سپرد فرمائی جائے۔“

سرورِ عالم ﷺ نے انہیں بڑے پیار سے اپنے سامنے بٹھایا، اس مہم کی تفصیل سمجھائی اور پھر نہایت محبت اور شفقت کے ساتھ (ان کا عمامہ کھول کر) اپنے دستِ مبارک سے ان کے سر پر سیاہ عمامہ باندھا جس کا شملہ چار انگشت ان کی پشت پر چھوڑا۔ اس کے بعد انہیں سات سو مجاہدین کا قائد مقرر فرمایا اور پھر حمد و ثنا کے بعد ان سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے جاؤ، اللہ کی نافرمانی کرنے والوں سے لڑو۔ لیکن خیانت نہ کرنا، مُثلہ نہ کرنا (دشمن کی لاشوں کے ہونٹ کان ناک وغیرہ مت کاٹنا) اور نہ بچّوں ہی کو قتل کرنا۔ یہ تم میں خدا کا عہد اور اس کے نبی کی سیرت ہے۔''

ان صاحب نے ارشادِ نبوی ﷺ کے سامنے سر جھکا دیا۔ اس پر عمل کرنے کا عہد کیا اور اپنے ساتھیوں کو لے کر دومۃ الجندل کی طرف روانہ ہو گئے۔

یہ صاحبِ رسول رضی اللہ عنہ جن کی دستار بندی خود سیّد المرسلین، رحمتِ دو عالم فخرِ موجودات ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے فرمائی اور جن کو ایک اہم مہم کی قیادت کے لیے منتخب فرمایا، سیّدنا حضرت عبدالرحمٰن بن عوف الزہری رضی اللہ عنہ تھے۔

(۲)

سیّدنا ابو محمد عبدالرحمٰن بن عوف آسمانِ فضائل کا مہرِ عالمتاب ہیں وہ ان دس جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ایک ہیں۔ جن کو ساقی کوثر ﷺ نے خصوصیت سے نام لے کر جنّتی ہونے کی بشارت دی اور جو ''عشرہ مبشّرہ'' کے مہتم بالشان لقب سے مشہور ہوئے۔ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ قریش کے خاندان ''بنو زُہرہ'' سے تھے۔ سلسلہ نسب یہ ہے:

عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بن عوف بن عبد عوف بن عبد بن حارث بن زُہرہ بن کلاب بن مُرّہ۔

ان کا نسب چھٹی پشت میں کلاب بن مرّہ پر سرورِ عالم ﷺ کے سلسلہ نسب سے مل جاتا ہے۔ حضور ﷺ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ بھی بنو زہرہ سے تھیں اور ان کا سلسلہ نسب زہرہ بن کلاب پر حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کے سلسلہ نسب سے مل جاتا ہے۔ زہرہ حضور ﷺ کے جدّ اعلیٰ قصی بن کلاب کے بھائی تھے۔

حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کی والدہ کا نام شُفاء رضی اللہ عنہا بنتِ عوف (بن عبد بن حارث بن زہرہ) تھا۔ بعض روایتوں میں ان کا نام صفیہ، صفا اور ضبعیہ بھی آیا ہے۔ لیکن جمہور

اہلِ سیَر نے شفاء ہی کو ترجیح دی ہے۔ حضرت شفاء رضی اللہ عنہا اپنے خاوند عوف بن عبدِ عوف کی بنتِ عم تھیں۔ ان کو صحابیت کا شرف بھی حاصل ہے۔

بیہقی رحمۃ اللہ علیہ اور حافظ ابنِ عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ رحمتِ عالم ﷺ کی ولادت با سعادت کے وقت دایہ کی خدمت حضرت شفاء بنتِ عوف رضی اللہ عنہا نے انجام دی۔ وہ حضرت آمنہ کی ہم جد اور قریبی رشتہ دار تھیں۔

حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کے سالِ ولادت کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں۔ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ وہ عام الفیل کے دس برس بعد پیدا ہوئے اس لحاظ سے وہ حضور ﷺ سے عمر میں دس برس چھوٹے تھے۔ لیکن حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ''الاصابہ'' میں ان کی عمر کی نسبت جو روایت بیان کی ہے اس کی رو سے ان کا سالِ ولادت عام الفیل سے بارہ برس بعد قرار پاتا ہے۔

صحیح بخاری کے مطابق حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کا جاہلی نام عبدِ عمرو تھا۔ لیکن ابنِ سعد رضی اللہ عنہ، حافظ ابنِ عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ، بلاذری رحمۃ اللہ علیہ اور حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کا جاہلی نام عبدالکعبہ لکھا ہے۔ حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ''الاصابہ'' میں اور امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے ''مستدرک'' میں بیان کیا ہے کہ جب وہ ایمان لائے تو حضور ﷺ نے ان کا جاہلی نام بدل کر عبدالرحمٰن (اسلام) نام رکھا۔

حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں وہ کفر و شرک اور فسق و فجور کا گہوارہ تھا۔ لیکن حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے فطرتِ صالح عطا کی تھی۔ حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ''اصابہ'' میں لکھا ہے کہ انہوں نے زمانہ جاہلیت میں اپنے اوپر شراب حرام کر لی تھی۔

حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کے والد عوف تجارت پیشہ تھے ان کی خواہش تھی کہ عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بھی ایک کامیاب تاجر بنیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے نوجوان فرزند کو تجارت کے طریقے اور اسرار و رموز خوب اچھی طرح ذہن نشین کرائے اور بعض تجارتی

سفروں میں اپنے ساتھ لے جا کر عملی تربیت بھی کی۔ بعثت نبوی ﷺ سے پہلے کا ذکر ہے کہ ایک بار وہ فاکہ بن مغیرہ (حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے چچا) عفّان (حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے والد) حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر تجارت کے لیے یمن گئے۔ راستے میں بنو جذیمہ نے عوف اور فاکہ کو قتل کر دیا۔ عفّان، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بچ گئے۔ ابنِ ہشام کا بیان ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے بڑی بہادری سے دشمنوں کا مقابلہ کیا اور اپنے باپ کے قاتل کو وہیں ختم کر دیا۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ فطری طور پر نہایت شجاع اور جانباز تھے۔

حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ ستائیس یا تیس برس کے پیٹے میں تھے کہ آفتابِ اسلام فاران کی چوٹیوں سے طلوع ہوا اور ہادی برحق ﷺ منصبِ رسالت ﷺ پر فائز ہوئے۔ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کی طبعی سلامت روی اور پاکیزہ نفسی نے انہیں فوراً اسلام کی طرف مائل کر دیا اور وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تبلیغ سے اوائل بعثت ہی میں سعادت اندوزِ اسلام ہو گئے۔ ایک روایت میں ہے کہ اسلام لانے والوں میں ان کا تیرھواں ۱۳ نمبر تھا۔ اس وقت تک سرورِ کونین ﷺ دارِ ارقم میں پناہ گزین نہیں ہوئے تھے۔

(۳)

شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہونے کے بعد حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بھی دوسرے بلاکشانِ اسلام کی طرح کفارِ مکہ کے جور و ستم کا ہدف بن گئے۔ ۵ بعدِ بعثت میں سرورِ عالم ﷺ نے مظلوم صحابہ کو حبش کی طرف ہجرت کرنے کی تلقین فرمائی تو حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ دس مردوں اور چار خواتین کے ہمراہ حبش چلے گئے۔ اس وقت ان کی دو بیویاں اور بچے موجود تھے لیکن وہ تنہا گئے اور اہل و عیال کو اللہ کے بھروسے پر مکہ ہی میں چھوڑا۔ تین چار ماہ بعد مہاجرین حبشہ نے اڑتی اڑتی خبر سنی کہ کفارِ مکہ اور رسول اللہ ﷺ

کے مابین مفاہمت ہوگئی ہے۔ یہ خبر سن کر چند مہاجرین نے حبش سے مکہ کا عزم کیا۔ ان میں حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ مکہؔ کے قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ خبر محض افواہ تھی لیکن اب انہوں نے واپس جانا مناسب نہ سمجھا اور ہر شخص قریش کے کسی نہ کسی با اثر سردار کی پناہ حاصل کر کے مکہ میں داخل ہوگیا۔ علامہ بلاذری رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ اسود بن یغوث کی پناہ حاصل کر کے مکہ میں داخل ہوئے۔

حبش سے واپس آ کر بھی حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ اور دوسرے مسلمانوں کو چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا کیونکہ مشرکینِ قریش کے مظالم اہلِ حق پر شدید سے شدید تر ہوتے چلے گئے۔ اس صورتِ حال کے پیش نظر سرورِ عالم ﷺ نے ایک بار پھر مسلمانوں کو ہدایت فرمائی کہ وہ حبش کی جائے عافیت کی طرف ہجرت کر جائیں۔ چنانچہ ۶ بعدِ بعثت میں ۸۰ سے زیادہ مردوں اور ۱۸۔ ۱۹ عورتوں نے ایک قافلے کی صورت میں حبش کی راہ لی۔ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بھی اس قافلے میں شامل تھے۔ یہ اصحاب کئی سال تک حبش میں غریب الوطنی کی زندگی گزارتے رہے۔ اہلِ سیَر کا بیان ہے کہ مہاجرینِ حبشہ کی ایک جماعت تو بارہ برس سے زیادہ عرصے تک حبش میں مقیم رہی اور غزوۂ خیبر کے موقع پر حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے ہمراہ مدینہ منوّرہ واپس آئی۔ البتہ متعدد اصحاب حضور ﷺ کی ہجرت الی المدینہ سے پہلے مختلف اوقات میں مکہ میں واپس آگئے۔ ان واپس آنیوالوں میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ تھے۔

۱۳ نبوّت میں سرورِ عالم ﷺ نے اپنے جاں نثاروں کو مدینہ منوّرہ کی طرف ہجرت کا اِذن دیا تو حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بھی ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے اس طرح ان کو تین بار ہجرت کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ مدینہ منوّرہ پہنچ کر حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ حضرت سعد بن ربیع انصاری رضی اللہ عنہ کے مہمان ہوئے۔ چند ماہ بعد سرورِ عالم ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے مابین مواخاۃ قائم کی۔ تو حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو حضرت سعد بن ربیع انصاری رضی اللہ عنہ کا اسلامی بھائی بنایا اس مواخاۃ کے بعد حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ نے ایثار

کا ایسا شاندار مظاہرہ کیا کہ تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی صحیح بخاری میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

''ہمارے یہاں عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ آئے اور رسول اللہ ﷺ نے ان کے اور سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کے مابین مواخاۃ قائم کی وہ (سعد رضی اللہ عنہ) دولت مند آدمی تھے انہوں نے (عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ) سے کہا، تمام انصار جانتے ہیں کہ میں نہایت دولتمند ہوں میں اپنا مال (آپ کے اور اپنے درمیان) نصف نصف بانٹ دونگا اور میری دو بیویاں ہیں آپ ان کو دیکھ لیں جو پسند آئے میں اس کو طلاق دے دوں گا۔ اور جب وہ حلال ہو جائے (عِدّت گزار لے) آپ اس سے نکاح کر لیں۔

عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے کہا، اللہ آپ کے اہل وعیال اور مال ومنال میں برکت دے (مجھے ان چیزوں کی ضرورت نہیں) کیا یہاں کوئی بازار ہے جہاں تجارت ہوتی ہو۔ سعد رضی اللہ عنہ نے کہا، بازار قینقاع۔ عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ صبح کو بازار گئے اور پنیر اور گھی لائے۔ پھر دوسری صبح کو گئے۔ اس روز جب لوٹے تو کچھ گھی اور پنیر فاضل بچا لیا تھا۔''

اس روایت سے جہاں حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کے عدیم المثال ایثار کا منظر دیکھنے میں آتا ہے وہاں حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کے استغنا اور اعتماد علی النفس کا ثبوت بھی ملتا ہے۔

حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو تجارت کا پیشہ باپ سے ورثے میں ملا تھا اور وہ اس کے طریقوں سے بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے مدینہ میں کاروبار شروع کیا تو تھوڑے ہی عرصہ میں اسے کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ نے ''طبقات'' میں خود ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اگر میں پتھر بھی اٹھاتا تو یہ خیال ہوتا تھا کہ اس کے نیچے چاندی یا سونا ملے گا۔

صحیح بخاری کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ تجارت شروع کرنے کے بعد جب ان کے پاس کچھ پس انداز ہو گیا تو انہوں نے ایک انصاری خاتون سے شادی کی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

''چند دن بعد عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ آئے تو ان کے کپڑوں پر زردی (حجلہ عروسی کی بشاشت یعنی زعفرانی رنگ) کا دھبہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا، نکاح کیا ہے؟ بولے، جی ہاں۔ فرمایا ﷺ، کس سے؟ جواب دیا، ایک انصاری عورت سے..... فرمایا، اس کو کتنا مہر دیا؟ عرض کیا کھجور کی گٹھلی کے برابر سونا۔ ارشاد ہوا' ولیمہ کرو گو ایک ہی بکری ہو۔''

بخاری میں ان انصاری خاتون کا نام مذکور نہیں البتہ بعض دوسرے اربابِ سیر نے ان کا نام سہلہ بنتِ عاصم رضی اللہ عنہا بتایا ہے جو قبیلہ بلّی سے تھیں۔ یہ قبیلہ قضاعہ کی شاخ تھا اور قضاعہ کے متعلق ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے۔ ''و ھم من الانصار''

حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے اپنی تجارت کو فروغ دینے کی کئی صورتیں نکالیں ان میں وہ معاہدۂ تجارت خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جو ان کے اور مکہ کے رئیس امیّہ بن خلف کے درمیان ہوا۔ صحیح بخاری میں خود ان سے روایت ہے کہ:

''میں نے امیّہ بن خلف کو ایک تحریر دی کہ وہ میری مکہ میں حفاظت کرے اور میں اس کی مدینہ میں حفاظت کرونگا۔ جب میں نے الرّحمان کا ذکر کیا تو امیّہ کہنے لگا، میں الرحمان کو نہیں جانتا تم اپنا وہ نام لکھو جو جاہلیت میں تھا (چنانچہ) میں نے اپنا نام عبدِ عمرو لکھا۔''

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاہدہ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کے ورودِ مدینہ کے بعد لکھا گیا تھا اور یہ بھی کہ تجارت کے سلسلے میں حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ ہجرت کے بعد بھی مکّے آتے جاتے رہتے تھے۔ شارحینِ حدیث نے اس روایت سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔

(۴)

رمضان المبارک ۲ ہجری میں بدر کے مقام پر حق و باطل کا پہلا معرکہ پیش آیا تو حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ اس میں بڑے جوش و جذبے کے ساتھ شریک ہوئے۔ ہنگامہ کارزار میں وہ دشمن کی صفوں میں سربکف گھس گئے اور کئی مشرکوں کو گھائل کرنے کے علاوہ سائب بن ابی رفاعہ کو جہنم واصل کیا۔ صحیح بخاری میں غزوۂ بدر کے سلسلے میں خود حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ سے دو واقعے منقول ہیں۔ ایک واقعہ یہ ہے:

"میں بدر کے دن صف میں کھڑا تھا، مڑ کر دیکھا تو میرے دائیں بائیں جانب دو نوجوان تھے، مجھ کو ان پر اطمینان نہیں ہوا۔ اتنے میں ایک نے مجھ سے دبی زبان میں کہا، چچا ابوجہل کو دکھلا دیجئے۔ میں نے پوچھا، برادر زادے کیا کرو گے؟ اس نے کہا، میں نے خدا سے عہد کیا ہے کہ اس کو قتل کروں گا یا اسی کوشش میں قتل ہو جاؤں گا۔ دوسرے نے بھی آہستہ سے مجھ سے یہی باتیں کہیں۔ اب مجھ کو خوشی ہوئی کہ میں کن دو آدمیوں کے درمیان کھڑا ہوں۔ میں نے اشارے سے ابوجہل کو دکھلا دیا۔ وہ دونوں باز کی طرح اس پر جھپٹ پڑے اور اس کو مار ڈالا۔ یہ دونوں عفراء رضی اللہ عنہا کے بیٹے تھے۔"

جمہور اہلِ سیَر نے لکھا ہے کہ ابوجہل کو مہلک طور پر زخمی کرنے والے نوجوان حضرت مُعاذ رضی اللہ عنہ اور حضرت مُعَوِّذ ابناء عفراء رضی اللہ عنہا تھے۔ (عفراء رضی اللہ عنہا ان کی والدہ کا نام تھا۔ والد کا نام حارث بن رفاعہ تھا۔ ان کا تعلق انصار کے قبیلہ خزرج کی شاخ بنو نجار سے تھا۔)

دوسرا واقعہ اُمیّہ بن خلف کے قتل کا ہے۔ اُمیّہ مشرکین کے لشکر میں شامل ہو کر مسلمانوں سے لڑنے آیا تھا۔ جب مشرکین کو شکست ہو گئی اور انہوں نے بھاگنا شروع کیا تو اُمیّہ نے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو دیکھ لیا چونکہ معاہدۂ تجارت میں حضرت

عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے اس کی حفاظت کا عہد کیا تھا، اُمیّہ نے بھاگتے بھاگتے ان کو آواز دی کہ مجھے بچاؤ۔ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے ایفائے عہد کے خیال سے اس کو بچانا چاہا یہ الگ بات ہے کہ وہ اس میں کامیاب نہ ہوئے۔ یہ واقعہ ان کی زبانی اس طرح منقول ہے:

''جب بدر کا دن آیا تو میں پہاڑ کی طرف چلا تا کہ اس (امیہ بن خلف) کی حفاظت کروں۔ اس وقت لوگ سو چکے تھے (لیکن) اس اُمیہ) کو بلال رضی اللہ عنہ نے دیکھ لیا۔ وہ گئے اور انصار کی ایک مجلس میں کھڑے ہو کر کہا، وہ رہا اُمیہ بن خلف اس (دشمنِ خدا) کے چھوڑنے میں رستگاری نہیں ہے۔ انصار کی ایک جماعت نے ان کے ساتھ ہمارا تعاقب کیا مجھ کو ڈر پیدا ہوا کہ یہ لوگ ہم کو پا جائیں گے۔ میں نے اس (اُمیہ کے بیٹے کو پیچھے چھوڑ دیا تا کہ وہ اس سے نبٹتے رہیں۔ انہوں نے اس کو قتل کر دیا لیکن ہمارا پیچھا نہ چھوڑا۔ وہ (اُمیہ) بھاری جسم کا آدمی تھا (اس لیے تیز نہیں چل سکتا تھا) جب وہ لوگ ہمارے پاس پہنچ گئے۔ میں نے اس سے کہا، بیٹھ جا، وہ بیٹھ گیا، میں نے حفاظت کے خیال سے اپنے آپ کو اس پر ڈال دیا۔ ان لوگوں (انصار) نے میرے نیچے سے تلواریں چلائیں اور اس کو قتل کر ڈالا۔ میرے پاؤں میں بھی تلوار کا زخم لگا۔''

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے غزوۂ بدر میں ایک مشرک حجاج بن الحارث کو قید بھی کیا۔

غزوۂ اُحد (۳ ھ) میں بھی حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ سر ہتھیلی پر رکھ کر لڑے۔ ابنِ ہشام رحمۃ اللہ علیہ اور حافظ ابنِ عبدالبرؒ رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ انہوں نے غزوۂ اُحد میں اکیس ۲۱ زخم کھائے۔ پاؤں کا زخم اتنا شدید تھا کہ عمر بھر لنگڑا کر چلتے رہے۔

ایک روایت میں ہے کہ جب لڑائی کی آگ پوری شدت سے بھڑک رہی تھی، حضرت حارث بن صمہ انصاری رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ ﷺ نے ان سے پوچھا، تم نے عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو دیکھا ہے۔ انہوں نے

عرض کیا، یارسول اللہ ﷺ وہ پہاڑ کی طرف کفار کے نرغہ میں تھے میں نے اُدھر جانا چاہا لیکن آپ ﷺ پر نظر پڑ گئی اس لیے ادھر چلا آیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا، عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو فرشتے بچا رہے ہیں۔ اب حضرت حارث رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کے پاس گئے تو دیکھا کہ ان کے سامنے کافروں کی سات لاشیں پڑی ہیں۔ انہوں نے پوچھا، کیا ان سب کو آپ نے قتل کیا ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ارطاۃ اور فلاں فلاں کو تو میں نے قتل کیا ہے۔ باقی مشرکین کے قاتل مجھے نظر نہیں آئے۔ یہ سن کر حضرت حارث رضی اللہ عنہ پکار اٹھے۔ رسول اللہ ﷺ نے بالکل صحیح فرمایا تھا۔ (سیر انصار)

غزوۂ اُحد کے بعد حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ غزوۂ احزاب میں جانبازانہ شریک ہوئے۔

شعبان ۶ھ ہجری میں سرورِ عالم ﷺ نے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو سات سو آدمی دے کر دومۃ الجندل کے قریب آباد قبیلہ بنو کلب کی طرف روانہ فرمایا۔ چلنے سے پہلے حضور ﷺ نے ان کا عمامہ کھول ڈالا اور خود اپنے دستِ مبارک سے ان کے سر پر سیاہ عمامہ باندھا اور ان کی پشت پر چار انگشت شملہ چھوڑ کر فرمایا: ''عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ عمامہ اس طرح باندھا کرو کیونکہ یہ عمدہ اور پسندیدہ طریقہ ہے۔''

حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے دومۃ الجندل پہنچ کر بنو کلب کو اسلام کی دعوت دی۔ پہلے روز ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ دوسرے روز بھی دعوت دی لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ تیسرے روز انہوں نے پھر ان کو حق کی طرف بلایا۔ اس مرتبہ ان کے نصرانی سردار اصبغ بن عمرو کلبی پر حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کی دعوت کا خاص اثر ہوا اور وہ نصرانیت کا قلاوہ گردن سے اتار کر مشرف بہ اسلام ہو گئے۔ ان کے ساتھ بنو کلب کے اور بہت سے لوگ بھی حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے سرورِ عالم ﷺ کو حضرت رافع بن کیث رضی اللہ عنہ کے ہاتھ ایک خط بھیجا جس میں آپ ﷺ کو اصبغ کے اسلام لانے کی اطلاع دی۔ اور بنو کلب سے تعلقات قائم رکھنے کے بارے میں بھی دریافت کیا۔

حضور ﷺ نے (جواباً) تحریر فرمایا کہ تم اصبغ کی بیٹی سے شادی کر لو۔ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کے ارشاد کی تعمیل میں اصبغ رضی اللہ عنہ کی بیٹی تماضر رضی اللہ عنہا ہی کے بطن سے پیدا ہوئے۔ بعض اہلِ سِیَر نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو اصبغ کی بیٹی سے شادی کا مشورہ اس لیے دیا تھا کہ اس طرح بنوکلب سے مسلمانوں کے تعلقات استوار ہو جائیں گے۔ اس سے پہلے قریش اور بنوکلب میں باہم شادی بیاہ کے تعلقات نہیں تھے۔

ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ مدینہ سے چلنے لگے تو حضور ﷺ نے انہیں دوسری نصیحتوں کے علاوہ یہ ہدایت بھی فرمائی کہ اللہ تعالیٰ تمہیں فتح دے (یا بنوکلب دعوتِ اسلام قبول کرلیں) تو ان کے حاکم کی لڑکی سے نکاح کر لینا۔ یہ روایت ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ نے طبقات میں اور ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ''اُسد الغابہ'' میں درج کی ہے۔ لیکن پہلی روایت جو حافظِ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اور محدّث دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کی ہے زیادہ قرینِ قیاس ہے۔

(۵)

سریہ دومۃ الجندل کے بعد حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے فتح مکہ سے غزوۂ تبوک تک تمام غزوات ومشاہد میں سرورِ عالم ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔

ایک روایت میں ہے کہ فتح مکہ کے بعد حضور ﷺ نے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہمراہ بنوجذیمہ میں تبلیغِ اسلام کے لیے بھیجا۔

غزوۂ تبوک کے دوران میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کے شرف ومجد میں اور اضافہ کر دیا۔ صحیح مسلم میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

''میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تبوک کا غزوہ کیا۔ جب آپ ﷺ طہارت کے لیے تشریف لے گئے میں نمازِ فجر سے پہلے (پانی کا) برتن لے

کر ساتھ ہوا۔ جب آپ ﷺ واپس آئے تو میں نے برتن سے آپ ﷺ کے ہاتھوں پر پانی ڈالا۔ آپ ﷺ نے تین مرتبہ دونوں ہاتھ دھوئے۔ پھر منہ دھویا۔ پھر اپنے جبہ (کی آستین) چڑھانے لگے۔ آستین تنگ تھی چڑھ نہ سکی تو اندر سے ہاتھ نکالے اور دونوں ہاتھ کہنی تک دھوئے۔ پھر موزوں پر وضو (مسح) کیا۔ پھر چلے۔ میں بھی چلا۔

لوگوں نے عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو امام بنا دیا اور انہوں نے نماز شروع کر دی۔ رسول اللہ ﷺ کو ایک رکعت ملی۔ آپ ﷺ نے لوگوں کے ساتھ (باجماعت) دوسری رکعت پڑھی، جب عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے سلام پھیرا، رسول اللہ ﷺ اپنی نماز پوری کرنے کے لیے کھڑے ہوئے۔ اب مسلمان گھبرائے اور بار بار سبحان اللہ کہنا شروع کیا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے نماز ختم کی تو فرمایا، تم نے خوب کیا، ٹھیک کیا۔ منشاء یہ تھا کہ نماز وقت پر پڑھا کرو۔''

''مسلم'' ہی کی ایک اسی مضمون کی دوسری روایت میں یہ اضافہ ہے:

''مغیرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، میں نے چاہا کہ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو ہٹا دوں لیکن نبی ﷺ نے فرمایا، ان کو رہنے دو۔''

مسندِ احمد رحمۃ اللہ علیہ میں بھی اسی قسم کی ایک روایت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے ایک روز فجر کی نماز پڑھائی۔ اور رسول اللہ ﷺ نے ان کے ساتھ نماز پڑھی۔ اس روایت میں یہ تصریح نہیں کی گئی کہ یہ کب کا واقعہ ہے۔

بعض اہلِ سیَر نے اس واقعہ کو حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کے عظیم ترین فضائل میں شمار کیا ہے۔ اور بعض نے لکھا ہے کہ یہ روایت جرح سے محفوظ نہیں۔

تبوک سے واپسی پر ۹ ھ میں ذی قعدہ کے آخر یا ذوالحجہ کے شروع مہینہ میں سرورِ عالم ﷺ نے تین سو مسلمانوں کا ایک قافلہ مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ کو روانہ فرمایا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس قافلے کے امیر اور حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ اس کے نقیب تھے۔ قربانی کے لیے بیس اونٹ قافلے کے ساتھ تھے۔ اس قافلے میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ عہدِ رسالت میں یہ مسلمانوں کا پہلا حج تھا جسے قرآنِ کریم نے حجِ اکبر کا نام دیا ہے۔ اس میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو حج کے صحیح طریقے بتائے اور سکھائے اور قربانی کے دن کھڑے ہو کر اسلام کا خطبہ پڑھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سورۂ برات کی چالیس آیتیں پڑھ کر سنائیں۔ جن میں کافروں سے ہر قسم کے تعلقات منقطع کرنے کا اعلان تھا۔ اس موقع پر منادی کی گئی کہ اب سے کسی مشرک کو خانہ کعبہ میں داخل ہونے کی اجازت نہ ہوگی اور نہ کوئی برہنہ ہو کر حج کر سکے گا۔

سنہ ۱۰ ہجری میں رحمتِ عالم ﷺ حجۃ الوداع کے لیے مکہ معظمہ تشریف لے گئے تو حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بھی آپ ﷺ کے ہم رکاب تھے۔

حجۃ الوداع سے واپسی کے کچھ عرصہ بعد (صفر ۱۱ ہجری میں) سرورِ عالم ﷺ کی علالت کا آغاز ہوا۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضور ﷺ کی وفات سے کچھ پہلے صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہم لوگوں کو وصیت فرمایئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا، میں تم کو ان مہاجرین کے بارے میں (حسنِ سلوک) کی وصیت کرتا ہوں۔ اگر تم ایسا نہ کرو گے تو اللہ تعالیٰ تم سے کسی نفل اور فرض کو قبول نہ کرے گا۔

(۶)

ربیع الاوّل ۱۱ ہجری میں سرورِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد سقیفہ بنو ساعدہ میں خلافت کا قضیہ پیش آیا تو بعض روایات کے مطابق حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ بھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ہمراہ وہاں تشریف لے گئے اور اس مسئلے کو حل کرنے میں پوری سرگرمی سے حصہ لیا کہا جاتا ہے کہ اس موقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کرنے میں ان کا تیسرا نمبر تھا یا کم از کم وہ اوّلین بیعت کرنے

والوں میں تھے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سریر آرائے خلافت ہونے کے بعد سب سے پہلے اس مہم کی تکمیل کی طرف توجہ کی جس پر حضور ﷺ اپنی وفات سے پہلے حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو مامور فرما چکے تھے۔ ابن جریر طَبری کا بیان ہے کہ حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کو رخصت کرنے پڑاؤ پر تشریف لے گئے تو حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بھی ان کے ہمراہ تھے۔ صِدّیق اکبر رضی اللہ عنہ حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کی سواری کے ساتھ پیادہ پا چل رہے تھے اور حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے ان کی سواری کی مہار تھام رکھی تھی۔

حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ کے نزدیک حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کی بڑی قدر و منزلت تھی اور وہ اکثر اہم معاملات میں ان سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ ۱۱ ہجری میں صِدّیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو امیر الحج بنا کر مکہ معظّمہ بھیجا۔ ۱۲ ھ میں امیر الحج کون تھے؟ اس کے بارے میں اختلاف ہے ایک قول کے مطابق اس سال بھی حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ امیر الحج تھے۔ طَبری کا بیان ہے کہ ۱۳ ھ میں اپنی وفات سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین نامزد کرنا چاہا تو سب سے پہلے اس معاملے میں حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ سے مشورہ کیا۔ انھوں نے بلا تکلف عرض کیا کہ عمر رضی اللہ عنہ بلاشبہ اس منصب کے اہل ہیں لیکن ان کے مزاج میں سختی ہے۔ حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”وہ اس لیے سخت تھے کہ میں نرم تھا۔ جب ان پر خلافت کی ذمہ داری پڑے گی تو خود بخود نرم ہو جائیں گے۔“

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو بہت مانتے تھے جب وہ مسند نشینِ خلافت ہوئے تو اپنے دورِ خلافت میں آنے والے پہلے حج پر خود نہ جا سکے اور حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو امیر الحج بنا کر بھیجا (۱۳ ھ) اس کے بعد انہوں نے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو مجلسِ شوریٰ کا مستقل رکن بنا دیا۔ عہدِ فاروقی کے متعدد واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نہایت مخلص اور صائب الرائے مشیرِ خلافت

ثابت ہوئے۔

۱۴ھ ہجری میں جب عراقِ عرب پر باقاعدہ لشکر کشی کا فیصلہ کیا گیا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے تمام عرب سے مجاہدین کو طلب کیا۔ چنانچہ مدینہ منورہ میں شوقِ جہاد سے سرشار مجاہدین کا ایک عظیم لشکر جمع ہو گیا۔ اس موقع پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا:

''میرا ارادہ ہے کہ اس لشکر کے ساتھ میں خود جاؤں۔ میری غیر حاضری میں علی رضی اللہ عنہ خلافت کا کاروبار چلائیں گے۔ طلحہ رضی اللہ عنہ، زبیر رضی اللہ عنہ اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ میرے ساتھ ہوں گے۔ طلحہ رضی اللہ عنہ مقدمۃ الجیش کے افسر ہوں گے اور میمنہ و میسرہ کی قیادت زبیر رضی اللہ عنہ اور عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کریں گے۔''

عام مجاہدین کو امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے ارادے کا علم ہوا تو وہ بہت خوش ہوئے لیکن حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے ان سے اختلاف کیا اور کہا:

''اے امیر المومنین! آپ یہیں ٹھہریئے اور لشکر کو بھیج دیجئے اگر خدانخواستہ آپ میدانِ جنگ میں کام آئے یا آپ کی موجودگی میں لشکر کو شکست ہوئی تو مسلمانوں کو سخت دھچکا لگے گا اور اسلام کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اگر آپ کی غیر موجودگی میں کوئی انہونی بات ہوئی تو آپ یہاں سے اس کا مداوا کر سکیں گے۔''

دوسرے اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کی تائید کی۔ اب سوال پیدا ہوا کہ اس اہم مہم کی قیادت کس کے سپرد کی جائے۔ سب یہی سوچ رہے تھے کہ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے دفعتاً اٹھ کر کہا، ''میں نے پا لیا، میں نے پا لیا۔'' حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ نے پوچھا، کون؟ بولے سعد بن مالک رضی اللہ عنہ (ابی وقاص) امیر المومنین رضی اللہ عنہ اور دوسرے تمام سربرآوردہ اصحاب نے ان کے انتخاب سے اتفاق کیا اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اس مہتم بالشان مہم کی قیادت پر مامور ہوئے بعد کے واقعات نے

ثابت کر دیا کہ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کی رائے کس قدر صحیح اوصائب تھی۔ واقدی اور طبری کا بیان ہے کہ جنگِ یرموک کے موقع پر جب رومیوں کی زبردست جنگی تیاریوں کی اطلاعات مدینے پہنچیں تو حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو اس قدر جوش آیا کہ انہوں نے مجلسِ شوریٰ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر کہا: ''امیر المومنین! آپ خود سپہ سالار بنیں اور مجھے ساتھ لے چلیں۔ اگر خدانخواستہ ہمارے بھائیوں کو کوئی ضرر پہنچا تو پھر جینا بیکار ہے۔'' لیکن دوسرے اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان کی رائے سے اتفاق نہ کیا اور یہی صلاح ٹھہری کہ امدادی فوجیں روانہ کی جائیں۔

نہاوند کی مشہور لڑائی سے پہلے جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اہل الرائے صحابہ سے مشورہ کیا تو بقول طبری حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے رائے دی کہ امیر المومنین کو موقعِ جنگ پر نہیں جانا چاہیے۔

معرکہ نہاوند کو عراقِ عجم کی فیصلہ کن لڑائی کہا جاتا ہے۔ اسی لیے عربوں نے اس کو ''فتح الفتوح'' کا نام دیا ہے اس لڑائی میں مسلمانوں کو بے شمار مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔ جب مالِ غنیمت کی سینکڑوں گٹھڑیاں مدینہ منوّرہ لائی گئیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں مسجدِ نبوی میں رکھنے کا حکم دیا اور ان پر خاص خاص صحابہ کا پہرہ مقرر کیا۔ طبری کا بیان ہے کہ ان میں حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ شرکتِ جہاد کی نیّت سے ایک دو مرتبہ شام تشریف لے گئے۔ طبری نے لکھا ہے کہ بیت المقدس کی فتح کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور عیسائیوں کے درمیان جابیہ کے مقام پر جو معاہدہ لکھا گیا اس پر گواہ کی حیثیت سے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے بھی دستخط کیے۔ طاعونِ عمواس (۱۸ ہجری) کے زمانے میں بھی حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ شام میں موجود تھے جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ دورہ کرتے ہوئے سرغ کے مقام پر پہنچے تو انہیں اطلاع ملی کہ شام میں طاعون کی وبا پھیلی ہوئی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ وہاں سے واپس جانا چاہتے تھے لیکن

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو ان کی رائے سے اختلاف تھا۔ اس موقع پر یہ مسئلہ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے حل کیا۔ اس سلسلے میں صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ:

''عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ آئے وہ بعض ضرورتوں کی وجہ سے کہیں گئے ہوئے تھے۔ بولے میرے پاس اس (مسئلہ) کے متعلق علم ہے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سُنا ہے، فرماتے تھے، جب تم اس (طاعون) کو کسی زمین (علاقے) میں سنو تو وہاں نہ جاؤ اور جب تم کسی زمین (علاقے) میں ہو اور وہاں وبا پھوٹ پڑے تو اس سے بھاگ کر نہ نکلو۔''

یہ حدیثِ پاک سن کر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''خدا کا شکر ہے! پلٹ چلو'' چنانچہ لوگوں کو لے کر وہاں سے واپس ہوئے۔ سالم بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مراجعت کی وجہ صرف حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث تھی۔

(۷)

۲۷ رذوالحجہ ۲۳ھ کو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر قاتلانہ حملے کا واقعہ ہائلہ پیش آیا۔ امیر المومنین رضی اللہ عنہ نمازِ فجر پڑھانے کھڑے ہوئے تو ایک پارسی غلام ابولولو فیروز نے ان پر خنجر سے حملہ کر کے شدید زخمی کر دیا۔ صحیح بخاری میں حضرت عمرو بن میمون رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے (زخمی ہونے کے بعد) عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا اور ان کو (امامت کے لیے) آگے بڑھایا جو لوگ قریب تھے وہ سب کچھ دیکھ رہے تھے جو میں دیکھ رہا تھا۔ باقی دُور کے لوگ تو ان کو کچھ خبر نہ تھی (کہ کیا ہوا) صرف اتنا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آواز گم پا کر لوگ چلا رہے تھے۔ سبحان اللہ سبحان اللہ۔ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے ان کو ہلکی (مختصر) نماز پڑھائی۔''

نماز سے فارغ ہونے کے بعد حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ دوسرے لوگوں کے ساتھ زخمی امیرالمومنین رضی اللہ عنہ کو اٹھا کر ان کے گھر لے گئے۔

جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی جانبری کی اُمید نہ رہی تو لوگوں نے ان سے اصرار کیا کہ منصبِ خلافت کے لیے کسی کو نامزد کر دیجئے۔ ان کے اصرار سے مجبور ہو کر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اِن چھ بزرگوں کے نام پیش کیے:

حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت سعد بن ابی وقّاص رضی اللہ عنہ، اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ۔

اور فرمایا ان چھ آدمیوں میں سے جس کی نسبت کثرت رائے ہو اس کو خلیفہ منتخب کر لیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ ان سب سے آخر وقت تک خوش رہے تھے۔

زخمی ہونے کے تین دن بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے پیکِ اجل کو لبیک کہا اور یکم محرم ۲۴ھ کو ان کی تدفین عمل میں آئی۔ جن بزرگوں نے اس رجلِ عظیم کو قبر میں اتارا ان میں حضرت علی کرّم اللہ وجہہ، حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد بن ابی وقّاص رضی اللہ عنہ کے علاوہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ بھی تھے۔
حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے وفات سے پہلے یہ وصیّت بھی کی تھی کہ خلافت کا مسئلہ تین دن کے اندر اندر حل ہونا چاہیے۔ چنانچہ ان کی تدفین کے بعد اس مسئلہ پر نہایت سرگرمی سے غور و خوض شروع ہو گیا۔ پہلے دو دن تک تو کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ تیسرے دن حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے دوسرے (نامزد) بزرگوں سے کہا کہ آپ امرِ خلافت تین آدمیوں تک محدود کر دیں۔ اس پر حضرت سعد بن ابی وقّاص رضی اللہ عنہ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کے حق میں دست بردار ہو گئے۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں اور حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں رائے دی۔ اس کے بعد حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے اپنے حق سے دست برداری کا اعلان کر دیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے پوچھا، کیا آپ لوگ یہ کام (انتخاب) میرے متعلق کرتے ہیں۔

خدا شاہد ہے میں تم میں سے افضل شخص (کے انتخاب) میں کوتاہی نہیں کروں گا۔

دونوں بزرگوں نے ان کی بات تسلیم کرنے کی حامی بھری۔ اس کے بعد حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے دونوں بزرگوں کو الگ الگ لے جا کر ان کے فضائل و مناقب بیان کیے اور ہر ایک سے عہد لیا کہ اگر ان کو منصبِ خلافت دیا گیا تو وہ عدل کریں گے اور اگر ان کے مقابل کو دیا گیا تو ان کی اطاعت کریں گے۔ اس عہد و پیمان کے بعد حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے (ایک روایت کے مطابق مجمع عام میں ایک موثر خطبہ دیا اور پھر) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا۔ ''اے عثمان ہاتھ اٹھائیں۔'' انہوں نے ہاتھ بڑھایا تو حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر ان کی بیعت کر لی۔ اس کے ساتھ ہی تمام لوگ بیعت کے لیے ٹوٹ پڑے۔

اس سلسلے میں کتبِ حدیث و سیَر میں اور بھی کئی روایتیں موجود ہیں۔ ان میں ایک مشہور روایت یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بلا تامل شیخین کے اتباع کا عہد کیا تھا اسی لیے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے انہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ترجیح دی۔ بعض اربابِ علم نے ان روایتوں پر نقد و جرح کی ہے۔ بہر حال صورتِ واقعہ کچھ بھی ہو یہ معاملہ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے بڑی خوش اسلوبی سے حل کر دیا اور اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس معاملہ میں ان کی تمام مساعی میں اخلاص اور خیر خواہی اُمت کا جذبہ کار فرما تھا۔ صحیح بخاری کی ایک روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک خلافت کا مسئلہ طے نہ ہو گیا حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ ہی مسلمانوں کی امامت کرتے رہے۔ امیر المومنین حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ نے بھی حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کا اعزاز و اکرام برقرار رکھا اور مختلف معاملات میں ان سے مشورہ کرتے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ ۲۴ھ (عام الرعاف) میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نکسیر پھوٹنے کی وجہ سے حج کو نہ جا سکے تو حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو امیر الحج بنایا۔ ۲۹ھ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حج کے لیے گئے تو حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی چھ سال نہایت امن وسکون سے گزرے لیکن پھر فتنوں کا آغاز ہو گیا۔ یہ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کی زندگی کا آخری دور تھا جو انہوں نے نہایت خاموشی سے گوشہ عزلت میں گزارا۔ آخر وہ گھڑی آ پہنچی جس کو ہر ذی روح پر ایک نہ ایک دن وارد ہونا ہے۔ ۳۱ھ یا ۳۲ ہجری میں رحمتِ دو عالم ﷺ کے اس برگزیدہ جاں نثار نے پیکِ اجل کو لبیک کہا۔ بقول ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ اس وقت ان کی عمر ۷۵ برس کی تھی لیکن حافظ ابنِ حجر رضی اللہ عنہ نے "الاصابہ" میں ان کی عمر ۷۲ سال بیان کی ہے۔ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ اور حافظ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ امیر المومنین حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔

سیّدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ، نے جنازہ پر کھڑے ہو کر فرمایا:

"عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ جاؤ تم نے اچھا زمانہ پایا اور فتنوں سے بچ کر چل دیئے۔"

سیّدنا حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جنازے میں شریک تھے اور ساتھ ساتھ کہتے تھے "واجبلاہ" "واجبلاہ" (ہائے افسوس یہ پہاڑ یعنی بہت بڑا آدمی دنیا سے چل بسا) صحیح بخاری (کتاب الجنائز) کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مسلمانوں نے ان کی قبر پر خیمہ کھڑا کر دیا تھا، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اسے دیکھا تو فرمایا، اس خیمے کو اکھاڑ لو، ان (عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ) پر ان کا عمل سایہ کرے گا۔"

حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے مختلف اوقات میں متعدد شادیاں کیں (لیکن ایک وقت میں چار سے زیادہ بیویاں کبھی نہیں رہیں۔) بیویوں کے نام یہ ہیں:

اُمِ کلثوم بنتِ عتبہ بن ربیعہ۔ نا معلوم الاسم بنتِ شیبہ بن ربیعہ اُمِ کلثوم رضی اللہ عنہا بنتِ عقبہ بن ابی معیط۔ سہلہ رضی اللہ عنہا بنتِ عاصم قضاعیہ۔ بحریہ بنتِ ہانی شیبانیہ۔ اُمِ حبیبہ بنتِ جحش رضی اللہ عنہا (اُمّ المومنین حضرت زینب بنتِ جحش رضی اللہ عنہا کی بہن تھیں۔ اس لحاظ سے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے ہم زلف تھے) سہلہ بنتِ سہیل رضی اللہ عنہا۔ اُمِ حکیم بنتِ قارظ، بنتِ ابوالحسین بن رافع اوسیہ۔ تماضر بنتِ اصبغ رضی اللہ عنہا، اسماء بنتِ سلامہ۔ اُمِ

حریت مجد بنتِ یزید حمیریہ۔ غزال بنتِ کسریٰ۔ زینب بنتِ صباح۔ بادیہ بنتِ غیلان ثقفیہ۔ اولادِ ذکور کے نام یہ ہیں۔

سالم اکبر، (اسلام سے پہلے فوت ہو گیا) محمد ابراہیم، حمید، اسماعیل، معن، عمر، زید، عروہ اکبر، سالم اصغر، ابوبکر، عبداللہ، ابوسلمہ عبداللہ اصغر، عبدالرحمٰن، مصعب، سہیل، ابوالابیض، عثمان، عروہ اصغر، یحییٰ، بلال۔

اولادِ اناث کے نام یہ ہیں:

اُمّ القاسم، حمیدہ اَمۃ الرحمان، امۃ الرحمٰن صغریٰ، آمنہ مریم، اُمِ یحییٰ، جویریہ۔

حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ اغنیائے صحابہ میں تھے۔ بے مثال جود و سخا اور انفاق فی سبیل اللہ (جس کا ذکر آگے آتا ہے) کے باوجود اپنے پیچھے جائیداد غیر منقولہ اور نقدی کے علاوہ ایک ہزار اونٹ تین ہزار بکریاں اور سو گھوڑے چھوڑے جو بقیع میں چرتے تھے۔ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ اور ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ ان کی چاروں بیویوں نے جائیداد متروکہ کے آٹھویں حصے سے اسی ۸۰ اسی ۸۰ ہزار دینار پائے۔ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ سونے کے ڈلے اتنے بڑے بڑے تھے کہ کدال سے کاٹے گئے اور لوگوں کے ہاتھوں میں کاٹتے کاٹتے آبلے پڑ گئے۔ وفات سے پہلے پچاس ہزار دینار اور ایک ہزار گھوڑے راہِ خدا میں وقف کیے۔ ان کے علاوہ اصحابِ بدر میں سے ہر ایک کے لیے چار چار سو دینار کی وصیّت کی۔ ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ اس وقت ایک سو بدری صحابہ بقیدِ حیات تھے۔ ان سب نے بخوشی اس وصیّت سے فائدہ اٹھایا۔ ان میں خود امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ اُمہات المومنین رضی اللہ عنہن کے لیے ایک باغ کی وصیت کی جو چار لاکھ درہم میں فروخت ہوا۔

حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ اور بعض دوسرے اہلِ سیَر نے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کا حلیہ اس طرح بیان کیا ہے:

چھریرا بدن، قد بلند و بالا، رنگ سرخ و سپید، ناک اونچی اور لانبی، فراخ چشم، پلکیں

گھنی اور بڑی، ریش دراز، سر پر کانوں سے نیچے تک گھونگھر دار زُلفیں، نہایت خوبرو، ہتھیلیاں پُر گوشت، کلائیاں گٹھی ہوئی، انگلیاں موٹی، غزوۂ اُحُد میں زخم آنے کی وجہ سے پاؤں میں لنگ تھا۔

ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ''اُسد الغابہ'' میں حضرت قبیصہ بن جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس گیا ان کے داہنی جانب ایک اور شخص بیٹھے تھے قرصِ نقرہ جیسے سفید و روشن تھے وہ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ تھے۔

(۸)

سیّدنا حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی ذاتِ گرامی گوناگوں اوصاف و محاسن اور فضل و کمال کی جامع تھی۔ اہلِ سِیَر نے ان کے علم و فضل، اخلاص فی الدین تحملِ شدائد حُبِّ رسول ﷺ، شوقِ جہاد، انفاق فی سبیل اللہ، ایثار، صدق و صفا، خوفِ خدا، وفائے عہد، رقتِ قلب، اصابتِ رائے شغفِ عبادت، تقویٰ، انکسار، امانت، امر بالمعروف، عیادتِ مرضیٰ، ہمت اور شجاعت کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ ان کے علم و فضل کا اندازہ واقدی کی اس روایت سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ ان بزرگوں میں تھے جو عہدِ رسالت میں فتویٰ دیتے تھے۔ ان سے بہت سے صحابہ و تابعین نے متعدد احادیث روایت کی ہیں۔ راویوں میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں۔ حافظ ابنِ حجر نے ''اصابہ'' میں لکھا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ ان سے روایت کی تو ان کے بارے میں یہ الفاظ فرمائے ''العدل الرضیٰ'' حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ سے مروی احادیث میں جزیہ مجوس (یعنی مجوسیوں سے جزیہ روا ہے)' حدِ خمر (شرابی کی سزا اسی درّے) مقامِ طاعون (یعنی طاعون زدہ جگہ سے نہ بھاگنا چاہیے اور نہ وہاں جانا چاہیے) سے متعلق حدیثیں فقہ میں ممتاز درجہ رکھتی ہیں۔ ان کے طلبِ علم کی یہ کیفیت تھی کہ باوجود اپنی کبرسنی اور جلالتِ قدر کے عہدِ فاروقی میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما جیسے صغیر السن صحابی سے بھی علمی استفادہ کیا۔ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ ایک خوشحال گھرانے

سے تعلق رکھتے تھے اور گھر میں ہر طرح کی راحت میسّر تھی۔ لیکن انہوں نے تمام نتائج و عواقب سے بے پرواہو کر اس وقت اسلام قبول کیا جب ایسا کرنا مصائب و آلام کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ انھوں نے تین مرتبہ ہجرت کی سعادت حاصل کی اور راہِ حق میں ہر قسم کی مصیبتیں برداشت کیں۔

حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو سرکارِ دو عالم ﷺ سے والہانہ محبت تھی، غزوات میں تو وہ ذاتِ رسالت مآب ﷺ پر اپنی جان فدا کرنے کے لیے آپ ﷺ کے ہمرکاب رہتے ہی تھے۔ ویسے بھی جب موقع ملتا بارگاہِ رسالت ﷺ میں حاضر ہو کر فیضانِ نبوی سے بہرہ یاب ہوتے تھے۔ مسندِ احمد، کنز العمال، ترمذی اور مستدرکِ حاکم وغیرہ میں خود حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم اصحابِ رسول اللہ ﷺ میں سے پانچ یا چار آدمی آپ ﷺ سے جُدا نہ ہوتے تھے تا کہ کسی وقت آپ ﷺ کو کوئی ضرورت پیش آئے تو اس کو پورا کر سکیں۔ ایک دن میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ ﷺ مکان سے باہر نکلے میں آپ کے پیچھے ہو لیا۔ آپ ﷺ بلندی پر واقع ایک باغ میں داخل ہوئے۔ وہاں آپ ﷺ سربسجود ہو گئے اور اتنا طویل سجدہ کیا کہ مجھے ڈر پیدا ہوا کہ شاید اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی روح قبض کر لی ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں رونے لگا۔ حضور ﷺ نے اپنا سر مبارک اٹھایا اور فرمایا، عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ تجھے کیا ہو گیا؟ میں نے عرض کیا، یارسول اللہ آپ نے اتنا طویل سجدہ کیا کہ میں سمجھا آپ ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو گئے ہیں اس لیے مجھ پر گریہ طاری ہو گیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: جبریل علیہ السلام نے مجھ سے کہا کہ کیا میں آپ کو بشارت نہ دے دوں کہ اللہ عزّ وجل نے فرمایا کہ جو آپ پر درود بھیجے گا میں اس پر درود بھیجوں گا اور جو آپ پر سلام بھیجے گا میں اس پر سلامتی نازل کروں گا۔ میرا یہ طویل سجدہ سجدہ شکر تھا۔

نہایت رقیق القلب تھے اور اثر پذیر طبیعت پائی تھی۔ کبھی پُرتکلف کھانا سامنے آتا تو چشم پُر آب ہو کر فرماتے۔ ''رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے اہل وعیال کی تمام عمر

پیٹ بھر جو کی روٹی بھی نہ ملی۔" صحیح بخاری میں ہے کہ ایک دفعہ روزہ سے تھے شام کو کھانا سامنے آیا تو مسلمانوں کا گزشتہ فقر و فاقہ یاد کر کے فرمایا، مُصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ قتل ہوئے وہ مجھ سے بہتر تھے، ان کو ایک چادر کا کفن دیا گیا سر چھپایا جاتا تھا تو پاؤں کھل جاتے تھے اور پاؤں چھپائے جاتے تھے تو سر برہنہ ہو جاتا تھا۔ حمزہ رضی اللہ عنہ قتل ہوئے وہ بھی مجھ سے بہتر تھے۔ پھر ہمارے لیے دنیا اس قدر بچھا دی گئی کہ ہم کو خوف ہے کہ ہمارے نیک اعمال کا بدلہ آخرت کی بجائے دنیا میں ہی نہ دے دیا گیا ہو۔ پھر رونا شروع کر دیا اور کھانا چھوڑ دیا۔

اپنے عہد کا اس قدر پاس تھا کہ غزوۂ بدر کے موقع پر اُمیہ بن خلف جیسے نابکار کو بچاتے ہوئے زخمی ہو گئے۔

حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کے صدق و عفاف کے سب لوگ معترف تھے۔ مسندِ احمد حنبل رحمۃ اللہ علیہ میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی عدالت میں دعویٰ کیا کہ میں نے آلِ عمر رضی اللہ عنہ سے ایک قطعہ زمین خریدا جو عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ نے بطور جاگیر عطا فرمایا تھا لیکن عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس قطعہ زمین میں ان کی زمین بھی آ گئی ہے جو انہیں رسول اللہ ﷺ نے عمر رضی اللہ عنہ کی جاگیر کے ساتھ مرحمت فرمائی تھی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ اپنے موافق یا مخالف جو شہادت بھی دیں گے قبول کی جائے گی۔

حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کی امانت اور تقویٰ پر امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اس قدر اعتماد تھا کہ جب امہات المومنین رضی اللہ عنہن حج کے لیے گئیں تو انہوں نے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو اُن کا نگران مقرر کیا۔

زبیر بن بکار رحمۃ اللہ کا قول ہے کہ عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی ازواج پر امین تھے۔

حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ نے "اصابہ" میں لکھا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ سفرِ حج میں

ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے لیے پردہ اور سواری کا انتظام کرتے تھے اور جہاں پڑاؤ ہوتا تھا وہاں نہایت احتیاط اور اہتمام کے ساتھ اتارتے تھے۔

ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ''اُسد الغابہ'' میں اور امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ''جامع الصغیر'' میں اُمّ المومنین حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی ازواج سے فرماتے تھے کہ جو شخص میرے بعد تمہاری خدمت کرے گا وہ صادق اور سخی ہوگا۔ الٰہی عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو سبیل (جنت کا ایک چشمہ) سے سیراب کر۔

گویا خود ذاتِ رسالت مآب ﷺ نے اشارہ فرمادیا کہ میرے وصال کے بعد عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ ازواجِ مطہرات کی خدمت کریں گے اور وہ صادق اور سخی ہیں۔

حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو اپنے اوصاف ومحاسن کی بدولت بارگاہِ نبوّت میں درجہ تقرب حاصل ہوگیا تھا۔ کئی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے متعدد موقعوں پر کاشانہ اقدس سے باہر جاتے ہوئے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو اپنی معیت کا شرف بخشا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے تو حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بھی آپ ﷺ کے ساتھ تھے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ جب حضور ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی علالت شروع ہوئی تو آپ ﷺ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر عوالی مدینہ میں حضرت ابوسیف رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے جن کی اہلیہ حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی دایہ تھیں۔ آپ ﷺ نے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کو اٹھا کر بوسہ لیا اور سونگھا۔ جس وقت ان کی آخر سانس نکلنے لگی، تو حضور ﷺ آبدیدہ ہوگئے۔ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:

''یارسول اللہ ﷺ آپ روتے ہیں؟''

ارشاد ہوا ''اے ابنِ عوف یہ رحمت ہے۔''

حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے اپنے بات کا اعادہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''آنکھیں آنسو بہاتی ہیں، دل غمگین ہے لیکن ہم وہی کہیں گے جو ہمارے
رَبّ کی مرضی ہو۔ اے ابراہیم ہم تیرے فراق میں بہت غمگین ہیں۔''

ابنِ عساکر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے درمیان کسی بات پر تلخ کلامی ہوگئی۔ (حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو کوئی سخت بات کہدی) سرورِ عالم ﷺ کو اطلاع ہوئی تو آپ ﷺ کو حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی بات ناگوار گزری (ایک اور روایت کے مطابق حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے بارگاہِ رسالت میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی شکایت کی)۔ حضور ﷺ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو بُلا بھیجا اور ان سے فرمایا:

''خالد تم میرے بدری صحابہ میں سے کسی کو تکلیف نہ دو کیونکہ تم میں سے کوئی شخص کوہِ اُحد کے برابر سونا خرچ کرے تو ان کے (اہلِ بدر کے) نصف کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔''

یہ واقعہ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ، طبرانی رحمۃ اللہ علیہ اور بعض دوسرے علماء نے بھی بیان کیا ہے تاہم تفصیلات اور الفاظ میں کسی قدر اختلاف ہے۔

حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کے ایثارِ نفس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ اصحابِ شوریٰ میں چھ بزرگ تھے جن میں دو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مؤید تھے اور ایک نے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کا نام پیش کیا تھا۔ لیکن وہ حقِ خلافت سے یکسر دست بردار ہوگئے اور صاف کہہ دیا۔

لست بالذی انا فسکم علیٰ ھذا الامر

(میں وہ نہیں ہوں جو تم سے اس امر (خلافت پر) منافست کروں گا)

حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نہایت زیرک اور دور اندیش تھے اور ان کی معاملہ فہمی اور اصابتِ رائے سب کے نزدیک مسلّم تھی یہی سبب تھا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ نے انہیں اپنا مشیر بنایا تھا ان کے مشورے نہایت صائب اور خیر

خواہی اُمت کے جذبے سے مملو ہوتے تھے۔ بقول ابنِ جریر طبری حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے وفات سے پہلے ان کے بارے میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے:

''عبد الرحمٰن رضی اللہ عنہ نہایت صائب الرائے ہیں ان کی رائے معقول اور درست ہوتی ہے خدا کی طرف سے (غلط رائے سے) ان کی حفاظت کی جاتی ہے۔ (اگر وہ خلیفہ ہوں) تو تم ان کی بات ماننا۔''

عبادت سے بے انتہا شغف تھا، نماز نہایت خشوع وخضوع سے پڑھتے تھے۔ خصوصاً ظہر کے فرضوں سے پہلے دیر تک نفل پڑھتے رہتے تھے۔ کثرت سے روزے رکھتے تھے اور حجِ بیت اللہ کی سعادت بھی متعدد بار حاصل کی تھی۔

(۹)

حضرت عبد الرحمٰن رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے اتنی کثیر دولت عطا کی تھی کہ ان کا شمار چوٹی کے اغنیائے صحابہ رضی اللہ عنہم میں ہوتا تھا وہ ایک باہمت اور کامیاب تاجر تھے اور دولت ان پر مُن کی طرح برستی تھی۔ مکّے سے خالی ہاتھ آئے تھے لیکن جب ان کے انصاری بھائی حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ نے اپنا آدھا مال پیش کیا تو انہوں نے اس کے لے نے سے معذرت کر دی اور ان کو دعا دیتے ہوئے یہ درخواست کی کہ مجھے بازار کا راستہ بتا دو۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے کاروبار کو اتنی ترقی دی کہ ان کا تجارتی مال سینکڑوں اونٹوں پر لد کر باہر جاتا تھا اور اسی طرح باہر سے آتا تھا۔ حافظ ابنِ عبد البر رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ تجارت کے علاوہ وہ زراعت بھی وسیع پیمانے پر کرتے تھے حضور ﷺ نے انہیں خیبر میں ایک وسیع جاگیر عطا فرمائی تھی اس کے علاوہ انہوں نے خود بھی بہت سی اراضی خریدی تھی۔ جُرف میں ان کی مملوکہ اراضی میں بیس اونٹ آب پاشی کا کام کرتے تھے۔ حضرت عبد الرحمٰن رضی اللہ عنہ مال و دولت کے اعتبار سے ہی غنی نہ تھے بلکہ دل کے بھی غنی تھے اور اپنی دولت بے دریغ راہِ خدا میں لٹاتے رہتے تھے ان کے انفاق فی سبیل اللہ اور جود وسخا کے بے شمار واقعات کتبِ سیَر میں موجود ہیں ان کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

انہیں کیسا کشادہ دستِ کرم اور کتنا جذبہ خیر عطا کیا تھا۔

ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ''اُسد الغابہ'' میں لکھا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے دوبار چالیس چالیس ہزار دینار راہِ خدا میں وقف کیے۔ جہاد کے لیے پانچ سو گھوڑے اور پانچ سو اونٹ حاضر کیے۔ سورۂ براۃ کی نزول کے موقع پر چار ہزار درہم پیش کیے مستدرکِ حاکم میں حضرت اُمِ بکر رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اپنی ایک زمین چالیس ہزار دینار میں بیچی اور یہ ساری رقم فقراء نبی زہرہ اہلِ حاجت اور اُمہات المومنین رضی اللہ عنہم میں تقسیم کر دی۔ جب اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس حِصّہ پہنچا تو انہوں نے دریافت کیا کہ یہ مال کس نے بھیجا ہے، انہیں بتایا گیا کہ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے زمین بیچی ہے اور مال تقسیم کیا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ میرے بعد تم پر سوائے بھلے لوگوں کے اور کوئی مہربانی نہ کرے گا۔ اللہ تعالیٰ ابنِ عوف رضی اللہ عنہ کو جنت کی سبیل سے سیراب کرے۔

مسندِ احمد رحمۃ اللہ علیہ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اپنے گھر میں تھیں انہوں نے شور سُنا دریافت کیا، یہ کیسا غُل ہے، لوگوں نے کہا، عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے سامانِ تجارت کا قافلہ شام سے آیا ہے اس میں ہر قسم کا سامان ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں نے حضور ﷺ سے سنا تھا کہ عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ جنت میں گھسٹتے ہوئے داخل ہوں گے۔ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ تک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بات پہنچی تو انہوں نے پورا قافلہ تجارت (صرف سامان ہی نہیں بلکہ اونٹ اور پالان تک) راہِ خدا میں وقف کر دیا۔

ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے ایک جائیداد (بن نضیر والی) چالیس ہزار دینار پر کیدمہ کے ہاتھ فروخت کی اور یہ تمام رقم ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہم میں تقسیم کر دی۔ ایک اور موقع پر ایک زمین چالیس ہزار دینار میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ فروخت کی اور اسے بھی راہِ خدا میں لٹا دیا۔

امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ اور حافظ ابونعیم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے (اپنی زندگی میں) تیس ہزار غلام اور لونڈیاں آزاد کیں۔ ایک روایت میں ہے کہ وہ ایک ہی دن میں تیس تیس غلام آزاد کر دیتے تھے۔

خاص خاص موقعوں پر خطیر رقمیں راہِ خدا میں صرف کرنے کے علاوہ وہ عام صدقات و خیرات کا سلسلہ بھی متواتر جاری رکھتے تھے۔ وفات سے پہلے انہوں نے جو وصیت کی اس کی تفصیل اوپر آ چکی ہے۔

کثرتِ مال، غفلت شعاری کے بجائے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کے لیے خشیتِ الٰہی کا سبب بن گئی تھی۔ راہِ خدا میں دل کھول کر خرچ کرنے کے باوجود انہیں ہر وقت یہ فکر دامنگیر رہتی تھی کہ یہ مال و دولت آخرت میں کہیں نقصان کا باعث نہ ہو۔ حافظ ابنِ عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے ''استیعاب'' میں لکھا ہے کہ ایک بار انھوں نے اُمّ المومنین حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں عرض کی اُمّ المومنین مجھے اندیشہ ہے کہ کثرتِ مال کہیں (آخرت میں) مجھے تباہ و برباد نہ کر دے۔ انہوں نے فرمایا، بیٹا اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہا کرو۔

مختصر یہ کہ سیّدنا حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی زندگی کے کسی بھی پہلو کو لیں وہ ایک ایسی قدآور اور مثالی شخصیت نظر آتے ہیں کہ ملّت اسلامیہ بجا طور پر ان پر ناز کر سکتی ہے اور ان کے نقشِ قدم پر چل کر فوز و فلاح کی منزل تک پہنچ سکتی ہے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

حضرت طلحۃ الخیر رضی اللہ عنہ ...... صاحبِ اُحُد

(۱)

رحمتِ دوعالم ﷺ ایک دن اپنے چند جاں نثاروں کے حلقے میں تشریف فرما تھے کہ ایک اعرابی (دیہاتی آدمی) حاضرِ خدمت ہوئے اور عرض کیا:۔

''یارسول اللہ قرآنِ کریم کی آیت من المؤمنین رجالٌ صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ فمنھم من قضٰی نحبہ[1] کا مصداق کون ہے (یا کون لوگ ہیں؟)''

رحمتِ عالم ﷺ نے اعرابی کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ انہوں نے اپنا سوال دہرایا لیکن حضور ﷺ پھر بھی خاموش رہے۔ اتنے میں میانہ قد، ورزشی بدن اور سرخ و سفید رنگ کے ایک خوبرو آدمی بارگاہِ رسالت میں وارد ہوئے۔ حضور ﷺ معاً سائل کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

''یہ ہے وہ شخص جو اس آیت کا مصداق ہے۔ (یا ان لوگوں میں سے ایک ہے جن کی شان میں یہ آیت نازل ہوئی ہے)''

یہ صاحبِ رسول جن کو یہ عظیم شرف حاصل ہوا کہ خود سیّد المرسلین فخرِ موجودات ﷺ نے انہیں آیت من قضٰی نحبہ کا مصداق ٹھہرایا، سیّدنا حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ تھے۔

(۲)

سیّدنا ابو محمد طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کا شمار نہایت عظیم المرتبت صحابہ رضی اللہ عنہم میں ہوتا

---

[1] (ایمان والوں میں سے ایسے لوگ موجود ہیں جنھوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا ہے ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا ہے اور کوئی وقت آنے کا منتظر ہے۔)

ہے۔ وہ ان دس اصحاب (عشرہ مبشّرہ) میں سے ہیں جن کو ساقیٔ کوثر ﷺ نے نام لے کر جنتی ہونے کی بشارت دی۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کا تعلق قریش کے خاندان بنو تیم سے تھا۔ شجرۂ نسب یہ ہے:

طلحہ رضی اللہ عنہ بن عُبَیْد اللہ بن عثمان بن عمرو بن کعب بن سعد بن تَیم بن مُرّہ بن کعب بن لُوی

مُرّہ بن کعب پر ان کا نسب نامہ رسولِ اکرم ﷺ سے مل جاتا ہے اور عمرو بن کعب پر حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ سے۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے دادا عثمان بن عمرو حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ کے دادا عامر بن عمرو کے سگے بھائی تھے۔

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے والد عبید اللہ نے اسلام کا زمانہ نہیں پایا البتہ ان کی والدہ صعبہ رضی اللہ عنہا (بنتِ عبداللہ حضرمی بن ضماد بن سلمی بن اکبر) نے طویل زندگی پائی۔ انہوں نے اسلام قبول کیا اور شرفِ صحابیت سے بہرہ ور ہوئیں۔ مشہور صحابی حضرت علاء بن الحضرمی رضی اللہ عنہ ان کے بھائی اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے ماموں تھے۔

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، سرورِ عالم ﷺ کی بعثت سے تقریباً چودہ پندرہ برس پہلے پیدا ہوئے۔ لڑکپن ہی میں تجارت کا شغل اختیار کر لیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں نہایت صالح فطرت سے نوازا تھا۔ سرورِ کونین ﷺ نے دعوتِ حق کا آغاز فرمایا تو اس پر لبیک کہنے والے اوّلین سعید الفطرت اصحاب میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ وہ ان آٹھ اصحاب میں سے ایک ہیں جو سب سے پہلے شرفِ ایمان سے بہرہ ور ہوئے۔ اگرچہ بعض علماء نے اس روایت کو تسلیم کرنے میں تامّل کیا ہے لیکن اس بات سے کسی کو انکار نہیں کہ وہ بعثتِ نبوی کے ابتدائی زمانے میں سعادت اندوزِ اسلام ہوئے اور اس میں ان کے ہم قبیلہ، بزرگ حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ کی تبلیغ و تلقین کا بڑا عمل دخل تھا۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کے سلسلے میں ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ، امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ اور ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دلچسپ روایت خود حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی زبانی نقل کی ہے وہ کہتے

ہیں کہ میں (بعثت کے ابتدائی زمانے میں بغرضِ تجارت) بصریٰ (شام) گیا۔ وہاں ایک صومعہ میں ایک راہب کو دیکھا جو لوگوں سے پوچھ رہا تھا کہ آج کل مکہ سے بھی کوئی شخص آیا ہے میں نے کہا، ہاں میں وہیں سے آ رہا ہوں، راہب پوچھنے لگا کہ احمد نبی ﷺ ظاہر ہو چکے ہیں؟ میں نے کہا، کون احمد ﷺ؟ راہب نے کہا، احمد ﷺ بن عبداللہ بن عبدالمُطّلِب۔ یہی ان کے ظہور کا زمانہ ہے وہی دنیا میں آخری نبی ہیں، تم واپس جا کر بلا تاخیر ان کی بیعت کر لینا۔ میں بصریٰ سے مکہ واپس آیا اور لوگوں سے پوچھا کہ میری غیر حاضری میں کوئی اہم واقعہ پیش آیا ہے؟ لوگوں نے کہا کہ محمد ﷺ بن عبداللہ نے نبوّت کا دعویٰ کیا ہے اور ابنِ ابی قحافہ (حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ) نے ان کی پیروی اختیار کر لی ہے۔ میں یہ سُن کر ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور ان سے پوچھا، کیا آپ نے محمّد ﷺ کی متابعت اختیار کر لی ہے؟ انہوں نے کہا، ہاں وہ حق کی دعوت دیتے ہیں تم بھی یہ دعوت قبول کر لو۔ اب میں جو کچھ راہب سے سنا تھا انہیں بتایا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور مجھے ساتھ لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ میں نے آپ ﷺ سے درخواست کی کہ مجھے بھی اپنے دین میں داخل کر لیجئے۔ آپ ﷺ نے میری درخواست قبول فرمالی اور میں نعمتِ ایمان سے بہرہ ور ہو گیا۔

کتبِ سِیَر میں متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ قبولِ اسلام کے بعد دوسرے فرزندانِ توحید کی طرح حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو بھی کفارِ مکہ کے ظلم و ستم کا نشانہ بننا پڑا۔ اس وقت تک ان کی والدہ اسلام نہیں لائی تھیں وہ بھی بیٹے کے قبولِ اسلام پر سخت برافروختہ ہوئیں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ''تاریخ الصغیر'' میں حضرت مسعود بن خراش رضی اللہ عنہ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ ہم صفا اور مروہ کے درمیان چکر لگا رہے تھے، ہم نے دیکھا کہ بہت سے لوگ ایک نوجوان کو کھینچتے ہوئے لے جا رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ یہ معاملہ کیا ہے؟ لوگوں نے کہا کہ طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ بے دین ہو گیا ہے۔ ایک عورت اس نوجوان کے پیچھے پیچھے غرّاتی ہوئی اور گالیاں دیتی ہوئی جا رہی تھی، میں نے پوچھا یہ عورت کون ہے،

لوگوں نے کہا کہ یہ اس کی ماں صعبہ بنتِ حضرمی ہے۔

حافظ ابنِ کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ''البدایہ والنہایہ'' میں لکھا ہے کہ نوفل بن خویلد عدویہ جو شیرِ قریش کے لقب سے مشہور تھا، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام پر سخت غضب ناک ہوا۔ اور اس نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ دونوں کو پکڑ کر ایک رسی میں باندھ دیا اسی لیے ان دونوں حضرات کو قرینین (یعنی ساتھی) کہتے ہیں۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضور ﷺ کو ان کی مظلومی کی خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے دُعا مانگی: ''الٰہی ہم لوگوں کو ابنِ عدویہ کے شرّ سے بچا۔

ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ اور امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ جب حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کی اطلاع ان کے چچا اور بڑے بھائی (عثمان بن عبید اللہ) کو ہوئی تو انہوں نے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ دونوں کو رسی سے باندھ کر بہت پٹیا تا کہ اس تشدّد سے دینِ اسلام کو چھوڑ دیں لیکن کیا مجال کہ ان کے پائے استقامت میں ذرہ برابر لغزش آئی ہو۔

(اُسد الغابہ..... مستدرک حاکم)

ایک روایت میں ہے مکہ میں سرورِ عالم ﷺ نے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کا بھائی چارہ اپنے پھوپھی زاد بھائی حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ سے کرا دیا۔ (ایک دوسری روایت میں مکہ میں ان کا مواخاتی بھائی حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کو بتایا گیا ہے)......

(اُردو دائرہ معارفِ اسلامیہ)

(۳)

جب کفّار کے تمام حربے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو دینِ حق سے برگشتہ کرنے میں ناکام ہو گئے تو انہوں نے اُن کو اپنے حال پر چھوڑ دیا اور وہ حسبِ سابق اپنے تجارتی مشاغل میں منہمک ہو گئے۔ ایک روایت میں ہے کہ جس زمانے میں رحمتِ عالم ﷺ نے مکہ سے ہجرت فرمائی حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اپنے کاروبار کے سلسلے میں شام گئے ہوئے

تھے۔ اِدھر حضور ﷺ مکہ سے عازمِ مدینہ ہوئے اُدھر حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اپنے تجارتی قافلے کے ساتھ شام سے مکہ کے لیے روانہ ہوئے۔ مدینہ پہنچے تو وہاں کے لوگوں کو بے تابی سے حضور ﷺ کا انتظار کرتے دیکھا۔ وہاں سے مکہ کی جانب روانہ ہوئے تو راستے میں سرورِ عالم ﷺ اور آپ ﷺ کے رفقاء سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے سرورِ عالم ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں کچھ شامی کپڑے پیش کیے اور اہلِ مدینہ کے بے تابانہ انتظار کا حال بتایا پھر اپنے قافلے کے ساتھ مکہ چلے گئے۔ بالکل اسی قسم کی روایت صحیح بخاری میں حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی ملتی ہے کہ وہ بھی تاجر مسلمانوں کے ایک قافلے کے ساتھ شام سے واپس آ رہے تھے اثنائے راہ میں سرورِ عالم ﷺ سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے حضور ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق کی خدمت میں کچھ سفید کپڑے تحفۃً پیش کیے۔ معلوم نہیں یہ ایک ہی واقعہ ہے یا دو مختلف واقعے ہیں۔ (یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ دونوں ایک ہی تجارتی قافلے میں ہوں اور یہ بھی کہ دو مختلف قافلوں میں ہوں)۔

مکہ واپس آ کر حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے اپنے تجارتی کاروبار کو سمیٹ دیا اور چند دن بعد اپنی والدہ صعبہ بنت الحضرمی رضی اللہ عنہا کے ساتھ (جو اس وقت شرفِ ایمان سے بہرہ ور ہو چکی تھیں) مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کر گئے۔ مدینہ منورہ میں سیدنا حضرت اسعد بن زُرارہ انصاری رضی اللہ عنہ نے انہیں اپنا مہمان بنایا۔ چند ماہ بعد سرورِ عالم ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے مابین مواخاۃ قائم کرائی تو حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو حضرت اُبی بن کعب انصاری رضی اللہ عنہ کا اسلامی بھائی بنایا۔

(۴)

رمضان المبارک ۲ ہجری میں حق و باطل کا معرکہ اوّل ''غزوۂ بدر الکبریٰ'' پیش آیا۔ جامع صحیح میں اصحابِ بدر کی جو فہرست دی گئی ہے اس میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کا نام موجود نہیں ہے۔ اہلِ سِیَر نے اس سلسلے میں دو روایتیں بیان کی ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ

اس زمانے میں وہ تجارتی اغراض کے لیے شام گئے ہوئے تھے۔ بعض دوسروں نے لکھا ہے کہ سرورِ عالم ﷺ نے انہیں اکیلے یا حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کے ساتھ مشرکین کی خبریں لانے کے لیے شام کی طرف بھیجا تھا۔ جب وہ واپس آئے تو لڑائی ختم ہو چکی تھی تاہم حضور ﷺ نے مالِ غنیمت میں ان کا حصہ بھی لگایا اور یہ بھی فرمایا کہ تم جہاد کے ثواب سے محروم نہ رہو گے۔ دونوں قسم کی روایتوں میں ایک بات مشترک ہے وہ یہ کہ دوسرے مجاہدین کی طرح حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو بھی بدر کے مالِ غنیمت سے حصہ ملا۔ گویا وہ کسی نہ کسی حیثیت سے غزوہ میں شریک تھے کیونکہ مالِ غنیمت کے مستحق وہی سمجھے جاتے تھے جو کسی نہ کسی طور پر لڑائی میں شریک ہوئے ہوں۔ دشمن کا تجسس بھی لڑائی ہی کا حصہ ہوتا ہے اس لیے انہیں بھی غزوہ میں شریک سمجھا گیا۔ اگر وہ تجارت کے لیے شام گئے ہوتے تو مالِ غنیمت کے حقدار نہ ٹھہرائے جاتے اس لیے تجارتی مقاصد کے لیے ان کے شام جانے کی روایت مشکوک ہے۔

۳ ہجری میں جنگِ اُحد پیش آئی تو حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اس میں بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ شریک ہوئے۔ اس لڑائی میں انہوں نے سرورِ عالم ﷺ کی حفاظت کی خاطر اپنی جان کی بازی لگا دی اور سرفروشی اور فدویت کا ایسا محیّر العقول مظاہرہ کیا کہ اس جنگ کے بطلِ خاص (ہیرو) متصوّر ہوئے۔ لڑائی کے ابتدائی دَور میں مسلمانوں نے کفّار کو شکست دے دی اور پھر مالِ غنیمت اکٹھا کرنے میں مشغول ہو گئے۔ بدقسمتی سے درّہ عینین پر متعین تیراندازوں میں سے بھی بیشتر نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور مالِ غنیمت سمیٹنے میں مصروف ہو گئے۔ اسی موقع پر کفّار کے ایک گھڑ سوار دستے نے پہاڑ کا چکر کاٹ کر اس درّے کے راستے مسلمانوں پر حملہ کر دیا اور ان کی صفیں درہم برہم کر دیں۔ مزید ستم یہ ہوا کہ سرورِ عالم ﷺ کی شہادت کی خبر مشہور ہو گئی اس سے بہت سے مسلمان بددل ہو گئے۔ اُدھر حضور ﷺ میدانِ جنگ میں کوہِ استقامت بن کر کھڑے تھے اور کچھ مہاجرین اور انصار جو آپ ﷺ کے قریب تھے، آگے پیچھے دائیں بائیں ہر طرف سے

آپ ﷺ کو کفار کے حملوں سے بچا رہے تھے۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ بھی انہی جانبازوں میں تھے۔ کفار بار بار ذاتِ رسالت مآب ﷺ پر نرغہ کرتے تھے لیکن شمعِ رسالت ﷺ کے یہ پروانے سر دھڑ کی بازی لگا کر ان کو پیچھے دھکیل دیتے تھے یا اسی کوشش میں اپنی جان قربان کر دیتے تھے۔ تین چار موقعے ایسے آئے کہ کفار نے حضور ﷺ پر نرغہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا، کوئی ہے جو ان کو روکے؟ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے ہر موقع پر آگے بڑھ کر عرض کیا، یا رسول اللہ میں حاضر ہوں، لیکن کچھ دوسرے جانباز پہل کر گئے اور اپنے آقا و مولا ﷺ کو مشرکین کے واروں سے بچاتے ہوئے خلعتِ شہادت سے سرفراز ہو گئے۔ پھر ایک ایسا موقع آیا کہ دوسرے فدائیانِ رسول ﷺ اور حضور ﷺ کے درمیان کفار حائل ہو گئے اور صرف حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے قریب رہ گئے۔ حضور ﷺ کو شدید خطرے میں دیکھ کر حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ پر پروانہ وار نثار ہونے کا عزم بالجزم کر لیا۔ جسم و جان سے ان کی تمام تر محبت ایمان کی محبت میں بدل گئی اور وہ دائیں بائیں آگے پیچھے ہر طرف سے آنے والے تیروں، نیزوں، تلواروں اور پتھروں کو اپنے جسم پر روکنے لگے۔ وہ زخم پر زخم کھا رہے تھے لیکن حضور ﷺ کے سامنے سے ہٹنے کا تصور بھی ان کے دل میں نہیں آتا تھا۔ فی الحقیقت انہوں نے مہبطِ وحی ﷺ کو بچانے کی خاطر اپنے پورے جسم کو قیمہ کرا لینے کا والہانہ فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ خون میں نہا چکے تھے اور بیسوں زخموں نے ان کے جسم کو چھلنی کر دیا تھا لیکن سیّد المرسلین ﷺ پر جان قربان کرنے کی تڑپ نے انہیں ایسی قوت بخش دی تھی جو انہیں گرنے نہیں دیتی تھی۔ ایک روایت کے مطابق اس وقت ان کی زبان پر یہ رجز جاری تھا:

نحن حماة غالب و مالك   نذب عن رسولنا المبارك

نضرب عنه القوم في المعارك   ضرب صفاح الكوم في المبارك

(ہم غالب آنے والے اور قدرت رکھنے والے محافظ ہیں۔ ہم اپنے رسولِ مبارک ﷺ سے دشمنوں کو ہنکاتے ہیں...... معرکوں میں مشرکین کو مار کر

آپ ﷺ سے ہٹاتے ہیں۔ جس طرح بیچنے والا آدمی موٹی اونٹنی کو باندھنے کی جگہ پر مارتا ہے) (ابن عساکر)

اسی اثناء میں ایک مشرک نے حضور ﷺ کے قریب پہنچ کر تلوار کا وار کیا۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے تڑپ کر اسے اپنے ہاتھ پر لیا۔ ان کی انگلیاں شہید ہو گئیں (یا بروایت دیگر دو انگلیوں کی نسیں کٹ گئیں) اسی لمحے حضور ﷺ ایک طرف ہو گئے اور گزند سے محفوظ ہو گئے۔

حافظ ابنِ کثیر رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ اس موقع پر حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی زبان سے بے اختیار حس (یعنی آہ) کا لفظ نکل گیا۔ اس کے برعکس ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ان کی زبان سے حسن (یعنی خوب ہوا) کا لفظ نکلا۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم اس لفظ کے بجائے بسم اللہ کہتے تو تم کو ملائکہ اٹھا لیتے اور سب لوگوں کے سامنے تمہیں آسمان پر لے جاتے۔

غرض حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ دیر تک جذب و جنون اور وارفتگی کے عالم میں ذاتِ رسالت مآب ﷺ کی حفاظت کا فریضہ ادا کرتے رہے یہاں تک کہ کچھ دوسرے سرفروش بھی ان کی مدد کے لیے آ پہنچے اور سب نے مل کر مشرکین کو پرے ہٹا دیا۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اگرچہ زخموں سے چُور چُور ہو چکے تھے لیکن ان کی ہمت جوان تھی۔ جامع ترمذی میں ہے کہ حضور ﷺ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنا چاہتے تھے لیکن جسم اقدس پر دوہری زرہ تھی (اور پھر آپ ﷺ زخمی بھی تھے) اس لیے چڑھنے میں دِقّت محسوس ہو رہی تھی۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ (اپنے زخموں کو بھول کر) آگے بڑھے اور آپ ﷺ کو اپنی پیٹھ پر سوار کر کے پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے اس موقع پر لسانِ رسالت ﷺ سے ارشاد ہوا، طلحہ کے لیے جنت واجب ہو گئی۔

حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ''فتح الباری'' میں لکھا ہے کہ حضرت ابو بکر صِدّیق رضی اللہ عنہ نے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے جسم پر ستّر سے زیادہ زخم شمار کیے۔

بعض روایتوں میں ان کے زخموں کی تفصیل بھی دی گئی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محض ہاتھ پر چوبیس زخم آئے تھے اور یہ ہمیشہ کے لیے شل ہو گیا تھا۔ کل بدن پر تلوار، نیزہ اور تیر کے پچھتر زخم آئے تھے۔ تلوار کی ایک ضرب سے سر بھی شدید زخمی ہو گیا تھا۔

صحیح بخاری (کتاب المغازی) میں قیس بن ابو حازم رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے۔

"رایت ید طلحہ رضی اللہ عنہ شلاء وقیٰ بھا النبی صلی اللہ علیہ وسلم یوم احد"

(میں نے طلحہ کا ہاتھ دیکھا جو شل ہو گیا تھا اس سے انہوں نے غزوۂ اُحد میں نبی ﷺ کی حفاظت کی تھی)۔

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے غزوۂ اُحد میں جس عدیم النظیر جوشِ ایمان، شجاعت و بسالت اور فدا کاری کا مظاہرہ کیا اس کے صلہ میں انہیں دربارِ رسالت سے "خیر" کا عظیم الشان لقب مرحمت ہوا۔ رحمتِ دارین ﷺ نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

"یہ طلحہ نہیں خیر ہے"

ایک روایت میں ہے کہ اس موقع پر رحمتِ عالم ﷺ کے ایماء پر حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے یہ اشعار کہے۔

و طلحة یوم الشعب آسی محمدا ۔۔۔ علی ساعة ضاقت علیه و شقت

یقیه بکفیه الرماح و اسلمت ۔۔۔ اصابعه تحت السیوف فشلت

(اور طلحہ رضی اللہ عنہ نے گھاٹی کے دن محمد ﷺ کی حفاظت کی، ایسے وقت میں آپ ﷺ پر تنگ اور دشوار ہو گیا تھا۔

وہ اپنے ہتھیلیوں کے ذریعے نیزوں سے آپ ﷺ کو بچاتے تھے اور انہوں نے اپنی انگلیاں تلواروں کے نیچے دے دیں جو شل ہو گئیں)۔

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے اُحد کے دن صفحۂ تاریخ پر جو داستانِ وفا رقم کی اس نے انہیں دوسرے تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک نہایت محبوب اور محترم بنا دیا تھا اور وہ ان پر رشک

کیا کرتے تھے۔ سیّدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

''اُحد کا دن، اُحد کا دن نہ تھا سچ پوچھوں تو طلحہ رضی اللہ عنہ کا دن تھا۔''

سیّدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ان کو دیکھ کر فرمایا کرتے تھے:

''اے طلحہ، اے اُحد والے، اے صاحبِ اُحد''

غزوۂ اُحد میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو جو عظیم سعادت نصیب ہوئی تھی وہ اظہارِ تشکر ﷺ کے طور پر خود بھی کبھی کبھی اس کا ذکر فرمایا کرتے تھے۔ صحیح بخاری (کتاب المغازی باب غزوۂ اُحد) میں ان سے مروی ایک حدیث موجود ہے جس میں انہوں نے اس واقعہ کا اجمالی طور پر تذکرہ فرمایا ہے۔

غزوۂ اُحد کے بعد عہدِ رسالت میں پیش آنے والے دوسرے تمام غزوات میں بھی حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے سرورِ کونین ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا اور ہر معرکے میں جانبازی کے جوہر دکھائے۔ بیعتِ رضوان میں بھی موجود تھے۔ فتح مکہ کے بعد غزوۂ حنین میں جب بنو ہوازن کی بے پناہ تیر اندازی سے اکثر مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے وہ اخیر تک میدانِ جنگ میں ڈٹے رہے تا آنکہ دشمن کو شکست ہوگئی۔ غزوۂ تبوک (۹ ھ) کے موقع پر انہوں نے مصارفِ جنگ کے لیے ایک کثیر رقم پیش کی۔ ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ اس موقع پر سرورِ عالم ﷺ نے انہیں ''فیاض'' کے لقب سے نوازا۔ بعض روایات میں ہے کہ وہ دوسرے غزواتِ نبوی کے مصارف کے لیے بھی گرانقدر رقوم پیش کرتے رہتے تھے، ایک غزوے میں عام مسلمانوں کے کھانے کے اخراجات برداشت کیے تھے۔ اپنی اسی دریادلی اور جذبہ خیر کی بدولت ''فیاض'' کے لقب سے نوازے گئے۔

ابنِ ہشام نے ''سیرۃ النبویہ'' میں لکھا ہے کہ غزوۂ تبوک کے موقع پر منافقین نے مسلمانوں میں بددلی پھیلانی چاہی اس مقصد کے لیے وہ مدینہ منورہ سے کچھ فاصلے پر سویلم یہودی کے مکان میں جمع ہو کر منصوبے بناتے تھے۔ سرورِ عالم ﷺ کو ان کی شرارتوں کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ نے ان کی سرکوبی پر حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو مامور فرمایا۔

انہوں نے چند آدمیوں کو ساتھ لے کر سویلم کے مکان کا محاصرہ کر لیا اور اس میں آگ لگا دی اس سے منافقین کے حوصلے پست ہو گئے اور ان کی فتنہ انگیزی کا بڑی حد تک سدِ باب ہو گیا۔

سنہ ۱۰ ہجری میں رحمتِ عالم ﷺ حجۃ الوداع کے لیے مکہ معظّمہ تشریف لے گئے۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ بھی آپ ﷺ کے ساتھ تھے۔ صحیح بخاری میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ:

"رسول اللہ ﷺ اور صحابہ نے حج کا احرام باندھا۔ سوائے رسول اللہ ﷺ اور طلحہ رضی اللہ عنہ کے کسی کے پاس ہدی نہ تھی۔"

(۵)

سنہ ۱۱ ہجری میں رسولِ اکرم ﷺ نے رحلت فرمائی تو حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ فرطِ الم سے نڈھال ہو گئے اور کئی دن تک گوشہ نشین رہے۔ اس اثناء میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مسند نشینِ خلافت ہوئے تو حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے بھی ان کی بیعت کر لی۔ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ ان کو بہت مانتے تھے اور تمام اہم معاملات میں ان سے مشورہ لیتے تھے۔

سنہ ۱۳ ھ میں اپنی وفات سے پہلے انہوں نے منصب خلافت کے لیے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو نامزد کیا تو حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا:

"اے خلیفۃ الرسول عمر کے مزاج میں سختی ہے اور یہ سختی آپ کے مشاہدہ میں بھی کئی بار آ چکی ہے۔ وہ خلیفہ بن گئے تو اللہ ہی جانے وہ مخلوقِ خدا کے ساتھ کیسا برتاؤ کریں گے۔ آپ اس معاملہ میں دوبارہ غور فرمایئے کیونکہ آخرت میں آپ کو اس کی جواب دہی کرنی ہو گی۔"

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "اگر مجھ سے اس بارے میں پوچھا گیا تو میں اللہ کو جواب دوں گا کہ الٰہی میں نے تیرے بندوں پر اس شخص کو امیر کیا ہے جو ان سب

سے زیادہ اچھا ہے۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی یہ رائے کسی ذاتی اختلاف یا خودغرضی پر مبنی نہ تھی بلکہ فی الواقعہ وہ نیک نیتی سے یہ سمجھتے تھے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی سخت مزاجی عامۃ المسلمین کے لیے نا قابل برداشت ثابت ہوسکتی ہے تاہم جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنی رائے پر قائم رہے تو ان کی وفات کے بعد حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے بلا تامّل حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی۔ اور جب انہوں نے اپنے تدبر، فراست اور حسنِ عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ منصبِ خلافت کے لیے ان سے بڑھ کر کوئی موزوں شخص نہیں ہے تو وہ دل و جان سے ان کے حامی اور مددگار بن گئے۔ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے نزدیک بھی حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ بڑی قدر و منزلت کے حامل تھے۔ چنانچہ انہوں نے ان کو مجلسِ شوریٰ کا رکن نامزد کر دیا اور ہمیشہ ان کے مشوروں کو خاص وزن دیتے رہے۔

اواخرِ ۲۳ھ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا واقعہ شہادت پیش آیا۔ وفات سے پہلے انہوں نے ان چھ اصحاب کو خلافت کے لیے نامزد فرمایا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ۔

ان اصحاب کو باہمی مشاورت سے اپنے میں سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کرنا تھا۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے ایثار سے کام لیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں دستبردار ہو گئے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت کا بیشتر حصہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے خاموشی سے گزارا۔ صرف آخری سال (۳۵ھ) میں ان کا نام منظرِ عام پر آتا ہے۔ اس سال امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف فتنہ پردازی اور شورش نقطۂ عروج پر پہنچ چکی تھی۔ بعض روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ کچھ انتظامی امور میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے اختلاف تھا لیکن امیر المومنین کے خلاف ریشہ دوانی اور فتنہ انگیزی کو وہ

سخت ناپسند کرتے تھے۔ چنانچہ جب مصر، کوفہ اور بصرے کے باغی مدینے کے اندر گھس آئے اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی تو ان تینوں بزرگوں نے ان کو جھڑک دیا۔ مسندِ احمد حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور طبقات ابنِ سعد میں ہے کہ جب باغیوں نے کاشانہ خلافت کا محاصرہ کر لیا تو حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ تحقیقِ احوال کے لیے محاصرین کے مجمع میں تشریف لے گئے۔ (قیاس یہ ہے کہ انہوں نے باغیوں کو اپنی حرکتوں سے باز آنے کی تلقین کی ہوگی) اسی موقع پر (یا کسی اور موقع پر جب کہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ محاصرین میں موجود تھے) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے مکان کے جھروکے سے جو مقامِ جبریل علیہ السلام کے متصل تھا، کبار صحابہ میں سے ایک ایک کا نام لے کر پکارا ان میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کا نام بھی آیا، پہلے تو انہوں نے سکوت اختیار کیا لیکن جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تین بار ان کا نام پکارا تو انہوں نے جواب دیا، میں حاضر ہوں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے راہِ حق میں اپنی خدمات اور فضائل و مناقب بیان کیے اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ سے ان کی تصدیق چاہی۔ انہوں نے سارے مجمع کے سامنے نہایت بلند آہنگی سے ان کی تصدیق کی لیکن مفسدین پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ ناچار حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ واپس چلے گئے۔ ابن اثیر رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ جب محاصرے نے خطرناک صورت اختیار کر لی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی طرح حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے صاحبزادے محمد رضی اللہ عنہ کو کاشانہ خلافت کی حفاظت پر مقرر کر دیا۔ انہوں نے اپنے دوسرے رفقاء کے ساتھ نہایت بہادری سے مفسدین کا مقابلہ کیا لیکن وہ دوسری طرف سے اندر گھس آئے اور امیر المومنین رضی اللہ عنہ کو نہایت سفاکی سے شہید کر ڈالا۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو اس دردناک حادثے کا علم ہوا تو انہیں سخت صدمہ پہنچا اور بڑے دُکھ کے ساتھ فرمایا:

''اللہ تعالیٰ عثمان رضی اللہ عنہ پر رحم فرمائے۔'' لوگوں نے کہا کہ مفسدین اپنے کیے پر نادم ہیں۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''خدا انہیں ہلاک کرے۔ اس کے بعد یہ آیت پڑھی:

فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً وَّلَآ اِلٰٓى اَهْلِهِمْ يَرْجِعُوْنَ ۝

(یٰسین آیۃ:۵۰)

ابنِ جریر طبری نے اس سلسلے میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ بھی نقل کیے ہیں:

''ہم صرف یہ چاہتے تھے کہ (بعض معاملات میں) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنا طرزِ عمل بدلنے پر آمادہ کیا جائے۔ ہمارا یہ خیال ہرگز نہ تھا کہ وہ قتل کر ڈالے جائیں لیکن بے وقوف لوگ بُردبار لوگوں پر غالب آ گئے اور انہوں نے ان کو قتل کر دیا۔''

(۶)

سیّدنا حضرت عثمان ذوالنّورین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت علی کرّم اللہ وجہٗ سریر آرائے خلافت ہوئے۔ یہ سخت پُرآشوب زمانہ تھا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مظلومانہ شہادت سے مسلمانوں کے ایک بہت بڑے طبقے میں سخت بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ ابنِ سعد کاتب الواقدی کا بیان ہے کہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے اکابر صحابہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی۔ لیکن بعد میں جب انہوں نے دیکھا کہ جن لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ غنی کے خلاف شورش میں حصہ لیا تھا ان میں بیشتر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں شامل ہو گئے ہیں تو وہ (بقول طبری رحمۃ اللہ علیہ، ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ، ابنِ کثیر رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ) حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ملے اور کہا کہ ہم نے اقامتِ حدود کی شرط پر آپ سے بیعت کی ہے اب آپ ان لوگوں پر حد جاری کیجئے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل میں شریک تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''بھائیو جو باتیں آپ کے پیشِ نظر ہیں۔ میں بھی ان سے واقف ہوں مگر ان لوگوں کو کیسے پکڑا جائے جن کا اس وقت زور ہے۔ کیا موجودہ صورتِ حال میں ان پر حد جاری کرنا ممکن ہے؟''

سب نے کہا "نہیں" اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "خدا کی قسم میں بھی آپ کا ہم خیال ہوں لیکن ذرا حالات کو اعتدال پر آنے دیجیے تا کہ حقوق کی وصولی ممکن ہو جائے۔"

اس کے بعد حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے رخصت ہو کر مکّہ معظّمہ گئے جہاں اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حج کے لیے تشریف لائی تھیں۔ایک روایت کے مطابق اُمّ المومنین رضی اللہ عنہا حج سے فارغ ہو کر واپس جا رہی تھیں کہ راستے میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ ان سے ملے اور مدینہ کے حالات بیان کیے۔اس پر اُمّ المومنین رضی اللہ عنہا ان کے ساتھ واپس مکہ معظمہ چلی گئیں۔اُم المومنین رضی اللہ عنہا سے مشورہ کے بعد طے پایا کہ علم اصلاح بلند کیا جائے۔چنانچہ وہ اُمّ المومنین رضی اللہ عنہا کے ساتھ بصرے کی جانب روانہ ہوئے اور وہاں پہنچنے تک ہزاروں لوگ ان کے لشکر میں شامل ہو گئے۔حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس صورتِ حال کا علم ہوا تو وہ بھی اپنی فوج لے کر مقابلہ کے لیے بڑھے۔فریقین جن میں اُمّت کے بہترین لوگ شامل تھے، شاید ایک دوسرے سے متصادم نہ ہوتے اور افہام وتفہیم کا کوئی راستہ نکل آتا لیکن بعض لوگوں نے غلط فہمیاں پھیلا کر تصادم کو ناگزیر بنا دیا اور "جنگِ جمل" کا افسوس ناک واقعہ پیش آیا۔
طبری ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ، ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ، حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ، حافظ ابنِ عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ اور بہت سے دوسرے اہلِ سِیَر کا بیان ہے کہ لڑائی کے آغاز میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو پیغام بھیجا کہ آپ میرے پاس آ کر گفتگو کریں۔ دونوں بزرگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس گئے تو انہوں نے ان کو حضور ﷺ کے بعض ارشادات یاد دلائے۔اس کا اثر یہ ہوا کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ میدانِ جنگ سے ہٹ کر الگ چلے گئے اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اگلی صفوں کی بجائے پچھلی صفوں میں جا کھڑے ہوئے۔ اس موقع پر مروان بن الحکم نے ایک زہریلا تیر ان کی طرف چلایا جو ان کے گھٹنے (یا پاؤں) میں پیوست ہو گیا اور اسی کے صدمہ سے اُمّتِ مسلمہ کے اس رجلِ عظیم نے

شہادت پائی۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ مروان نے ان پر تیر کیوں چلایا حالانکہ دونوں ایک ہی فوج میں تھے، ابنِ خلدون اور بعض دوسرے مورخین نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ بنواُمیہ کے عام لوگوں کا خیال یہ تھا کہ وہ سب لوگ کسی نہ کسی حد تک قتلِ عثمان رضی اللہ عنہ کے ذمہ دار ہیں جو شورش کے وقت مدینہ میں موجود تھے لیکن باغیوں کے خلاف نہ لڑے یا جنہوں نے سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کبھی کسی معاملے میں اختلافِ رائے کیا تھا۔ مروان حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو ایسے ہی لوگوں میں سمجھتا تھا اور ان سے سخت بدظن تھا اسی لیے اس نے ان کے خون سے ہاتھ رنگے۔

(دورِ حاضر کے بعد علماء اور مورخین نے ''جنگِ جمل'' اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں محولہ بالا روایات پر تنقید کی ہے اور سلسلہ سند کے لحاظ سے انہیں قابلِ حُجت نہیں ٹھہرایا۔ بحث و مناظرہ یا ان روایات کا محاکمہ کرنا ہمارا موضوع نہیں ہے، بہرصورت ایک بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے جو کچھ بھی کیا، نیک نیتی سے کیا اور اس میں ان کی کسی ذاتی غرض کا دخل نہیں تھا۔)

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ''تاریخ الصغیر'' میں لکھا ہے کہ جنگِ جمل میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ سب سے پہلے شہید ہوئے۔ یہ جمعہ ۱۰ جمادی الآخرہ ۳۶ھ کا واقعہ ہے۔ اس وقت ان کی عمر چونسٹھ ۶۴ برس کی تھی۔

امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ کو حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کا بہت افسوس ہوا۔

(سیر اعلام النبلاء)

ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ نے طبقات میں لکھا ہے کہ لڑائی کے بعد حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے ایک صاحبزادے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے بڑی محبت کے ساتھ ان کو اپنے پاس بٹھایا، ان کی جائیداد ان کو واپس کی اور فرمایا: ''مجھے امید ہے کہ

آخرت میں میرے اور تمہارے باپ کے درمیان وہی معاملہ پیش آئے گا جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں یوں فرمایا ہے:

وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ٥
(ہم ان کے دلوں سے رنجش دُور کر دیں گے اور وہ بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کے سامنے تختوں پر بیٹھے ہوں گے۔)

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو میدانِ جنگ ہی کے ایک گوشے میں سپردِ خاک کیا گیا۔ لیکن یہ جگہ نشیب میں تھی اور آئے دن پانی میں ڈوب جاتی تھی۔ علامہ ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ''اُسد الغابہ'' میں لکھا کہ ایک صاحب نے مسلسل تین بار حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو خواب میں دیکھا کہ وہ اپنی لاش کو اس قبر سے منتقل کرنے کے لیے کہہ رہے ہیں۔ ان صاحب نے اپنا خواب حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا تو انہوں نے حضرت ابوبکرہ بن مسروح رضی اللہ عنہ کا مکان دس ہزار درہم میں خرید کر اس میں قبر کھدوائی اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی میت کو اس میں منتقل کر دیا۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اتنے دنوں کے بعد بھی حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کا جسدِ مقدس بالکل صحیح سالم تھا یہاں تک کہ آنکھوں میں جو کافور لگایا گیا تھا وہ بھی بعینہ موجود تھا۔

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے اپنے زندگی میں (مختلف اوقات میں) متعدد شادیاں کیں۔ بیویوں کے نام یہ ہیں حمنہ بنتِ جحش رضی اللہ عنہا، خولہ بنتِ قعقاع تمیمی رضی اللہ عنہا، سعدیٰ بنتِ عوف، اُمِ ابان بنتِ عتبہ رضی اللہ عنہا، اُمِ کلثوم بنتِ ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہا، ام الحارث بنتِ قسامہ، فرعۃ علی تغلبی، رقیہ بنتِ ابوامیہ رضی اللہ عنہا، فارعہ بنتِ ابوسفیان رضی اللہ عنہا...... حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی چار بیویاں حمنہ رضی اللہ عنہا، رقیہ رضی اللہ عنہا، فارعہ رضی اللہ عنہا اور اُمِ کلثوم رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کی سالی تھیں، حمنہ رضی اللہ عنہا حضرت زینب بنتِ جحش رضی اللہ عنہا کی، رقیہ حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا کی، فارعہ رضی اللہ عنہا حضرت اُمِ حبیبہ رضی اللہ عنہا کی اور اُمِ کلثوم حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی بہن تھیں۔ لڑکوں کے نام یہ ہیں:

محمد رضی اللہ عنہ (سجاد)، عمران، موسیٰ، اسحاق، اسمٰعیل، عیسیٰ، یحییٰ، یعقوب، زکریا، یوسف، صالح۔

صاحبزادیوں کے نام یہ ہیں:

عائشہ، اُمِ اسحاق، صعبہ، مریم۔

ابن حزم کا بیان ہے کہ اُمِ اسحاق حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے نکاح میں آئیں۔ ان کی وفات کے بعد حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما سے نکاح کیا اور انہیں کے بطن سے حضرت فاطمہ بنتِ حسین رضی اللہ عنہا پیدا ہوئیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پوتے عبداللہ بن عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کے فرزند حضرت مصعب رضی اللہ عنہ بھی حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے داماد تھے۔

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے بڑے صاحبزادے محمد رضی اللہ عنہ شرفِ صحابیت سے بہرہ ور تھے۔ وہ کثرتِ عبادت کی وجہ سے سجّاد کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔ انہوں نے بھی جنگِ جمل میں شہادت پائی۔ ایک صاحبزادے یعقوب واقعہ حرہ میں شہید ہوئے۔

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کا حلیہ یہ تھا:

قد میانہ مائل بہ پستی۔ رنگ گندم گوں (بروایتِ دیگر سرخ و سفید) خوش رُو، سینہ کشادہ، شانے چوڑے، پنڈلیاں موٹی، بال گھنے، نہ سیدھے نہ گھونگھر والے اور خضاب سے پاک۔ پاؤں پُر گوشت۔ ایک ہاتھ کی انگلیاں غزوۂ اُحد میں شل ہو گئی تھیں۔ جب کسی سے بات کرتے تو اس کی طرف گھوم جاتے، بے توجہی اور متکبرانہ انداز سے گفتگو کرنا ان کا شیوہ نہ تھا۔

(۷)

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے لڑکپن ہی سے تجارت کو اپنا ذریعہ معاش بنایا تھا۔ مدینہ منورہ آ کر بھی انہوں نے یہی شغل جاری رکھا اور حجاز کے کامیاب ترین تاجروں میں شمار

ہوئے۔ اس کے علاوہ ہجرت کے بعد انہوں نے زراعت بھی شروع کر دی، بارگاہِ رسالت سے انہیں خیبر میں ایک جاگیر عطا ہوئی تھی۔ انہوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ عراقِ عرب میں اور بھی بہت سے قطعاتِ اراضی خرید لیے ان میں ''قناۃ'' اور ''سراۃ'' بہت مشہور ہیں۔ ان مقامات پر انہوں نے زراعت کا وسیع پیمانے پر اہتمام کیا۔ بیسیوں اونٹ کھیتوں کی سرابی کا کام کرتے تھے۔ ان کھیتوں کو پیداوار کی فراوانی کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق ان کی روزانہ آمدنی کا اوسط ایک ہزار دینار تھا۔ غرض تجارت اور زراعت کی آمدنی نے انہیں غیر معمولی دولت و ثروت کا مالک بنا دیا تھا۔ لیکن وہ جتنے صاحبِ ثروت اور متمول تھے اتنے ہی فیاض اور سخی بھی تھے۔ اہلِ سیَر نے ان کے انفاقِ فی سبیل اللہ، مہمان نوازی، جذبہ خیر اور جود وسخا کے بیسیوں واقعات قلمبند کیے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی دولت راہِ حق میں بے دریغ لٹاتے رہتے تھے اور اقلیم سخاوت کے بادشاہ تھے۔ حضرت قبیصہ بن جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں بڑی مدت تک حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہا اور میں نے ان سے بڑھ کر کسی کو بغیر مانگے مالِ کثیر دینے والا نہیں دیکھا۔

قیس بن ابی حازم کا بیان ہے کہ میں نے طلحہ رضی اللہ عنہ سے زیادہ کسی کو بے طلب کی بخشش میں پیش پیش نہ دیکھا۔

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ غزواتِ نبوی کے مصارف کے لیے بالالتزام گرانقدر رقوم پیش کرتے رہے۔ حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ غزوۂ ذی قرد کے موقع پر انہوں نے مسلمانوں کی ضروریات کے پیشِ نظر پانی کا ایک چشمہ ''بیسانِ صالح'' خرید کر وقف کر دیا۔ موطا امام مالک میں حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے پہاڑ کے دامن میں ایک کنواں خریدا اور لوگوں کو کھانا کھلایا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، بے شک اے طلحہ تم بڑے فیاض ہو۔

غزوۂ تبوک کے مصارف کے سلسلے میں بھی انہوں نے بہت بڑی رقم خرچ کی۔

ان کی ایسی ہی فیاضیوں نے انہیں فیاض کے لقب کا مستحق ٹھہرایا۔ ایک روایت میں ان کا لقب ''جواد'' بھی بیان کیا گیا ہے۔ ان کے صاحبزادے موسیٰ رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے میرے والد کا غزوۂ اُحد میں طلحۃ الخیر، تبوک میں، طلحۃ الفیاض اور غزوۂ حنین میں طلحۃ الجواد فرمایا تھا۔

ایک دفعہ انہیں حضرموت سے ساتھ لاکھ درہم کی خطیر رقم موصول ہوئی۔ یہ تمام رقم انہوں نے ضرورت مند مہاجرین وانصار میں تقسیم کر دی اور ان کی اہلیہ کے حصے میں صرف ایک ہزار درہم آئے۔

ایک مرتبہ اپنی ایک جائیداد سات لاکھ درہم میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ فروخت کی یہ ساری رقم بھی انہوں نے راہِ خدا میں لٹا دی۔

ایک اور موقع پر چار لاکھ درہم کی رقم ان کے پاس آئی تو انہوں نے ساری رقم اپنی قوم (بنو تیم) میں تقسیم کر دی۔

امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی ہے کہ ایک دفعہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے انہیں سات لاکھ درہم عطا کیے۔ اتنی بڑی رقم کی وجہ سے انہیں رات بھر نیند نہ آئی اور صبح ہوتے ہی انہوں نے یہ ساری رقم راہِ خدا میں تقسیم کر دی۔

طبقات ابنِ سعد میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی بیوی سعدیٰ بنتِ عوف رضی اللہ عنہا سے روایت کہ ایک مرتبہ طلحہ رضی اللہ عنہ گھر تشریف لائے تو سخت غمگین تھے۔ میں نے پوچھا، آپ اتنے غمگین ہیں، مجھ سے کوئی خطا تو سرزد نہیں ہوگئی؟ انہوں نے کہا، ''خدا کی قسم تم تو بہتر رفیقہ حیات ہو، بات اصل میں یہ ہے کہ میرے پاس بہت سا مال جمع ہو گیا ہے اور اسی کے بارے میں فکر مند ہوں۔''

میں (سعدیٰ) نے کہا کہ فکر کی کیا بات ہے اپنے گھر والوں اور اپنی قوم کی طرف آدمی بھیجئے اور یہ مال ان میں تقسیم کرا دیجئے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ میں نے خزانچی سے پوچھا، کتنا مال تقسیم کیا ہے؟ اس نے کہا چار لاکھ۔

ایک دفعہ ایک اعرابی ان کے پاس سائل کی حیثیت سے آیا اور کسی رشتے کا واسطہ دے کر سوال کیا۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "اس سے پہلے کبھی کسی نے اس رشتے کا واسطہ دے کر مجھ سے سوال نہیں کیا تھا، میرے پاس زمین ہے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یہ زمین تین درہم میں خریدنے کے خواہش مند ہیں۔ چاہو تو زمین لے لو اور چاہو تو اس کی قیمت۔

اعرابی نے نقد رقم لینی پسند کی اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے اسے بخوشی دے دی۔

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اپنے قبیلے (بنو تیم) کے غریب اور محتاج لوگوں کے مستقل کفیل بن گئے تھے۔ مقروضوں کے قرض ادا کر دیتے تھے اور غریب لڑکیوں اور بیوہ عورتوں کی اپنے خرچ پر شادی کرا دیتے تھے۔ صبیحہ تیمی پر تیس ہزار درہم قرض تھا۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو انہوں نے ان کا تمام قرض اپنے پاس سے ادا کر دیا۔

علامہ ابنِ سعد اور حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بڑی عقیدت تھی اور وہ ہر سال ان کی خدمت میں دس ہزار درہم پیش کیا کرتے تھے۔ عام جود و سخا اور غرباء و مساکین کی سرپرستی کے علاوہ مہمان نوازی بھی حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کا خاص شیوہ تھا۔ وہ مہمانوں کی خدمت کر کے روحانی مسرت محسوس کرتے تھے۔ اور اگر ان کا کوئی کام اٹکا ہوتا تو اس کے پورا کرنے میں بھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتے تھے۔

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ جس قدر مال و دولت راہِ خدا میں صَرف کرتے تھے اللہ تعالیٰ ان کو اس سے کہیں زیادہ مال و دولت عطا کر دیتا تھا۔ چنانچہ جب شہادت پائی تو اہل و عیال کے لیے کثیر مال چھوڑ گئے۔ ایک دفعہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کے صاحبزادے موسیٰ رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ تمہارے والد تم لوگوں کے لیے کیا چھوڑ گئے تو انہوں نے جواب دیا، کثیر مقدار میں سونے اور چاندی کے علاوہ دو لاکھ دینار اور بائیس لاکھ درہم نقد اور تین کروڑ درہم مالیت کی جائیداد۔ یہ تمام مال انہوں نے حلال ذرائع سے حاصل کیا تھا۔ اور راہِ خدا میں بے دریغ خرچ کرنے کے باوجود ان کے پاس بچ گیا تھا۔

(۸)

سیّدنا حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اگرچہ برسوں سرورِ عالم ﷺ کے شرف صحبت سے فیض یاب ہوئے لیکن وہ حدیث بیان کرنے میں بے حد محتاط تھے۔ اسی لیے ان سے بہت کم احادیث مروی ہیں۔ ان کے راویوں میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سائب رحمۃ اللہ علیہ بن یزید عبدالرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ بن عثمان تیمی، قیس رحمۃ اللہ علیہ بن ابوحازم، مالک رحمۃ اللہ علیہ بن ابی عامر اصبحی، عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ بن شدّاد بن الہاد اور ابوعثمان نہدی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ شامل ہیں۔ وہ اپنی احادیث میں عموماً امہات مسائل اور اصولِ دین بیان فرمایا کرتے تھے۔ مثلاً صحیح بخاری کی ایک حدیث میں کہتے ہیں:

”رسول اللہ ﷺ کے پاس نجد کا ایک باشندہ آیا جس کے بال پریشان تھے۔ ہم اس کی بھنبھناہٹ سنتے تھے لیکن بات سمجھ میں نہ آتی تھی۔ وہ جب قریب آیا تو معلوم ہوا کہ اسلام کی نسبت پوچھ رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، رات دن میں پانچ نمازیں، بولا، کیا ان کے علاوہ کچھ اور نمازیں بھی میرے ذِمّہ ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا تجھ پر اور کوئی نماز فرض نہیں مگر ہاں اپنی طرف سے خود پڑھنا چاہے۔ پھر اس نے روزہ کے متعلق دریافت کیا، آپ ﷺ نے فرمایا، رمضان کے روزے۔ اس نے کہا، کچھ اور؟ فرمایا کچھ نہیں مگر ہاں تو اپنی طرف سے خود رکھنا چاہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے اس سے زکوٰۃ کا ذکر کیا۔ بولا، کیا میرے ذِمّہ زکوٰۃ کے سوا بھی کچھ اور دینا فرض ہے۔ فرمایا کچھ نہیں مگر ہاں تو اپنی طرف سے خود دینا چاہے۔ اس سوال و جواب کے بعد آپ ﷺ نے اس کو اسلام کے اور احکام بھی سکھائے۔ وہ شخص پلٹا تو یہ کہہ رہا تھا واللہ نہ اس سے زیادہ کروں گا اور نہ اس سے کم (نہ تو میں اپنی طرف سے کچھ اضافہ کروں گا اور نہ ان باتوں میں جو اللہ تعالیٰ نے مجھ پر فرض کی ہیں کوئی کمی کروں گا)۔ آپ ﷺ نے فرمایا،

اگر اس نے سچ کہا ہے تو کامیاب ہو گیا۔'' (بخاری کتاب الحیل)

غزوۂ اُحُد سے متعلق حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کو مغازی میں خاص اہمیت حاصل ہے صحیح بخاری میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ سے ایک فقہی مسئلہ بھی منقول ہے۔

عبد الرحمٰن بن عثمان تیمی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ''ہم طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے اور احرام باندھے ہوئے تھے۔ طلحہ رضی اللہ عنہ کے لیے پرندے کا گوشت ہدیہ میں آیا۔ وہ اس وقت سو رہے تھے۔ ہم میں سے بعض نے کھایا اور بعض نے احتیاط کی۔ جب طلحہ رضی اللہ عنہ بیدار ہوئے تو کھانے والوں کی موافقت کی اور فرمایا، ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ (اس قسم کا ہدیہ) کھایا ہے۔''

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو سرورِ عالم ﷺ سے والہانہ عقیدت اور محبت تھی ۔ جو کچھ آپ ﷺ سے سنتے اسے حرزِ جان بنا لیتے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضور ﷺ کا ایک ارشادِ مبارک بھول گئے تو سخت پریشان ہوئے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان کو پریشان اور مغموم دیکھا تو پوچھا، کیا بات ہے، کسی سے جھگڑا تو نہیں ہوا؟ انہوں نے کہا، نہیں واقعہ یہ ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سُنا تھا کہ اگر کوئی بندہ موت کے وقت ایک کلمہ زبان سے ادا کرے تو جانکنی کی تکلیف دُور ہو جائے گی اور اس کا چہرہ درخشاں ہو جائے گا یہ کلمہ میں بھول گیا ہوں اسی لیے پریشان ہوں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا، کیا تم اس کلمہ سے بھی زیادہ باعظمت کلمہ جانتے ہو جس کا حضور نے حکم دیا یعنی لا الہ الا اللہ۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ یہ سُن کر ہشاش بشاش ہو گئے اور فرمایا، ہاں خدا کی قسم یہی کلمہ ہے۔ (مسند احمد حنبل رحمۃ اللہ علیہ)

(۹)

سیّدنا حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی کتابِ سیرت میں سبقت فی الاسلام، تحملِ شدائد، حُبِ رسول ﷺ، فدویت، شجاعت، انفاق فی سبیل اللہ، خدمتِ خلق، مہمان نوازی اور حسنِ معاشرت سب سے نمایاں ابواب ہیں۔ ان کی زندگی کے بیشتر پہلوؤں کی جھلکیاں اوپر

بیان کی جا چکی ہیں۔ان کے حسنِ معاشرت کا سب سے بڑا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ حضرت اُمِ ابان رضی اللہ عنہا بنتِ عتبہ بن ربیعہ کو بہت سے معزز اشخاص نے شادی کے پیغام بھیجے ان میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ اُمِ ابان رضی اللہ عنہا نے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے سوا باقی سب کے پیغام یہ کہہ کر ردّ کر دیئے کہ میں طلحہ رضی اللہ عنہ کے اوصاف ومحاسن سے واقف ہوں، وہ گھر آتے ہیں تو ہنستے ہوئے، باہر جاتے ہیں تو لبوں پر تبسّم ہوتا ہے، کچھ مانگو تو بلا تامل دے دیتے ہیں اور خاموش رہو تو مانگنے کا انتظار نہیں کرتے اور خود ہی دینے میں سبقت کرتے ہیں۔ اگر کوئی کام کر دو تو شکر گزار ہوتے ہیں اور غلطی ہو جائے تو عفو و در گزر سے کام لیتے ہیں۔ (کنز العمال)

مشہور صحابی حضرت کعب بن مالک انصاری رضی اللہ عنہ غزوہ تبوک میں شریک نہ ہوئے تھے۔حضور ﷺ واپس مدینہ منورّہ تشریف لائے تو ان سے مقاطعہ کا حکم دیا۔جب ان کی توبہ قبول ہوئی اور وہ رسول اکرم ﷺ سے ملاقات کرنے کے لیے مسجد میں آئے تو حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو بے انتہا خوشی ہوئی۔ انہوں نے دوڑ کر حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے پُر تپاک مصافحہ کیا اور قبول توبہ کی مبارکباد دی چونکہ اور کسی نے حتّی کہ حضرت کعب رضی اللہ عنہ کی اپنی قوم (انصار) نے بھی ایسی غیر معمولی خوشی اور گرمجوشی کا اظہار نہیں کیا تھا اس لیے ان پر حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے خلوص اور محبت کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ تمام عمر اس بات کو نہ بھولے۔ صحیح بخاری میں خود حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

> ''طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ میری طرف دوڑ پڑے۔ مجھ سے مصافحہ کیا اور مبارک باد دی۔ خدا کی قسم ان کے سوا مہاجرین میں سے کوئی اٹھ کر میرے پاس نہیں آیا اور میں طلحہ رضی اللہ عنہ کی یہ بات کبھی نہیں بھولوں گا۔''

(کتاب المغازی، غزوہ تبوک)

فضائل ومناقب کے لحاظ سے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ بہت بلند مرتبے پر فائز ہیں۔ وہ نہ صرف اصحابِ عشرہ مبشرہ میں سے ایک ہیں بلکہ غزوہ اُحد میں ان کو انفرادی طور پر بھی

جنت کی بشارت دی گئی۔ تمام غزواتِ نبوی میں سیّد المرسلین ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔ بیعت رضوان کی سعادت حاصل کی اور ''اصحاب الشجرہ'' میں شمار ہوئے۔ بارگاہِ رسالت ﷺ سے خیر، فیّاض اور جواد کے القاب سے نوازے گئے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

''رسول اللہ ﷺ کوہِ حراء پر تھے۔ آپ ﷺ کے ساتھ ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ، علی رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ، طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ پتھر (چٹان یا پہاڑ) نے جنبش کی (ہلنے لگا) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ٹھہر جا تجھ پر نبی یا صدیق یا شہید ہیں۔'' (کتاب الفضائل)

ان بزرگوں میں جو اس موقع پر بارگاہِ رسالت ﷺ میں حاضر تھے حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ کے سوا باقی تمام بزرگ (حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ) رتبہ شہادت پر فائز ہوئے۔ تمام اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے فضائل کے معترف تھے اور برملا ان کی تعریف وتوصیف فرمایا کرتے تھے۔ ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ جنگِ جمل سے پہلے حضرت علی کرّم اللہ وجہہ، کو حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی مخالفت کا علم ہوا تو انہوں نے فرمایا، مجھے اس وقت چار آدمیوں کی مخالفت کی خبر پہنچی ہے ان میں سب سے زیادہ نیک اور سخی طلحہ رضی اللہ عنہ ہیں۔

(اُسد الغابہ)

جب انہوں نے جنگِ جمل میں شہادت پائی تو حضرت علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ لڑائی کے بعد ان کی نعش پر تشریف لے گئے، چہرے سے مٹّی صاف کی اور فرمایا، ابو محمد مجھے یہ بات بہت شاق گزر رہی ہے کہ تجھے نجوم آسمان کے نیچے خاک آلود دیکھوں۔ پھر فرمایا، کاش میں اس واقعہ سے بیس یوم پیشتر انتقال کر جاتا۔ یہ کہہ کر امیر المومنین رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء رو پڑے اور بہت روئے۔ (عشرہ مبشرہ، قاضی حبیب الرحمٰن)

ایک دفعہ کسی شخص نے حضرت علی کرّم اللہ وجہہ، کے سامنے یہ شعر پڑھا

فَتـی کَـانَ یُـدْنِیْـهِ الْـغِنٰی مِنْ صَدِیْقِهٖ
اِذَا هُـوَ اِسْتَـغْـنٰـی وَ یُبْعِـدُوْهُ الْـفَقَرَ

(وہ ایسا جوانمرد تھا کہ اس کی دولت نے اس کو دوستوں سے قریب تر کر دیا تھا جبکہ اسے کسی کی ضرورت نہ تھی اور تنگ دستی نے اس کے دوستوں کو دور پھینک دیا تھا)

سیّدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''اس کے مصداق تو ابو محمد طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ تھے اللہ ان پر رحم فرمائے۔''

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ

(۱)

رحمتِ عالم ﷺ بعدِ بعثت کے ابتدائی تین سالوں میں نہایت راز داری کے ساتھ فریضہ تبلیغ ادا فرماتے رہے۔ چوتھے سالِ بعثت کے اوائل میں جب یہ حکم نازل ہوا:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ٥ (سورۃ الحجر)

(احکامِ الٰہی برملا سنایئے اور مشرکین کی مخالفت کو خاطر میں نہ لایئے)

تو حضور ﷺ نے لوگوں کو علانیہ حق کی طرف بلانا شروع کر دیا۔ سعادت مند روحوں نے تو دعوتِ حق پر فوراً لبیک کہا لیکن وہ لوگ کہ جن کا خمیر ہی کفر و شرک سے اٹھا تھا، فرطِ غضب سے دیوانے ہو گئے۔ یہ وہی لوگ تھے جن کی زبانیں حضور کو صادق اور امین کہتے کہتے نہ تھکتی تھیں لیکن جب رحمتِ عالم ﷺ نے ان کو حق کی طرف بُلایا، تو وہ علانیہ برسرِ پرخاش ہو گئے اور اہلِ حق کے خون کے پیاسے بن گئے۔ ان بدبختوں نے توحید کے نام لیواؤں پر ظلم و ستم کے ایسے ایسے پہاڑ توڑے کہ انسانیت سر پیٹ کر رہ گئی اور اہلِ حق کے لیے مکہ میں زندگی کے دن کاٹنا مشکل ہو گیا، ایک سال تو جوں توں کر کے گزر گیا، لیکن جب اشقیاءِ قریش کے مظالم انتہا کو پہنچ گئے اور پانی سر سے گزر گیا تو رحمتِ عالم ﷺ نے رجب ۵ بعدِ بعثت میں اپنے مظلوم جان نثاروں سے فرمایا:

"اچھا ہو کہ تم لوگ مکہ سے ہجرت کر کے حبش چلے جاؤ۔ وہاں ایک ایسا بادشاہ ہے جو کسی پر ظلم نہیں ہونے دیتا۔ وہ بھلائی کی سرزمین ہے۔ تم وہیں قیام کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس مصیبت کو دور کرنے کی کوئی صورت تمہارے لیے پیدا کر دے۔"

حضور ایماء پا کر گیارہ مردوں اور چار خواتین پر مشتمل اہلِ حق کے ایک قافلے نے سب سے پہلے سرزمینِ مکہ...... کو الوداع کہا اور طویل (بری اور بحری) سفر کے بعد حبش کے غربت کدہ میں جا کر مقیم ہو گیا۔ اس قافلے کی روانگی کے بعد بھی اِکا دکا لوگ برابر ہجرت کر کے حبش جاتے رہے۔ ۲ بعدِ بعثت میں اسی سے زیادہ مردوں اور اٹھارہ انیس خواتین پر مشتمل اہلِ حق کے ایک دوسرے قافلے نے حبش کی طرف ہجرت کی۔ اس طرح حبشہ میں مسلمانوں کی کافی تعداد ہو گئی اور وہاں وہ پُر عافیت زندگی بسر کرنے لگے۔ مشرکینِ مکہ جب یہ سنتے کہ مسلمان حبش میں امن وسکون کی زندگی گزار رہے ہیں، تو وہ انگاروں پر لوٹ لوٹ جاتے۔ بالآخر انہوں نے باہمی مشورہ کے بعد طے کیا کہ نجاشی شاہِ حبشہ کے پاس ایک وفد بھیجا جائے جو اس کو ترغیب دے کر وہ مسلمانوں کو اپنے ملک سے نکال دے۔ چنانچہ اس قرارداد کے مطابق انہوں نے عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ابی ربیعہ (ابوجہل کے اخیافی بھائی) کو بہت سے قیمتی تحائف (جن میں مکہ کا دباغت کیا ہوا نفیس چمڑا کثیر مقدار میں تھا) دے کر حبش روانہ کر دیا۔

قریش کے وفد نے حبش پہنچ کر سب سے پہلے یہ کام کیا کہ نجاشی کے عمائدِ سلطنت میں دل کھول کر تحائف تقسیم کیے اور چکنی چپڑی باتیں کر کے ان کو اپنا موید بنا لیا۔ ان لوگوں نے وفدِ قریش سے پختہ وعدہ کیا کہ وہ بادشاہ کے سامنے ان کے مطالبے کی تائید کریں گے اور اس پر زور دیں گے کہ وہ مسلمانوں کو حبشہ سے نکال دے۔ اس کے بعد عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ابی ربیعہ دونوں نجاشی کے دربار میں حاضر ہوئے اور بہت سے قیمتی تحائف اس کی خدمت میں پیش کر کے یوں عرض پیرا ہوئے:

"اے شاہِ ذی جاہ! ہماری قوم قریش کے بعض سر پھروں نے اپنا آبائی دین ترک کر دیا اور پھر وہ اپنے وطن کو چھوڑ کر یہاں چلے آئے۔ انہوں نے جہاں پناہ کا دین بھی اختیار نہیں کیا بلکہ ایک نرالا دین ایجاد کیا ہے۔ اس لیے ہماری قوم کے اشراف نے ہمیں حضور کی خدمت میں اس درخواست کے

ساتھ بھیجا ہے کہ جہاں پناہ ان لوگوں کو اپنے وطن واپس جانے کا حکم دیں۔"

ابھی بادشاہ ان کی بات کا جواب نہ دینے پایا تھا کہ اہلِ دربار ہر طرف سے ان کی تائید میں بولنے لگے اور بادشاہ کو ترغیب دینے لگے کہ عالی جاہ ان پناہ گزینوں کے بارے میں ان کی قوم اور وطن کے لوگ ہم سے زیادہ واقف ہیں اور ان کے عیوب کو وہی اچھی طرح جانتے ہیں، اس لیے ان کو ضرور واپس کر دینا چاہیے۔

نجاشی ایک سلیم الطبع اور منصف مزاج حکمران تھا۔ اس پر ان لوگوں کی باتوں کا کچھ اثر نہ ہوا اس نے کہا:

"اس طرح تو میں ان لوگوں کو اپنے وطن سے نہیں نکالوں گا، آخر انہوں نے مجھ پر اعتماد کیا ہے اور میری پناہ میں آئے ہیں۔ جب تک میں ان سے بھی نہ پوچھ لوں کہ اس وفد کے بیان میں کہاں تک صداقت ہے، میں ان کی طرف سے کیسے آنکھیں پھیر سکتا ہوں؟"

اس کے بعد اس نے مہاجرینِ حبشہ کو اپنے دربار میں بُلا بھیجا۔ وفدِ قریش اور مہاجرین بیک وقت دربار میں حاضر ہوئے۔ قریش کے نمائندے تو بادشاہ کو دیکھتے ہی سجدے میں گر گئے، لیکن مہاجرین میں سے کسی نے سجدہ نہ کیا۔ بادشاہ نے ان سے چھوٹتے ہی سوال کیا:

"یہ تم لوگوں نے کیا کیا کہ اپنی قوم کا دین بھی چھوڑ بیٹھے، میرا دین بھی اختیار نہیں کیا اور دنیا کے کسی دوسرے دین میں بھی داخل نہیں ہوئے۔ آخر تم نے یہ کون سا نیا دین ایجاد کیا ہے؟"

نجاشی کی بات سن کر مہاجرین نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر اُن میں سے پچیس چھبیس سال کے ایک نہایت خوبرو اور وجیہ نوجوان آگے بڑھے، اُن کی پیشانی نورِ سعادت سے درخشاں تھی اور چہرہ جوشِ ایمان سے تمتما رہا تھا۔ انہوں نے بڑے گمبھیر انداز میں کجکلاہِ حبشہ سے یوں خطاب کیا:

''اے بادشاہ! ہم لوگ جاہلیت میں پڑی ہوئی ایک قوم تھے۔ بتوں کی پرستش کرتے تھے۔ مُردار کھاتے تھے، بے حیائی کے کام کرتے تھے، قطعِ رحمی کرتے تھے، اپنے ہمسایوں سے بُرا سلوک کرتے تھے، جو شخص ہم میں مضبوط اور طاقت ور ہوتا، وہ کمزور کو کھا جاتا تھا، ہم اسی تاریکی میں زندگی گزار رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری طرف خود ہم میں سے ایک رسول بھیجا جس کے نسب، جس کی راست گوئی، جس کی امانت داری اور جس کی پاک دامنی کو ہم اچھی طرح جانتے پہچانتے تھے۔ اس نے ہمیں اللہ کی طرف بلایا کہ ہم اس کو ایک جانیں اور اُسی کی عبادت کریں اور بتوں اور پتھروں کو یکسر چھوڑ دیں جن کی ہم اور ہمارے باپ دادا عبادت کیا کرتے تھے۔ اس نے ہمیں حکم دیا کہ سچ بولیں، امانت کو ادا کریں، رشتہ داروں کا خیال رکھیں، پڑوسی کے ساتھ اچھا سلوک کریں، حرام کاموں اور خون ریزی سے اجتناب کریں۔ ہم کو بے حیائیوں سے، جھوٹ بات منہ سے نکالنے سے، یتیم کا مال کھانے سے اور پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے سے روکا۔ اس نے ہم کو تلقین کی کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ۔ اس نے ہم کو نماز پڑھنے، زکوٰۃ دینے اور روزہ رکھنے کا حکم بھی دیا...... ہم لوگ اس یگانۂ دہر ہستی پر خلوصِ دل سے ایمان لائے اور اس کی تصدیق کی اور جو دین وہ اللہ کی طرف سے لایا تھا، اس کی پیروی کی۔ ہم نے صرف اللہ کی عبادت کی اور کسی کو اس کے ساتھ شریک نہیں کیا۔ جو چیزیں اس نے ہمارے لیے حلال قرار دیں ان کو حلال جانتے ہیں۔ بس اسی بات پر ہماری قوم ہم سے بگڑ بیٹھی۔ اس نے ہم کو ستایا تاکہ ہم اللہ تعالیٰ کی عبادت کے بجائے پھر بتوں کی پوجا کرنے لگیں اور وہ ناپاک چیزیں جنہیں ہم نے پہلے حلال بنا رکھا تھا، ان کو پھر حلال سمجھنے لگیں۔ آخرکار

جب انہوں نے ہم پر سختی کی اور ظلم ڈھایا اور ہم کو اپنے دین پر عمل کرنے سے روکنے کے لیے ہم پر وطن میں عرصہ حیات تنگ کر دیا تو ہم نے (بصد مجبوری) آپ کے ملک کا رُخ کیا اور سب کو چھوڑ کر آپ کو اور آپ کے پڑوس کو پسند کیا اور آپ کی پناہ میں آ گئے...... اے بادشاہ ہم کو آپ سے اُمید ہے کہ اب یہاں ہم پر ظلم نہ ہوگا۔"

نوجوان کی پُر تاثیر تقریر ختم ہوئی تو دربار میں سناٹا چھا گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس تقریر کا ایک ایک لفظ اہلِ دربار کے سینوں میں ترازو ہو گیا ہے۔ نجاشی نے نوجوان پر شفقت بھری نظر ڈالی اور پوچھا: "کیا اس کلام کا کوئی حصہ تمہیں یاد ہے جو تم کہتے ہو کہ تمہارے نبی پر اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے؟"

نوجوان نے جواب دیا "جی ہاں"

بادشاہ نے کہا، اچھا اس کو ذرا میرے سامنے بھی پڑھو۔

نوجوان نے بڑے اثر انگیز پیرائے میں سورۂ مریم پڑھنی شروع کی، ابھی انھوں نے ابتدائی چند آیات ہی پڑھی تھیں کہ بادشاہ پر رقت طاری ہو گئی اور وہ اس قدر رویا کہ اس کی ڈاڑھی تر ہو گئی، اس کے پادری بھی اتنا روئے کہ ان کے سامنے جو صحیفے تھے وہ بھی تر ہو گئے۔ اس وقت بادشاہ کی زبان سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے:

"خدا کی قسم یہ کلام اور جو کلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام لے کر آئے تھے، دونوں ایک ہی سرچشمے سے نکلے ہیں، میں تمہیں ان لوگوں کے حوالے ہرگز نہ کروں گا۔"

اس کے بعد اس نے قریش کے سفیروں سے مخاطب ہو کر کہا:

"تم لوگ یہاں سے واپس جاؤ، خدا کی قسم یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ میں ان لوگوں کو تمہارے حوالے کر دوں۔"

یہ پاکباز اور بے خوف نوجوان جن کے سحرِ بیان نے ایک وسیع و عریض سلطنت

کے فرمانروا کے دل کو پگھلا دیا اور جنھوں نے اپنے غریب الدیار بھائیوں کی طرف لپکتے ہوئے شعلوں کا رُخ پلٹ کر سرزمینِ حبشہ کی فضا ان کے لیے سازگار بنا دی، دودمان ہاشمی کے چشم و چراغ سیّدنا حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ تھے۔

(۲)

سیّدنا ابوعبداللہ جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا شمار نہایت عظیم المرتبت صحابہ میں ہوتا ہے۔ان کے حسب ونسب کے بارے میں اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ وہ رحمتِ عالم ﷺ کے ابنِ عَم (چچازاد بھائی) اور حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ کے حقیقی برادرِ بزرگ تھے۔حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کو دعوتِ توحید کے ابتدائی زمانے میں اس وقت لوائے توحید تھامنے کا شرف حاصل ہوا جب ابھی صرف اکتیس بتیس آدمیوں کو یہ سعادت حاصل ہوئی تھی۔اس کی تقریب یوں ہوئی کہ ایک دن سرورِ عالم ﷺ حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے، حضرت ابوطالب اپنے بھتیجے اور فرزند کا خشوع وخضوع دیکھ کر بہت متاثر ہوئے اور انھوں نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ سے کہا، بیٹے تم بھی اپنے ابنِ عم کے پہلو میں کھڑے ہو جاؤ۔حضرت جعفر رضی اللہ عنہ فوراً حضور ﷺ کے بائیں پہلو میں کھڑے ہو گئے۔ نماز میں ان کو ایسی روحانی لذّت حاصل ہوئی کہ اپنا دل وجان رسولِ عربی ﷺ پر نثار کر بیٹھے اور حضور ﷺ کے حضرت ارقم بن ابی الارقم رضی اللہ عنہ کے گھر میں پناہ گزین ہونے سے پہلے سعادت اندوزِ اسلام ہو گئے۔ان کی اہلیہ حضرت اسماء بنتِ عمیس رضی اللہ عنہا بھی اسی زمانے میں شرفِ ایمان سے بہرہ ور ہو گئیں۔

۴ ؁ بعثت کے اوائل میں حضور ﷺ نے عامۃ الناس کو برملا پیغامِ حق سنانا شروع کیا تو مشرکینِ مکہ کے غیظ وغضب کا آتش فشاں پوری قوت سے پھٹ پڑا اور انہوں نے اہلِ حق پر جور وستم کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا۔حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اور ان کی اہلیہ بھی کفّار کے دستِ تعدّی سے محفوظ نہ رہ سکے۔حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کو عبادتِ الٰہی سے بڑا شغف تھا اور ان پر یہ بات نہایت شاق گزرتی تھی کہ کفّار ان کی عبادت میں

خارج ہوتے تھے ۵ بعدِ بعثت میں مہاجرینِ حبشہ کے پہلے قافلے کی روانگی کے کچھ عرصہ بعد حضرت جعفر رضی اللہ عنہ ایک دن سرورِ عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: ''یارسول اللہ! آپ اجازت دیجیے کہ میں کسی ایسی سرزمین میں چلا جاؤں جہاں اللہ پاک کی بلا خوف وخطر عبادت کر سکوں۔''

حضور ﷺ نے فرمایا: ''تم بھی حبش چلے جاؤ، وہ امن کی سرزمین ہے۔''

چنانچہ حضور ﷺ کے ارشاد کے مطابق ٦ بعدِ بعثت میں حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اپنی اہلیہ کے ہمراہ مہاجرینِ حبشہ کے دوسرے قافلے میں شامل ہو کر حبش پہنچ گئے۔

علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ اور بعض دوسرے مورخین نے لکھا ہے کہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ عازمِ حبشہ ہونے سے پہلے حضور ﷺ سے رخصت ہونے آئے تو آپ ﷺ نے انہیں نجاشی شاہِ حبشہ کے نام ایک خط دیا جس میں اس کو دعوتِ اسلام دینے کے بعد یہ بھی لکھا کہ ''میں اپنے ابنِ عم جعفر کو چند دوسرے مسلمانوں کے ساتھ تیرے پاس بھیج رہا ہوں، جب وہ تیرے پاس آئیں، تو ان کی مہمانداری کر۔'' اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کو حضرت جعفر رضی اللہ عنہ سے کس قدر تعلقِ خاطر تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے بھرپور جوانی میں ہر قسم کے خطرات کے علی الرغم اسلام قبول کیا تھا اور پھر قبولِ اسلام کے بعد فیضانِ نبوی سے بہرہ یاب ہونے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا تھا۔ یہ اثرِ نبوّت ہی تھا کہ وہ نہ صرف علم وفضل کے لحاظ سے بلکہ شوقِ عبادت، زہد واتقا اور ایثار واستغناء کے اعتبار سے بھی نہایت بلند مرتبے پر فائز ہو گئے تھے۔ ان کے یہی محاسن تھے کہ مہاجرینِ حبشہ بھی ان کو نہایت عزت واحترام کی نظروں سے دیکھتے تھے اور ان کی اصابتِ رائے اور فہم ودانش پر اعتماد کرتے تھے۔ چنانچہ جب وفدِ قریش نے نجاشی کے دربار میں جا کر غریب الوطن اہلِ حق کو حبشہ کی جائے امن سے محروم کرنے کی کوشش کی تو مہاجرین نے اپنی ترجمانی کے لیے انہیں ہی منتخب کیا اور پھر انہوں نے اہلِ حق کی ترجمانی کا حق ایسے حسن وخوبی سے ادا کیا کہ چشمِ فلک دنگ رہ گئی۔ دربارِ حبشہ

میں ان کی اثر انگیز تقریر نے آناً فاناً ہوا کا رُخ بدل ڈالا۔ یہ تقریر تاریخ اسلام کا ایک ایسا لا فانی حصہ ہے کہ اس کو پڑھ کر آج بھی مضمحل اور افسردہ روحوں میں ایمان کی حرارت پیدا ہو جاتی ہے۔

(۳)

سفرائے قریش کو نجاشی کے دربار میں پہلے دن جو ناکامی ہوئی اس سے ان کے زُعم اور پندار کو سخت دھچکا لگا۔ تاہم وہ مایوس نہ ہوئے اور مہاجرین پر ایک اور وار کرنے کی ٹھانی۔ عمرو بن العاص نے اپنے ساتھی سے کہا۔ خدا کی قسم کل میں ایک ایسی بات نجاشی کو بتاؤں گا جو ان لوگوں کو برباد کر ڈالے گی۔ ان کی بات سن کر عبداللہ بن ابی ربیعہ کے دل میں مہاجرین کے لیے نرم گوشہ پیدا ہو گیا اور اس نے کہا: ''عمرو جانے دو، یہ لوگ ہمارے مخالف ہی سہی، لیکن پھر بھی ہمارا ان سے خون برادری کا تعلق ہے اور وہ ہم پر کچھ حق رکھتے ہیں۔''

خدا کی شان وہی عمرو بن العاص جو بعد میں اسلام کے ایک جانباز سپاہی بنے، اس وقت اپنے وطن مسلمانوں کی مخالفت میں اس حد تک بڑھ گئے کہ انہوں نے عبداللہ بن ابی ربیعہ کی بات فوراً رَدّ کر دی اور کہا: ''واللہ میں تو کل نجاشی کو ضرور بتاؤں گا کہ یہ لوگ عیسیٰ ابنِ مریم علیہ السلام کو محض بندہ قرار دیتے ہیں۔'' چنانچہ دوسرے دن وہ صبح ہی صبح نجاشی کے پاس پہنچے اور اس سے کہا:

> ''جہاں پناہ یہ لوگ آپ کے پیغمبر عیسیٰ ابنِ مریم علیہ السلام کے بارے میں ایک بہت ہی بڑی بات کہتے ہیں، آپ ذرا ان کو بُلا کر یہ تو پوچھئے کہ وہ عیسیٰ ابنِ مریم علیہ السلام کو کیا سمجھتے ہیں۔''

عمرو بن العاص کی بات سن کر نجاشی نے مہاجرین کو دوبارہ بُلا بھیجا۔ حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا جو اس وقت حبش میں مقیم تھیں، فرماتی ہیں کہ یہ وقت مہاجرین پر بڑا کٹھن تھا، لیکن انہوں نے آپس میں مشورہ کر کے یہی فیصلہ کیا کہ خواہ کچھ ہو جائے ہم نجاشی کے

جواب میں حق بات کے سوا کچھ نہ کہیں گے، چنانچہ جب وہ نجاشی کے دربار میں حاضر ہوئے اور اس نے سوال کیا کہ تم لوگ عیسیٰ ابنِ مریم علیہ السلام کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ تو حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر بلا تامل کہا: "اے بادشاہ ہم ان کے بارے میں وہی کہتے ہیں جو ہمارے نبی ﷺ نے ہمیں بتایا ہے کہ وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور اس کی طرف سے ایک روح اور ایک کلمہ ہیں جسے اللہ نے کنواری پاک دامن مریم رضی اللہ عنہا پر القاء کیا تھا۔"

یہ سن کر نجاشی نے اپنا ہاتھ زمین کی طرف بڑھایا اور ایک تنکا اٹھا کر کہا "خدا کی قسم تم نے عیسیٰ ابنِ مریم علیہ السلام کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ اس سے اس تنکے کے برابر بھی زیادہ نہیں تھے۔"

نجاشی کی بات سن کر دربار میں موجود پادری بڑبڑانے لگے مگر نجاشی نے کہا، "تم کتنے ہی بڑبڑاؤ خدا کی قسم سچی بات تو وہی ہے جو کہی گئی۔۔۔۔۔" پھر اس نے مسلمانوں سے کہا۔۔۔۔۔ "جاؤ تمہیں میرے ملک میں ہر طرح کا امن ہے، جو تمہیں بُرا کہے گا اس سے جرمانہ لیا جائیگا، اگر مجھے پہاڑ کے برابر سونا بھی ملے، تو میں اس کے عوض تم پر ادنیٰ سی زیادتی بھی گوارا نہیں کر سکتا۔"

پھر اس نے اپنے ملازموں کو حکم دیا کہ قریش کے سفیروں کے تحائف انہیں واپس کردو۔ مجھے ان کی کوئی ضرورت نہیں۔ خدا کی قسم اللہ نے جب میرا ملک مجھے واپس دلوایا تھا تو اس نے مجھ سے کوئی رشوت نہیں لی تھی۔ اب میں اللہ کے معاملے میں رشوت کیوں قبول کروں؟۔۔۔۔۔ اس طرح قریش کے سفیروں کو ناکام و نامراد حبش سے واپس جانا پڑا۔

ہجرتِ حبشہ سے متعلق بعض دوسری روایات میں حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی حق گوئی وبے باکی کے کچھ اور واقعات بھی ملتے ہیں۔ ایک روایت میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب مہاجرین کو نجاشی نے اپنے دربار میں طلب کیا تو حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں سے کہا، آج تم لوگوں کی طرف سے میں بات کروں گا۔

چنانچہ سب ان کے پیچھے چل پڑے۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے دربار میں داخل ہو کر سلام کیا اور دستور کے مطابق سجدہ نہ کیا۔ اس پر درباری چین بجبیں ہوئے اور انہوں نے کہا۔ ''تم نے بادشاہ کو سجدہ کیوں نہیں کیا؟

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے بے دھڑک جواب دیا ''ہم اللہ عزّ وجلّ کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کرتے۔''

اس کے بعد حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے نہایت بلیغ پیرائے میں نجاشی کے سوالوں کے جواب دیئے۔ نجاشی ان کے حسنِ تقریر سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے بھرے دربار میں کہا۔ ''مرحبا اس ذاتِ گرامی پر جس کی طرف سے تم آئے ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ بے شک وہ اللہ کے رسول ہیں اور یہ وہی نبی ہیں جن کا ذکر انجیل میں آیا ہے اور جن کی عیسیٰ بن مریم علیہ السلام نے بشارت دی تھی۔ جہاں تم لوگوں کا جی چاہے، بلا کھٹکے وہاں ٹھہرو خدا کی قسم اگر میں اس حکومت کے جنجال میں نہ پھنسا ہوتا تو میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا اور ان کی جوتیاں اٹھانے کی سعادت حاصل کرتا۔''

ایک اور روایت میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ نقل کیے گئے ہیں کہ خود نجاشی نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ تم کو کس چیز نے میرے سامنے سربسجود ہونے سے منع کیا۔

انہوں نے بلا جھجک جواب دیا۔ ''ہم اللہ کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کرتے۔''

طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے خود حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ جب نجاشی اور ہمارے درمیان سوال و جواب ہو چکے تو بادشاہ نے ہم سے پوچھا کہ کیا تم کو یہاں کوئی ستاتا ہے؟ ہم نے کہا ''ہاں'' اس پر بادشاہ نے یہ منادی کرانے کا حکم دیا کہ جو کوئی ان مسلمانوں میں سے کسی کو ستائے گا اس سے چار درہم تاوان لے کر مظلوم کو دلایا جائے گا۔ پھر اس نے پوچھا ''کیا اتنا تاوان کافی ہے۔'' ہم نے کہا نہیں۔ تب اس نے اس تاوان کو دوگنا کر دیا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ نجاشی نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ

پر بیعت اسلام بھی کی۔

اس واقعہ کے بعد مسلمان نہایتِ امن وسکون کے ساتھ حبش میں زندگی گزارنے لگے۔ چند سال بعد (ہجرتِ نبوی سے کچھ عرصہ پہلے) تقریباً چالیس مسلمان حبش سے مکہ واپس چلے گئے، لیکن حضرت جعفر رضی اللہ عنہ مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ برابر حبش میں مقیم رہے۔ یہاں تک کہ ان کو غریب الوطنی کی زندگی گزارتے تیرہ برس گزر گئے۔ اس دوران میں سرورِ عالم ﷺ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ منوّرہ تشریف لے گئے اور بدر، اُحد اور احزاب وغیرہ کے معرکے گزر چکے۔ ۶ ہجری کے اواخر میں حضور ﷺ غزوۂ خیبر کی تیاری کر رہے تھے کہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے بھی حبش سے مدینہ منوّرہ کا عزم کیا، حافظ ابنِ کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے "البدایہ والنہایہ" میں لکھا ہے کہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ حبش سے چلنے لگے تو سلامِ رُخصت اور رسمی اجازت کے لیے نجاشی سے ملنے گئے اس نے انہیں سواری اور زادِ راہ دیا اور ساتھ ہی ان سے درخواست کی کہ پیغمبرِ عربی (ﷺ) کو میرا اسلام کہنا اور یہ بھی بتانا کہ میں اللہ کے ایک ہونے اور ان کے رسول اللہ ہونے کی شہادت دیتا ہوں، میں نے تم لوگوں کے ساتھ یہاں جو سلوک کیا ہے اس سے بھی ان کو آگاہ کرنا اور یہ عرض بھی کرنا کہ میرے لیے مغفرت کی دعا کریں۔ اس کے بعد اس نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کو خدا حافظ کہہ کر رخصت کر دیا۔

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مدینہ منوّرہ پہنچے تو حضور ﷺ غزوۂ خیبر کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ ان اصحاب کو اب حضور ﷺ کی زیارت کے بغیر مدینہ میں ایک لمحہ کاٹنا بھی مشکل تھا، خواتین کو مدینہ میں چھوڑ کر سارے مرد سیدھے خیبر پہنچے۔ اس وقت خیبر فتح ہو چکا تھا اور مسلمان فتح کی خوشی منا رہے تھے، اپنے غریب الوطن بھائیوں کو اپنے درمیان پا کر ان کی مسرّت دوبالا ہو گئی۔ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ رحمتِ عالم ﷺ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر بے انتہا مسرور ہوئے، گلے لگا کر ان کی پیشانی چومی اور فرمایا:

''میں نہیں جانتا کہ مجھ کو خیبر کی فتح سے زیادہ خوشی ہوئی یا جعفر کے آنے سے۔''

اس کے بعد حضور ﷺ نے حبش سے واپس آنے والے دوسرے تمام اصحاب سے بھی معانقہ فرمایا اور سب کو اہلاً وسہلاً ومرحبا کہا۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ جو حبش سے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہی آئے تھے۔ صحیح بخاری میں ان سے روایت ہے کہ جب ہم نبی ﷺ کی خدمت میں فتح خیبر کے بعد حاضر ہوئے تو آپ نے ہم کو (حبش سے واپس آنے والے اصحاب کو) مالِ غنیمت میں سے حصہ دیا اور دوسرے کسی شخص کو جو اس لڑائی میں شریک نہیں ہوا تھا، حصہ نہیں دیا۔

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کو نجاشی کا سلام پہنچایا اور مہاجرین کے ساتھ اس کے حُسنِ سلوک کی تفصیل بھی بتائی۔ پھر انہوں نے نجاشی کی یہ درخواست حضور ﷺ کے سامنے پیش کی کہ میرے لیے مغفرت کی دُعا فرمائیں۔ رحمتِ عالم ﷺ اُسی وقت اٹھے، وضو فرمایا اور پھر تین مرتبہ یہ دُعا مانگی۔ ''اے اللہ نجاشی کی مغفرت فرما۔'' تمام مسلمانوں نے حضور ﷺ کی دُعا پر بآوازِ بلند آمین کہا۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اور دوسرے مسلمانوں کے ساتھ مدینہ منوّرہ کو مراجعت فرمائی۔

(۴)

ذیقعدہ ۷ ہجری میں رحمتِ عالم ﷺ اپنے جان نثاروں کے ہمراہ عمرۃ القضا کے لیے مکہ تشریف لے گئے۔ اس مقدس سفر میں حضرت جعفر رضی اللہ عنہ بھی حضور ﷺ کے ہمرکاب تھے۔ چونکہ پچھلے سال صلح حدیبیہ کے وقت یہ شرط قرار پائی تھی کہ مسلمان ہتھیار اتار کر مکہ میں داخل ہوں گے، اس لیے مسلمانوں نے اپنے تمام ہتھیار مکہ سے آٹھ میل ادھر قریہ بطن میں چھوڑ دیے اور سو سواروں کا ایک دستہ ان کی حفاظت پر متعین کر دیا۔ باقی مسلمان غیر مسلح حالت میں بڑے ذوق وشوق سے مکہ میں داخل ہوئے۔ ان میں حضرت جعفر رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ سرورِ عالم ﷺ لبیک کہتے ہوئے مسجدِ حرام میں داخل

ہوئے۔ حجر اسود کو بوسہ دیا اور طواف کیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی آپ کی تقلید کی۔ تین دن گزرنے پر قریش نے مطالبہ کیا کہ معاہدۂ حدیبیہ کی شرط پوری ہو چکی، اس لیے اب مسلمان مکہ سے باہر چلے جائیں حضور ﷺ نے یہ مطالبہ بلا تامّل قبول کر لیا اور اسی وقت مکہ خالی کر دیا۔ مکہ سے چلتے وقت ایک عجیب اثر میں ڈوبا ہوا منظر سامنے آیا۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شہیدِ اُحد کی یتیم بچّی اُمامہ رضی اللہ عنہا یا عَم یا عَم (چچا چچا) اور بروایتِ دیگر بھائی بھائی کہتی ہوئی حضور ﷺ کی طرف دوڑیں (حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے چچا بھی تھے اور رضاعی وخالہ زاد بھائی بھی۔ اس اعتبار سے اُمامہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کی بنتِ عَم بھی تھیں اور بھتیجی بھی) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو اٹھا لیا اور لا کر حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے سپرد کر دیا کہ یہ تمہاری بنتِ عم ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے بھی اُمامہ رضی اللہ عنہا کے لیے اپنے دعوے الگ الگ پیش کیے۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ یہ میرے چچا کی لڑکی ہے اور اس کی حقیقی خالہ (اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا) میری اہلیہ ہے۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ حمزہ رضی اللہ عنہ میرے دینی (مواخاتی) بھائی تھے، اس لیے اس کی پرورش اور تربیت میرے ذِمّہ ہے۔ اللہ اللہ یہ ناز اور محبت کا جھگڑا اس معاشرے میں ہو رہا تھا جس میں اسلام سے پہلے بچّیوں کو زندہ زمین میں گاڑ دیا جاتا تھا۔ سرورِ عالم ﷺ نے فیصلہ صادر فرمایا کہ اُمامہ رضی اللہ عنہا کی سرپرستی کے حقدار جعفر رضی اللہ عنہ ہیں کیونکہ ان کے گھر اُمامہ رضی اللہ عنہا کی خالہ ہے اور خالہ بمنزلہ ماں کے ہوتی ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ کے ارشاد کے مطابق حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اُمامہ بنتِ حمزہ رضی اللہ عنہا کو اپنے گھر لے آئے اور اپنی اہلیہ (اُمامہ رضی اللہ عنہا کی خالہ) کے سپرد کر دیا۔

(۵)

صلح حدیبیہ کے بعد سرورِ عالم ﷺ نے سلاطین و امراء کے نام دعوتِ اسلام کے خطوط بھیجے، تو ایک تبلیغی خط حضرت حارث بن عمیر ازدی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ حاکمِ بصریٰ کے پاس بھیجا، یہ شخص ایک عرب خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور عیسائی رومیوں کی طرف سے

بُصریٰ پر حکومت کر رہا تھا۔ حضرت حارث رضی اللہ عنہ موتہ کے مقام پر پہنچے، تو بلقاء کے رئیس شُرَحبیل بن عمرو غسانی نے انہیں شہید کر ڈالا۔ سفیر کا قتل ایک نہایت قبیح اور غیر انسانی جرم تھا۔ حضور ﷺ نے اس کا انتقام لینے کے لیے تین ہزار مجاہدین کا لشکر حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں روانہ فرمایا۔ اس لشکر میں حضرت جعفر رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ اس موقع پر حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کی:

''یا رسول اللہ مجھے یہ اُمید نہ تھی کہ آپ زید رضی اللہ عنہ کو مجھ پر امیر بنائیں گے۔''

حضور ﷺ نے فرمایا: ''جعفر اس بات کو جانے دو، تم نہیں جانتے کہ اللہ کے نزدیک بہتر کیا ہے۔''

سرورِ کون و مکان ﷺ نے تھوڑی دُور تک اس لشکر کی مشایعت فرمائی اور اس کو رخصت کرتے وقت فرمایا۔ ''اگر لڑائی میں زید رضی اللہ عنہ شہید ہو جائیں، تو جعفر رضی اللہ عنہ امیرِ لشکر ہوں گے، وہ بھی شہید ہو جائیں، تو عبداللہ بن رواحہ انصاری رضی اللہ عنہ قیادت سنبھالیں گے۔''

اس چھوٹے سے لشکر کی نقل و حرکت کی خبر حاکمِ بُصریٰ کو ملی تو اس نے بڑے زور شور سے مقابلے کی تیاری کی اور اپنے حلیف قبائل کو ساتھ ملا کر ایک کثیر لشکر جمع کر لیا۔ اتفاق سے ہرقل شاہِ روم بھی اسی علاقے میں خیمہ زن تھا۔ اس نے ہزاروں رومی جنگجو حاکمِ بُصریٰ کی مدد کے لیے بھیج دیئے۔ اس طرح ایک لاکھ عیسائی عرب اور رومی جنگجو مسلمانوں کے مقابلے پر آ گئے۔ اپنی قلیل تعداد کے باوجود مسلمان اس مہیب طاغوتی قوّت سے بھڑ گئے اور موتہ کے میدان میں حق و باطل کے درمیان گھمسان کا رن پڑا، مسلمان جان توڑ کر لڑے اور کشتوں کے پشتے لگا دیئے، لیکن دشمن کا ٹڈی دل کسی طرح کم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ عین اس وقت جب لڑائی پورے شباب پر تھی امیرِ لشکر حضرت زید رضی اللہ عنہ مردانہ وار لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے ان کے

گرتے ہی آگے بڑھ کر پرچم اسلام اپنے ہاتھ میں لیا اور گھوڑے سے کود کر اس کی کونچیں کاٹ دیں۔ پھر تلوار چلاتے ہوئے دشمن کی صفوں میں گھس گئے۔ اس وقت ان کی زبان پر یہ رجز جاری تھا:

یَاحَبَذَا الْجَنَّةُ وَ اَقْتِرَابُهَا   طَيِّبَةٌ وَ بَارِدًا اَشْرَابُهَا
وَالرُّوْمُ رُوْمٌ قَدْدَنَا عَذَابُهَا   كَافِرَةٌ بُعِيدَةٌ اُنْسَابُهَا
عَلَيَّ اذلاقيتها ضِرَابُهَا

(ترجمہ) جنت کیا ہی اچھی ہے اور اس کی قربت کتنی پیاری ہے۔ اور اس کا پانی نہایت ٹھنڈا ہے۔

رومی وہ لوگ ہیں جن کے عذاب کا وقت قریب آ گیا ہے، یہ کافر ہیں اور ان کے نسب ناموں میں گڑبڑ ہے۔

مجھ پر فرض تھا کہ جب وہ میرے سامنے آئیں تو میں ان پر وار کروں۔

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ پر ہر طرف سے تیروں، تلواروں اور برچھیوں کی بارش ہو رہی تھی، لیکن وہ زخم پر زخم کھاتے آگے ہی آگے بڑھتے جاتے تھے۔ سارا جسم زخموں سے چھلنی ہو گیا تھا لیکن اس حالت میں بھی جو شخص اللہ کے اس شیر کے سامنے آتا تھا۔ آناً فاناً خاک وخون میں لوٹ جاتا تھا۔ آخر دشمنوں نے نرغہ کر کے ان کا ایک ہاتھ شہید کر ڈالا۔ انہوں نے فوراً دوسرے ہاتھ سے جھنڈا پکڑ لیا۔ دوسرا ہاتھ بھی کٹ گیا، تو علمِ اسلام کو سینے سے چمٹا لیا۔ اسی حالت میں دشمن کا ایک نیزہ ان کے سینے کے پار ہو گیا اور وہ فرشِ خاک پر گر گئے اور شہید ہو گئے۔ عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے علم سنبھالا۔ وہ بھی شہید ہو گئے، تو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے علم ہاتھ میں لیا اور اپنی بے مثال شجاعت اور عسکری مہارت کی بدولت اسلامی فوج کو بچا لائے۔

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جعفر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد میں نے ان کی لاش کو دیکھا تو نوے سے زیادہ زخم تھے اور ان میں سے کوئی بھی

زخم پیٹھ پر نہ تھا۔

حافظ ابنِ کثیر رحمۃ اللہ علیہ، طبرانی رحمۃ اللہ علیہ اور بعض دوسرے اہل سیَر نے لکھا ہے کہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ وہ پہلے آدمی ہیں جنھوں نے اپنی سواری کے جانور کی کونچیں حق کے راستے میں کاٹیں۔

(۶)

تمام اربابِ سیَر و مغازی نے جنگِ موتہ کے سلسلے میں یہ روایت تواتر کے ساتھ نقل کی ہے کہ جس وقت موتہ کے میدان میں مسلمانوں اور رومیوں کے درمیان خونریز لڑائی ہو رہی تھی، سرورِ عالم ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کے درمیان مسجدِ نبوی میں رونق افروز تھے۔ یکایک آپ ﷺ نے فرمایا:

''نشان لیا زید رضی اللہ عنہ نے اور وہ شہید ہوئے، نشان لیا اب جعفر رضی اللہ عنہ نے، اور وہ شہید ہوئے، نشان لیا اب عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے اور وہ شہید ہوئے۔ نشان لیا اب اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار نے۔''

گویا میدانِ جنگ کا نقشہ حضور ﷺ کے بالکل سامنے تھا، اسی واقعہ کی بناء پر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ، سیف اللہ کے لقب سے مشہور ہوئے۔

اس وقت اللہ تعالیٰ نے میدانِ جنگ کو آپ ﷺ کی نظروں کے سامنے کر دیا تھا۔ یا جبریلِ امین علیہ السلام آپ ﷺ کو لحظہ لحظہ کی خبریں پہنچا رہے تھے، صورتِ واقعہ کچھ بھی ہو اس بات پر سب اہلِ سیَر کا اتفاق ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت زید رضی اللہ عنہ، حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر مجاہدین کی موتہ سے مراجعت سے بہت پہلے لوگوں کو سنا دی تھی۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضور ﷺ نے جس وقت اپنے محبوب جان نثاروں کی شہادت کی خبر لوگوں کو سنائی تو آپ ﷺ کی آنکھوں سے سیلِ اشک رواں تھا۔ علامہ ابنِ سعد کا بیان ہے کہ اس موقع پر حضور ﷺ نے کھڑے ہو کر پہلے حضرت زید رضی اللہ عنہ، جعفر رضی اللہ عنہ اور عبداللہ رضی اللہ عنہ کے محاسن بیان فرمائے اور

پھر فرمایا: ''اے اللہ زید کو بخش دے، اے اللہ جعفر کو بخش دے، اے اللہ عبداللہ بن رواحہ کو بخش دے۔''

علامہ ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ''اُسد الغابہ'' میں لکھا ہے کہ اس موقع پر حضور ﷺ نے یہ الفاظ بھی ارشاد فرمائے:

اخوانی و مونسائی و محدثائی

(یہ میرے بھائی، میرے مونس اور میرے جلیس تھے)

حضرت جعفر رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت کا اعلان کرنے کے بعد (یا بروایتِ دیگر اس سے پہلے حضور ﷺ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے۔ اس وقت ان کی اہلیہ حضرت اسماء بنتِ عمیس رضی اللہ عنہا آٹا گوندھ چکی تھیں اور بچوں کو نہلا دُھلا کر کپڑے پہنا رہی تھیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا، جعفر کے بچوں کو میرے پاس لاؤ۔ اُنہوں نے ان کو حاضر خدمت کیا تو حضور ﷺ آبدیدہ ہو گئے اور ان کو پیار کیا، حضرت اسماء رضی اللہ عنہا مضطرب ہو گئیں اور پوچھا: ''یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان، کیا جعفر کے بارے میں کوئی خبر آئی ہے؟''

حضور ﷺ نے فرمایا، ہاں' وہ شہید ہو گئے ہیں۔

یہ سن کر حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کی چیخ نکل گئی۔ ان کے رونے دھونے کی آواز سن کر محلے کی عورتیں ان کے گرد جمع ہو گئیں اور ان کی دلجوئی کرنے لگیں۔ ان کے بعد سرورِ عالم ﷺ اپنے گھر تشریف لے گئے اور ازواجِ مطہرات سے فرمایا کہ جعفر کے بچوں کے لیے کھانا پکاؤ۔ آج وہ اپنے ہوش میں نہیں ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر سُنی تو وہ ''واعماہ واعماہ'' کہہ کر روتی ہوئی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''بے شک جعفر جیسے شخص پر رونے والیوں کو رونا چاہیے۔''

علامہ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت فاطمۃ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ

جعفر رضی اللہ عنہ کے بچوں کے لیے کھانا تیار کرو کیونکہ آج اسماء رضی اللہ عنہا رنج وغم میں مصروف ہے۔

تیسرے دن حضور ﷺ پھر حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے اور حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کو صبر کی تلقین فرمائی۔

ایک اور روایت میں حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے عبداللہ رضی اللہ عنہ (جو اس وقت کم سن تھے) بیان کرتے ہیں کہ میرے باپ کی شہادت کے بعد رسول اللہ ﷺ مجھے اور میرے بھائیوں کو لے کر مسجدِ نبوی میں تشریف لے گئے اور درد وغم بھری آواز میں مسلمانوں کو حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر سنائی۔ پھر آپ نے ہمیں اپنے ساتھ کھانا کھلایا۔ تین روز تک ہم وہیں کھانا کھاتے رہے اور حضور ﷺ ہمارے گھر تشریف لاتے رہے۔

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے کچھ عرصہ بعد سرورِ عالم ﷺ نے ایک دن لوگوں کو بتایا کہ جبریل علیہ السلام نے مجھے خبر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جعفر کو ان کے کٹے ہوئے بازوؤں کے عوض دو نئے بازو عطا کیے ہیں جن سے وہ جنت میں فرشتوں کے ساتھ اڑتے پھرتے ہیں۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا، میں نے جعفر کو بہشت میں فرشتوں کی طرح اڑتے ہوئے دیکھا۔ حضور ﷺ کے اسی ارشاد کی بناء پر حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کا لقب طیار مشہور ہو گیا۔ بعض روایتوں میں ان کا لقب طیار کے علاوہ ''ذوالجناحین'' بھی بتایا گیا ہے۔

(۷)

سیّدنا حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نہایت حسین وجمیل اور وجیہ آدمی تھے۔ اربابِ سیَر نے لکھا ہے کہ وہ صورت شکل میں سرورِ عالم ﷺ سے کمال درجے کی مشابہت رکھتے تھے۔ صرف صورت ہی نہیں بلکہ سیرت وکردار کے اعتبار سے بھی وہ اخلاقِ پیمبری کا ایک مثالی پیکرِ جمیل بن گئے تھے۔ صحیح بخاری میں روایت ہے کہ خود رحمتِ عالم ﷺ فرمایا کرتے تھے۔ ''جعفر تم صورت اور سیرت دونوں میں مجھ سے مشابہت رکھتے ہو۔''

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اگرچہ کوئی امیر آدمی نہ تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں بڑا وسیع ظرف عطا کیا تھا اور وہ اپنی ضروریات پر اصحابِ صُفّہ اور دوسرے غریبوں مسکینوں کی ضروریات کو ترجیح دیتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ (جو اصحابِ صفہ رضی اللہ عنہما میں سے ایک تھے) فرماتے ہیں کہ جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ مسکینوں کے حق میں نہایت بھلے انسان تھے۔ وہ ہم لوگوں کو اپنے گھر لے جاتے اور جو کچھ گھر میں ہوتا، ہمیں کھلاتے تھے، یہاں تک کہ گھر سے شہد یا گھی کا مشکیزہ نکال لاتے اور (جب یہ خالی ہو جاتا تو) اس کو پھاڑ دیتے۔ اس میں جو کچھ لگا ہوتا تھا ہم اس کو چاٹ لیتے تھے۔

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی اسی غریب نوازی کو دیکھ کر سرورِ عالم ﷺ ان کو ''ابو المساکین (مسکینوں کا باپ)'' کہا کرتے تھے۔

حبش کے دورانِ قیام میں حضرت اسماء بنتِ عمیس رضی اللہ عنہا کے بطن سے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے تین بچے ہوئے تھے۔ عبداللہ رضی اللہ عنہ، محمد رضی اللہ عنہ اور عون رضی اللہ عنہ۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ حبش سے واپس آئے تو اپنے نو عمر فرزند عبداللہ رضی اللہ عنہ کو حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیا، حضور ﷺ نے مسکرا کر ان کی بیعت لی اور دعا دی۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضور ﷺ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ پر غیر معمولی شفقت فرماتے تھے۔ حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ ''اصابہ'' میں لکھا ہے کہ ایک دن حضور ﷺ نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر دعا کی:

''الٰہی عبداللہ کو جعفر رضی اللہ عنہ کا صحیح جانشین بنا، اس کی بیعت میں برکت عطا فرما اور میں دنیا اور آخرت دونوں میں آلِ جعفر کا والی ہوں۔''

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ اور ان کے بھائی یتیم ہوئے، تو سرورِ اکرم ﷺ ان کی پرورش اور نگرانی فرماتے رہے۔ حضور ﷺ کے وصال کے بعد یہ ذمہ داری ان کے حقیقی چچا حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اٹھالی۔ حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ جوان ہوئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی لختِ جگر زینب رضی اللہ عنہا کو ان سے بیاہ دیا۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ بعض اوقات میں چچا (حضرت علی رضی اللہ عنہ) سے کچھ مانگتا تو وہ انکار کر دیتے تھے۔لیکن جب میں اپنے باپ (جعفر رضی اللہ عنہ) کا واسطہ دیتا، تو ضرور کچھ نہ کچھ دے دیتے تھے۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی نسل حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ ہی سے چلی۔ دوسرے صاحبزادے لاولد فوت ہوئے۔

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے حبشہ سے واپسی کے تھوڑے ہی عرصہ بعد شہادت پائی۔اس لیے انہیں حدیث بیان کرنے کا موقع نہیں ملا۔ البتہ ابنِ عساکر رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی زبانی ایک طویل روایت نقل کی ہے جس میں انہوں نے اپنے قیامِ حبشہ اور وہاں سے مدینہ آنے کے واقعات تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے علم و فضل، فہم و فراست، جوشِ ایمان اور حق گوئی کا اندازہ اس تقریر سے بخوبی کیا جا سکتا ہے جو انہوں نے شاہِ حبشہ کے دربار میں کی۔اس کے بعد انہوں نے جس حکیمانہ انداز میں بادشاہ کے سوالوں کے جواب دیئے، اسی کا اثر تھا کہ فرمانروائے حبشہ کو قبولِ اسلام کی سعادت نصیب ہوئی اور غریب الوطن مسلمان سالہا سال تک حبش میں امن و سکون کی زندگی گزارتے رہے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

حضرت عُمیر بن ابی وقّاص رضی اللہ عنہ

حق و باطل کا پہلا معرکہ رمضان المبارک ۲ ہجری میں بدر کے میدان میں ہوا۔ لڑائی شروع ہونے سے پہلے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دیکھا کہ ایک سبزہ آغاز نوجوان مجاہدین کی صفوں میں اِدھر اُدھر چھپتا پھرتا ہے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی نظر اس پر پڑی تو انہوں نے اُسے اپنے پاس بلایا اور پوچھا "جانِ برادر! یہ تم کیا کر رہے ہو؟" نوجوان نے جواب دیا۔ "بھائی جان! میں اللہ کی راہ میں لڑنا چاہتا ہوں، شاید اللہ تعالیٰ مجھے شہادت نصیب کرے۔ لیکن ڈر ہے کہ رسول اللہ ﷺ مجھے چھوٹا سمجھ کر لڑائی میں شریک ہونے کی اجازت نہ دیں۔"

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نوجوان کی بات سُن کر خاموش ہو گئے۔ جب حضور ﷺ نے اپنے جان نثاروں کی صفوں کا مُعائنہ فرمایا تو نوجوان کا خدشہ دُرست ثابت ہوا۔ حضور ﷺ نے ان سے فرمایا "بیٹے! تمہاری عمر ابھی لڑنے کی نہیں ہے۔ اس لیے تم واپس جاؤ۔" حضور ﷺ کا ارشاد سُن کر وہ نوجوان رونے لگے اور بار بار التجا کرنے لگے کہ "یا رسول اللہ! مجھے لڑائی میں شریک ہونے کی اجازت ضرور مرحمت فرمایئے۔ شاید میں اللہ تعالیٰ کے راستے میں کام آ جاؤں۔"

سَرورِ عالم ﷺ نوجوان کے جوشِ ایمان اور شوقِ شہادت سے بہت متاثر ہوئے اور انہیں لڑائی میں شریک ہونے کی نہ صرف اجازت دے دی بلکہ اپنے دست مبارک سے ان کے تلوار باندھی۔

یہ سعادت مند نوجوان جن کے دل میں شہادت کی اس قدر تڑپ تھی، حضرت عمیر

بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ تھے۔ وہ قریش کے خاندان بنوزہرہ کے چشم و چراغ تھے اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فاتحِ عراق و عرب کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے۔ سلسلہ نسب یہ ہے:

عمیر بن مالک رضی اللہ عنہ (ابو وقاص) بن وہیب بن عبد مناف بن زہرہ بن کلاب بن مُرّہ بن کعب بن لُوی بن غالب بن فہر۔

بعدِ بعثت کے ابتدائی زمانے میں جن نفوسِ قدسی کو سبقت فی الاسلام کی سعادت نصیب ہوئی ان میں حضرت عمیر رضی اللہ عنہ کے دو بڑے بھائی حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور حضرت عامر بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ عمیر رضی اللہ عنہ اس وقت بہت کم عمر تھے لیکن ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، جب ذرا سوجھ بوجھ پیدا ہوئی تو بڑے بھائی کی پیروی میں وہ بھی جادۂ توحید پر گامزن ہو گئے اور راہِ حق میں سر کٹانے کے لیے بے چین رہنے لگے۔ مکہ میں جب پرستارانِ حق پر کفار کے ظلم وستم کی انتہا ہو گئی تو سرورِ عالم ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو ہجرت مدینہ کا حکم دیا۔ حضرت عمیر رضی اللہ عنہ بھی بھائیوں کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ پہنچ گئے۔ ہجرتِ نبوی ﷺ کے چند ماہ بعد جب حضور ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے مابین مواخاۃ قائم کرائی تو حضرت عمیر رضی اللہ عنہ کو سیّد الاوس حضرت سعد بن معاذ اشہلی رضی اللہ عنہ کے چھوٹے بھائی حضرت عمرو بن معاذ رضی اللہ عنہ کا اسلامی بھائی بنایا۔

رحمتِ عالم ﷺ غزوۂ بدر کے لیے روانہ ہوئے تو حضرت عمیر رضی اللہ عنہ کو شوقِ جہاد نے بے تاب کر دیا اور وہ بھی حضور ﷺ کے ہمرکاب جاں نثاروں میں شامل ہو گئے۔ ان کی کم عمری کے پیشِ نظر سرورِ عالم ﷺ انہیں لڑنے کی اجازت دینے میں متامل تھے۔ لیکن جب انہوں نے شوق جہاد اور آرزوئے شہادت کا اظہار گریہ وبکا کی صورت میں کیا تو حضور ﷺ نے انہیں لڑائی میں شریک ہونے کی اجازت دے دی۔ اس طرح گویا انہیں سارے جہاں کی نعمتیں مل گئیں۔ تلوار چلاتے ہوئے دشمنوں کی صفوں میں گھس گئے اور دیر تک دادِ شجاعت دیتے رہے۔

کفار کا نامی شہسوار عمرو بن عبدِ ودّ جو ایک ہزار شجاعانِ عرب کے برابر ہوتا تھا۔ مشرکین میں موجود تھا۔ وہ جھلا کر حضرت عمیر رضی اللہ عنہ پر حملہ آور ہوا اور اسلام کے اس نہالِ تازہ کو اپنی خون آشام تلوار سے کاٹ دیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ○ یوں یہ سبزہ آغاز نوجوان اپنی مراد کو پہنچ گیا۔ حضرت عمیر رضی اللہ عنہ نے اپنے خونِ شہادت سے صفحہ تاریخ پر جو نقش مرتسم کیے وہ نوجوانانِ ملت کے لیے تا ابد مشعلِ راہ بنے رہیں گے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ
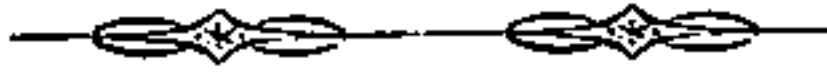
حضرت عامر بن فُہیرہ رضی اللہ عنہ

(۱)

ابوعمرو عامر رضی اللہ عنہ بن فہیرہ، امّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے اخیافی بھائی طفیل بن عبداللہ کے غلام تھے۔ وہ ظاہری صورت کے لحاظ سے ایک سیاہ فام حبشی تھے، لیکن ان کی جبلّت کو مبداء فیض نے ایسے نورانی سانچے میں ڈھالا تھا کہ مکہ کے ظلمت کدہ میں جونہی رسولِ عربی ﷺ نے شمعِ توحید روشن کی، وہ اس شمع کے پروانے بن گئے اور حضور ﷺ کے دارِ ارقم میں تشریف لے جانے سے پہلے ہی دولتِ ایمان سے بہرہ یاب ہو گئے۔

مشرکین بھلا یہ کیونکر گوارا کر سکتے تھے کہ ایک بیکس غلام ان کے سامنے توحید کا دم بھرے۔ ان کے قہر و غضب کا طوفان پوری قوت سے حضرت عامر رضی اللہ عنہ پر پھٹ پڑا۔ کوئی ظلم ایسا نہ تھا جو ان بدبختوں نے اس مردِ حق پر نہ توڑا۔ کبھی انہیں بے دردی سے زدو کوب کرتے تھے کبھی گرم ریت اور کانٹوں پر گھسیٹتے تھے۔ عامر رضی اللہ عنہ اگرچہ نحیف الجثہ تھے، لیکن ان کے سینے میں فولاد کا دل تھا۔ انہوں نے نہایت ثابت قدمی اور استقلال کے ساتھ تمام مصیبتیں برداشت کیں اور ایک لحہ کے لیے بھی ان کے قدم جادۂ حق سے نہ ڈگمگائے۔ اتفاق سے ایک دن سیّدنا حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ نے انہیں اس حال میں دیکھ لیا کہ کفار انہیں کانٹے چبھو رہے تھے اور ان کی ڈاڑھی پکڑ کر طمانچے مار رہے تھے۔ صِدّیق اکبر رضی اللہ عنہ سے ان کی مظلومی دیکھی نہ گئی اور انہوں نے اسی وقت انہیں خرید کر آزاد کر دیا۔ اب عامر رضی اللہ عنہ تھے اور آستانہ نبوی تھا۔ دن رات اسی دُھن میں رہتے تھے کہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی خوشنودی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے پائے۔

(۲)

ہجرت کے موقع پر رحمتِ عالم ﷺ اور حضرت ابو بکر صِدّیق رضی اللہ عنہ غارِ ثور میں رونق افروز ہوئے تو صِدّیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے اہلِ خانہ کے علاوہ حضرت عامر بن فُہیرہ رضی اللہ عنہ بھی اس پُرخطر راز سے آگاہ تھے۔ گویا سرورِ عالم ﷺ اور صِدّیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے نزدیک وہ ایک ایسی شخصیت تھے جن پر ہر حال میں مکمل اعتماد کیا جا سکتا تھا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ دن بھر (حضرت ابو بکر صِدّیق رضی اللہ عنہ کی) بکریاں چراتے تھے اور شام کو انہیں غار کے منہ پر لے آتے تھے۔ یہاں ان کا دودھ دوہ کر سرکارِ دو عالم ﷺ اور صِدّیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش کرتے تھے۔

تین شب و روز کے بعد جب کائناتِ ارضی و سماوی کی یہ مقدس ترین ہستیاں غارِ ثور سے روانہ ہونے لگیں تو حضرت عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ بھی ان کے ہمرکاب ہو گئے۔ حضرت ابو بکر صِدّیق رضی اللہ عنہ نے انہیں اپنے اونٹ کے پیچھے بٹھا لیا اور یوں سفرِ ہجرت میں انہیں اپنے آقا و مولا ﷺ کی معیت کی سعادت نصیب ہوئی۔ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ جب اِس مقدس قافلے نے قُباء میں نزولِ اجلال فرمایا تو حضرت عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ کو حضرت سعد بن خیثمہ انصاری رضی اللہ عنہ نے اپنا مہمان بنایا۔

ورودِ مدینہ کے چند ماہ بعد حضور ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے مابین مواخاۃ قائم کرائی تو حضرت عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ کو حضرت حارث بن اوس رضی اللہ عنہ کا اسلامی بھائی بنایا۔

(۳)

مکہ اور مدینہ کی آب و ہوا میں بہت فرق تھا اس لیے مکہ سے آنے والے مہاجرین کو شروع شروع میں مدینہ کی آب و ہوا راس نہ آئی اور ان میں سے بعض اصحاب علیل ہو گئے۔ حضرت عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ بھی ان میں شامل تھے۔ ان کی علالت نے اتنی شدت اختیار کی کہ زندگی سے مایوس ہو گئے۔ اس حالت میں بار بار یہ شعر پڑھتے تھے۔

انی و جدتُّ الموت قبل ذوقہٖ
ان الجبانَ حتفہ من فوقہٖ
کل امرءٍ مجاھد" بطوقہٖ
کالثور یحمی اَنفَہ بروقہٖ

(میں نے موت سے پہلے ہی موت کا ذائقہ چکھ لیا۔ بے شک بزدل کی موت اس کے اوپر سے ہے۔
ہر شخص اپنی طاقت کے مطابق کوشش کرتا ہے۔ جس طرح بیل اپنے سینگ سے اپنی ناک کی حفاظت کرتا ہے۔)

صحیح بخاری میں ہے کہ سرورِ عالم ﷺ کو مہاجرین کی علالت کی خبر ہوئی تو آپ نے دُعا فرمائی:

''الٰہی تو مکہ کی طرح یا اس سے بھی زیادہ مدینہ کو ہمارے لیے خوشگوار بنا دے اور اس کی بیماریوں سے پاک وصاف کردے۔''

محبوبِ ربّ العالمین ﷺ کی دعا قبول ہوئی، مہاجرین صحت یاب ہو گئے اور حضرت عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ بھی بسترِ علالت سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

(۴)

حضرت عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ اخلاص فی الدین، زُہد و اتقا، شغفِ قرآن اور حُبّ رسول کے اعتبار سے ایک مثالی حیثیت رکھتے تھے۔ انوارِ رسالت کی تجلّیوں نے ان کے قلب و دماغ کو ایسا منور کیا تھا کہ خاصانِ خدا میں شامل ہو گئے تھے۔ رحمتِ دوعالم ﷺ سے والہانہ محبت اور عقیدت تھی اور آپ ﷺ کے معمولی اشارے پر اپنی جان راہِ حق میں قربان کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ رمضان المبارک ۲ ہجری میں حق و باطل کا معرکہ اوّل بدر کے میدان میں پیش آیا تو حضرت عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ اس میں بڑے ذوق وشوق سے شریک ہوئے اور پرستارانِ باطل کے خلاف خوب خوب

دادِ شجاعت دی۔

اگلے سال غزوۂ اُحد میں بھی رحمتِ عالم ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا اور بڑی بہادری سے لڑے۔ صفر ۴ ہجری میں سرورِ عالم ﷺ نے ابو براء کلابی کی استدعا پر ستر صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نجد کی طرف روانہ فرمائی۔ اس جماعت کے اکثر اراکین اصحابِ صُفّہ میں سے تھے اور قُرّاء (قرآن پڑھنے والے) کے لقب سے مشہور تھے۔ حضرت عامر بن فُہیرہ رضی اللہ عنہ بھی اس مقدس جماعت میں شامل تھے۔ جب یہ اصحاب بیر معونہ کے مقام پر پہنچے تو بنوکلاب کے سردار عامر بن طفیل نے غدّاری کی اور قبائل رعل و ذکوان کے مشرکین کو ساتھ لے کر ان پاکباز اصحاب پر حملہ کر دیا جو ان کو ہدایت اور نجات کا راستہ بتانے آئے تھے۔

یہ تمام مردانِ حق حضرت عمرو بن امیہ الضمری رضی اللہ عنہ کے سوا مشرکین کی تیغِ جفا کا شکار ہو گئے اور خلعتِ شہادت پہن کر خلدِ بریں میں پہنچ گئے۔ حضرت عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ کو ایک شخص جبار بن سلمٰی کلابی نے شہید کیا۔ جب اس نے پوری قوّت سے اپنا نیزہ حضرت عامر رضی اللہ عنہ کی پشت پر مارا تو انہوں نے گرتے ہوئے بے ساختہ فرمایا "فُزْتُ وَاللّٰہ" (خدا کی قسم میں کامیاب ہو گیا) اس وقت حضرت عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ کی لاش تڑپ کر آسمان کی طرف بلند ہوئی اور نظروں سے غائب ہو گئی۔ جبار بن سلمٰی کو یہ نظارہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی اور کفر کی تاریکی اس کے نہاں خانہ باطن سے کافور ہو گئی۔

ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ جبار بن سلمٰی اسی واقعہ سے متاثر ہو کر مشرّف بہ اسلام ہو گئے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ کو مشرکین نے زندہ گرفتار کر لیا اور پھر عامر بن طفیل نے اپنی ماں کی ایک منّت پوری کرنے کے لیے انہیں رہا کر دیا۔ وہ انہیں ساتھ لے کر صحابہ کے مقتل کی طرف گیا اور ایک لاش کی طرف اشارہ کر کے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ حضرت عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: "عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ"۔

عامر بن طفیل نے کہا کہ میں نے ان کو قتل ہونے کے بعد دیکھا کہ آسمان کی طرف اٹھا لیے گئے یہاں تک کہ آسمان اور زمین کے درمیان معلّق نظر آئے پھر ان کی لاش کو زمین پر رکھ دیا گیا۔

''اُسدُ الغابہ'' میں حضرت عروہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ بیان درج ہے کہ شہداء بئر معونہ میں حضرت عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ کی نعش تلاش کی گئی تو نہیں ملی۔ اس پر لوگوں نے خیال کیا کہ ان کی نعش کو فرشتے اٹھا کر لے گئے۔ سرورِ عالم ﷺ کو اس المناک واقعہ کی خبر ہوئی تو آپ ﷺ کو سخت صدمہ ہوا اور آپ ﷺ چالیس دن تک نمازِ فجر کے بعد قاتلوں کے لیے بددُعا کرتے رہے۔

ایک روایت میں ہے کہ واقعہ شہادت کے بعد عامر بن طفیل کلابی نے حضرت عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیا تو اپنے تمام ساتھیوں کو پہچانتا ہے۔ انہوں نے کہا، ہاں سب کو جانتا ہوں۔ چنانچہ عامر بن طفیل حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر شہداء کی لاشوں کے درمیان پھرنے لگا۔ وہ حضرت عمرو رضی اللہ عنہ سے ہر ایک شہید کا نام و نسب دریافت کرتا جاتا تھا۔ جب سب لاشوں کا نام و نسب دریافت کر چکا تو حضرت عمرو رضی اللہ عنہ سے پوچھا، ان میں کوئی کم ہے یا سب کی لاشیں موجود ہیں۔

حضرت عمرو رضی اللہ عنہ نے فرمایا، ان میں عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ نہیں ہیں۔ عامر بن طفیل نے پوچھا: تم لوگوں میں وہ کیسا شخص تھا؟ حضرت عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وہ ہم لوگوں میں سب سے افضل اور ہمارے نبی کریم ﷺ کے اوّلین صحابہ میں سے تھے۔

یہ سن کر عامر بن طفیل نے جبار بن سلمیٰ کلابی کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اس نے اس کو نیزے کی ضرب لگائی، جب نیزے کو اس کے جسم سے کھینچا تو ایک شخص مقتول کو اٹھا کر آسمان کی طرف لے گیا۔ اس کے بعد میں نے اسے نہیں دیکھا۔ حضرت عمرو بن اُمیہ رضی اللہ عنہ فوراً پکار اٹھے **ذٰلِکَ عامر بن فھیرہ** رضی اللہ عنہ (وہ عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ ہی تھے اور وہ ایسے ہی شخص تھے۔)

جبار بن سلمیٰ کلابی قاتل عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب میں نے عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ کو نیزہ مارا تو انہوں نے کہا، فُزتُ وَاللہ میں یہ نہ سمجھ سکا کہ ایسا کہنے سے ان کی کیا مراد ہے۔ چنانچہ میں ضحاک بن سفیان کلابی رضی اللہ عنہ کے پاس گیا جو رسول اللہ ﷺ کی طرف سے بنو کلاب کے عامل تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ "فُزتُ واللہ" کہنے سے مقتول کی کیا مراد تھی۔ ضحاک رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ان کی مراد یہ تھی، اس طرح شہادت پانے سے مجھے جنت مل گئی (اور میں اپنے مقصدِ زندگی میں کامیاب ہو گیا۔) پھر ضحاک رضی اللہ عنہ نے مجھے دعوتِ اسلام دی تو میں نے اسلام قبول کرنے کا اقرار کیا، لیکن میرے قبولِ اسلام کا اصل سبب وہ ماجرہ ہے جو میں نے عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

شہادت کے وقت حضرت عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ کی عمر بہ اختلافِ روایت ۳۴ برس یا چالیس برس کی تھی۔ انہوں نے اپنے پیچھے کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ
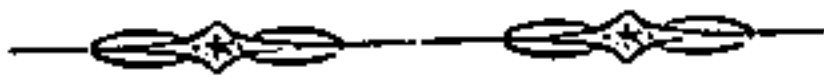
حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ - محبوبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

سنہ ۱۱ ہجری میں رحمتِ دوعالم ﷺ نے اپنے وصال سے چند دن پہلے حدودِ شام کی طرف بھیجنے کے لیے ایک لشکر مرتّب فرمایا۔ سات سو مجاہدین پر مشتمل اس لشکر میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کے علاوہ اور بھی بہت سے عظیم المرتبت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شامل تھے جو سب جذبہ شہادت سے سرشار تھے لیکن جب سرورِ دوعالم ﷺ نے اس لشکر کی قیادت کے لیے ایک اٹھارہ انیس سالہ نوجوان کو منتخب فرمایا تو کچھ لوگوں نے حیرت کا اظہار کیا کہ ایک نوعمر مجاہد کو مہاجرینِ اوّلین پر افسری کا استحقاق کیسے حاصل ہو گیا ہے۔ حضور ﷺ کو ان کے استعجاب کی خبر ہوئی تو آپ ﷺ علالتِ طبع کے باوجود سر پر پٹی باندھے ہوئے کاشانہ اقدس سے باہر تشریف لائے اور منبر پر رونق افروز ہو کر ایک پُرجلال خطبہ دیا جس میں فرمایا:

> ''لوگو! تم نے اس مہم کے قائد کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، مجھ کو اس کی اطلاع مل گئی ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں، اس سے پہلے تم اس کے باپ کے بارے میں ایسی ہی باتیں کہہ چکے ہو۔ خدا کی قسم وہ بھی افسری کا مستحق تھا اور اس کے بعد اس کا بیٹا بھی افسری کا مستحق ہے۔ وہ مجھ کو بہت محبوب تھا اور یہ بھی ہر خوش گمانی کے قابل ہے۔ اس لیے تم لوگ اس کے ساتھ بھلائی سے پیش آیا کرو کہ وہ تمہارے بہترین آدمیوں میں سے ہے۔''

حضور ﷺ کے ارشاداتِ مقدسہ نے لوگوں کو مبہوت کر دیا اور وہ بے اختیار پکار

اٹھے: ''یا رسول اللہ ﷺ ہم آپ کے فیصلے پر راضی ہیں اور اس نوجوان کی قیادت سب کو دل و جان سے منظور ہے۔''

یہ خوش بخت نوجوان جن کے بارے میں سیّد المرسلین فخرِ موجودات خیر الانام ﷺ نے بھرے مجمع میں اعلان فرمایا کہ وہ افسری کے سزاوار اور ہر نیک گمانی کے لائق ایک بہترین مسلمان ہیں، حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہما تھے۔

سیّدنا حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کا شمار بڑے جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم میں ہوتا ہے۔ ان کی کنیت ابو محمد بھی تھی اور ابو زید بھی اور وہ بنو قضاعہ کی ایک شاخ بنو کلب سے تعلق رکھتے تھے۔

حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے والد حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ وہ واحد صحابی ہیں جن کا نام قرآنِ پاک میں ہے۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ سرورِ عالم ﷺ کے آزاد کردہ غلام منہ بولے بیٹے اور سب سے پہلے ایمان لانے والی چار ہستیوں میں سے ایک تھے۔ ان کے جذبہ فدویت اور دوسرے اوصاف و محاسن کی بناء پر حضور ﷺ ان کو اس قدر عزیز جانتے تھے کہ وہ ''حُبّ رسول اللہ ﷺ (رسول ﷺ اللہ کے محبوب) کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔ حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کی والدہ برکتہ رضی اللہ عنہا جو تاریخ میں اپنی کنیت اُمِ ایمن سے مشہور ہیں۔ رسولِ اکرم ﷺ کے عہدِ طفلی میں آپ ﷺ کو کھلاتی تھیں، اس لیے حضور ﷺ ان کی بیحد تعظیم و تکریم فرماتے تھے اور ان کو ''امی'' کہہ کر مخاطب فرمایا کرتے تھے۔

علامہ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ ۷ بعدِ بعثت میں مکہ میں پیدا ہوئے۔ ماں باپ دونوں شمع رسالت ﷺ کے پروانے تھے اور سیّد الانام ﷺ انہیں اپنے گھر کے افراد کی طرح سمجھتے تھے۔ اس لیے حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ نے پہلے دن ہی سے اسلام کے بابرکت ماحول میں پرورش پائی۔ بقول حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ وہ اسلام کے سوا کچھ نہ جانتے تھے۔

سنہ ۱۴ بعدِ بعثت میں سرورِ عالم ﷺ مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لے گئے۔

اس وقت حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کی عمر سات برس کے قریب تھی۔ وہ اپنے والدہ حضرت اُمِ ایمن رضی اللہ عنہا کے ساتھ مکہ ہی میں مقیم رہے۔ البتہ ان کے والد حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ ۱۳ بعدِ بعثت کے اواخر میں حضور ﷺ کے ایماء پر ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے تھے۔ ہجرتِ نبوی ﷺ کے چند ماہ بعد حضور ﷺ نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کو مکے بھیجا۔ وہ اُمّ المومنین حضرت سودہ رضی اللہ عنہا اور حضور ﷺ کی دو صاحبزادیوں حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا اور حضرت اُمِ کلثوم رضی اللہ عنہا کے علاوہ حضرت اُمِ ایمن رضی اللہ عنہا اور حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کو بھی اپنے ساتھ مدینہ لے گئے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ نے ہجرت کا شرف سرورِ عالم ﷺ کی معیت میں حاصل کیا لیکن یہ صحیح نہیں۔ سفرِ ہجرت میں حضور ﷺ کی ہمرکابی کا شرف صرف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوا۔ عہدِ رسالت کے ابتدائی غزوات کے وقت حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کم عمر تھے۔ ان غزوات میں شریک ہونے کے آرزومند تھے، لیکن اُن کی کم عمری کے پیشِ نظر حضور ﷺ نے اجازت نہ دی۔ تاہم آپ کا سحابِ لطف و کرم حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ پر ہمیشہ برستا رہتا تھا۔ حضور ﷺ کے نواسے سیّدنا حضرت حسن رضی اللہ عنہ ۳ھ میں اور سیّدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ ۴ھ میں پیدا ہوئے۔ ہجرت کے پہلے سال حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بھی حریمِ نبوی میں آ چکی تھیں۔ یہ تمام ہستیاں حضور ﷺ کو بہت محبوب تھیں، لیکن آپ ﷺ اپنے محبت اور شفقت میں حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کو بھی برابر شریک رکھتے تھے۔ وہ اگرچہ دس گیارہ برس کے ہو گئے تھے، لیکن کاشانہ نبوی ﷺ میں آزادانہ آتے جاتے تھے۔ حضور ﷺ کبھی کبھی ازراہِ شفقت ان سے مزاح بھی فرماتے تھے۔ طبقات ابنِ سعد میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کاشانہ نبوی ﷺ میں بیٹھے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بھی موجود تھیں۔ حضور ﷺ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''عائشہ اگر یہ لڑکی ہوتا تو میں اس کو خوب زیور پہناتا اور بناتا سنوارتا تاکہ اس کے حسن و جمال کی شہرت ہوتی اور لوگ جگہ جگہ سے اس کے رشتے کے لیے پیغام بھیجتے۔''

ایک مرتبہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ دروازے کی چوکھٹ پھلانگتے ہوئے گر پڑے اور ان کے ماتھے سے خون بہنے لگا، حضور ﷺ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ اس کا خون صاف کر دو۔ انہوں نے خون سے کچھ کراہت محسوس کی تو آپ ﷺ نے خود اٹھ کر صاف کر دیا اور زخم پر اپنا لعاب دہن لگایا۔

مُسندِ احمد رحمۃ اللہ علیہ میں خود حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ مجھے پکڑتے اور اپنی دائیں ران پر بٹھاتے اور حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کو پکڑتے اور اپنی بائیں ران پر بٹھاتے پھر ہم دونوں کو ملا کر دعا کرتے:

''الٰہی میں ان دونوں پر رحم کرتا ہوں۔ تو بھی ان پر رحم فرما۔''

صحیح بخاری میں ہے کہ حضور ﷺ وضو فرماتے تو حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو اکثر پانی ڈالنے کی سعادت نصیب ہوتی تھی۔ حضور ﷺ ان کو اکثر سفر میں بھی اپنے ساتھ رکھتے تھے۔

۵ھ ہجری میں غزوۂ بنو مصطلق کے موقع پر افک کا افسوسناک واقعہ پیش آیا۔ اس میں عبداللہ بن اُبی اور بعض دوسرے لوگوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر ناپاک تہمت لگائی۔ اس تہمت طرازی سے حضور ﷺ کو قدرتاً ملال ہوا۔ گو اُمّ المومنین رضی اللہ عنہا کی بے گناہی مسلّم تھی، لیکن تہمت لگانے والوں کا منہ بند کرنے کے لیے تحقیق ضروری تھی، چنانچہ آپ ﷺ نے اس سلسلہ میں بعض صحابہ رضی اللہ عنہم اور صحابیات رضی اللہ عنہن سے مشورہ کیا۔ ان میں بارہ سالہ حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ چونکہ کاشانہ نبوی ﷺ میں ان کا گھر کے افراد کی طرح آنا جانا تھا، اس لیے ان کی رائے خاص اہمیّت کی حامل تھی۔ حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ نہایت صادق القول تھے۔ انہوں نے پُر زور طریقے سے حضرت

عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی پاکدامنی اور ارفع و اعلیٰ کردار کی شہادت دی۔ ساتھ ہی حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ ﷺ بالکل ملول نہ ہوں، اللہ تعالیٰ خود تہمت طرازوں کے جھوٹ کا پردہ چاک کر دے گا۔

حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کا قیاس درست ثابت ہوا اور آیاتِ برات نازل ہوئیں جن میں اللہ تعالیٰ نے اُمّ المومنین رضی اللہ عنہا کی پاک دامنی کی تصدیق کر دی۔

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کو بارگاہِ نبوی ﷺ میں جو خصوصیت حاصل تھی اس کی بناء پر منافقین ان سے بہت حسد کرتے تھے اور ان کے نسب میں تہمت لگاتے تھے۔ حضور ﷺ تک ان کی باتیں پہنچتیں تو آپ ﷺ کو بہت رنج ہوتا۔ اسی زمانے میں ایک دن عرب کا ایک مشہور قیافہ شناس مجرز مدلجی (یا اسلمی) حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ اپنے والد حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایک چادر اوڑھے سو رہے تھے۔ دونوں کے پاؤں البتہ چادر سے باہر تھے۔ مجرز نے پاؤں دیکھ کر کہا کہ یہ پیرا ایک دوسرے سے پیدا ہیں۔ یہ سُن کر حضور ﷺ بہت خوش ہوئے، ہنستے ہوئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا تم نے سنا مجرز نے ابھی اُسامہ رضی اللہ عنہ اور زید رضی اللہ عنہ کے پاؤں دیکھ کر کہا کہ یہ ایک دوسرے سے پیدا ہیں۔ شارحینِ حدیث نے لکھا ہے کہ حضور ﷺ کی مسرّت کا یہ سبب تھا۔ کہ مجرز نے جو کچھ کہا اس کی وجہ سے حاسدوں کے منہ بند ہو گئے۔ کیونکہ ان کے نزدیک قیافہ شناسوں کی باتیں الہام کا درجہ رکھتی تھیں، ورنہ حضور ﷺ کی شان اس سے بہت بلند تھی کہ آپ ﷺ کو قیافہ شناسوں کی احتیاج ہو۔

حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کی عمر ۱۴ برس کی ہوئی تو حضور ﷺ نے انہیں زینب بنتِ حنظلہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ رشتہ ازواج میں منسلک کر دیا، لیکن دونوں میاں بیوی میں بن نہ آئی اور علیٰحدگی ہو گی۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے ان کی شادی حضرت نعیم بن عبداللہ رضی اللہ عنہ النحام عدوی کی صاحبزادی سے کر دی۔ ان کے بطن سے ابراہیم بن اُسامہ رضی اللہ عنہ پیدا

ہوئے۔ایک مرتبہ حضرت دِحیہ کلبی رضی اللہ عنہ نے کتان کا کپڑا حضور ﷺ کو ہدیہ میں دیا۔ آپ ﷺ نے یہ حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کو عنایت فرما دیا۔ایک دن ان سے پوچھا کہ تم کتان کیوں نہیں پہنتے۔انہوں نے عرض کیا: ''یارسول اللہ ﷺ میں نے بیوی کو دے دیا۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اچھا تو اس سے کہہ دو کہ نیچے سینہ بند پہن لے ورنہ بدن دکھائی دے گا۔'' ایک مرتبہ ذی یزن نے حالتِ شرک میں ایک بیش قیمت حُلَہ ہدیۃً بھیجا۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں مشرک کا ہدیہ قبول نہیں کرتا، لیکن میں اب تم سے قیمتاً لے لیتا ہوں، چنانچہ پچاس دینار میں خرید لیا اور ایک دن پہن کر حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کو عطا کر دیا۔

ابنِ ہشام کا بیان ہے کہ ۷ ھ کے اوائل میں خیبر فتح ہوا تو حضور ﷺ نے حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کا وظیفہ مقرر فرما دیا۔ یہ وظیفہ اس زمین کے ایک حصّے کے پھلوں اور پیداوار کی صورت میں تھا جو حضور ﷺ کو فتح خیبر کے بعد فے میں ملی۔اس کے انتظام کے لیے وہ اکثر وہاں جایا کرتے تھے۔

حضرت اُسامہ پندرہ برس کے ہوئے تو حضور ﷺ نے انہیں ایک اہم مہم کا امیر بنا کر حرقہ (حرقاتِ جہینہ) کی طرف بھیجا۔تاریخ میں یہ مہم سَرِیّہ حرقہ (حرقات) کے نام سے مشہور ہے۔اس مہم میں ناتجربہ کاری کے باعث ان سے ایک غلطی سرزد ہوگئی۔جس پر ہمیشہ متاسّف اور نادم رہے۔صحیح بخاری میں خود ان سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم لوگوں کو حرقہ کی طرف بھیجا۔صبح کو دشمنوں سے مقابلہ ہوا تو وہ ہم سے شکست کھا کر بھاگے۔میں نے اور ایک انصاری نے ایک شخص کا پیچھا کیا۔جب وہ ہماری زد میں آ گیا تو کلمہ شہادت پڑھنے لگا۔اس پر میرے ساتھی نے ہاتھ روک لیا، لیکن میں نے اس کو قتل کر دیا۔جب ہم مدینہ واپس آئے اور حضور ﷺ کو یہ واقعہ معلوم ہوا تو آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: ''اُسامہ تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا حالانکہ وہ کلمہ شہادت پڑھتا تھا۔''

میں نے عرض کیا: ''یارسول اللہ ﷺ! اس نے محض جان بچانے کے لیے ایسا کیا

تھا۔"

حضور ﷺ نے میرا عذر رد فرما دیا اور بار بار اپنا یہ ارشاد دہراتے رہے کہ تم نے ایک شخص کو کلمہ شہادت پڑھنے کے باوجود قتل کر دیا۔ مجھ کو اس قدر ندامت ہوئی کہ دل میں کہنے لگا "کاش میں آج سے پہلے اسلام نہ لایا ہوتا۔"

یہ سریہ باختلاف روایت ۷ ھ یا ۸ ھ میں پیش آیا۔ ایک روایت کے مطابق حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ قتل ہونے والے شخص کا نام مرداس بن نہیک تھا۔

رمضان المبارک ۸ ہجری میں مکہ فتح ہوا تو حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کو رحمتِ دو عالم ﷺ کا ردیف بننے کا عظیم شرف حاصل ہوا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضور ﷺ مکہ معظمہ کی فتح کے بعد بیت اللہ میں داخل ہوئے تو حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی سواری (ناقہ) پر آپ ﷺ کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے جلو میں تھے۔

فتح مکہ کے بعد حضور ﷺ نے مختصر مدت کے لیے مکہ معظمہ میں قیام فرمایا۔ اس دوران میں ایک افسوس ناک واقعہ پیش آیا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ بنو مخزوم کی ایک عورت سے (جس کا نام بعض روایات میں فاطمہ بنتِ اسود آیا ہے۔) چوری کی لغزش سرزد ہو گئی۔ (باختلافِ روایت اس نے کسی کا زیور چوری کر لیا یا حضور ﷺ کے کاشانہ اقدس سے ایک چادر چرالی) اور وہ پکڑی گئی۔ بنو مخزوم کے لوگ گھبرائے ہوئے حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے اور ان سے درخواست کی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اس خاتون کی شفارش کریں۔ حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ نے ان کی بات مان لی اور حضور ﷺ سے التجا کی کہ اس خاتون سے رعایت فرمائی جائے۔ حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کو بے حد محبوب تھے۔ لیکن حدود اللہ کا معاملہ تھا۔ اس لیے حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کی بات سُن کر حضور ﷺ کے روئے انور پر تکدر کے آثار نمودار ہوئے اور آپ نے فرمایا: "اُسامہ، کیا تم مجھ سے اللہ تعالیٰ کی قائم کی ہوئی حدود کے بارے میں (رعایت

کی) گفتگو کرتے ہو؟"

حضور ﷺ کا ارشاد سُن کر حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ لرز اٹھے اور عرض کیا: "یارسول اللہ ﷺ، میرے ماں باپ آپ پر قربان، میرے لیے مغفرت طلب فرمائیے۔" شام ہوئی تو حضور ﷺ خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کے بعد فرمایا:

"اما بعد! پہلے لوگ اس وجہ سے ہلاک ہوئے کہ جب ان میں کوئی شریف (معزز یا امیر) آدمی چوری کرتا تو اس کو چھوڑ دیتے اور جب ان میں کوئی کمزور (معمولی) آدمی چوری کرتا تو اس پر حد قائم کرتے۔ قسم اس ذات کی کہ جس کے قبضہ قدرت میں محمد ﷺ کی جان ہے اگر فاطمہ بنتِ محمد رضی اللہ عنہا بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔"

چنانچہ اس خاتون پر حد جاری کی گئی اور اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ اس کے بعد اس کی زندگی میں یکسر انقلاب آ گیا اور اس نے اپنی توبہ کو نہایت پرہیز گاری اور استقامت کے ساتھ نباہا۔

۱۱ھ ہجری میں سرورِ عالم ﷺ نے اپنے وصال سے چند دن پہلے حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کو اس جیش کا افسر مقرر فرمایا جو آپ ﷺ نے اس غرض سے ترتیب دیا تھا کہ ایک تو سریہ موتہ (۸ھ) کا انتقام لیا جائے جس میں حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کے والد حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے علاوہ حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ اور کئی دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم نے جامِ شہادت پیا تھا اور دوسرے یہ کہ شام سے ملنے والی سرحد فتنہ و فساد سے محفوظ ہو جائے۔ کچھ لوگوں نے ان کی امارت پر استعجاب کا اظہار کیا تو حضور ﷺ کو ناگوار گزرا اور آپ ﷺ نے علیل ہونے کے باوجود باہر تشریف لا کر پُر زور الفاظ میں حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کو امارت کا اہل ٹھہرایا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کو عَلَم عطا فرمایا اور جیش کو

روانہ ہونے کا حکم دیا۔ اس لشکر نے مدینہ منورّہ سے چل کر جُرف کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ اسی دوران میں حضور ﷺ کی علالت شِدّت اختیار کر گئی۔ حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی تو وہ بے تاب ہو کر فوراً مدینہ واپس آئے اور حضور ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر آپ ﷺ کی جبینِ مبارک پر بوسہ دیا۔ حضور ﷺ بالکل خاموش تھے، تاہم آپ ﷺ نے دُعا کے لیے دستِ مبارک اٹھائے اور حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ پر رکھے۔ انہیں قدرے اطمینان ہو گیا اور وہ واپس جُرف چلے گئے۔ دوسرے دن پھر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت آپ ﷺ کو افاقہ تھا۔ آپ ﷺ نے حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کو روانہ ہونے کا حکم دیا۔ انہوں نے واپس جا کر فوج کو کوچ کرنے کا حکم دیا لیکن ابھی جُرف سے روانہ نہیں ہونے پائے تھے کہ مدینہ منوّرہ میں سرورِ عالم ﷺ کی علالت نہایت تشویشناک صورت اختیار کر گئی۔ حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کی والدہ حضرت اُمِّ ایمن رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کے پاس ہی تھیں، وہ ہاشمی خاندان کے بہت سے افراد کا وقتِ آخرت دیکھ چکی تھیں۔ حضور ﷺ کی بیماری میں کچھ ایسی علامات پائیں کہ انہیں یقین ہو گیا اب حضور ﷺ اس دارِ فانی سے رخصت ہو رہے ہیں۔ انہوں نے فوراً ایک آدمی کو یہ پیغام دے کر حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا کہ حضور ﷺ ہمیں داغِ مفارقت دے رہے ہیں۔ تم فوراً مدینہ واپس آ جاؤ۔ جونہی حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کو یہ دلدوز خبر ملی وہ کچھ دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہمراہ جرف سے مدینہ منوّرہ آ گئے۔ حضور ﷺ نے رحلت فرمائی تو حضرتِ اُسامہ رضی اللہ عنہ پر قیامت بیت گئی! تاہم بڑے صبر و ضبط سے کام لیا اور بڑی سرگرمی سے حضور ﷺ کی تجہیز و تکفین میں شریک ہوئے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ ان صحابہ میں سے ایک تھے جن کو سیّد الانام ﷺ کا جسدِ اطہر قبرِ مبارک میں اتارنے کا شرف حاصل ہوا۔ حضور ﷺ کے وصال کی خبر سن کر پورا لشکر جُرف سے مدینہ آ گیا اور یہ مہم ملتوی ہو گئی۔

حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ سریر آرائے خلافت ہوئے تو انہوں نے بیعت کے

دوسرے ہی دن حکم دیا کہ جیشِ اُسامہ تیار ہو کر اپنی منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہو جائے۔ خلیفۃ الرسول رضی اللہ عنہ کی طرف سے منادی نے یہ اعلان کیا۔ ''اُسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کو تیار ہو جانا چاہیے۔ تاکید کی جاتی ہے کہ جو لوگ اس مہم میں نامزد ہیں۔ ان میں سے ایک آدمی بھی مدینہ میں نہ رہے اور سب کے سب اپنے پڑاؤ پر بمقام جُرف جمع ہو جائیں۔

اس سے پہلے کہ لشکر جُرف میں جمع ہو اور اس کی روانگی عمل میں آئے، جگہ جگہ سے عرب قبائل کے ارتداد کی خبریں متواتر مدینہ آنے لگیں۔ ان خبروں سے عام مسلمان سخت تشویش میں مبتلا ہو گئے۔ سرورِ عالم ﷺ کے وصال کا جانکاہ صدمہ ابھی تازہ تھا اب جو انہوں نے کثیر التعداد عربوں کے ارتداد اور اپنی قلتِ تعداد پر نظر ڈالی تو انہیں مناسب یہی معلوم ہوا کہ جیش اُسامہ رضی اللہ عنہ کو اس نازک موقع پر مدینہ منورّہ ہی میں روک لیا جائے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اس وقت مسلمانوں کی حالت بکریوں کے اس ریوڑ سے مشابہت رکھتی تھی جو جاڑے میں بحالتِ بارش کھلے میدان میں گلّہ بان کے بغیر رہ جائے۔

انہی حالات کے پیشِ نظر بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضرت ابو بکر صدّیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں عرض کی کہ جو آدمی اُسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کے ساتھ جا رہے ہیں وہ مسلمانوں کے چیدہ اور منتخب افراد ہیں۔ ادھر فتنہ ارتداد جس سرعت سے عرب میں پھیل رہا ہے، اس کا بھی آپ کو بخوبی علم ہے۔ ان حالات میں جیش اُسامہ رضی اللہ عنہ کا مدینہ سے جانا مسلمانوں کی جمعیت کو منتشر کرنے کے مترادف ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اس مہم کو کسی آئندہ وقت پر اٹھا رکھیں۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ یقین اور استقامت کے نہایت بلند مقام پر فائز تھے۔ وہ یہ کبھی گوارا نہ کر سکتے تھے کہ جس مہم کو خود سرورِ عالم ﷺ روانہ ہونے کا حکم دے چکے ہوں، اس کو روک لیں انہوں نے جواب دیا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔ اگر مجھ کو یہ بھی گمان ہوتا کہ درندے مجھ کو اٹھا لے جائیں

گے تو بھی رسول اللہ ﷺ کے حکم کی تعمیل میں اُسامہ رضی اللہ عنہ کا لشکر ضرور بھیجتا۔ اگر بستیوں میں میرے سوا ایک شخص بھی باقی نہ رہتا تو بھی میں جیشِ اُسامہ کو ضرور روانہ کرتا۔''

اس کے بعد مجمع عام میں اسی موضوع پر ایک موثر خطبہ دیا اور تیاری لشکر کی تاکید کی۔

چنانچہ حضرت بُریدہ بن حصیب اسلمی رضی اللہ عنہ علَم لے کر جُرف پہنچ گئے اور باقی لشکر بھی وہاں جمع ہو گیا۔ حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کو اس مہم پر جانے میں کوئی عذر نہ تھا لیکن اس اندیشہ سے کہ ان کے جانے کے بعد دشمن مدینہ پر یلغار کر دیں گے، انہوں نے جُرف سے حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ کو پیغام بھیجا کہ مجھے اپنے روانگی کے بعد مدینہ منوّرہ پر دشمن کے حملے کا ڈر ہے، اگر آپ اجازت دیں تو اس مہم کو ملتوی کر کے لشکر کے ساتھ مدینہ آ جاؤں۔

خلیفۃ الرسول ﷺ نے انہیں وہی جواب دیا جو دوسرے لوگوں کو دیا تھا اسی اثناء میں انصار نے حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی وساطت سے پیغام بھیجا کہ اگر آپ لشکر ضرور روانہ کرنا چاہتے ہیں تو اس پر اُسامہ رضی اللہ عنہ کے بجائے کسی آزمودہ کار (سن رسیدہ) صحابی کو امیر بنائیے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے انصار کا پیغام حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو سنایا تو وہ غصے سے بے تاب ہو کر کھڑے ہو گئے اور فرمایا:

''ابنِ خطاب، اُسامہ رضی اللہ عنہ خود رسول اللہ ﷺ نے امیر لشکر مقرر فرمایا، لیکن تم مجھے یہ پیغام دیتے ہو کہ میں اس کے بجائے کسی اور کو امیر مقرر کر دوں''۔

اس جواب کے بعد بہ نفسِ نفیس جُرف تشریف لے گئے اور لشکر کو کوچ کا حکم دیا۔ لشکر چلنے لگا تو حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ گھوڑے پر سوار تھے اور صِدّیقِ اکبر رضی اللہ عنہ پیادہ پا ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ ان کا کوتل گھوڑا حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھا۔ حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اے خلیفۃ الرسول، آپ بھی سوار ہو جائیں یا مجھ کو پیادہ پا چلنے کی اجازت دیں۔'' ارشاد ہوا: ''نہ مجھ کو سوار ہونے کی ضرورت ہے نہ تم کو پیادہ پا چلنے کی۔ اگر میرے پاؤں چند لمحوں کے لیے راہِ خدا میں خاک آلود ہو جائیں تو میری کیا شان جاتی ہے۔ غازی اللہ کی راہ میں جو قدم رکھتا ہے اس کے بدلے میں سات

سونیکیاں نامہ اعمال میں لکھی جاتی ہیں، سات سو گناہ معاف ہوتے ہیں اور سات سو درجے بلند کیے جاتے ہیں۔

اس کے بعد صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جیشِ اُسامہ رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا:

''اے لوگو! میں تم کو دس نصیحتیں کرتا ہوں ان کو اچھی طرح یاد رکھنا۔ خیانت نہ کرنا، دھوکا نہ دینا، امیر کی نافرمانی نہ کرنا، کسی شخص کے اعضاء نہ کاٹنا، کسی بچے بوڑھے یا عورت کو قتل نہ کرنا، کسی پھلدار درخت کو مت کاٹنا یا جلانا، بکری گائے یا اونٹ کو غذا کی ضرورت کے بغیر ذبح نہ کرنا، تم کو ایسے لوگ ملیں گے جو اپنی عبادت گاہوں میں گوشہ نشین ہوں گے، اُن سے کوئی تعرّض نہ کرنا، تم کو ایسے آدمی بھی ملیں گے جو قسم قسم کے کھانے تمہارے سامنے پیش کریں گے یہ کھانے کھا کر (خدا کو نہ بھول جانا اور) اللہ کا شکر ادا کرنا، اور تم کو ایک ایسی قوم بھی ملے گی جن کے سر کے بال بیچ میں منڈے ہوں گے اور پٹھے چھوٹے ہوں گے، ان کو تازیانہ کی سزا دینا۔ اب اللہ کا نام لے کر روانہ ہو جاؤ، اللہ تم کو (دشمن کے) حربے اور طاعون سے محفوظ رکھے۔''

اس خطبہ کے سننے کے بعد جیشِ اُسامہ رضی اللہ عنہ اپنی منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس وقت سرورِ عالم ﷺ کو وصال فرمائے صرف انیس دن گزرے تھے۔ حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ ارضِ شام میں دور تک فاتحانہ یلغار کرتے ہوئے ابنی (خان الزّیت) تک پہنچ گئے۔ اور چند دن دمشق کے قریب ایک مقام المزہ میں قیام کرنے کے بعد مدینہ منورّہ کو مراجعت کی۔ اس مہم میں باختلافِ روایت چالیس دن یا اس سے کچھ زیادہ عرصہ صرف ہوا۔ مراجعت سے پہلے حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ نے فتح کی بشارت مدینہ منورّہ بھیجی تو مسلمانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ کیونکہ یہ فتح نہ صرف سریّہ موتہ کا جواب تھی بلکہ تسخیرِ شام کی تمہید بھی تھی۔

جیشِ اُسامہ رضی اللہ عنہ اس شان سے مدینہ پہنچا کہ آگے آگے حضرت بُریدہ بن

حصیب رضی اللہ عنہ پر چم اڑا رہے تھے اور ان کے پیچھے حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ لشکر کو جلو میں لیے اپنے والد حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ شہید موتہ کے گھوڑے بسحہ پر سوار تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مہاجرین اور انصار کے ساتھ مدینہ سے باہر نکل کر اس فتح مند لشکر کا پُر جوش استقبال کیا۔ حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ مدینہ منوّرہ میں داخل ہوتے ہی مسجدِ نبوی میں گئے اور دو رکعت نماز پڑھی، اس کے بعد گھر گئے۔ اس وقت ان کی عمر اُنیس برس کی تھی۔

حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ سیّد الانام ﷺ کو بے حد محبوب تھے، اس لیے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور دوسر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی ان کو بہت عزیز جانتے تھے۔ طَبری کا بیان ہے کہ ذوالقعدہ ۱۱ھ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مرتد باغی قبائل کی سرکوبی کے لیے الابرق تشریف لے گئے تو انہوں نے مدینہ منوّرہ میں حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین مقرر فرمایا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ سے اس قدر لگاؤ تھا کہ اپنی اولاد پر بھی ان کو ترجیح دیتے تھے۔ ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ نے "اُسد الغابہ" میں لکھا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے عہدِ خلافت میں تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے وظائف مقرر کیے تو حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کا وظیفہ تین ہزار اور اپنے فرزند حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کا وظیفہ ڈھائی ہزار مقرر کیا۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے شکایت کی کہ نہ میں کسی غزوہ میں اُسامہ رضی اللہ عنہ سے پیچھے رہا اور نہ آپ ان کے والد زید رضی اللہ عنہ سے۔ لیکن میرا وظیفہ آپ نے ان سے کم مقرر کیا ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: "وہ رسول اللہ ﷺ کو تجھ سے زیادہ عزیز تھے اور ان کے والد تمہارے والد سے زیادہ رسول اللہ ﷺ کو عزیز تھے۔"

اس واقعہ کے بعد حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما باوجود عمر میں بڑا ہونے کے ہمیشہ حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کا نہایت احترام کرتے رہے، بلکہ ان کی اولاد کو بھی نہایت عزیز جانتے تھے۔ حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے کئی سال بعد ایک دن انہوں نے مسجدِ نبوی ﷺ کے ایک گوشے میں ایک پاکیزہ صورت نوجوان کو دیکھا تو بے اختیار اس کی

طرف کشش پیدا ہوئی۔ پاس ہی عبداللہ بن دینار رحمۃ اللہ علیہ بیٹھے تھے۔ ان سے پوچھا، یہ نوجوان کون ہے؟ ایک شخص بولا...... "ابوعبدالرحمٰن کیا آپ اس کو نہیں پہچانتے، یہ اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کا فرزند محمد رحمۃ اللہ علیہ ہے۔"

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے یہ سن کر گردن جھکا لی اور ہاتھوں سے زمین کو کریدنے لگے پھر فرمایا: "اگر رسول اللہ ﷺ اس کو دیکھتے تو اس کو بھی محبوب رکھتے۔"

حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت (کے نصف آخر) میں فتنوں نے سر اٹھایا تو حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ نے گوشہ نشینی اختیار کر لی، تاہم دل میں ہمیشہ ملک و ملّت کی خیر خواہی کا جذبہ موجزن رہا۔ اس لیے وقتاً فوقتاً حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو تنہائی میں مفید مشورے دیتے رہے۔ لیکن عملاً اور علانیہ کسی سرگرمی میں حِصّہ نہیں لیا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد بھی وہ ان معرکہ آرائیوں سے بالکل الگ رہے جو حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے مابین ہوئی۔

حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ نے باختلافِ روایت ۵۴ھ یا ۵۸ھ میں وفات پائی۔ اس وقت وہ جُرف میں مقیم تھے۔ تدفین مدینہ منوّرہ میں ہوئی۔

حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کی جن دو شادیوں کا ذکر اوپر آچکا ہے، ان کے علاوہ بھی انہوں نے اپنی زندگی میں کئی خواتین سے نکاح کیا۔ ان کے نام یہ ہیں۔ دُرّہ بنتِ عدی (ان کے بطن سے محمد رحمۃ اللہ علیہ اور ہندہ پیدا ہوئے) اُمِ حکم بنتِ عتبہ، فاطمہ رضی اللہ عنہا بنتِ قیس (ان کے بطن سے جبیر رحمۃ اللہ علیہ، زید رحمۃ اللہ علیہ اور عائشہؒ پیدا ہوئے)، بنتِ ابی ہمدان سہمی، برزہ بنتِ ربعی (ان کے بطن سے حسن رحمۃ اللہ علیہ اور حسین رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہوئے)۔

سرورِ عالم ﷺ کے وصال کے وقت حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کی عمر صرف ۱۸ یا ۱۹ برس کی تھی، تاہم انہیں فیضانِ نبوی سے بہرہ یاب ہونے کا کافی موقع مل گیا تھا، اس لیے علم و فضل کے اعتبار سے بڑے بلند مقام پر فائز ہو گئے تھے۔ ان سے ایک سو اٹھائیس احادیث مروی ہیں جن میں سے ۱۵ متفق علیہ ہیں، دو میں بخاری اور دو میں مسلم منفرد

ہیں۔ ان کے راویوں میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، ابو عثمان نہدی رحمۃ اللہ علیہ، ابو وائل رحمۃ اللہ علیہ اور خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے اسماء گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

فضائلِ اخلاق کے لحاظ سے بھی حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کا درجہ بہت بلند ہے۔ رحمتِ دو عالم ﷺ کی تربیت نے اُن کو ایک مثالی مردِ مومن بنا دیا تھا۔ اپنے ہر قول و فعل میں حضور ﷺ پُر نور کا اُسوہ حسنہ پیشِ نظر رکھتے تھے، اس لیے لوگ بھی ان کے عمل کو اپنے لیے نمونہ سمجھتے تھے۔

عبادتِ الٰہی سے نہایت شغف تھا۔ انہوں نے سالہا سال تک حضور ﷺ کی عبادت دیکھی تھی۔ اس لیے کثرتِ عبادت کو اپنی زندگی کا شعار بنا لیا تھا۔ آخر عمر میں بھی جب ان کے قوائے جسمانی مضمحل ہو چکے تھے، دوشنبہ اور پنجشنبہ کو پابندی سے روزے رکھتے تھے۔ ایک دن غلام نے کہا، یہ روزے فرض تو نہیں اس لیے آپ اس بڑھاپے میں ان کی پابندی کیوں کرتے ہیں۔ فرمایا رسول اللہ ﷺ ان دنوں میں روزہ رکھا کرتے تھے۔

حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کی والدہ حضرت اُمِ ایمن رضی اللہ عنہا کے بارے میں بعض اہلِ سیَر نے لکھا ہے کہ انہوں نے حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں وفات پائی، لیکن ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ نے محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی ہے کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں بھی حیات تھیں اور حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ ان کی خوشنودی اور دلجوئی کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ سے کھجور کی پیڑی کے مغز کی فرمائش کی۔ اس زمانے میں کھجور کے درختوں کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں اور ایک درخت ایک ہزار پر اٹھتا تھا۔ حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ نے ایک درخت کی پیڑی کو کھوکھلا کر کے اس کا مغز نکالا۔ لوگوں نے کہا اتنے قیمتی درخت کو آپ کیوں برباد کر رہے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا۔ ماں کی فرمائش پوری کر رہا ہوں۔ وہ جس چیز کی خواہش کرتی ہیں، میں کوشش کرتا ہوں کہ جس طرح بھی ہو سکے ان کی فرمائش پوری کروں۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

حضرت شمّاس بن عثمان مخزومی رضی اللہ عنہ

(۱)

عثمان بن شرید (بن ہرمی بن عامر بن مخزوم) مخزومی قریش کے کھاتے پیتے لوگوں میں سے تھا اور رئیسِ مکہ ربیعہ بن عبدِ شمس کا داماد تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے فرزند عطا کیا تو اس نے اس کا نام اپنے ہی نام پر عثمان رکھا، لیکن اس نہالِ تازہ کو خالقِ کائنات نے ایسے حسن و جمال سے نوازا کہ لوگ اس کو شمّاس (روئے تاباں) کہہ کر پکارنے لگے یہاں تک کہ کسی کو اس کا اصلی نام یاد ہی نہ رہا۔

شمّاس کا ابھی عہدِ طفلی تھا کہ شفیق باپ کا سایہ سرے سے اُٹھ گیا۔ ماں صفیہ بنتِ ربیعہ پر قیامت ٹوٹ پڑی، لیکن شمّاس رضی اللہ عنہ کے ماموں عتبہ بن ربیعہ نے بیوہ بہن اور یتیم بھانجے کے سر پر دستِ شفقت رکھا اور ان کو عثمان بن شرید کی کمی چنداں محسوس نہ ہونے دی۔ شمّاس ماموں اور ماں کے زیرِ سایہ ہی عنفوانِ شباب کو پہنچے۔ شمّاس کے سیاہ چمکیلے بال، موتیوں جیسے دانت، گورا چٹا رنگ، ستواں ناک، غلافی آنکھیں، کتابی چہرہ۔ ایسے خدوخال نہیں تھے کہ دیکھنے والوں کو مسحور نہ کر دیتے۔ ماں اور ماموں دونوں شمّاس پر سو جان سے فدا تھے اور انہوں نے ان کو بڑے ناز و نعم سے پالا تھا۔ ایک مرتبہ مکہ میں ایک خوبرو نصرانی (یا آتش پرست) وارد ہوا لوگوں میں اس کے رنگ روپ اور حسنِ صورت کا چرچا پھیلا تو عتبہ نے ایک دن اپنے بھانجے (شمّاس) کو اس کے ساتھ لا کھڑا کیا اور لوگوں سے کہا کہ ذرا غور سے دیکھو، میرا بھانجا حسن و جمال میں اس اجنبی سے بڑھ کر ہے یا نہیں؟ دونوں کو یکجا دیکھ کر اہلِ مکہ کی آنکھیں کھل گئیں، شمّاس کے حسن و جمال کے سامنے اجنبی کے حسن و جمال کی کوئی حقیقت ہی نہ تھی۔ بعض روایتوں میں

ہے کہ عثمان بن عثمان اسی دن سے شماس کے لقب سے مشہور ہوئے۔ اس لقب نے اتنی شہرت پائی کہ لوگ اُن کے اصل نام کو بھول گئے۔

(۲)

شماس رضی اللہ عنہ ابھی انیس بیس برس کے پیٹے میں تھے کہ رحمتِ عالم ﷺ نے دعوتِ حق کا آغاز فرمایا۔ شماس کو اللہ تعالیٰ نے حسنِ صورت کے ساتھ حسنِ سیرت سے بھی نوازا تھا، ان کے کان جونہی دعوتِ توحید سے آشنا ہوئے انہوں نے کسی تامل کے بغیر اس پر لبیک کہا۔ ماں بھی نہایت نیک بخت خاتون تھیں وہ بھی اپنے فرزندِ سعید کے ساتھ نعمتِ اسلام سے بہرہ یاب ہوگئیں۔ عتبہ بن ربیعہ نے بہن اور بھانجے کو بہتیرا سمجھایا کہ آبائی مذہب ترک نہ کرو، لیکن وہ دونوں جس جادۂ مستقیم پر گامزن ہو چکے تھے اس سے منہ موڑنا انہوں نے کسی صورت میں گوارا نہ کیا۔

یہ بڑا پُر آشوب زمانہ تھا اور دعوتِ حق قبول کرنا گردابِ بلا میں پھنسنے کے مترادف تھا۔ مشرکینِ قریش کو کسی مسلمان کو چین سے بیٹھنا گوارا نہ تھا۔ جوں جوں اسلام کی دعوت پھیلتی جاتی تھی اُن کی آتشِ غضب اور تیز ہوتی جاتی تھی۔ جور و تعدی کا کوئی حربہ نہ تھا جو انہوں نے اہلِ حق پر نہ آزمایا ہو۔ اُن کے دستِ تظلّم سے صفیہ رضی اللہ عنہا بنتِ ربیعہ اور شماس رضی اللہ عنہ بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ جب کفّار کے مظالم حد سے بڑھ گئے تو سرورِ عالم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حبش کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دے دی۔ حضرت شماس رضی اللہ عنہ بھی اپنی والدہ کو ساتھ لے کر بہت سے دوسرے بلا کشانِ اسلام کی طرح ہجرت کر کے حبش چلے گئے اور کئی سال وہاں مقیم رہ کر غریب الوطنی کی مصیبتیں جھیلتے رہے۔

مہاجرینِ حبشہ میں سے ایک جماعت تو حضرت جعفر طیار بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے ساتھ غزوۂ خیبر تک حبشہ ہی میں رہی البتہ ابنِ اسحاق رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق چالیس کے لگ بھگ مسلمان مختلف اوقات میں سرورِ عالم ﷺ کی ہجرت الی المدینہ سے پہلے

مکہ واپس آ گئے۔ ان واپس آنے والوں میں حضرت شماس رضی اللہ عنہ اور ان کی والدہ بھی تھیں، لیکن مکہ میں ان کو واپس آئے ہوئے زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ ہجرتِ مدینہ کا اِذن ہو گیا۔ حضرت شماس رضی اللہ عنہ اب والدہ کے ہمراہ مدینہ کی طرف ہجرت کر گئے اس طرح ان کو ذوالہجرتین (دو ۲ ہجرتیں کرنے والے) کا شرف حاصل ہو گیا۔

(۳)

حضرت شماس رضی اللہ عنہ کو مدینہ منورہ میں حضرت مبشر بن عبدالمنذر انصاری رضی اللہ عنہ نے اپنا مہمان بنایا۔ ہجرت کے چند ماہ بعد جب سرورِ عالم ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے مابین مواخاۃ قائم فرمائی تو حضرت شماس رضی اللہ عنہ کو غسیل الملائکہ حضرت حنظلہ بن ابی عامر انصاری رضی اللہ عنہ کا اسلامی بھائی بنایا۔

رمضان المبارک ۲ھ ہجری میں غزوۂ بدر پیش آیا تو حضرت شماس رضی اللہ عنہ ان تین سو تیرہ سرفروشوں میں شامل تھے جو کفر کی مہیب طاغوتی قوت سے محض اللہ کے بھروسے پر بھڑ گئے۔ میدانِ جنگ میں ان کے دو حقیقی ماموں عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ مخالف صفوں میں تھے لیکن حضرت شماس رضی اللہ عنہ کے نزدیک راہِ حق میں دینوی رشتے ناتے کوئی حقیقت نہیں رکھتے تھے۔ وہ مشرکین کے خلاف اس جوش اور وارفتگی سے لڑے کہ جانبازی کا حق ادا کر دیا۔

۳ھ ہجری میں وہ غزوۂ اُحد میں بھی بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ شریک ہوئے اور مردانہ وار دادِ شجاعت دی۔ لڑائی کے دوسرے مرحلے میں ایک اتفاقی غلطی سے مسلمانوں میں انتشار پھیل گیا اور رحمت عالم ﷺ کے قریب صرف چند جاں نثار رہ گئے۔ ان جان نثاروں میں حضرت شماس رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ کفار بار بار رحمتِ عالم ﷺ پر نرغہ کرتے تھے اور آپ کے جاں نثار اُن کو بزورِ شمشیر پیچھے ہٹا دیتے تھے۔ اپنے آقا و مولا (ﷺ) کو خطرے میں دیکھ کر حضرتِ شماس رضی اللہ عنہ کے جسم میں غضب کی چُستی اور قوت آ گئی تھی۔ وہ حضور (ﷺ) کے دائیں بائیں آگے پیچھے پھر رہے تھے اور ان کی

تلوار برقِ بے اماں بن کر کافروں پر گر رہی تھی۔ اس وقت وہ دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر تھے۔ دُھن تھی تو صرف یہی کہ کوئی مشرک رحمتِ عالم ﷺ کے قریب نہ پھٹکنے پائے۔

حضور ﷺ جس طرف نظر اٹھا کر دیکھتے شماس رضی اللہ عنہ کو سر بکف کفار سے نبرد آزما پاتے۔ انہوں نے اپنے آپ کو حضور (ﷺ) کی ڈھال بنا لیا تھا اور کفار کے ہر وار کو بڑھ کر اپنے جسم پر لے لیتے تھے۔ یہاں تک کہ زخموں سے چُور چُور ہو کر گر گئے۔ لڑائی ختم ہوئی اور شہیدوں اور زخمیوں کی تلاش شروع ہوئی تو شماس رضی اللہ عنہ اس حالت میں ملے کہ جس کا کوئی حصہ زخموں سے خالی نہ تھا لیکن ابھی سانس چل رہی تھی۔ حضور ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو حکم دیا کہ انہیں اٹھا کر مدینے لے جاؤ اور ان کا علاج کرو۔ چنانچہ وہ مدینے لائے گئے جہاں حضرت اُمِ سلمہ مخزومیہ رضی اللہ عنہا نے ان کی تیمارداری کا فرض انجام دیا لیکن حضرت شماس رضی اللہ عنہ کی حالت علاج معالجہ اور تیمارداری کی حد سے گزر چکی تھی، صرف ایک رات اور ایک دن زندہ رہے۔ اس دوران میں نہ کچھ کھایا اور نہ پیا، اس کے بعد اپنی جان جان آفریں کے سُپرد کر دی۔ اس وقت ان کی عمر چونتیس برس کی تھی۔ اولاد میں ایک صاحبزادے عبداللہ اور ایک صاحبزادی اُمِ حبیب تھیں۔ یہ دونوں لاولد فوت ہوئے۔ اس لیے حضرت شماس رضی اللہ عنہ کی نسل نہیں چلی۔

حضرت شماس رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ان کی میت حضور (ﷺ) کے حکم کے مطابق میدانِ اُحد میں لائی گئی اور جن خون آلود کپڑوں میں انہوں نے شہادت پائی تھی، انہی میں اس شہیدِ راہ حق کو اُحد کے گنج شہیداں میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ (ایک روایت میں ان کی تدفین بقیع میں بیان کی گئی۔ واللہ اعلم)

سرورِ عالم ﷺ غزوۂ اُحد کا ذکر کرتے وقت فرمایا کرتے تھے: ما وجدت شبهاس سبها الا الجنّة یعنی میں شماس کے لیے سپر کے سوا کوئی تشبیہ نہیں پاتا۔۔۔۔۔۔ ایک روایت میں "الجنة" کے بجائے "الجُبتة" کا لفظ ہے۔ جس کے معنی "زرہ" کے

ہیں یعنی میں شماس کے لیے زرہ کے سوا کوئی تشبیہ نہیں پاتا۔

حضرت شماس رضی اللہ عنہ نے اپنے آپ کو حضور ﷺ کی سپر بنایا یا زرہ بہر صورت انہوں نے اپنی جان اپنے آقا ﷺ پر قربان کر دی۔

یہ حضرت شماس رضی اللہ عنہ جیسے سرفروش ہی تھے جنہوں نے نخلِ اسلام کو اپنے خون سے سینچا۔ مِلّتِ اسلامیہ ان جوانمردوں پر تا ابد فخر کرتی رہے گی۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ
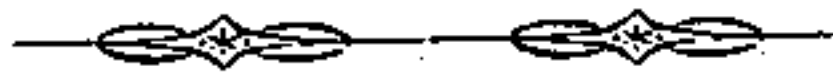
حضرت ہشیم بن عتبہ رضی اللہ عنہ

(۱)

یہ ۱۷ر رمضان المبارک ۲ ہجری کا دن تھا۔

اس دن مدینہ منورّہ سے اسی میل کی فاصلے پر بدر کا میدان ایک تحیّر خیز منظر پیش کر رہا تھا۔ مشرکینِ مکہ جو بڑے ساز و سامان اور طمطراق کے ساتھ اہل حق کو صفحہ ہستی سے نیست و نابود کرنے کے لیے آئے تھے۔ اپنے سے ایک تہائی بے سروسامان عَلَم بردارانِ توحید سے ذِلت انگیز شکست کھا چکے تھے۔ ان کے بڑے بڑے سردار قتل ہو چکے تھے اور ان کی لاشیں میدانِ جنگ میں جگہ جگہ بکھری پڑی تھیں۔ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے مکہ میں اہلِ حق کا جینا دوبھر کر دیا تھا اور ان کو اپنے وطن سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ آج یہاں ان کی لاشیں خاک و خون میں غلطاں نشانِ عبرت بنی ہوئی تھیں۔ سرورِ دو عالم ﷺ اگر چاہتے تو ان لاشوں کو گِدھوں، چیلوں اور درندوں کی خوراک بننے کے لیے اسی طرح کُھلے میدان میں چھوڑ دیتے لیکن آپ ﷺ کی شانِ رحیمی نے یہ گوارا نہ کیا اور آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حکم دیا کہ ان تمام لاشوں کو جمع کر کے کسی مناسب جگہ دفن کر دیا جائے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے میدان کا چکر لگایا تو ایک جگہ ایک بڑا کنواں نظر پڑا جو مدت سے غیر مستعمل پڑا تھا۔ انہوں نے تمام لاشیں اس کنوئیں میں ڈال دیں اور ان کو مٹی اور پتھروں سے ڈھک دیا۔ اس وقت حضور ﷺ اس اجتماعی قبر کے قریب تشریف لے گئے اور بآوازِ بلند ارشاد فرمایا:

> ”اے عتبہ، اے شیبہ، اے ابوجہل، اے فلاں، اے فلاں، کیا تم نے اللہ کے وعدے کو ٹھیک پایا، بے شک مجھ سے جو وعدہ ربّ العزت نے کیا وہ پورا

ہوا۔“

جس وقت لسانِ رسالت سے یہ الفاظ ادا ہوئے، وہاں پر موجود حضور ﷺ کے تمام جان نثاروں کے چہرے عبرت پذیری کا مرقع بن گئے۔ لیکن ان میں سے ایک صاحب رسول نہایت غمزدہ معلوم ہوتے تھے۔ وہ ادھیڑ عمر کے ایک کشیدہ قامت آدمی تھے۔ سامنے کا ایک دانت زیادہ تھا اور ایک آنکھ میں قدرے بھینگا پن تھا لیکن چہرے کے نقوش دلکش تھے اور پیشانی نورِ سعادت سے چمک رہی تھی۔ ان کو غم و اندوہ سے نڈھال دیکھ کر رحمتِ عالم ﷺ نے اپنے قریب بُلایا اور بڑی شفقت سے فرمایا، ”شاید تم کو اپنے باپ کے مرنے کا غم ہے۔“...... انہوں نے عرض کیا: ”یارسول اللہ! خدا کی قسم میں اپنے باپ کی موت کی وجہ سے مغموم نہیں ہوں بلکہ مجھے دُکھ اور رنج اس بات کا ہے کہ میرے باپ کو قبولِ حق کی سعادت نصیب نہ ہوئی اور وہ کفر پر مرا حالانکہ وہ ایک دانشمند صائب الرائے، معاملہ فہم اور خوش اخلاق شخص تھا اور مجھے پورا وثوق تھا کہ وہ شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہوگا۔ لیکن جس حالت میں وہ اپنے انجام کو پہنچا اس کو دیکھ کر میری تمام اُمیدیں اور آرزوئیں خاک میں مل گئیں۔ میرے باپ کا مرتے دم تک دولتِ ایمان سے محروم رہنا ہی میرے قلق کا سبب ہے۔“

سرورِ دو عالم ﷺ نے ان کے جذبہ ایمانی کی تعریف کی اور ان کو دُعائے خیر سے نوازا۔ غیرتِ دینی اور جوشِ ایمان کا بھرپور مظاہرہ کرنے والے یہ صاحب رسول قریشِ مکہ کے نامور رئیس عتبہ بن ربیعہ (مقتولِ بدر) کے فرزند ہشیم تھے جو تاریخ میں اپنی کنیت ابوحذیفہ سے مشہور ہیں۔

(۲)

سیّدنا حضرت ابوحذیفہ ہشیم بن عتبہ رضی اللہ عنہ (بن ربیعہ بن عبد شمس بن عبد مناف بن قُصَیّ) کا شمار کبار صحابہ میں ہوتا ہے۔ انہوں نے ایک ایسے گھرانے میں آنکھیں کھولیں جو کفر و شرک کی آماجگاہ تھا۔ ان کا والد عتبہ بن ربیعہ قریش کے سر برآوردہ، رؤسا میں سے

تھا۔ اور اپنی قوم میں بڑے اثر ورسوخ کا حامل تھا۔ اس کی معاملہ فہمی، دُور اندیشی اور وضعداری کا بھی سب کو اعتراف تھا۔ لیکن وائے بدبختی کہ جب رحمتِ عالم ﷺ نے اہلِ مکہ کو توحید کی دعوت دی تو اس نے اپنے کانوں میں رُوئی ٹھونس لی اور ان لوگوں میں شامل ہو گیا جنہوں نے دینِ حق کی مخالفت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا تاہم اس کی طبعی شرافت نے اُسے ابولہب، ابوجہل، عقبہ بن ابی معیط، اُمیّہ بن خلف، ولید بن مغیرہ اور اسود بن عبدِ یغوث وغیرہ جیسے شریر النفس لوگوں کی صف میں شامل ہونے سے باز رکھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں حضور ﷺ کی ایذا رسانی کے لیے ذلیل سے ذلیل حرکت سے بھی اجتناب نہیں تھا۔ عتبہ اور اُس کا بھائی شیبہ اسلام کے دشمن ضرور تھے لیکن انہوں نے حضور ﷺ کو ستانے کے لیے کبھی کسی کمینہ حرکت کا ارتکاب نہیں کیا۔ عتبہ نے اپنے فرزند ہشیم کی پرورش بڑے ناز ونعم سے کی۔ جب وہ جوان ہوئی تو ان کی شادی خطیبِ قریش سہیل بن عمرو کی صاحبزادی سہلہ سے کر دی۔ ہشیم تیس بتیس برس کے پیٹے میں تھے کہ مکہ میں صدائے توحید بلند ہوئی۔ گو عتبہ نے اپنے فرزند کو اپنے رنگ میں ڈھالنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے اس نوجوان کو فطرتِ صالح سے نوازا تھا۔ انہوں نے ہر قسم کے خطرات کے علی الرغم بلا تامّل دعوتِ حق پر لبیک کہا۔ نیک بخت بیوی حضرت سہلہ بنتِ سہیل رضی اللہ عنہا نے بھی ان کا ساتھ دیا اور یوں دونوں میاں بیوی سابقون الاوّلون کی مقدّس جماعت میں شامل ہو گئے۔ عتبہ پر بیٹے اور بہو کی سعادت اندوزی اسلام سخت شاق گزری اور اُس نے ان کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح مشرکینِ قریش کے جور وستم کا نشانہ بن گئے۔ جب کفّار کے مظالم حد سے گزر گئے تو سرورِ عالم ﷺ نے مظلوم مسلمانوں کو حبش کی طرف ہجرت کرنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ رجب ۵ بعدِ بعثت میں ۱۱ مردوں اور چار خواتین نے ارضِ مکہ کو الوداع کہہ کر حبش کی راہ لی تو ان میں حضرت ہشیم رضی اللہ عنہ اور ان کی اہلیہ حضرت سہلہ رضی اللہ عنہا بنتِ سہیل بھی شامل تھے۔ مشرکینِ قریش کو یہ بھی گوارا نہ تھا کہ اہلِ حق کسی ایسی

جگہ چلے جائیں جہاں ان کا دستِ تعدّی نہ پہنچ سکے۔ انہوں نے ساحلِ بحر تک مسلمانوں کا تعاقب کیا مگر حُسنِ اتفاق سے غیبہ کے بندرگاہ پر ان کو حبش جانے والی ایک کشتی مل گئی اور وہ اُس میں سوار ہو کر فوراً کھلے سمندر میں داخل ہو گئے۔ اس طرح تعاقب کرنے والے مشرکین کو بے نیلِ مرام واپس جانا پڑا۔

مہاجرین کو حبش پہنچے ابھی دو تین مہینے ہی گزرے تھے کہ انہوں نے ایک عجیب و غریب خبر سُنی۔ کسی نے ان کو بتایا کہ رسولِ اکرم ﷺ اور قریشِ مکہ کے درمیان صلح ہو گئی ہے۔ اور اب اہلِ حق قریش کے جور و تعدّی سے محفوظ و مامون ہو گئے ہیں۔ مہاجرین یہ خبر سن کر اپنے آقا و مولا ﷺ کے قدموں میں پہنچنے کے لیے بے تاب ہو گئے۔ چنانچہ بقول ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ وہ سب اور بقول ابنِ اسحاق رحمۃ اللہ علیہ ان میں سے بعض مکہ کی طرف واپس ہو گئے۔ بہر صورت حبش سے واپس آنے والوں میں حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ اور حضرت سہلہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں۔ جب یہ لوگ مکہ کے قریب پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ جو کچھ انہوں نے سُنا تھا وہ محض افواہ تھی۔ اس پر انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ حبش واپس چلے جائیں یا مکہ میں داخل ہو جائیں۔ سب کی رائے یہی ٹھہری کہ عمائد قریش میں سے کسی نہ کسی کی پناہ حاصل کر کے شہر میں داخل ہو جائیں۔ چنانچہ ان میں سے ہر ایک نے قریش کے کسی نہ کسی سردار کی پناہ حاصل کر لی اور سب شہر میں داخل ہو گئے۔ علامہ بلاذری رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ اور ان کی اہلیہ اُمیہ بن خلف کی پناہ حاصل کر کے مکہ میں داخل ہوئے۔ یہ اصحاب یوں تو اپنے وطن واپس آ گئے اور سیّد الانام ﷺ کی زیارت سے بھی شادکام ہو گئے لیکن انہوں نے دیکھا کہ حالات کی ناسازگاری میں مطلق کوئی فرق نہیں آیا اور مشرکین کے مظالم شدید سے شدید تر ہوتے جا رہے ہیں اس پر حضور ﷺ نے پھر ہدایت فرمائی کہ مظلوم مسلمان حبش ہی کی طرف ہجرت کر جائیں۔ چنانچہ ۶ بعدِ بعثت کے آغاز میں سو کے قریب (ذکور و اناث) مسلمانوں کا ایک قافلہ عازمِ حبش ہو گیا۔ ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ بھی حضرت سہلہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ اس قافلے

میں شامل تھے۔ گویا یہ ان کی دوسری ہجرتِ حبشہ تھی۔ دونوں میاں بیوی کئی سال تک حبش میں غریب الوطنی کی زندگی گزارتے رہے۔ اسی دوران میں ان کے فرزند محمد رضی اللہ عنہ بن ابی حذیفہ پیدا ہوئے۔ علامہ ابنِ اسحاق کا بیان ہے کہ مہاجرینِ حبشہ کی ایک جماعت تو حضرت جعفر (طیار رضی اللہ عنہ) بن ابی طالب کے ساتھ ۶ھ تک حبش میں رہی اور غزوۂ خیبر کے موقع پر واپس آئی البتہ ۳۳ مردوں اور آٹھ خواتین پر مشتمل ایک جماعت حضور ﷺ کی ہجرت الی المدینہ سے کچھ عرصے پہلے حبش سے مکہ واپس آ گئی۔ حضرت ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ بھی اپنی اہلیہ اور فرزند کے ساتھ اس جماعت میں شامل ہو کر مکہ واپس آ گئے۔ چند دن بعد حضور ﷺ نے مسلمانوں کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کا اِذن دیا۔ تو حضرت ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ بھی اپنی اہلیہ، فرزند اور آزاد کردہ غلام (منہ بولے بیٹے) حضرت سالم رضی اللہ عنہ کے ہمراہ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے۔ اس طرح ان کو تیسری مرتبہ راہِ حق میں ہجرت کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ مدینہ میں حضرت عباد بن بشر اشہلی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ اور ان کے اہلِ خاندان کو اپنا مہمان بنایا۔ جب رحمتِ عالم ﷺ نے مدینہ منوّرہ میں نزول اجلال فرمایا اور چند ماہ بعد مہاجرین اور انصار کے مابین مواخاۃ قائم کرائی تو حضرت ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ کو ان کے میزبان حضرت عباد بن بشر رضی اللہ عنہ ہی کا دینی بھائی بنایا۔

(۳)

رمضان المبارک ۲ھ ہجری میں حق و باطل کا پہلا معرکہ بدر کے میدان میں برپا ہوا تو حضرت ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ ان تین سو تیرہ نفوسِ قدسیہ میں سے ایک تھے جنہیں اس تاریخ ساز موقع پر سرورِ عالم ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل ہوا۔ دوسری طرف پرستارانِ باطل کی قیادت حضرت ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ کے باپ عتبہ بن ربیعہ کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے ساتھ اس کا دوسرا بیٹا ولید، بھائی شیبہ اور نواسہ حنظلہ بن ابی سفیان تھے۔ بعض اربابِ سیر نے لکھا ہے کہ عتبہ کی دلی خواہش تھی کہ کسی طرح لڑائی ٹل جائے۔ چنانچہ اس نے حکیم بن

حزام کو یہ پیغام دے کر ابوجہل کے پاس بھیجا کہ بہتر یہی ہے کہ ہم اپنے ابنِ عم (رسولِ اکرم ﷺ) کے مقابلے سے ہٹ جائیں...... ابوجہل یہ پیغام سن کر بھڑک اٹھا اور کہنے لگا کہ عتبہ کا ایک بیٹا (ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ) محمد (ﷺ) کے لشکر میں ہے وہ اس بناء پر لڑائی سے جی چراتا ہے کہ کہیں اس کا بیٹا مارا نہ جائے۔

حکیم بن حزام نے واپس جا کر عتبہ کو ابوجہل کے رَدِّ عمل سے آگاہ کیا تو اس نے کہا لوگ دیکھ لیں گے کہ لڑائی کی نوبت آئی تو بزدلی کا داغ کون اٹھاتا ہے۔ اس کے بعد عتبہ نے ایک سُرخ اونٹ پر سوار ہو کر قریش کے سامنے ایک زوردار تقریر کی جس میں ان کو لڑے بغیر واپس چلنے کی تلقین کی۔ لیکن ابوجہل اور دوسرے جنگ پسند مشرکین نے اس کی کوئی پیش نہ چلنے دی۔ لڑائی کا آغاز ہوا تو عتبہ نے ابوجہل کے طعنے کو عملاً ثابت کرنے کے لیے اپنے فرزند ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کو مقابلے کے لیے للکارا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ خود حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ نے جوشِ ایمانی سے بیقرار ہو کر اپنے باپ کو دعوتِ مبارزت دی۔ حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کی ہمشیرہ ہند بنتِ عتبہ بھی باپ کے ساتھ آئی تھیں۔ انہوں نے بھائی (ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ) کو باپ اور دوسرے اقربا کے سامنے شمشیر بکف دیکھا تو غصے سے بے قابو ہو گئیں اور بھائی کی مذمت میں یہ شعر کہے

الاحول الاثعل المشئوم طائره ابو حذیفة شر الناس فی الدین

اما شکرت اباً ربّاك فی صغر حتیٰ شببت شباباً غیر محجون

(بھینگا، بڑے دانت والا، جس کا طائرِ بخت سخت منحوس ہے یعنی ابوحذیفہ جو دین میں سب سے بُرا ہے، کیا تو اپنے والد کا شکر گزار نہیں ہے جس نے بچپن سے تیری پرورش کی یہاں تک کہ تو نے بے داغ جوانی پائی۔)

باپ نے بیٹے کے مقابلے پر آنے سے پہلو تہی کی یا بیٹے نے باپ کی دعوتِ مبارزت کو قابلِ التفات نہ سمجھا دونوں کے درمیان مقابلہ نہ ہوا۔ البتہ عتبہ حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اس کا مشرک بیٹا ولید، بھائی شیبہ اور نواسہ

حنظلہ بھی لڑائی میں کام آئے لڑائی کے بعد سرورِ عالم ﷺ نے مشرکین کی لاشوں کو ایک اندھے کنویں میں دفن کرایا تو وہ واقعہ پیش آیا جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔

غزوۂ بدر میں قریش کے جو آدمی مسلمانوں کے ہاتھ اسیر ہوئے ان میں عمِ رسول ﷺ حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ عباس رضی اللہ عنہ در پردہ مسلمان ہو چکے تھے یا دل سے مسلمانوں کے خیر خواہ تھے۔ اور مشرکین کے مجبور کرنے پر بادلِ نخواستہ لڑائی میں شریک ہوئے تھے۔ سرورِ عالم ﷺ کو حقیقتِ حال کا علم تھا۔ اسی بناء پر حضور ﷺ نے لڑائی سے پہلے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ہدایت فرمائی تھی کہ بنو ہاشم اور کچھ دوسرے لوگوں کو زبردستی ہمارے مقابلے پر لایا گیا ہے۔ ورنہ وہ ہم سے قطعاً لڑنا نہیں چاہتے تھے لہٰذا اثنائے جنگ میں اگر ہاشمیوں میں سے کوئی شخص تمہارے ہاتھ آ جائے تو اس کو قتل نہ کرنا۔ ابوالبختری بن ہشام (جس نے شعبِ ابی طالب کا محاصرہ توڑنے میں نمایاں حصہ لیا تھا) کی بھی جان نہ لینا اور بالخصوص میرے چچا عباس کے قتل سے باز رہنا کیونکہ وہ سخت ناگواری کے ساتھ یہاں آئے ہیں۔

علّامہ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کو جوشِ ایمان انتہا کو پہنچا ہوا تھا اور ان کے نزدیک حق کے مقابلے میں خونی اور نسبی تعلق اور رشتوں کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ انہوں نے سرورِ عالم ﷺ کے ارشاد کو اچھی طرح نہ سمجھا اور بول اٹھے:

''یہ حق اور باطل کا مقابلہ ہے اگر ہم حق کی خاطر اپنے باپ، بھائی، بیٹے اور دوسرے اقربا سے درگزر نہیں کرتے تو بنو ہاشم سے کیوں کریں، بخدا اگر میں نے عباس کو پا لیا تو ان کو لقمۂ شمشیر بنائے بغیر نہ رہوں گا۔''

حضور ﷺ کو حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کے اس قول کی اطلاع ہوئی تو آپ ﷺ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''ابوحفص! تم نے ابوحذیفہ کی بات سنی۔ کیا میرے چچا کا چہرہ قتل کے لائق ہے؟''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جوش آ گیا اور عرض کی، ''یارسول اللہ! اگر اجازت ہو تو

ابوحذیفہ کی گردن اڑادوں۔"

لیکن رحمتِ عالم ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایسا کرنے سے باز رکھا کیونکہ حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ آپ کے نہایت مخلص اور جاں نثار صحابی تھے۔ یہ جملہ اتفاقیہ (غلط فہمی کی بناء پر) ان کی زبان سے نکل گیا تھا۔

ابنِ جریر طبری کا بیان ہے کہ حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے کہ یہ گستاخانہ کلمہ جو غلطی سے میری زبان سے نکل گیا تھا میں اس سے ہمیشہ خوف زدہ رہتا تھا کہ معلوم نہیں اس کا کیا وبال مجھ پر پڑے۔ اور میں یقین کرتا تھا کہ صرف راہِ حق میں جان قربان کرنا ہی اس غلطی کا کفارہ ہوسکتا ہے۔

حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کی یہ پشیمانی ان کے اخلاص فی الدین اور حُبِّ رسول ﷺ کی آئینہ دار تھی۔ اگرچہ حضور ﷺ نے ان کو بالکل معاف کردیا تھا لیکن ان کے دل میں اپنی بات کا کانٹا ہمیشہ کھٹکتا رہتا تھا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ایک دن ان کی تمنائے شہادت بھی پوری کردی۔

(۴)

بدر کے بعد حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ دوسرے تمام اہم غزوات میں بھی بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ شریک ہوئے اور ہر معرکے میں نہایت پامردی سے دادِ شجاعت دی۔ ۱۱ ہجری میں سرورِ عالم ﷺ نے وصال فرمایا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سریر آرائے خلافت ہوئے تو سارے عرب میں فتنہ ارتداد کے شعلے بھڑک اٹھے۔ اس پُر آشوب زمانے میں حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ نے بڑی سرگرمی سے خلیفۃ الرسول رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا اور مرتدین کا قلع قمع کرنے کے لیے سَر دھڑ کی بازی لگادی۔ فتنہ رِدّہ کے سلسلے کی سب سے خونریز لڑائی "جنگِ یمامہ" تھی۔ اس میں لوہے کی لوہے سے ٹکر تھی۔ ایک طرف بھی سخت کوش عرب تھے اور دوسری طرف بھی عرب۔ لیکن ایک فریق اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے لیے لڑ رہا تھا اور دوسرا مسیلمہ کذاب کے دجل و تلبیس کے زیرِ اثر

لڑ رہا تھا۔ اہلِ حق کی صفوں میں حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ بھی اپنے منہ بولے بیٹے حضرت سالم رضی اللہ عنہ کے ساتھ شامل تھے۔ دونوں نے لڑائی میں ایسی جاں فروشی کا مظاہرہ کیا کہ شجاعت بھی آفرین پکار اٹھی۔ آخر بیشمار زخم کھا کر حق کے دونوں جاں باز سپاہی جامِ شہادت پی کر خلدِ بریں میں پہنچ گئے۔ حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کی عمر اس وقت ۵۴ برس کی تھی۔ وہ آرزوئے شہادت جوان کے دل میں یومِ بدر سے مچل رہی تھی نو سال بعد یمامہ کے میدان میں پوری ہوگئی۔

حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی میں تین نکاح کیے۔ بیویوں کے نام یہ ہیں۔ سہلہ بنتِ سہیل رضی اللہ عنہا، ثبیتہ بنتِ یعار رضی اللہ عنہا اور آمنہ بنت عمرو۔ اولاد میں دو بیٹوں کا نام ملتا ہے۔ محمد بن ابی حذیفہ رضی اللہ عنہ حضرت سہلہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے حبش میں پیدا ہوئے اور عاصم بن ابی حذیفہ رضی اللہ عنہ آمنہ بنتِ عمرو سے پیدا ہوئے۔ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ محمد اور عاصم دونوں لاولد فوت ہوئے اس لیے حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کی نسل نہیں چلی۔

حضرت ابوحذیفہ ہشیم رضی اللہ عنہ کی کتابِ زندگی میں سبقت فی الاسلام، راہِ حق میں بلا کشی، اخلاص فی الدین، جذبہ فدویت، اور جوشِ ایمان سب سے نمایاں ابواب ہیں۔ غلام پر اس قدر شفیق تھے کہ جب ان کی اہلیہ ثبیتہ بنتِ یعار رضی اللہ عنہا نے اپنے غلام سالم رضی اللہ عنہ کو آزاد کر دیا تو انہوں نے حضرت سالم رضی اللہ عنہ کو اپنا منہ بولا بیٹا بنالیا اور وہ لوگوں میں سالم بن ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کے نام سے مشہور ہوگئے۔ لیکن جب یہ حکم نازل ہوا اُدعو ھم لا بآئھم (یعنی لوگوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارا کرو) تو لوگ ان کو سالم رضی اللہ عنہ مولیٰ ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے۔

مسندِ ابی داؤد میں ہے کہ اس حکم کے نازل ہونے کے بعد حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کو حضرت سالم رضی اللہ عنہ کا اپنے گھر میں آزادنہ آنا جانا ناگوار گزرنے لگا۔ کیونکہ ان کو خدشہ تھا کہ سالم رضی اللہ عنہ کی اس طرح آمدورفت کہیں حکمِ الٰہی کے خلاف نہ ہو۔ انہوں نے

اپنے خدشے کا اظہار حضرت سہلہ بنتِ سہیل رضی اللہ عنہا سے کیا تو وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کی:

''یارسول اللہ ہم سالم کو اپنا بیٹا سمجھتے تھے اور وہ بچپن سے ہمارے گھر آتا جاتا تھا۔ لیکن اب ابوحذیفہ کو اس کا ہمارے گھر آزادانہ آنا جانا پسند نہیں ہے۔''

حضور ﷺ نے فرمایا ''اس کو اپنا دودھ پلا دو تو وہ تمہارا محرم ہو جائے گا۔''

غرض اس طرح حضرت سالم رضی اللہ عنہ، حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ اور حضرت سہلہ رضی اللہ عنہا کے رضاعی فرزند ہو گئے۔ اُمّ المومنین حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتے ہیں کہ یہ صرف حضرت سالم رضی اللہ عنہ کے لیے مخصوص اجازت تھی ورنہ جوانی کی حالت میں رضاعت ثابت نہیں ہوتی۔

حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ رئیس ابن رئیس تھے اور ریاست و امارت اُن کے گھر کی لونڈی تھی لیکن انہوں نے محض رضائے الٰہی کی خاطر عیش و راحت پر جفاکشی، غریب الوطنی اور فقر و فاقہ کی زندگی کو ترجیح دی۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی شخصیت ایک منارۂ نور تھی اور راہِ حق میں ان کی جان نثاری اور دینِ حق سے ان کی والہانہ شیفتگی امتِ مسلمہ کے لیے تا ابد مشعلِ راہ بنی رہے گی۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ
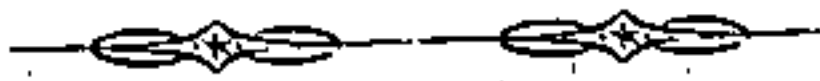
حضرت عامر بن ربیعہ العنزی رضی اللہ عنہ

(۱)

عامر نام۔ ابوعبداللہ کنیت، نسب نامہ یہ ہے:

عامر بن ربیعہ بن کعب بن مالک بن ربیعہ بن عامر بن سعد بن عبداللہ بن حارث بن رفیدہ بن عنز بن وائل۔

ان کا خاندان بنوعدی کا حلیف تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے والد خطاب بن نفیل عدوی کو حضرت عامر رضی اللہ عنہ سے اتنی محبت تھی کہ اس نے انہیں اپنا بیٹا (متبنیٰ) بنالیا تھا اور لوگ ان کو عامر بن خطاب کہہ کر پکارتے تھے۔ لیکن جب قرآنِ کریم میں اُدْعُوْهم لآبائهم (یعنی لوگوں کو اپنے نسبی آباء کے انتساب سے پکارو) کا حکم نازل ہوا تو لوگ انہیں اپنے اصل باپ کی نسبت سے عامر بن ربیعہ کہنے لگے۔

حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ کا شمار نہایت عظیم المرتبت صحابہ میں ہوتا ہے۔ وہ بعثت کے بالکل ابتدائی زمانے میں سعادت اندوزِ اسلام ہوئے۔ اس وقت تک رحمتِ عالم ﷺ دارارقم میں تشریف نہیں لے گئے تھے۔ ان کی اہلیہ لیلیٰ بنتِ ابی حثمہ عدویہ رضی اللہ عنہا بھی بہت نیک بخت خاتون تھیں۔ وہ بھی شوہر کے ساتھ ہی شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہو گئیں۔ قبول اسلام کے بعد دوسرے سابقون الاوّلون کی طرح یہ دونوں میاں بیوی بھی مشرکینِ مکہ کے عتاب کا نشانہ بن گئے۔ جب مشرکین کا ظلم و ستم حد سے بڑھ گیا تو سرورِ عالم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کا اذن دے دیا۔ چنانچہ ۵ بعدِ بعثت میں ستم رسیدہ مسلمانوں کے ایک مختصر قافلے نے مکہ سے حبشہ کا عزم کیا۔ اس قافلے میں حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ بھی اپنی اہلیہ لیلیٰ رضی اللہ عنہا کے ساتھ شامل تھے۔ متعدد

اہلِ سیَر نے تھوڑے بہت لفظی اختلاف کے ساتھ بیان کیا ہے کہ حضرت لیلیٰ رضی اللہ عنہا اونٹ پر سوار ہونے کو تھیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ وہاں آ گئے۔ وہ ابھی تک ایمان نہ لائے تھے۔ انہوں نے حضرت لیلیٰ رضی اللہ عنہا سے پوچھا، اُمِ عبداللہ کدھر کا قصد ہے؟ انہوں نے جواب دیا:

''ہم تمہاری ایذا رسانیوں سے تنگ آ کر گھر بار کو خیر باد کہہ رہے ہیں۔ خدا کا ملک تنگ نہیں ہے جہاں پناہ ملی چلے جائیں گے اور جب تک اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے لیے امن وسکون کی صورت نہ پیدا کر دے گا، وطن سے دُور ہی رہیں گے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کی باتوں سے بہت متاثر ہوئے اور کہا ''صحبکم اللہ'' (اللہ تمہارے ساتھ ہو) جب وہ چلے گئے تو حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ بھی آ پہنچے۔ حضرت لیلیٰ رضی اللہ عنہا نے ان کو یہ واقعہ سنایا تو بولے ''عمر اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک خطاب کا گدھا اسلام قبول نہیں کرے گا۔''

حضرت لیلیٰ رضی اللہ عنہا نے کہا۔ ''مجھے دیکھ کر عمر رضی اللہ عنہ پر سخت رِقت طاری ہو گئی تھی، کیا خبر اللہ، ان کا دل پھیر دے۔''

حضرت عامر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''کیا تم یہ چاہتی ہو کہ عمر رضی اللہ عنہ ایمان لے آئیں؟ انہوں نے کہا: ''ہاں''۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت لیلیٰ رضی اللہ عنہا کی تمنا یوں پوری کی کہ اگلے ہی سال حضرت عمر رضی اللہ عنہ مشرف بہ ایمان ہو گئے اور اسلام کے قوی دست و بازو بن گئے۔

(۲)

حضرت عامر رضی اللہ عنہ اور حضرت لیلیٰ رضی اللہ عنہا کو حبش گئے ہوئے صرف تین ہی مہینے گزرے تھے کہ مشرکینِ مکہ کے قبولِ اسلام کی خبر مشہور ہو گئی۔ مہاجرینِ حبشہ نے یہ خبر سنی تو ان کا ایک گروہ شوال ۵ بعدِ بعثت میں حبشہ سے مکہ کی جانب روانہ ہو گیا، ان میں حضرت عامر رضی اللہ عنہ اور ان کی اہلیہ بھی شامل تھے۔ مکہ کے قریب پہنچ کر ان اصحاب کو معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط تھی لیکن اب انہوں نے اُلٹے پاؤں واپس جانا مناسب نہ سمجھا اور سب

قریش کے کسی نہ کسی سردار کی پناہ حاصل کر کے مکہ میں داخل ہو گئے۔ حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ اور ان کی اہلیہ نے عاص بن وائل سہمی کی پناہ حاصل کی۔ اس واقعہ کے بعد مسلمانوں پر مشرکین کے ظلم و ستم میں اور شدّت پیدا ہو گئی۔ اس پر حضور ﷺ نے پھر ہدایت فرمائی کہ مظلوم لوگ حبش کی طرف ہجرت کر جائیں۔ چنانچہ ۶ بعدِ بعثت کے آغاز میں تقریباً ایک سو مظلوم اہلِ حق کا ایک قافلہ حبشہ کی طرف ہجرت کر گیا۔ حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ اور حضرت لیلیٰ بنتِ ابی حثمہ رضی اللہ عنہا بھی اس قافلے کے شرکاء میں تھے۔ حبشہ میں چند سال غریب الوطنی کی زندگی گزارنے کے بعد حضرت عامر رضی اللہ عنہ اور حضرت لیلیٰ رضی اللہ عنہا کچھ دوسرے مسلمانوں کے ساتھ حضور ﷺ کی ہجرت الی المدینہ سے کچھ عرصہ پہلے مکہ واپس آ گئے اور پھر چند دن بعد رسولِ کریم ﷺ کا اِذن پا کر مدینہ منوّرہ کی طرف مستقل ہجرت کر گئے۔ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضرت عامر رضی اللہ عنہ کی اہلیہ حضرت لیلیٰ رضی اللہ عنہا کو یہ شرف حاصل ہے کہ مسلمان خواتین میں وہ سب سے پہلے ہجرت کر کے مدینہ پہنچیں۔

(۳)

غزوات کا آغاز ہوا تو حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ نے بدر سے لے کر تبوک تک تمام غزواتِ نبوی میں سرورِ عالم ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔ اس کے علاوہ وہ اور کئی چھوٹی چھوٹی مہمات میں شریک ہوئے اور ان کی انجام دہی کے لیے بڑی بڑی سختیاں اور مصیبتیں برداشت کیں۔ مُسندِ احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ میں خود ان کی زبانی منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہم لوگوں کو مہمات پر بھیجتے تھے اور عسرت کے سبب خوراک میں تھوڑی سی کھجوریں عطا فرماتے تھے۔ اگر کسی مہم پر زیادہ دن صَرف ہو جاتے تو یہ کھجوریں فی کس ایک مٹھی سے کم ہوتے ہوتے ایک ایک کھجور فی کس ملا کرتی تھیں۔ بعض اوقات کھجوریں بالکل ختم ہو جاتی تھیں اور ہمیں درختوں کے پتوں سے پیٹ بھرنا پڑتا تھا۔

سرورِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ آخر دم تک مدینہ منوّرہ میں مقیم رہے اور نہایت خاموشی سے زندگی گزاری۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ انکو بہت

مانتے تھے۔ اپنے عہدِ خلافت میں جب وہ بیت المقدس تشریف لے گئے تو اپنے ساتھ چند انصار اور مہاجرین کو بھی لیتے گئے ان میں حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔

حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جس سال حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین بنا کر حج کے لیے تشریف لے گئے تو حضرت عامر رضی اللہ عنہ بن ربیعہ بھی ان کے ساتھ تھے۔ امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے خود انہیں اپنا رفیقِ سفر منتخب کیا تھا۔

حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ کا بیشتر وقت عبادتِ الٰہی میں گزرتا تھا۔ حضرت عثمان ذُوالنورین رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری دَور میں فتنوں نے سر اٹھایا تو وہ بالکل گوشہ نشین ہو گئے اور اس خدشہ سے باہر نکلنا بہت کم کر دیا کہ کسی فتنے میں نہ پڑ جائیں، دن رات گھر کے اندر نماز روزہ اور اور اد و وظائف میں مشغول رہتے تھے۔ ایک رات نیند آ گئی اسی حالت میں خواب دیکھا کہ کوئی شخص کہہ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اس فتنہ سے بچانے کی دعا کرو جس سے اس نے دوسرے نیک بندوں کو بچایا ہے۔

حضرت عامر رضی اللہ عنہ نے بیدار ہو کر اسی طرح نہایت خشوع وخضوع سے دُعا مانگی اور پھر یکسر ایسے عزلت گزیں ہوئے کہ کسی نے ان کو گھر سے کبھی باہر نکلتے نہ دیکھا۔ اسی حالت میں علیل ہو گئے یہ علالت مرض الموت کی صورت اختیار کر گئی اور حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے چند دن بعد انہوں نے پیکِ اجل کو لبیک کہا۔ اہلِ مدینہ کو مطلق علم نہ تھا کہ وہ کب بیمار ہوئے اور کب وفات پائی، جب یکا یک ان کا جنازہ دیکھا تو سکتے میں آ گئے اور چاروں طرف سے سیّد المرسلین ﷺ کے اس جلیل القدر شیدائی کو آخری آرامگاہ تک پہنچانے کے لیے اُمڈ آئے۔

سبقت فی الاسلام، اخلاص فی الدین تحملِ شدائد، حُبِّ رسول ﷺ، شوقِ جہاد، شغفِ عبادت اور زُہد وتقویٰ حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ کے چمنِ اخلاق کے سب سے خوش رنگ پھول ہیں۔ انھوں نے جس طرح مسلمانوں کی خانہ جنگی اور فتنوں سے اپنا دامن بچایا وہ ان کی عظمتِ کردار کا بیّن ثبوت ہے۔ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

حضرت سہیل بن بیضاء فہری رضی اللہ عنہ

سہیل نام، ابوموسیٰ کنیت۔ قریش کے خاندان بنوفہر بن مالک میں سے تھے والد کا نام وہب تھا لیکن وہ اپنی والدہ بیضاء بنت حجدم کی نسبت سے سہیل رضی اللہ عنہ بیضاء مشہور ہوئے۔ شجرہ نسب یہ ہے:

سہیل رضی اللہ عنہ بن وہب بن ربیعہ بن ہلال بن مالک بن ضبہ بن حارث بن فہر بن مالک۔

حضرت سہیل رضی اللہ عنہ ان عظیم المرتبت بزرگوں میں سے ہیں جن کی دعوتِ حق کے ابتدائی تین سالوں کے اندر قبولِ ایمان کا شرف حاصل ہوا۔ اس وقت ان کی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ ۶ بعد بعثت کے آغاز (۶۱۵ء) میں انہوں نے راہِ حق میں وطن کو خیر باد کہہ کر حبشہ کی غریب الوطنی اختیار کی۔ کئی سال پردیس میں گزارنے کے بعد ہجرتِ نبوی سے کچھ عرصہ پہلے مکہ کو مراجعت کی اور پھر وہاں سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی۔

حضرت سہیل رضی اللہ عنہ کو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ سے بے پناہ محبت تھی اور وہ ہر وقت راہِ حق میں اپنی جان قربان کرنے پر آمادہ رہتے تھے اس لیے رحمتِ عالم ﷺ ان کو نہایت عزیز جانتے تھے۔ غزوات کا آغاز ہوا تو انہوں نے بدر سے تبوک تک تمام غزوات میں رحمتِ دوعالم ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا اور ہر غزوے میں اپنی سر فروشی کے جوہر دکھائے۔

مستدرکِ حاکم میں ہے کہ سفرِ تبوک میں انہیں یہ عظیم سعادت نصیب ہوئی کہ خود سیّد المرسلین ﷺ نے انہیں اپنی سواری پر بٹھالیا۔ راستے میں حضور ﷺ نے انہیں دو

تین مرتبہ بلند آواز سے پکارا انہوں نے ہر مرتبہ "لبیک یا رسول اللہ" کہا۔ دوسرے صحابہ نے حضور ﷺ کی آواز سنی تو وہ بھی آپ ﷺ کے گرد جمع ہو گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

"جس شخص نے اللہ کے ایک ہونے کی شہادت دی۔ اللہ اس پر جہنم کی آگ حرام کر دے گا اور جنت اس پر واجب ہو جائے گی۔"

تبوک سے واپس آنے کے چند دن بعد حضرت سہیل رضی اللہ عنہ کو پیغامِ اجل آ گیا اور انہوں نے اپنے آقا و مولا ﷺ کے سامنے ہی ۹ھ میں وفات پائی۔ اولاد کوئی نہ تھی۔ سرورِ عالم ﷺ نے اپنے محبوب جان نثار کی نمازِ جنازہ مسجد میں پڑھائی۔

صحیح مسلم (کتاب الجنائز) میں ہے کہ چند سال بعد حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا جنازہ مسجد میں لایا گیا تو بعض لوگوں نے اعتراض کیا۔ اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ لوگ کس قدر جلد بات بھول جاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سہیل بن بیضاء رضی اللہ عنہ کے جنازہ کی نماز مسجد ہی میں پڑھی تھی۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ
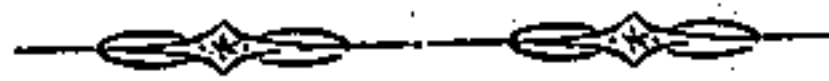
حضرت زید بن خطاب رضی اللہ عنہ

ہجرتِ نبوی کے تیسرے سال اُحد کے میدان میں معرکہ حق و باطل برپا ہوا تو چشمِ فلک نے ایک عجیب منظر دیکھا...... بلند و بالا قد اور گندم گوں رنگ کے ایک نورانی صورت مجاہد، قمیص اور زرہ سے بے نیاز، ننگے بدن مشرکینِ مکہ کی صفوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے انھیں اس حالت میں دیکھا تو بیتاب ہو گئے۔ آگے بڑھ کر انھیں روک لیا اور کہا، ''خدا کی قسم میں آپ کو اس حالت میں دشمن کا ہدف نہیں بننے دوں گا۔'' یہ کہہ کر اپنی زرہ اتار کر ان صاحب کو پہنا دی اس وقت تو انھوں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی بات مان لی لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد زرہ اتار پھینکی اور پھر سینہ عریاں کیے شمشیر بدست دشمن کی طرف بڑھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پھر دوڑتے ہوئے ان کے پاس گئے اور پوچھا کہ آپ نے زرہ کیوں اتار دی ہے؟ انھوں نے کڑک کر کہا: ''عمر میرے راستے سے ہٹ جاؤ، اگر تم شہادت کے تمنائی ہو تو میرے دل میں بھی شوقِ شہادت کے شعلے بھڑک رہے ہیں، زرہ وہ پہنے جس کو زندگی عزیز ہو، میں تو اپنی زندگی راہِ حق میں بیچ چکا ہوں۔''

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ خاموش ہو گئے اور سر جھکائے ہوئے واپس اپنی صف میں آ گئے اُدھر وہ صاحب برہنہ تن ہی دشمنوں کی صفوں میں گھس گئے اور اس جوش اور وارفتگی سے لڑنے لگے کہ شجاعت بھی آفرین پکار اٹھی...... یہ مردِ جری جن کو شوقِ شہادت نے قمیص اور زرہ سے بے نیاز کر دیا تھا، حضرت زید بن خطاب عدی رضی اللہ عنہ تھے۔

(۲)

سیّدنا حضرت ابوعبدالرحمٰن زید بن خطاب رضی اللہ عنہ کا شمار بڑے جلیل القدر صحابہ میں ہوتا ہے۔ان کا تعلق قریش کے خاندان ''بنو عدی'' سے تھا۔سلسلہ نسب یہ ہے:

زید رضی اللہ عنہ بن خطاب بن نُفَیل بن عبدالعزّیٰ بن رباح بن عبداللہ بن قرط بن زراح بن عدی بن کعب بن لُوی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ان کے سوتیلے بھائی تھے اور عمر میں ان سے چھوٹے تھے۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ کی والدہ کا نام اسماء بنت وہب تھا اور وہ بنواسد سے تھیں۔حضرت عمر خطاب بن نُفَیل رضی اللہ عنہ کی دوسری اہلیہ حنتمہ بنتِ ہاشام بن المغیرہ کے بطن سے تھے۔ سوتیلے ہونے کے باوجود دونوں بھائیوں میں کمال درجے کی محبت تھی جس میں ازدیادِ عمر کے ساتھ برابر اضافہ ہوتا رہا۔

حضرت زید بن خطاب رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے فطرتِ سعید سے نوازا تھا وہ ان عظیم المرتبت نفوس میں سے ہیں جنھوں نے بعثتِ نبوی کے ابتدائی تین سالوں کے دوران میں دعوتِ حق پر لبیک کہا اور پھر سالہا سال تک مشرکینِ مکہ کے ہولناک مظالم کا ہدف بنے رہے۔ ۱۳ بعدِ بعثت میں سرورِ عالم ﷺ نے بلاکشانِ اسلام کو مکہ معظمہ سے مدینہ منورّہ کی طرف ہجرت کرنے کا اِذن دیا تو حضرت زید بن خطاب رضی اللہ عنہ مہاجرین کے پہلے قافلے کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ آ گئے۔ایک دوسرے روایت کے مطابق انھوں نے مہاجرین کے تیسرے قافلے کے ساتھ ہجرت کی اور قُباء میں حضرت رفاعہ بن عبدالمنذر رضی اللہ عنہ کے ہاں قیام کیا۔تھوڑے ہی عرصہ بعد سرورِ عالم ﷺ نے بھی مدینہ میں نزولِ اجلال فرمایا اور اس قدیم شہر کے در و دیوار طلعت اقدس سے جگمگانے لگے۔ہجرت کے چھٹے مہینے میں حضور ﷺ نے حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ (خادمِ رسول اللہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے سوتیلے والد) کے مکان پر انصار و مہاجرین کو جمع کیا اور ان میں مواخاۃ قائم کی۔

حافظ ابنِ عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت زید بن خطاب رضی اللہ عنہ کو حضرت معن بن عدی عجلانی انصاری رضی اللہ عنہ کا دینی بھائی بنایا۔

سنہ ۲ ہجری میں بدر کے مقام پر حق اور باطل کے درمیان پہلا معرکہ ہوا تو حضرت زید بن خطاب رضی اللہ عنہ کو ''اصحابِ بدر'' میں شامل ہونے کا عظیم شرف حاصل ہوا۔ اگلے سال غزوۂ اُحد میں انہوں نے جس والہانہ جوش وخروش سے دادِ شجاعت دی اس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ اُحد کے بعد غزوۂ خندق میں سرفروشی کا حق ادا کیا۔ ۶ھ میں انھوں نے حدیبیہ کے مقام پر بیعتِ رضوان میں شریک ہونے کی لازوال سعادت حاصل کی۔ فتح مکہ کے بعد حنین، اوطاس اور طائف کے معرکے پیش آئے تو ان میں بھی وہ برابر رحمتِ عالم ﷺ کے ہمرکاب رہے۔ حجۃ الوداع (۱۰ھ) میں بھی حضور ﷺ کے ساتھ تھے۔ ابنِ سعد کا بیان ہے کہ حجۃ الوداع کے زمانے میں ایک دن سرورِ عالم ﷺ نے حضرت زید بن خطاب رضی اللہ عنہ کے سامنے یہ حدیث بیان فرمائی:

''جو تم کھاتے ہو وہی اپنے غلاموں کو کھلاؤ جو پہنتے ہو وہی اپنے غلاموں کو پہناؤ اگر وہ کوئی خطا کریں جو تم معاف نہ کر سکو تو ان کو فروخت کر ڈالو۔''

غرض عہدِ رسالت میں شاید ہی کوئی ایسا شرف ہو جو حضرت زید بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حاصل نہ کیا ہو۔ وہ خیر البشر ﷺ کے ان جان نثاروں میں سے تھے جو حق کی حمایت میں ہمیشہ سربکف رہتے تھے اور کسی قسم کا دباؤ، لالچ یا خوف انہیں اس کام سے باز نہیں رکھ سکتا تھا۔

(۳)

سنہ ۱۱ ہجری میں آفتابِ رسالت اللہ تعالیٰ کی شفقِ رحمت میں غروب ہوا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سریر آرائے خلافت ہوئے تو دفعتہً سارے عرب میں فتنۂ ارتداد کے شعلے بھڑک اٹھے۔ قریشِ مکہ، انصارِ مدینہ، بنوثقیفِ طائف اور تین چار دوسرے قبیلوں کے سوا عرب میں کوئی قبیلہ ایسا نہ تھا جو اس فتنے سے کسی نہ کسی صورت میں متاثر نہ ہوا ہو۔

امتِ مسلمہ پر یہ وقت سخت نازک تھا اور مرتدین کے مقابلے میں ذرا سی کمزوری کا مظاہرہ بھی خوفناک نتائج پیدا کر سکتا تھا۔ اس موقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کمال درجہ کے عزم و ہمت اور فراستِ مومنانہ سے کام لیا۔ وہ بادِ حوادث کے سامنے کوہِ استقامت بن کر کھڑے ہو گئے اور مرتدین کے تمام مطالبوں کو یکسر رد کر کے ان کے استیصال پر کمر باندھ لی۔ اس سلسلہ میں علمبردارانِ حق اور مرتدین کے درمیان کئی خونریز لڑائیاں ہوئی۔ ان میں سب سے ہولناک لڑائی مسیلمہ کذّاب کے خلاف یمامہ کے مقام پر پیش آئی۔ مورّخ طبری نے اس لڑائی کی بابت لکھا ہے لم یلق المسلمون حربًا مثلها قط یعنی مسلمانوں کو اس سے زیادہ سخت معرکہ کبھی پیش نہیں آیا۔

اہلِ سیر کا بیان ہے کہ حضرت زید بن خطاب رضی اللہ عنہ نے شروع ہی سے فتنہ ارتداد کو فرو کرنے کے لیے سردھڑ کی بازی لگا دی تھی اور مرتدین کے خلاف کئی معرکوں میں انہوں نے والہانہ جوش و خروش سے حصہ لیا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو جب مسیلمہ کی زبردست جنگی تیاریوں اور ترکتازیوں کی اطلاع ملی تو انہوں نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو مسیلمہ سے معرکہ آرا ہونے کا حکم دیا اور ان کی کمک کے لیے تازہ دم فوج روانہ کی۔ اس فوج میں انصار کے سردار حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ اور مہاجرین کے امیر حضرت زید بن خطاب رضی اللہ عنہ تھے۔ یمامہ کے قریب عقرباء کے مقام پر مسلمانوں اور مسیلمہ کے لشکروں کا آمنا سامنا ہوا۔ مسیلمہ کے لشکر کی تعداد چالیس ہزار تھی جبکہ مسلمانوں کی کل تعداد مل ملا کر دس ہزار کے قریب تھی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ اس موقع پر اسلامی لشکر کے علمبردار حضرت زید بن خطاب رضی اللہ عنہ تھے۔ جب دونوں جانب جنگ کی صفیں آراستہ ہو لیں تو سب سے پہلے مسیلمہ کی جانب سے نہار الرجال بن عنفوہ میدان میں نکلا اور اس نے مسلمانوں کو للکار کر دعوتِ مبارزت دی۔ یہ ایک نہایت شریر النفس شخص تھا۔ مورّخین نے لکھا ہے کہ وہ عہدِ رسالت میں یمامہ سے ہجرت کے لیے مدینہ منورہ چلا گیا تھا اور سرورِ عالم ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر آپ ﷺ

(۴)

سیّدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو حضرت زید بن خطاب رضی اللہ عنہ سے بے پناہ محبت تھی۔ اس محبت کی وجہ صرف یہ نہیں تھی کہ زید رضی اللہ عنہ ان کے برادرِ بزرگ تھے بلکہ یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کو قلبِ تپاں عطا کیا تھا اور وہ اپنی جان راہِ حق میں قربان کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ چنانچہ جب انہوں نے حضرت زید بن خطاب رضی اللہ عنہ کے شہید ہونے کی خبر سنی تو فرطِ غم سے نڈھال ہو گئے، لیکن جزع فزع کے بجائے زبان سے صرف یہ الفاظ نکلے:

''زید دو نیکیوں میں مجھ سے بڑھ گئے۔ ایک قبولِ اسلام میں اور دوسرے جامِ شہادت پینے میں......''

تاہم یہ صدمہ اتنا شدید تھا کہ کسی صورت بھلائے نہ بھولتا تھا۔ ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے۔ ''بادِ صبا چلتی ہے تو مجھے اس سے زید رضی اللہ عنہ کی خوشبو آتی ہے اور ان کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔''

امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ''مستدرک'' میں لکھا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو بھی کبھی کوئی مصیبت پیش آتی تو فرماتے، سب سے بڑی مصیبت زید رضی اللہ عنہ کی جدائی کی تھی، اس کو برداشت کیا اور صبر کیا اب اس سے بڑھ کر کیا مصیبت ہو سکتی ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں ایک مرتبہ عرب کا نامور شاعر متمم بن نویرہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ متمم کے بھائی مالک بن نویرہ کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے غلط فہمی کی بناء پر قتل کرا ڈالا تھا۔ اس واقعہ نے اس کو اس قدر صدمہ پہنچایا کہ ہمیشہ اپنے محبوب بھائی کے غم میں رویا کرتا اور مرثیے کہا کرتا۔ جہاں کہیں جاتا لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے اور اس سے مرثیے پڑھوا کر سنتے۔ وہ مرثیہ پڑھتے ہوئے خود بھی روتا جاتا اور سننے والوں کو بھی رلاتا جاتا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس کو دیکھا تو پوچھا ''متمم تم کو اپنے بھائی کی جدائی کا کس قدر غم ہے؟ اس نے عرض کیا:

''امیر المومنین ایک عارضے کی وجہ سے میری ایک آنکھ کے آنسو خشک ہو گئے تھے لیکن بھائی کے غم میں آنسو ایسے جاری ہوئے ہیں کہ آج تک نہیں رکے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''یہ غم کی انتہا ہے۔ کوئی بھی کسی جانے والے کا اتنا غم نہیں کرتا۔'' پھر آپ نے متمم سے بھائی کے غم میں کہا ہوا کوئی مرثیہ سنانے کی فرمائش کی اس نے رِقّت انگیز لہجے میں ایک دلدوز مرثیہ پڑھا جس کے آخر کے شعر یہ تھے۔

وکنا کَندَ مَا نَیْ جذیمة حقبة من الدهر حتیٰ قیل لن یتصدعا

فلما تفرقنا کانی و ما لکاً لطول اجتماع لم نبت لیلةً معا

(ہم دونوں جذیمہ (بادشاہ) کے مصاحبوں کی طرح مدت تک ایک ساتھ رہے یہاں تک کہ لوگ کہنے لگے یہ اب ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے پھر جب ہم جدا ہو گئے تو گویا میں نے اور مالک نے عرصہ رفاقت کی درازی کے باوجود ایک رات بھی ساتھ نہیں گزاری۔)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ یہ مرثیہ سن کر بہت متاثر ہوئے اور متمم سے مخاطب ہو کر فرمایا، ''اگر میں ایسا مرثیہ کہہ سکتا تو اپنے بھائی زید رضی اللہ عنہ کا مرثیہ کہتا۔'' متمم نے عرض کیا: ''امیر المومنین اگر میرا بھائی آپ کے بھائی کی طرح (میدانِ جہاد میں) شہید ہوا ہوتا تو میں ہرگز اشکباری نہ کرتا۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، ''تم نے جیسے میری تعزیت کی اس سے بہتر تعزیت کبھی کسی نے نہیں کی۔''

حضرت زید رضی اللہ عنہ نے اپنے پیچھے دو بیویاں اور دو بچے چھوڑے۔ بیویوں کے نام لبابہ اور جمیلہ تھے۔ لبابہ سے ایک صاحبزادے عبدالرحمٰن تھے اور جمیلہ سے ایک صاحبزادی اسماء۔

حضرت زید بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی چند احادیث بھی کتب حدیث میں موجود ہیں۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

حضرت اَبُو فُکَیہہ یسار ازدی رضی اللہ عنہ

حضرت اَبُو فُکَیہہ یسار ازدی رضی اللہ عنہ ابتداء میں قریش کے خاندان عبد دار کے غلام تھے۔ بے کس اور بے یار و مددگار ہونے کے باوجود ان کے سینے میں شیر کا دل تھا۔ رحمتِ دو عالم ﷺ نے جب ظلمت کدۂ عرب میں شمع توحید روشن کی تو ابو فکیہہ رضی اللہ عنہ بے خوف و خطر آگے بڑھے اور اس شمع کے پروانے بن گئے اس زمانہ میں وہ بنو جمح کی غلامی میں تھے۔ ان کا آقا اُمیہ بن خلف جمحی اپنے غلام کی اس جراتِ رندانہ پر شعلہ جوالہ بن گیا۔ اور اس نے بے کس ابو فکیہہ پر بے پناہ ظلم و ستم ڈھانا شروع کر دیا۔ ظالم خود بھی ان کو نت نئی سزا کا ہدف بناتا تھا اور اپنے اہل خاندان کو بھی کھلی چھٹی دے دی تھی کہ جب جی چاہے اس مظلوم کو اپنی مشقِ ستم کا نشانہ بنائیں۔ یہ ظالم تپتی ہوئی ریت پر دوپہر کے وقت حضرت ابو فکیہہ رضی اللہ عنہ کو منہ کے بل لٹا دیتے اور پیٹھ پر ایک وزنی پتھر رکھ دیتے۔ وہ مردانہ وار اس سزا کا مقابلہ کرتے حتیٰ کہ ہولناک گرمی اور ناقابلِ برداشت اذیت سے بے ہوش ہو جاتے۔ اتنی تکلیف کے باوجود کیا مجال کہ ان کی زبان شرک سے آلودہ ہو۔

ایک دن شقی القلب امیہ نے حضرت ابو فکیہہ رضی اللہ عنہ کے دونوں پاؤں میں رسی باندھی اور انہیں بُری طرح گھسیٹتا ہوا باہر لے گیا۔ اس وقت دوپہر کا وقت تھا اور سورج آگ برسا رہا تھا۔ امیہ نے ابو فکیہہ رضی اللہ عنہ کو تپتی ہوئی ریت پر ڈال دیا۔ امیہ کا بیٹا صفوان بھی باپ کے پیچھے پیچھے وہاں پہنچا اور حضرت ابو فکیہہ رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر پوچھنے لگا، کیا میرا باپ تیرا ربّ نہیں ہے؟

شمع توحید کے پروانے ابو فکیہہ رضی اللہ عنہ نے فوراً جواب دیا۔

''ہرگز نہیں، میرا ربّ اللہ تعالیٰ ہے جو سب کا خالق و مالک ہے اور جو سب کو روزی دیتا ہے۔''

صفوان کو اس جواب پر سخت طیش آیا اور اس نے حضرت ابوفکیہہ رضی اللہ عنہ کا گلا اس زور سے دبایا کہ ان کی زبان باہر نکل پڑی اور وہ بالکل بے حس وحرکت ہو گئے۔ صفوان اور اُمیّہ نے سمجھا کہ ختم ہو گئے۔[1] لیکن ابھی ان میں زندگی کی رمق باقی تھی۔ حسنِ اتفاق سے اس وقت دردمندِ بیکساں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ادھر سے گزرے۔ انہوں نے حضرت ابوفکیہہ رضی اللہ عنہ کی دردناک بلاکشی کا منظر دیکھا تو دل بھر آیا اور اس وقت حضرت ابوفکیہہ رضی اللہ عنہ کو اُمیّہ بن خلف سے خرید کر آزاد کر دیا۔ لیکن حضرت ابوفکیہہ رضی اللہ عنہ آزاد ہونے کے باوجود مشرکینِ مکہ کے جور و تعدّی سے محفوظ نہ تھے۔ چنانچہ حبشہ کی دوسری ہجرت (۶ھ بعد بعثت) میں وہ بھی بہت سے دوسرے مسلمانوں کے ساتھ حبش چلے گئے۔ راہِ حق میں مصیبتیں جھیلتے جھیلتے صحت بگڑ گئی تھی اور قوائے بدنی ضعیف ہو گئے تھے۔ غزوۂ بدر سے کچھ عرصہ پہلے پیکِ اجل کو لبیک کہا۔ حضرت ابوفکیہہ رضی اللہ عنہ ان ثابت قدم ہستیوں میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے سخت نامساعد حالات کے باوجود بت پرستوں کے غول میں برملا خدا کا نام لیا۔ بلاکشانِ اسلام میں ان کا درجہ بہت بلند ہے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

---
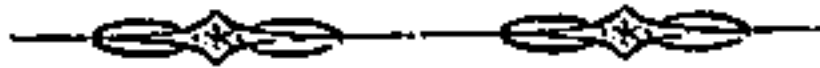
[1] یہ ابن اثیر رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے۔ (اُسد الغابہ) حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ''اصابہ'' میں لکھا ہے کہ اُمیّہ خود حضرت ابوفکیہہ رضی اللہ عنہ کا گلا گھونٹ رہا تھا کہ اس کا بھائی ابی بن خلف ادھر سے گزرا۔ اس نے اُمیّہ سے کہا ''اور مارو'' چنانچہ اُمیّہ انہیں برابر زدوکوب کرتا رہا یہاں تک کہ ان کو غش آ گیا۔

حضرت ابو قیس بن حارث سہمی رضی اللہ عنہ

نام ابو قیس تھا اور کنیت بھی یہی تھی۔ ان کا تعلق قریش کے خاندان بنو سہم سے تھا۔
نسب نامہ یہ ہے:

ابو قیس رضی اللہ عنہ بن حارث بن قیس بن عدی بن سعد بن سہم۔

ان کا دادا قیس بن عدی قریش کے سرداروں میں سے تھا اور باپ حارث بن قیس بھی مشرکین کا سرغنہ تھا۔ یہ ان شریر النفس لوگوں میں سے تھا جو قرآنِ کریم کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ حافظ ابنِ عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے ''الاستیعاب'' میں لکھا ہے کہ سورۂ حجر کی یہ آیات ایسے ہی لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی تھیں:

الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ ○ فَوَرَبِّكَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ○ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ○ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ○

''جن لوگوں نے قرآن کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تیرے ربّ کی قسم ہم ان کے اعمال کا ضرور محاسبہ کریں گے۔ پس تم کو جو حکم دیا گیا ہے اس کو کھول کر سنا دو اور مشرکین کی طرف دھیان نہ دو۔ جو لوگ تمہار تمسخر اڑاتے ہیں ہم ان کے لیے کافی ہیں۔''

حارث بن قیس کے ساتھ بیٹے تھے۔ ابو قیس، عبداللہ، سائب، تمیم، معبد، حجاج، سعید...... خدا کی قدرت جیسے دشمنِ اسلام کے چھ بیٹوں ابو قیس رضی اللہ عنہ، عبداللہ رضی اللہ عنہ، سائب، تمیم رضی اللہ عنہ، حجاج رضی اللہ عنہ اور سعید رضی اللہ عنہ کو اسلام اور ہجرت کا شرف نصیب ہوا۔

(معبد کے بارے میں کتبِ سیَر خاموش ہیں)۔ حضرت ابوقیس رضی اللہ عنہ دعوتِ حق کے ابتدائی زمانے میں سعادت اندوزِ ایمان ہوئے اور ٦ بعدِ بعثت میں ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے۔(ان کے بھائی بھی ساتھ تھے) وہاں کئی سال گزارنے کے بعد غزوۂ اُحد سے پہلے مدینہ منورّہ آ گئے اور اُحد، خندق، خیبر، فتح مکّہ، حنین، تبوک تمام غزووں میں سرورِ عالم ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔

رحمتِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ سریرآرائے خلافت ہوئے تو سارے عرب میں فتنہ ارتداد کے شعلے بھڑک اٹھے۔ اس فتنے کے استیصال کے لیے جولڑائیاں پیش آئیں ان میں سب سے خونریز جنگ ''جنگِ یمامہ'' تھی...... جو مسیلمہ کذّاب کے خلاف لڑی گئی۔ حضرت ابوقیس رضی اللہ عنہ بھی مجاہدینِ اسلام میں شامل تھے۔ انہوں نے اسی جنگ میں مردانہ وار لڑتے ہوئے اپنے جان راہِ حق میں قربان کر دیا۔ ان کے بھائی عبداللہ رضی اللہ عنہ بھی اسی لڑائی میں رتبہ شہادت پر فائز ہوئے۔ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضرت ابوقیس رضی اللہ عنہ کے دوسرے بھائی بھی مختلف معرکوں میں شہید ہوئے، تمیم رضی اللہ عنہ جنگِ جنادین میں، سائب رضی اللہ عنہ جنگِ فحل میں، حجاج رضی اللہ عنہ اور سعید رضی اللہ عنہ جنگِ یرموک میں شہید ہوئے۔

یہ اللہ کی دین ہے جسے چاہے اپنے کرم سے نوازے۔ ایک کنیہ توز مشرک کے بیٹوں کو اس نے یہ سعادت بخشی کہ وہ سیّد المرسلین ﷺ کے شیدائیوں اور دینِ حق کے جانباز سپاہیوں میں شمار ہوئے، ربّ کریم نے سب کو شرفِ شہادت سے سرفراز فرمایا ع

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

رضی اللہ تعالیٰ عنہ
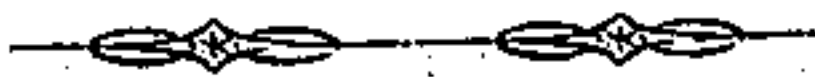
حضرت عبداللہ بن حُذافہ سہمی رضی اللہ عنہ

(۱)

سیّدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں جب مسلمانوں کی فتوحات کا سیلاب شام میں داخل ہوا تو رومیوں میں مسلمان دشمنی کا جنون اس حد تک پہنچ گیا کہ وہ جنگی قیدیوں کو بھی نہایت بی دردی سے شہید کر ڈالتے تھے۔ عرب مورخین نے لکھا ہے کہ رومیوں نے تانبے کی ایک بہت بڑی گائے بنا رکھی تھی۔ اس کے پیٹ میں روغنِ زیتون ڈال کر نیچے آگ جلاتے رہتے تھے۔ اگر مسلمان قیدی نصرانیت قبول کر لیتے تھے تو ان کو چھوڑ دیتے اور اگر اپنا دین ترک کرنے سے انکار کرتے تو انہیں کھولتے ہوئے تیل میں ڈال دیتے۔

ایک دفعہ شام کے ایک معرکے میں اسی ۱۸۰ کاسی ۸۱ مجاہدین، رومیوں کے ہاتھ اسیر ہو گئے ان مسلمان قیدیوں میں ایک قوی الجثہ صاحبِ رسول رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ ان کی پیشانی نُورِ سعادت سے درخشاں تھی اور چہرے پر عجیب قسم کا جلال تھا۔ شامی لشکر میں خود شاہِ روم موجود تھا۔ رومی ان صاحب کو پکڑ کر بادشاہ کے پاس لے گئے۔ بادشاہ نے ان کو نصرانی مذہب قبول کرنے کی دعوت دی، لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ بادشاہ نے ان سے کہا کہ اپنا انجام اچھی طرح سوچ لو اگر تم اپنے انکار پر قائم رہے تو تمہیں کھولتے ہوئے تیل میں ڈال دیا جائے گا۔ ان صاحبِ رسول ﷺ نے بے دھڑک جواب دیا کہ خواہ کچھ بھی کرو میں اپنا دین نہیں چھوڑوں گا۔ اب رومی ان کو خوفزدہ کرنے کے لیے ایک اور مسلمان قیدی کو بادشاہ کے سامنے لائے۔ اس نے اس قیدی کو بھی اسلام ترک کرنے کے لیے کہا لیکن اس بندۂ حق نے بھی صاف انکار کر دیا۔ اس پر رومی ظالموں نے اسے

کھولتے ہوئے تیل میں ڈال دیا وہ آناً فاناً جل بھن کر کباب ہو گیا۔ وہ صاحبِ رسول ﷺ اپنے مظلوم ساتھی کا انجام دیکھ کر رونے لگے۔ رومیوں نے کہا، اب موت سے ڈر کر روتے کیوں ہو، ابھی وقت ہے نصرانیت قبول کر لو تو ہم تمہیں رہا کر دیں گے۔

رومیوں کی بات سُن کر ان صاحبِ رسول ﷺ کی آنکھوں میں ایک نورانی چمک پیدا ہوئی اور انہوں نے بڑے پُر جلال لہجے میں فرمایا: ''میں موت سے ڈر کر نہیں روتا بلکہ اس بات پر روتا ہوں کہ اللہ کی راہ میں قربان کرنے کے لیے میرے پاس صرف ایک جان ہے کاش ایک جان کے بجائے میرے ہر بال کی جگہ ایک ایک جان ہوتی اور میں ان سب جانوں کو راہِ حق میں نثار کر دیتا۔''...... رومی ان کی قوّتِ ایمانی دیکھ کر حیران رہ گئے اور ایسے پختہ ایمان والے شخص کو اپنے دین میں داخل کرنے کے لیے اور بے تاب ہو گئے۔

انہوں نے ان صاحب رسول رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اگر ہمارے بادشاہ کی پیشانی پر بوسہ دو تو ہم تمہیں ابھی رہا کر دیں گے۔

انہوں نے صلیب پرست بادشاہ کی پیشانی چومنے سے بھی صاف انکار کر دیا۔ اب رومیوں نے انہیں مال و دولت اور حسین عورتوں کا لالچ دیا، لیکن انہوں نے ہر ترغیب کو ٹھکرا دیا۔ آخر قیصرِ روم نے کہا کہ میری پیشانی چوم لو تو تمام مسلمان قید چھوڑ دیے جائیں گے۔ اپنے مسلمان بھائیوں کی خاطر وہ صاحب رسول رضی اللہ عنہ اب فوراً آگے بڑھے اور بادشاہ کی پیشانی کو چوم لیا۔ اس طرح اُسی ۸۰ مسلمانوں کی قیمتی جانیں بچ گئیں۔

یہ صاحب رسول ﷺ جب مدینہ منوّرہ آئے اور امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو یہ واقعہ سنایا تو انہوں نے فرطِ مسرّت سے ان کی پیشانی چوم لی اور دوسرے مسلمانوں سے بھی فرمایا کہ وہ ان کے سر کو بوسہ دیں۔

عزم واستقلال کے یہ پہاڑ جن کے اخلاص و ایثار کو خلیفہ عرب و عجم سیّدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے بھی خراجِ تحسین پیش کیا، حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ تھے۔

(۲)

سیّدنا ابو حذیفہ عبداللہ رضی اللہ عنہ بن حُذافہ قریش کی شاخ بنو، سہم سے تھے۔ نسب نامہ یہ ہے: عبداللہ رضی اللہ عنہ بن حذافہ بن قیس بن عدی بن سعد بن سہم بن عمر بن حصیص بن کعب بن لُوی

حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے فطرتِ سلیم سے نوازا تھا۔ انہوں نے بعثتِ نبوی کے ابتدائی زمانے میں اس وقت دعوتِ توحید پر لبیک کہا جب ایسا کرنا ہولناک خطرات اور مصائب کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ سعادت اندوزِ اسلام ہونے کے بعد حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بھی دوسرے اہلِ حق کی طرح کفار کے ظلم وستم کا نشانہ بن گئے۔ جب کفار کا ظلم وستم حد سے بڑھ گیا تو ۶ بعدِ بعثت میں حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن حذافہ حضور ﷺ کے ایما پر بہت سے دوسرے مظلوم مسلمانوں کے ساتھ ہجرت کر کے حبش چلے گئے اور وہاں کئی سال غریب الوطنی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ وہ حبش سے کب واپس آئے؟ مورخین نے اس کی تصریح نہیں کی۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ غزوہ بدر سے پہلے واپس آ گئے اور انہیں اصحابِ بدر میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا، لیکن جمہور اہلِ سِیَر اس طرف گئے ہیں کہ غزوہ بدر کے سوا وہ دوسرے تمام غزواتِ نبوی میں شریک ہوئے اور اپنی جانبازی کے جوہر دکھائے۔

صلح حدیبیہ (۶ھ) کے بعد جنابِ رسالت مآب ﷺ نے جب ہمسایہ ممالک کے حکمرانوں کے نام دعوتِ اسلام کے خطوط بھیجے تو ان میں سے ایک خط شاہِ ایران کے نام بھی تھا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضور ﷺ نے یہ خط حضرت عبداللہ بن حُذافہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر کے انہیں حکم دیا کہ وہ اسے بحرین کے گورنر کی وساطت سے کسریٰ تک پہنچا دیں۔ حضرت عبداللہ بن حُذافہ رضی اللہ عنہ نے نہایت حسن وخوبی سے حضور ﷺ کے ارشاد کی تعمیل کی اور مکتوبِ نبوی کو بحفاظتِ تمام حاکمِ بحرین تک پہنچا دیا۔ اہلِ سِیَر نے یہ وضاحت نہیں کی کہ حاکمِ بحرین نے یہ خط دے کر حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ ہی کو مداین بھیجا یا

اپنے کسی آدمی کے ہاتھ اسے پایہ تخت روانہ کیا تھا۔ بہرصورت یہ خط کسریٰ تک پہنچ گیا۔
مورخین نے بالعموم اس مکتوبِ نبوی ﷺ کے مندرجات اس طرح نقل کیے ہیں:

بسم اللّٰه الرحمٰن الرحیم

من محمد رسول اللّٰه الٰی کسریٰ عظیم فارس

سلامٌ علٰی من اتبع الھدٰی و آمن باللّٰه ورسوله.

وادعوك بدعایة اللّٰه فانی انا رسول اللّٰه الی الناس کافة لا

نذر من کان حیًا و یحق القول علی الکافرین فاسلم تسلم

فان ابیت فان ء اثم المجوس علیك.

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

محمد رسول اللہ کی طرف سے کسریٰ سردارِ ایران کے نام

ہدایت پر چلنے اور اللہ ورسول پر ایمان لانے والے کے لیے سلامتی ہو۔

میں تجھے خدا کا بلاوا دیتا ہوں کیونکہ مجھے خدا نے تمام انسانوں کی طرف بھیجا ہے۔
تا کہ میں ہر زندہ شخص کو ڈراؤں، کافروں کے متعلق خدا کی بات پوری ہو کر رہے گی۔

اسلام لا۔ سلامت رہے گا۔

اگر تو انکار کرے تو تمام مجوسیوں کا وبال تجھی پر پڑے گا۔

(۳)

حضرت عبداللہ بن حُذافہ رضی اللہ عنہ کو رحمتِ دوعالم ﷺ سے بے پناہ عقیدت تھی اور لسانِ رسالت سے نکلے ہوئے ہر لفظ کی صداقت پر اُن کا یقینِ کامل مثالی حیثیت رکھتا تھا۔ صحیحین میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن آفتاب ڈھلنے کے بعد رسول اللہ ﷺ باہر تشریف لائے اور صحابہ کو ظہر کی نماز پڑھائی جب سلام پھیر چکے تو منبر پر کھڑے ہوئے اور قیامت کا ذکر فرمایا۔ اسی ضمن میں یہ بھی ذکر کیا کہ قیامت سے پہلے بڑے بڑے واقعات رُونما ہوں گے۔ اس کے بعد (حالتِ جلال میں) فرمایا

جسے جو پوچھنا ہو پوچھ لے۔ خدا کی قسم جب تک میں اس جگہ کھڑا ہوں تم مجھ سے جو دریافت کرو گے میں تم کو بتاؤں گا۔ یہ سُن کر لوگ بہت روئے۔ ادھر آپ ﷺ بار بار فرماتے تھے کہ پوچھو پوچھو۔ آخر عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور پوچھا، یارسول اللہ میرے والد کون ہیں۔ فرمایا تیرا باپ حُذَافہ ہے۔ جب اس کے بعد بھی آپ ﷺ یہی فرماتے رہے کہ پوچھو اور پوچھو تو عمر رضی اللہ عنہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اور کہا ہم اللہ کو ربّ، اسلام کو دین اور محمد ﷺ کو رسول مان کر راضی ہیں، ان کی بات سُن کر حضور ﷺ خاموش ہو گئے پھر فرمایا خبردار اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد ﷺ کی جان ہے، ابھی ابھی دیوار کی طرف جنت اور دوزخ مثالی طور پر میرے سامنے پیش کی گئی تھیں میں نے برائی اور بھلائی کا ایسا منظر جیسا آج دیکھا کبھی نہیں دیکھا۔

ابنِ شہاب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی اسناد سے اس واقعہ پر یہ اضافہ کیا ہے کہ عبداللہ بن حُذَافہ رضی اللہ عنہ کی والدہ نے عبداللہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تجھ جیسی نالائق اولاد میں نے نہیں دیکھی۔ تیرے پاس اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ تیری ماں نے زمانہ جاہلیت کی عورتوں کی طرح کوئی قبیح حرکت نہیں کی ہوگی۔ اگر کہیں ایسا ہوا ہوتا تو آج تو نے سب لوگوں کے سامنے اپنے ماں کو رسوا کر دیا ہوتا۔

حضرت عبداللہ بن حُذَافہ رضی اللہ عنہ نے کہا، خدا کی قسم اگر آپ ﷺ مجھے کسی حبشی غلام کی بھی اولاد قرار دیتے تو میں اپنے آپ کو اسی کی اولاد سمجھ لیتا۔

بعض شارحینِ حدیث نے لکھا ہے کہ اس واقعہ کا پس منظر یہ تھا کہ حضور ﷺ نے لوگوں کو غیر متعلق سوالات پوچھنے کی ممانعت فرمائی تھی اس پر بھی بعض طبائع سوال سے باز نہ آئیں تو آپ ﷺ کو جلال آ گیا اور اسی حالتِ جلال میں آپ ﷺ نے منبر پر کھڑے ہو کر اعلان فرما دیا کہ اچھا اب جسے جو پوچھنا ہو پوچھ ہی لے۔ حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ نے اپنے باپ کے بارے میں جو سوال کیا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ بعض

لوگ ان کے نسب میں تہمت لگاتے تھے۔

(۴)

صحیح بخاری میں روایت ہے کہ ایک دفعہ رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن حذافہ کو کسی سریہ میں امیر بنا کر بھیجا اور ان کے ماتحت مجاہدین کو حکم دیا کہ کسی بات میں ان کی حکم عدولی نہ کرنا۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کسی بات پر اپنے رفقاء سے ناراض ہو گئے اور انھیں لکڑیاں جمع کر کے آگ جلانے کا حکم دیا۔ انہوں نے حکم کی تعمیل کی تو بولے کیا رسول اللہ ﷺ نے تمہیں میری اطاعت کا حکم نہیں دیا؟

انہوں نے جواب دیا۔ ''بے شک دیا ہے۔''

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا تو پھر (میں تمہیں بحیثیت امیر کے حکم دیتا ہوں کہ) اس آگ میں کود پڑو۔

پہلے تو سب لوگ اس پر تیار ہو گئے لیکن پھر کچھ سوچ کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے، بعض نے کہا کہ امیر کی اطاعت ہم پر لازم ہے اور بعض نے کہا کہ ہم آگ ہی سے بچنے کے لیے اسلام لائے ہیں اس لیے آگ میں کیوں داخل ہوں۔

اسی اثناء میں آگ بجھ گئی اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کا غصہ بھی جاتا رہا۔ جب یہ لوگ سرورِ عالم ﷺ کی خدمت میں واپس مدینہ منوّرہ آئے اور اس واقعہ کا ذکر کیا تو حضور ﷺ نے فرمایا: ''اگر تم اس آگ میں داخل ہو جاتے تو پھر کبھی نہ نکلتے۔ امیر کی اطاعت تو اچھی بات میں ہوتی ہے جس کی خدا نے اجازت دی ہے۔''

اس واقعہ کے بارے میں (جو ۹ ھ میں پیش آیا) بعض اربابِ سِیَر نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں سے مذاق کیا تھا یعنی مزاح کے طور پر انہیں آگ میں کودنے کا حکم دیا تھا۔ اس ضمن میں بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بڑے زندہ دل آدمی تھے۔ اور اکثر ہنسنے ہنسانے کی باتیں کرتے رہتے تھے۔ ابنِ عساکر رحمۃ اللہ علیہ نے زہری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی ہے کہ ایک دفعہ بعض صحابہ

کرام رضی اللہ عنہم نے حضور ﷺ سے شکایت کی کہ عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ مزاحیہ باتیں کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا، اُسے چھوڑ دو، اس کا اندرون اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کو دوست رکھتا ہے۔

(۵)

سرورِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں ایران اور شام سے لڑائی کا آغاز ہوا تو حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ بھی شام جانے والے لشکرِ مجاہدین میں شامل ہو گئے اور عہدِ صدیقی اور عہدِ فاروقی میں رومیوں کے خلاف کئی معرکوں میں دادِ شجاعت دی۔ شام کی لڑائیوں کے دوران میں ایک موقع پر انھوں نے جس عزم وثبات اور جوشِ ایمان کا مظاہرہ کیا اس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ یہ واقعہ عرب مورّخین نے تواتر کے ساتھ نقل کیا ہے۔

علامہ بلاذری رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ نے مصر کی فتوحات میں بھی حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر حصہ لیا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے ''عین شمس'' کا خاص طور پر ذکر کیا ہے جو حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر فتح ہوا۔ ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ''اُسد الغابہ'' میں لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں مصر ہی میں وفات پائی اور اسی سرزمین کو ان کا مدفن بننے کا شرف حاصل ہوا۔

حضرت عبداللہ بن حذافہ کا پایہ فضل وکمال بہت بلند تھا۔ ان سے متعدد حدیثیں مروی ہیں۔ ایک حدیث صحیح بخاری میں بھی موجود ہے ان کے رواۃ میں ابنِ یسار رحمۃ اللہ علیہ سلیمان رحمۃ اللہ علیہ اور ابووائل رحمۃ اللہ علیہ جیسے جلیل القدر تابعین شامل ہیں۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت خالد بن سعید اُموی رضی اللہ عنہ

(۱)

بعثتِ نبوی ﷺ کے ابتدائی زمانے کا ذکر ہے کہ ایک دن مکہ کے ایک جوانِ رعنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت پو پھٹ رہی تھی اور اس نوجوان کے چہرے پر اضطراب کے آثار نمایاں تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نور کے تڑکے اس نوجوان کو ایسی حالت میں دیکھ کر کچھ حیران سے ہوئے کیونکہ وہ کسی معمولی گھرانے کا فرد نہیں تھا بلکہ بنو عبد شمس کے اس نامور سردار کا فرزند تھا جسے اہلِ مکہ نے ''ذوالتاج'' (تاج والے) کا لقب دے رکھا تھا اور جس کی دستار کی یہ شان تھی کہ کوئی دوسرا اس رنگ کی دستار اپنے سر پر نہیں رکھ سکتا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا: ''کیوں بھئی آج صبح ہی صبح کیسے آنا ہوا؟''

نوجوان نے نہایت دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ ''اے ابوبکر رضی اللہ عنہ، رات کو میں نے ایک عجیب خواب دیکھا، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کی تعبیر کیا ہو سکتی ہے۔ اسی شش و پنج میں آپ کے پاس آیا ہوں کہ اس خواب کے بارے میں مجھے کچھ بتائیں، مکہ میں مجھے اور کوئی شخص ایسا نظر نہیں آتا جو تعبیرِ رویاء میں آپ جیسی مہارت رکھتا ہو۔''

صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''بھتیجے تم نے اپنا خواب تو بیان ہی نہیں کیا ذرا بتاؤ تو تم نے کیا دیکھا؟''

نوجوان نے کہا: میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک غار کے دھانے پر کھڑا ہوں۔ جس میں آگ بھڑک رہی ہے۔ میرے والد پوری قوت سے مجھے اس غار میں دھکیل رہے ہیں لیکن محمد ﷺ بن عبداللہ نے میرا گریبان مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے اور وہ مجھے

اس غار میں گرنے سے بچا رہے ہیں۔ یہ کش مکش جاری تھی کہ میری آنکھ کھل گئی۔ رات کا باقی حصہ میں نے سخت اضطراب میں کاٹا اور صبح ہوتے ہی آپ کے پاس چلا آیا۔"

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نوجوان کی بات ختم ہوتے ہی فرمایا: "برادرزادے میرا مشورہ یہ ہے کہ محمد ﷺ جس دین کی دعوت دے رہے ہیں، تم فوراً اس کو قبول کر لو۔ تمہارے خواب سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسا کرنے سے تم اس آتشیں غار میں گرنے سے بچ جاؤ گے البتہ تمہارے والد کی قسمت میں یہ سعادت نہیں ہے، وہ ضرور اس غار میں گریں گے۔"

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا پُرخلوص مشورہ نوجوان کے دل میں اتر گیا وہ وہاں سے اُٹھ کر سیدھا سرورِ عالم ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا اور عرض کیا: "اے ابن عبدالمطلب آپ کس چیز کی دعوت دیتے ہیں؟"

حضور ﷺ نے فرمایا: "میری دعوت یہ ہے کہ اللہ ایک ہے اور وہی عبادت کے لائق ہے صرف اس کی پرستش کرو اور مجھ کو اس کا رسول مانو۔ ان پتھر کے بتوں کی پوجا چھوڑ دو جو کسی کو نفع یا نقصان پہنچانے پر قادر نہیں ہیں۔ ان کو تو اس بات کی بھی خبر نہیں ہے کہ کون ان کی پرستش کرتا ہے اور کون نہیں کرتا۔" حضور ﷺ کے ارشادات سن کر نوجوان کا چہرہ چمک اٹھا اور اس کی زبان پر بے ساختہ یہ الفاظ آ گئے۔ "اے اللہ کے رسول ﷺ، میں خدائے واحد اور آپ کی رسالت پر صدقِ دل سے ایمان لاتا ہوں۔ انشاءاللہ آپ مجھے راہِ حق میں ثابت قدم پائیں گے۔"

ایک متمول گھرانے کے یہ نوجوان جنہوں نے ہر قسم کا عیش و آرام میسّر ہونے کے باوجود قبولِ حق کا پُرخطر راستہ اختیار کیا اور سخت نامساعد حالات میں سرورِ عالم ﷺ کا دامنِ اقدس تھاما، حضرت خالد بن سعید اُموی رضی اللہ عنہ تھے۔

(۲)

سیّدنا حضرت ابوسعید خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کا شمار نہایت جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم میں

ہوتا ہے۔ ان کا تعلق قریش کے خاندان بنواُمیہ سے تھا۔ نسب نامہ یہ ہے:

خالد رضی اللہ عنہ بن سعید بن عاص بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف بن قصی۔

عبدِ مناف پر ان کا سلسلہ نسب رسول اکرم ﷺ سے مل جاتا ہے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا والد ابواُحیحہ سعید بن عاص بڑے دبدبہ اور شکوہ کا رئیس تھا اور مکہ میں بڑے اثر واقتدار کا مالک تھا۔ ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ وہ جس رنگ کا عمامہ باندھتا تھا مکہ میں کسی دوسرے کو یہ جرات نہ تھی کہ اس رنگ کا عمامہ باندھ سکے اسی لیے وہ لوگوں میں ''ذوالتاج'' (صاحبِ تاج) کے لقب سے مشہور ہو گیا تھا۔ جب ابواُحیحہ کو حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کا علم ہوا تو وہ سخت برافروختہ ہوا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ باپ کے قہر وغضب سے بچنے کے لیے کہیں چھپ گئے۔ ابواُحیحہ نے اپنے دوسرے بیٹوں کو ان کی تلاش کے لیے بھیجا۔ وہ انہیں پکڑ کر باپ کے پاس لے گئے۔ ابواُحیحہ نے خالد رضی اللہ عنہ کو سخت سست کہنے کے بعد اس بیدردی سے پیٹا کہ اس کے ہاتھ کی لکڑی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ جب مارتے مارتے تھک گیا تو کہا۔ ''محمد ﷺ کے دین کو چھوڑ دو ورنہ تمہاری خیر نہیں۔'' لیکن خالد رضی اللہ عنہ دل و جان سے اسلام کے شیدائی بن چکے تھے، بولے: ''ہرگز نہیں ہرگز نہیں خواہ میری جان بھی چلی جائے میں محمد ﷺ کا دامنِ اقدس ہاتھ سے نہ چھوڑوں گا۔'' ابواحیحہ نے بہت ڈرایا دھمکایا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اس پر باپ نے انہیں پھر مارا اور گالیاں دیں۔ اس کے بعد کہا خالد تو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ محمد ﷺ نے ساری قوم سے الگ راستہ اختیار کر لیا ہے وہ ہمارے معبودوں کی مذمت کرتا ہے اور ہمارے آباؤ اجداد کو گمراہ قرار دیتا ہے تجھے شرم نہیں آتی کہ ان باتوں میں اس کا ساتھ دیتا ہے۔''

خالد رضی اللہ عنہ نے بے دھڑک جواب دیا: ''خدا کی قسم محمد ﷺ جو کہتے ہیں، میں ہر حالت میں ان کی پیروی کروں گا۔'' ابواحیحہ نے تنگ آ کر کہا: ''نالائق میری آنکھوں سے دُور ہو جاؤ۔ میرے گھر میں تجھے کھانا نہیں ملے گا۔''

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے نہایت اطمینان سے جواب دیا: ''آپ میرا رزق بند کر دیں گے تو اللہ مجھے رزق دے گا۔''

پھر وہ رحمتِ عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ ہی کے ساتھ رہنے لگے۔ ابن سعید رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ ایک روز وہ مکہ کے نواح میں ایک سنسان جگہ نماز پڑھ رہے تھے کہ ابواحیحہ کو اس کی خبر پہنچ گئی۔ اس نے بُلا کر ان کو ایک بار پھر ورغلانے کی کوشش کی اور اپنے آبائی مذہب کی طرف لوٹ آنے کی ترغیب دی۔ لیکن انہوں نے جواب دیا کہ میں مرتے دم تک اسلام ترک نہیں کروں گا۔

یہ جواب سُن کر ابواُحیحہ نے ان کے سر پر لکڑی مارنی شروع کی یہاں تک کہ لکڑی ٹوٹ گئی۔ پھر اس نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو قید کر دیا اور ان کا کھانا پینا بند کر دیا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ تین دن تک بھوکے پیاسے مکہ کی ہولناک گرمی میں قیدِ تنہائی کی مصیبتیں جھیلتے رہے۔ چوتھے دن موقع پا کر بھاگ نکلے اور نواحِ مکہ میں کہیں چُھپ گئے۔

کچھ عرصہ بعد (۶ بعدِ بعثت میں) جب بلاکشانِ اسلام کا دوسرا قافلہ حبشہ جانے لگا تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ مکہ واپس آئے اور اپنی بیوی کو ساتھ لے کر اس قافلہ کے ہمراہ حبشہ چلے گئے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی اہلیہ کا نام اہلِ سِیَر نے اُمَینہ لکھا ہے اور بعض نے ہُمَینہ۔ ان کا تعلق بنوخزاعہ سے تھا اور وہ بھی بعثتِ نبوی کے ابتدائی زمانے میں سعادت اندوزِ اسلام ہوگئی تھیں۔ دونوں میاں بیوی تقریباً تیرہ برس تک حبشہ میں غریب الوطنی کی زندگی گزارتے رہے۔ وہیں ان کے صاحبزادے سعید رضی اللہ عنہ اور صاحبزادی اُمِ خالد رضی اللہ عنہا پیدا ہوئیں بعد میں ان دونوں کو بھی شرفِ صحابیت حاصل ہوا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے قیامِ حبشہ کے دوران میں حضرت اُمِ حبیبہ رضی اللہ عنہا بنتِ ابی سفیان رضی اللہ عنہما بیوہ ہوئیں تو سرورِ عالم ﷺ نے انہیں نجاشی (شاہِ حبشہ) کی وساطت سے نکاح کا پیغام بھیجا۔ حضرت اُمِ حبیبہ رضی اللہ عنہا نے حضور ﷺ کا پیغام بصد مسرّت قبول کر لیا اور حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کو اپنا وکیل مقرر کیا۔ نجاشی نے حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور دوسرے مسلمانوں کو

بلا کر خود حضرت اُمِ حبیبہ رضی اللہ عنہا کا غائبانہ نکاح حضور ﷺ سے پڑھایا۔ اس موقع پر حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے نہایت حسن وخوبی سے حضرت اُمِ حبیبہ رضی اللہ عنہا کی وکالت کا فرض انجام دیا اور رسمِ نکاح سے فراغت کے بعد شرکائے مجلس کو کھانا کھلا کر رخصت کیا۔ اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ اپنے اہل وعیال اور دوسرے مسلمانوں کیساتھ حبشہ سے ہجرت کر کے مدینہ آ گئے۔ یہ اواخر ۶ھ یا اوائل ۷ھ کا زمانہ تھا۔ اس وقت سرورِ عالم ﷺ غزوۂ خیبر میں مصروف تھے۔ حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ اور حبشہ سے واپس آنے والے دوسرے تمام مسلمان خواتین کو مدینہ میں چھوڑ کر شوقِ جہاد میں سیدھے خیبر پہنچے۔ اس وقت خیبر فتح ہو چکا تھا اور مسلمان خوشی منا رہے تھے۔ اپنے غریب الوطن بھائیوں کو اپنے درمیان پا کر ان کی مسرّت دوبالا ہو گئی۔ حضور نے ان کو اہلاً وسہلاً ومرحبا کہا اور ان سب سے معانقہ فرمایا۔ حافظ ابنِ عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے ''الاستیعاب'' میں لکھا ہے کہ اگرچہ یہ سب اصحاب غزوۂ خیبر میں عملاً شریک نہ ہو سکے تھے تاہم سرورِ عالم ﷺ نے مالِ غنیمت میں ان کا حصہ بھی لگایا۔

اس کے بعد حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ نے عمرۃ القضا میں رحمتِ عالم ﷺ کی ہم رکابی کا شرف حاصل کیا۔ فتح مکہ کے موقع پر وہ ان دس ہزار قدوسیوں میں شامل تھے جن کے بارے میں سینکڑوں سال پہلے کتابِ استثناء میں یہ پیش گوئی کی گئی تھی۔

> ''خداوند سینا سے آیا، شعیر سے ان پر آشکار ہوا اور کوہِ فاران سے ان پر جلوہ گر ہوا اور دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا۔ اس کے داہنے ہاتھ میں ان کے لیے ایک آتشیں شریعت تھی۔''

فتح مکہ کے بعد حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ نے حُنین، طائف اور تبوک کے غزوات میں سرورِ کائنات ﷺ کا حقِ رفاقت ادا کیا۔

بدر، اُحد اور خندق کے غزوات حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے قیامِ حبشہ کے دوران میں گزر چکے تھے۔ ان میں شرکت سے محرومی پر ان کو عمر بھر افسوس رہا۔ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ کا

بیان ہے کہ ایک دفعہ انہوں نے سرورِ عالم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا:۔

"یارسول اللہ افسوس کہ ہم لوگ غزوۂ بدر میں شریک ہونے کا شرف حاصل نہ کر سکے۔"

حضور ﷺ نے فرمایا: کیا تم کو یہ پسند نہیں کہ دوسرے لوگوں نے ایک ہجرت کا شرف حاصل کیا اور تم لوگوں (مہاجرینِ حبشہ) نے دو ہجرتوں کا۔"

حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ قریش کے ان گِنے چنے لوگوں میں سے تھے جو بعثتِ نبوی کے وقت اچھی طرح لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ چنانچہ جب وہ حبشہ سے مدینہ آئے تو حضور ﷺ اُن سے وقتاً فوقتاً خطوط لکھوایا کرتے تھے۔ زرقانی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ ۹ ہجری میں بنوثقیف کا وفد بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا تو ان کے اور حضور ﷺ کے درمیان جو معاہدہ طے پایا، اس کی کتابت حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ ہی نے کی۔ مسندِ ابوداؤد میں ہے کہ حضور ﷺ نے اہلِ یمن کو جو امان نامہ دیا تھا اس کو بھی حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے لکھا تھا۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے دو بھائی عمرو بن سعید رضی اللہ عنہ اور ابان بن سعید رضی اللہ عنہ بھی شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہو گئے تھے۔ سرورِ عالم ﷺ ان تینوں بھائیوں کو بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اور ان کو حکومت و امارت کا اہل سمجھتے تھے چنانچہ آپ ﷺ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو یمن کا، حضرت ابان رضی اللہ عنہ کو بحرین کا اور حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کو تیماء کا عامل مقرر فرمایا۔ تینوں بھائی حضور ﷺ کے اعتماد پر پورے اترے اور سرورِ عالم ﷺ کی رحلت تک اپنے فرائض نہایت حسن و خوبی سے انجام دیتے رہے حافظ ابنِ عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے "الاستیعاب" میں لکھا ہے کہ تینوں نے حضور ﷺ کے وصال کی خبر سنی تو سب پر اس دلدوز خبر نے یکساں اثر کیا اور تینوں اپنے عہدے چھوڑ کر مدینہ واپس آ گئے اس وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مسندِ خلافت پر فائز ہو چکے تھے۔ انہوں نے تینوں بھائیوں کو بلا کر فرمایا کہ تمہیں خود رسول اکرم ﷺ نے ان عہدوں پر مقرر فرمایا تھا

اس لیے تم لوگوں سے بڑھ کر کوئی اور ان عہدوں کا مستحق نہیں ہو سکتا میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ حسبِ سابق اپنے فرائض انجام دیتے رہو لیکن تینوں بھائیوں نے ایک ہی جواب دیا کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی کے عامل نہیں بن سکتے۔

ابنِ جریر طَبری کا بیان ہے کہ مدینہ واپس آنے کے بعد حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ دو ماہ تک حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ کے حسنِ اخلاق اور حلم و تحمل سے اس قدر متاثر ہوئے کہ خوشدلی سے ان کی بیعت کر لی۔ بیعت میں ان کے توقف کی وجہ غالباً یہ تھی کہ حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ کا تعلق قریش کے سب سے چھوٹے قبیلے "بنو تَیم" سے تھا اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ نیک نیتی سے یہ سمجھتے تھے کہ منصبِ خلافت کے لیے ایسا شخص موزوں ہے جو بنو ہاشم یا بنو اُمیہ جیسے با اثر قبیلے سے تعلق رکھتا ہو لیکن جب انہوں نے حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ کی ذات میں وہ تمام اوصاف موجود پائے جو اس وقت اُمتِ مسلمہ کی سربراہی کے لیے ضروری تھے تو انہوں نے بیعت کرنے میں ایک لمحہ بھی مزید توقف نہ کیا۔

(۳)

حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ کے سریر آرائے خلافت ہونے کے معاً بعد فتنہ ارتداد کی آگ اس تیزی سے بھڑکی کہ اس کے شعلوں نے دیکھتے ہی دیکھتے سارے عرب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ معدودے چند قبائل کے سوا عرب کا کوئی قبیلہ ایسا نہیں تھا جو اس فتنہ عظیم سے متاثر نہ ہوا ہو۔ اس نازک موقع پر حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ کوہِ استقامت بن کر کھڑے ہو گئے اور اپنی ہمت و شجاعت اور تدبیر و فراست کی بدولت خلافتِ اسلامیہ کی ہچکولے کھاتی کشتی کو ہولناک گردابِ بلا سے صحیح سلامت نکال لائے۔ فتنہ ارتداد کے استیصال کے لیے جن جوانمردوں نے سر دھڑ کی بازی لگا دی، حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ بھی ان میں سے ایک تھے۔ ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ مرتدین کے خلاف معرکوں میں ایک مرتبہ ان کا مقابلہ عمرو بن معدی کرب زبیدی سے ہو گیا۔ عمرو بن معدی کرب

بڑے ڈیل ڈول کے آدمی تھے اور عرب کے نامور بہادروں میں شمار ہوتے تھے۔ بعض روایتوں کے مطابق ان کو ایک ہزار سواروں کے برابر تسلیم کیا جاتا تھا۔ بدقسمتی سے وہ جھوٹے مدعی نبوّت اسود عنسی سے متاثر ہو کر اس کے حامیوں میں شامل ہو گئے تھے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ اگرچہ جسمانی قوّت کے لحاظ سے عمرو بن معدی کرب کے ہم پلّہ نہیں تھے لیکن جوشِ ایمانی نے ان کے بازوؤں میں بجلیاں بھر دی تھیں۔ انہوں نے عمرو بن معدی کرب کو نہ صرف زخمی کر دیا بلکہ ان کی تلوار اور گھوڑا بھی چھین لیا۔ عمرو بن معدی کرب نے بھاگ کر جان بچائی اور بعد میں دوبارہ مسلمان ہو کر جہادِ شام میں گرانقدر خدمات انجام دیں۔

فتنہ ارتداد کے فرو ہو جانے کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ایران اور شام کی مہموں کی طرف متوجہ ہوئے اور مسلمانوں کو ایران اور شام کی اسلام دشمن قوتوں کے خلاف جہاد پر جانے کی ترغیب دی۔ حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ ان سرفروشوں میں سے تھے جنہوں نے سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دعوتِ جہاد پر لبیک کہا۔ انہوں نے خلیفۃ الرسول ﷺ سے مخاطب ہو کر کہا:

''خدا کی قسم مجھ کو یہ بات پسند ہے کہ میں کسی سر بہ فلک پہاڑ سے گر پڑوں یا زمین و آسمان کے درمیان مجھے کوئی خونخوار پرندہ اُچک لے لیکن یہ پسند نہیں کرتا کہ آپ مجھے بلائیں اور میں توقف کروں آپ حکم دیں اور میں تعمیل نہ کروں۔ واللہ مجھے نہ دنیا سے محبت ہے اور نہ میں طویل زندگی کی تمنا رکھتا ہوں۔ تم سب لوگ گواہ رہو کہ میں، میرے اعزہ و اقارب اور میرے نوکر چاکر سب راہِ حق میں لڑنے کے لیے وقف ہیں۔ ہم برابر دشمنانِ دین سے مصروف جنگ رہیں گے۔ یہاں تک کہ اللہ انہیں ہلاک کر ڈالے یا ہم سب اپنی زندگیاں قربان کر دیں۔''

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کے حق میں دعائے خیر

کی اور پھر انہیں تیماء (شام) جانے والی امدادی فوج کا افسر مقرر کر دیا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ اپنی فوج کو لے کر مدینہ سے چلنے لگے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر کہا ''اے خلیفۃ الرسول اپنا ہاتھ دیجئے میں نہیں جانتا کہ آج کے بعد پھر اس دنیا میں ملاقات ہو گی یا نہیں اگر خدا نے ملاقات کا موقع دیا تو ہم اس کی بخشش اور عفو کے تمنائی رہیں گے اور اگر آج کے بعد پھر قسمت میں ملاقات نہیں تو اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اور آپ کو جنت میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت کا شرف نصیب فرمائے۔''

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ہاتھ بڑھا کر حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ سے نہایت محبت اور تپاک کے ساتھ مصافحہ کیا۔ یہ سماں اتنا اثر انگیز تھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ اور دوسرے تمام مسلمان آبدیدہ ہو گئے اور سب پر دیر تک رقّت طاری رہی۔ پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''ٹھہرو کچھ دور ہم تمہارے ساتھ چلتے ہیں۔'' حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''میں یہ نہیں چاہتا۔''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''لیکن میں اور دوسرے مسلمان یہی چاہتے ہیں۔'' چنانچہ سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور مدینہ کے باہر تک حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کی مشایعت کی۔

رومیوں کو تیماء کی طرف حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کی پیش قدمی کی اطلاع ملی تو انہوں نے زور شور سے جنگ کی تیاری کی اور شام کی سرحد پر آباد بعض مرتد عرب قبائل کو اپنے ساتھ ملا کر مختلف اطراف میں چھاپے مارنے شروع کر دیئے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن سعید نے دربارِ خلافت کی ہدایت کے مطابق ان پر ایسی زبردست یلغار کی کہ تمام رومی تتر بتر ہو گئے اور ان کے حامی عرب قبائل تائب ہو کر دوبارہ حلقہ اسلام میں آ گئے۔

اب رومیوں کا ایک نامور سردار باہان ایک جرار لشکر کے ساتھ حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کے مقابلے پر آیا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اسے شکست فاش دی اور وہ اپنی فوج کو دمشق کی طرف ہٹا کر لے گیا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ اس کا تعاقب کرتے ہوئے برابر آگے بڑھتے

گئے اور دمشق اور واقوصہ کے درمیان ایک مقام پر جا پڑاؤ ڈالا۔ دوسری طرف باہان نے اپنے فوجی دستے اسلامی لشکر کے چاروں طرف پھیلا دیئے اور خود ایک مضبوط فوج کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ راستے میں اس کو حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے صاجزادے سعید رضی اللہ عنہ ایک چھوٹے سے فوجی دستے کے ساتھ ملے۔ رومیوں نے گھیرا ڈال کر حضرت سعید رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کو شہید کر ڈالا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو اچانک بیٹے کی شہادت کی خبر ملی تو ان کو شدید صدمہ ہوا اور غم واندوہ کے عالم میں وہ اپنی فوج کو لے کر پیچھے ہٹ گئے۔ باہان نے چاہا کہ آگے بڑھ کر اسلامی لشکر پر کاری ضرب لگائے لیکن مسلمانوں کے ایک جانباز سردار عکرمہ ذوالکلاع رحمۃ اللہ علیہ نے باہان کو آگے بڑھنے سے روک دیا اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ پیچھے ہٹتے ہوئے ذوالمروہ کے مقام پر آ کر خیمہ زن ہو گئے۔ چند دن بعد وہاں سے مدینہ آئے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کے پیچھے ہٹ آنے پر ناراضی کا اظہار فرمایا اور مناسب تنبیہ کی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے معذرت کی کہ بیٹے کی جدائی کا غم مجھ پر غالب آ گیا اور میں صحیح فیصلہ نہ کر سکا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کی معذرت قبول کر لی اور انہیں پھر جہاد پر جانے کا حکم دیا۔

(۴)

حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ دوبارہ شام جا کر ایک عام سپاہی کی طرح حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کے لشکر میں شامل ہو گئے اور گزشتہ غلطی کی تلافی کرنے کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ لی۔ انہوں نے رومیوں کے خلاف متعدد معرکوں میں جانبازانہ حصہ لیا۔ اس سلسلہ میں مورّخین نے دمشق اور فحل کے معرکوں کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔ ان لڑائیوں میں وہ اس جوش اور وارفتگی سے لڑے کہ اپنے بیگانے سبھی عش عش کر اٹھے۔ اسی زمانے میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے حضرت عکرمہ بن ابی جہل رضی اللہ عنہ کی بیوہ حضرت اُمِ حکیم رضی اللہ عنہا سے نکاح کر لیا۔ معرکہ فحل کے بعد اسلامی لشکر ''مرج صفر'' پہنچا تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے خواہش کی کہ اسی مقام پر رسمِ عروسی ادا ہو جائے۔ اُمِ حکیم نے کہا کہ دشمن سر

پر کھڑا ہے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ اس سے نبٹ کر اطمینان سے یہ رسم ادا کریں۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے کہا: "مجھے اس معرکے میں اپنی شہادت کا یقین ہے۔" اُمِ حکیم رضی اللہ عنہا خاموش ہوگئیں۔ ایک پُل کے پاس جواب "قنطرہ اُمِ حکیم رضی اللہ عنہا" کہلاتا ہے، رسم عروسی ادا ہوئی۔ صبح کو حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے دعوتِ ولیمہ کا اہتمام کیا۔ ابھی لوگ کھانے سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ رومیوں نے حملہ کردیا۔ ان کا ایک قوی ہیکل جنگجو سب سے آگے آگے مسلمانوں کو مقابلے کے لیے للکار رہا تھا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ تیر کی طرح جھپٹ کر اس کے مقابلے کے لیے نکلے اور نہایت بہادری سے لڑ کر اس کے ہاتھوں شہید ہوگئے۔ اس کے بعد عام لڑائی شروع ہوگئی۔ حضرت اُمِ حکیم رضی اللہ عنہا شوہر کی شہادت کا منظر دیکھ رہی تھیں۔ اسی وقت اپنے خیمے کی چوب اکھاڑ کر رومیوں پر جھپٹ پڑیں اور سات آدمیوں کو خاک وخون میں سُلا کر اپنے شوہر کا انتقام لے لیا۔

اہلِ سیَر نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی صرف دو اولادوں کا ذکر کیا ہے، ایک بیٹا سعید رضی اللہ عنہ اور ایک بیٹی امہ یا اُمِ خالد رضی اللہ عنہا۔ سعید رضی اللہ عنہ میدانِ جہاد میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے سامنے ہی شہید ہوگئے تھے۔

حضرت اُمِ خالد رضی اللہ عنہا کا شمار مشہور صحابیات میں ہوتا ہے ان کا نکاح حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ سے ہوا تھا۔ سرورِ عالم ﷺ ان پر بہت شفقت فرمایا کرتے تھے۔ حبشہ سے واپس آنے کے بعد ایک مرتبہ وہ اپنے والدِ ماجد کے ہمراہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ حضور ﷺ نے انہیں دیکھ کر ازراہِ خوش طبعی فرمایا:

"سنہ سنہ" (یعنی بہت خوب صورت، بہت خوب صورت)

حبشی زبان کے یہ الفاظ حضور ﷺ نے اُمِ خالد رضی اللہ عنہا کو خوش کرنے کے لیے ارشاد فرمائے۔

ایک اور موقع پر حضور ﷺ نے حضرت اُمِ خالد رضی اللہ عنہا کو بطورِ خاص بلا کر ایک پھول دار خوبصورت چادر عنایت فرمائی اور اس وقت بھی ان کو خوش کرنے کے لیے یہی

الفاظ کہے۔

حافظ ابنِ عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کی زندگی میں تحکمانہ شان تھی تاہم وہ لباس وغیرہ میں سرورِ عالم ﷺ کی مشابہت کی کوشش کیا کرتے تھے۔ اپنی انگوٹھی پر بطور تبرک ''محمد رسول اللہ'' کا نقش کندہ کروایا تھا۔ حضور ﷺ نے یہ انگوٹھی دیکھی تو آپ نے ان سے لے لی اور ہمیشہ اپنے پاس رکھی۔

حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ نے قبولِ حق میں سبقت، راہِ حق میں بلاکشی اور شوقِ جہاد کے جو نقوش صفحہ تاریخ پر مرتسم کیے وہ تا ابد ان کے نام کو زندہ وتابندہ رکھیں گے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ
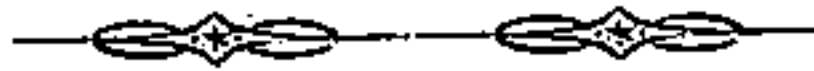
حضرت اَخرم اَسدی رضی اللہ عنہ

(۱)

سیّدنا حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے تعبیر رویاء میں کمال درجے کی مہارت عطا فرمائی تھی، اکثر لوگ ان کی خدمت میں اپنے خوابوں کی تعبیر پوچھنے کے لیے حاضر ہوا کرتے تھے۔ ۶ ہجری کا ذکر ہے ایک دن سرخ و سپید رنگ کے ایک خوبرو جوان سیّدنا صِدّیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

''اے ابوبکر! کل شب میں نے خواب میں دیکھا کہ آسمان کے دروازے میرے لیے کھول دیئے گئے اور میں عالمِ بالا کی سیر کرتا ہوا ساتویں آسمان، یہاں تک کہ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچ گیا۔ اس وقت غیب سے یہ آواز میرے کانوں میں آئی کہ یہی تمہارا مسکن ہے۔ اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ آپ مجھے بتائیں کہ اس عجیب خواب کی کیا تعبیر ہے؟''

حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''بھائی! میں تمہیں بشارت دیتا ہوں کہ تم راہِ حق میں درجہ شہادت پر فائز ہوگے۔ یہی اس خواب کی تعبیر ہے۔''

اور پھر چند دن بعد اس خواب کی تعبیر یوں پوری ہوئی کہ وہ صاحب راہِ حق میں مردانہ وار لڑتے ہوئے شہید ہوگئے اور اس شہادت نے انہیں اپنے ابدی مسکن سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچا دیا۔

یہ جوانِ رعنا جن کو آخرت میں سدرۃ المنتہیٰ کا مقامِ بلند عطا فرمایا گیا، حضرت مُحرِز بن نَضلہ رضی اللہ عنہ تھے جو بالعموم اَخرم اسدی کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔

(۲)

حضرت مُحرِز رضی اللہ عنہ بن فضلہ الملقب بہ اَخرَم اَسَدی کا شمار بڑے عظیم المرتبت صحابہ رضی اللہ عنہم میں ہوتا ہے۔ان کا تعلق بنواسد بن خزیمہ سے تھا۔سلسلہ نسب یہ ہے:

محرز رضی اللہ عنہ بن فضلہ بن عبداللہ بن مرہ بن کبیر بن غنم بن دودان بن اسد بن خزیمہ

ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ ایامِ جاہلیت میں ان کا خاندان بنوعبدشمس کا حلیف تھا۔اہل سیَر نے حضرت اخرم اسدی رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کے زمانے کی تخصیص نہیں کی۔ لیکن اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ ان سعید الفطرت نوجوانوں میں سے ہیں جنہوں نے بعثتِ نبوی کی ابتداء ہی میں عین عنفوانِ شباب میں دعوتِ توحید پر لبیک کہا تھا اس طرح ان کو السابقون الاوّلون کی مقدس جماعت کا رکن ہونے کا شرف حاصل ہو گیا تھا۔

سنہ ۱۳ بعدِ بعثت میں سرورِ عالم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مدینہ منوّرہ کی طرف ہجرت کرنے کا اِذنِ عام دیا تو حضرت اخرم اسدی رضی اللہ عنہ بھی دوسرے صحابہ کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ آ گئے۔ یہاں بنونجّار کے خاندان بنوعبدالاشہل نے انہیں اپنا حلیف بنالیا۔علامہ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ ان کا رشتہ مواخاۃ انصار کے جلیل القدر فرزند حضرت عمارہ بن حزم نجاری رضی اللہ عنہ سے قائم ہوا۔

حضرت اخرم اسدی رضی اللہ عنہ نہ صرف حُبِ رسول ﷺ، اخلاص فی الدین اور جوشِ ایمان کی نعمتوں سے مالا مال تھے بلکہ شجاعت، بے خوفی اور جانبازی میں بھی اپنی مثال آپ تھے۔غزوات کا سلسلہ شروع ہوا تو سب سے پہلے انہوں نے غزوۂ بدر الکبریٰ میں اپنی شمشیرِ خاراشگاف کے جوہر دکھائے۔اس کے بعد غزوۂ اُحد اور غزوۂ احزاب میں اپنی شجاعت اور سرفروشی کی دھاک بٹھائی۔رحمتِ عالم ﷺ سے والہانہ محبت کرتے تھے اور ہر وقت اپنی جان راہِ حق میں قربان کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ان کے اسی جذبہ فدویت نے انہیں خاصانِ خدا کی صف میں شامل کر دیا تھا۔

۶ ہجری میں انہوں نے وہ خواب دیکھا جس کا ذکر اُوپر آیا ہے۔ یہ خواب گویا اس بات کی دلیل تھا کہ حق تعالیٰ کے نزدیک وہ بہت بڑے رُتبے کے حامل ہیں۔ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ سے اس خواب کی تعبیر سُن کر وہ بے حد مسرور ہوئے اور اب ان کا سارا وقت شوقِ لقاءِ ربّ میں گزرنے لگا۔

(۳)

چند ہی دن بعد وہ وقت آ گیا جس کا حضرت اَخرم اسدی رضی اللہ عنہ کو شِدّت سے انتظار تھا۔ ربیع الآخر ۶ ہجری میں عُیَینہ بن حصین فزاری نے چالیس سواروں کے جتھے کے ساتھ غابہ کی چراگاہ پر چھاپہ مارا، یہ چراگاہ مدینہ منورہ سے چند میل کے فاصلے پر ایک چشمے ذی قرد سے متصل واقع تھی اور اس میں سرورِ عالم ﷺ کی اونٹنیاں چرا کرتی تھیں۔ فزاری غارت گروں نے اونٹنیوں کے نگران کو شہید کر ڈالا اور بیس شیر دار اونٹنیوں کو ہانک کر لے چلے۔ اتفاق سے حضرت سلمہ بن الاکوع اسلمی رضی اللہ عنہ اور حضرت رباح رضی اللہ عنہ مولیٰ رسول اللہ ﷺ گھوڑے پر سوار وہاں آ نکلے۔ حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ کو غارت گروں کی حرکت کا علم ہوا تو وہ غم و غصہ سے بے تاب ہو گئے۔ انہوں نے حضرت رباح رضی اللہ عنہ کو تو گھوڑے پر سوار کر کے فوراً مدینہ منورہ کی طرف روانہ کر دیا تاکہ حضور ﷺ کو اس واقعہ کی اطلاع دیں۔ اور خود تنِ تنہا فزاری لٹیروں سے لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ وہ بڑے دلاور اور نڈر آدمی تھے اور تیر اندازی میں بھی کمال درجے کی مہارت رکھتے تھے۔ انہوں نے تو پہلے ایک قریبی ٹیلے پر چڑھ کر مدینہ منورہ کی طرف منہ کر کے تین بار، ''یا صباحا'' کا نعرہ لگایا، اس زمانے میں جب کوئی شخص یہ نعرہ لگاتا تھا تو اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ وہ مصیبت میں مبتلا ہے یا اس کو کوئی سخت معاملہ درپیش ہے جس سے نکلنے کے لیے اس کو مدد کی ضرورت ہے، اس کے لفظی معنی ''اے صبح کی مصیبت'' کے ہیں۔

یہ نعرہ لگا کر حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ ٹیلے سے نیچے اترے اور درختوں کی آڑ لے کر چھاپہ ماروں پر پتھروں اور تیروں کی بوچھاڑ کر دی، جب تیر چلاتے تو للکار کر یہ رجز پڑھتے۔

خذھا و انا ابن الاکوع　　　و الیوم یوم الرضع

(اسے لے میں اَکوع کا بیٹا ہوں اور آج کا دن چھٹی کا دُودھ یاد کرانے (یاسخت لڑائی) کا دن ہے۔)

اس اکیلے مردِ مجاہد نے اپنے تیروں اور پتھروں سے لٹیروں کا ناطقہ بند کر دیا اور وہ بدحواسی کے عالم میں ساری اونٹنیاں چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ نے اونٹنیوں کو مدینہ منورہ کی طرف ہانک دیا اور خود برابر ڈاکوؤں کا پیچھا کرتے رہے جو اپنی چادریں اور نیزے پھینکتے جاتے تھے اور برق رفتاری کے ساتھ بھاگتے جاتے تھے۔ جب چاشت سے کچھ زیادہ وقت ہوا تو عینیہ بن بدر فزاری کچھ مسلح سواروں کے ساتھ غارتگروں کی مدد کے لیے آپہنچا۔ ان لوگوں نے حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ کو گرفتار کرنا چاہا، حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ ایک قریبی پہاڑی کی چوٹی پر چڑھ گئے اور وہاں سے للکار کر کہا:

"اے خدا کے دشمنو! جانتے ہو میں کون ہوں، میں ہوں اَکوع کا بیٹا، اس ذاتِ پاک کی قسم جس نے محمد ﷺ کے رُوئے انور کو بزرگ بنایا، تم میں سے کسی کی مجال نہیں کہ مجھ کو گرفتار کر سکے، اگر تم میں سے کوئی میرے نزدیک آیا تو وہ ہرگز بچ کر نہ جانے پائے گا۔"

ابھی فزاری غارت گر اگلا قدم اٹھانے کے لیے سوچ ہی رہے تھے کہ دُور سے گرد اڑتی نظر آئی اور درختوں کے جھنڈ سے تین شہسوار نمودار ہوئے جو اپنے گھوڑے اڑاتے حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ کی مدد کے لیے آرہے تھے۔ یہ شہسوار اس امدادی دستے کا ہراول تھے جو سرورِ عالم ﷺ نے ڈاکے کی اطلاع ملتے ہی لٹیروں کی سرکوبی کے لیے روانہ فرمایا تھا۔ سب سے آگے حضرت اخرم اسدی رضی اللہ عنہ تھے، ان کے پیچھے حضرت ابوقتادہ انصاری رضی اللہ عنہ اور ان کے پیچھے کچھ دُور حضرت مقداد بن الاسود کندی رضی اللہ عنہ تھے۔ اس وقت حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ فوراً پہاڑی کی چوٹی سے نیچے اترے اور حضرت اخرم رضی اللہ عنہ کے گھوڑے کی باگ پکڑ کر کہا:

''اخرم! رک جاؤ، اگر تم آگے بڑھے تو مجھے ڈر ہے کہ لٹیرے تم پر حملہ کر دیں گے۔ تھوڑی دیر انتظار کرو تا کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم آ جائیں۔''

حضرت اخرم رضی اللہ عنہ کو غیرتِ دینی نے شعلہ جوالہ بنا دیا تھا اور وہ غارت گروں سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے سخت بے تاب تھے، انہوں نے فرمایا:

''اے سلمہ اگر تم اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو اور سمجھتے ہو کہ جنت حق ہے اور دوزخ حق ہے تو مجھے راہِ حق میں اپنی جان قربان کرنے سے نہ روکو۔''

یہ جملے انہوں نے اس جوش اور جذبہ کے ساتھ کہے کہ حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ نے ان کے گھوڑے کی باگ چھوڑ دی اور وہ گھوڑا اڑاتے ہوئے لٹیروں کی طرف بڑھے۔ فزاریوں کا نامور جنگجو عبدالرحمٰن بن عینیہ سب سے پہلے ان کے سامنے آیا۔ انہوں نے اپنی تلوار سے اس پر ایک بھرپور وار کیا وہ خود تو بچ گیا لیکن اس کا گھوڑا کٹ کر گر پڑا۔ اب اس نے سنبھل کر حضرت اخرم رضی اللہ عنہ پر اپنے نیزے کا وار کیا، یہ وار کارگر ثابت ہوا اور نیزہ حضرت اخرم رضی اللہ عنہ کے جگر کے پار ہو گیا۔ وہ شہید ہو کر فرشِ خاک پر گر گئے اور یوں ان کے اس خواب کی تعبیر پوری ہو گئی جس میں سدرۃ المنتہٰی کو ان کا مسکن قرار دیا گیا تھا۔ عین اسی وقت حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ گھوڑا دوڑاتے آ پہنچے اور اپنے نیزے سے عبدالرحمٰن بن عینیہ کو جہنم واصل کر کے حضرت اخرم رضی اللہ عنہ کا بدلہ لے لیا۔ اس کے بعد اہلِ حق نے لٹیروں کی قرار واقعی گوشمالی کی۔

ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ شہادت کے وقت حضرت اخرم رضی اللہ عنہ کی عمر ۳۷ یا ۳۸ برس کی تھی۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را
رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت معمر بن عبداللہ عدی رضی اللہ عنہ

(۱)

سنہ ۱۰ ہجری میں رحمتِ عالم ﷺ حجۃ الوداع کے لیے مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ حج سے فارغ ہونے کے بعد حضور پُر نور ﷺ کو اپنے موئے اقدس ترشوانے کے لیے کسی آدمی کی تلاش ہوئی۔ ایک صاحبِ رسول ﷺ جو موتراشی کا کام جانتے تھے، حضور ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور بڑے ذوق وشوق سے اس خدمت کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا۔ جب انہوں نے استرہ ہاتھ میں لیا تو سرورِ عالم ﷺ نے متبسم ہو کر فرمایا:
''بھائی تم کو اللہ کے رسول نے اپنے کان کیلو پر اس حالت میں قابو دے دیا ہے کہ تمہارے ہاتھ میں اُسترہ ہے۔''

ان صاحب نے بے ساختہ عرض کیا: ''یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان، خدا کی قسم یہ اللہ تعالیٰ کا مجھ پر عظیم احسان اور کرم ہے کہ مجھے حضور ﷺ کے موئے اقدس تراشنے کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔''

یہ صاحبِ رسول ﷺ جن کو حجۃ الوداع کے موقع پر سید المرسلین ﷺ کے موئے اقدس تراشنے کی سعادت نصیب ہوئی اور جنہوں نے اس خدمت کو اپنے لیے لازوال شرف وافتخار کا باعث جانا، حضرت معمر بن عبداللہ عدوی رضی اللہ عنہ تھے۔

(۲)

سیّدنا حضرت معمر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کا شمار سرورِ عالم ﷺ کے نہایت مخلص جان نثاروں میں ہوتا ہے۔ وہ قریش کے خاندانِ عدی کے چشم و چراغ تھے۔ سلسلہ نسب یہ ہے:

معمر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بن نضلہ بن عبدالعزیٰ بن حرثان بن عوف بن عبید بن عویج بن عدی بن کعب۔

حضرت معمر رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے فطرتِ سلیم سے نوازا تھا۔ چنانچہ بعدِ بعثت کے ابتدائی زمانے میں جونہی ان کے کان صدائے توحید سے آشنا ہوئے انہوں نے بلا تامّل اس پر لبیک کہا اور السابقون الاوّلون کی مقدس جماعت میں شامل ہو گئے۔ اس پُر آشوب زمانے میں اسلام قبول کرنا مصائب و آلام کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ حضرت معمر رضی اللہ عنہ بھی کفّار کے دستِ تعدّی سے محفوظ نہ رہ سکے اور تین چار سال تک کفّار کے ظلم و ستم کی چکّی میں پستے رہے۔ ۶ بعدِ بعثت میں مسلمانوں کا دوسرا قافلہ عازم حبش ہوا تو حضرت معمر رضی اللہ عنہ بھی حضور ﷺ کے ایما پر اس قافلے میں شریک ہو گئے اور حبش کی غریب الوطنی اختیار کر لی۔ ابنِ سعد رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ کچھ مدّت بعد حضرت معمر رضی اللہ عنہ حبش سے مکہ واپس آ گئے اور یہاں طویل عرصہ قیام کے بعد مدینہ گئے، لیکن ابنِ ہشام نے لکھا ہے کہ وہ اس جماعت میں شامل تھے جو غزوۂ خیبر کے موقع پر حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے ساتھ حبش سے مدینہ منوّرہ پہنچی۔ اس طرح ان کو ذوالہجرتین (دو ہجرتیں کرنے والے) کا شرف حاصل ہوا۔ اگرچہ اہلِ سیَر نے صراحت نہیں کی لیکن قیاسِ غالب یہی ہے کہ غزوۂ خیبر کے بعد کے تمام غزوات میں حضرت معمر رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔

(۲)

مختلف روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے اخلاص اور جذبہ فدویت کی بدولت حضرت معمر رضی اللہ عنہ کو بارگاہِ رسالت میں درجہ تقرب حاصل ہو گیا تھا اور حضور ﷺ ان پر بہت اعتماد فرماتے تھے۔ اربابِ سیَر نے حجۃ الوداع میں ان کی خدمات کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔ اس سفر میں سرورِ عالم ﷺ کی سواری کا اہتمام انہی کے سپرد تھا اور کجاوہ وغیرہ وہی کستے تھے۔ ایک دن کسی شخص نے دانستہ یا نادانستہ اس کو ڈھیلا کر دیا۔ خیر رات

تو اسی طرح گزر گئی صبح ہوئی تو حضور ﷺ نے حضرت مَعمر رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''رات کو کجاوہ کا تنگ ڈھیلا معلوم ہوتا تھا۔''

حضرت مَعمر رضی اللہ عنہ کو بڑی ندامت ہوئی اور انہوں نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ میں نے تو حسبِ دستور کس کے باندھا تھا شاید کسی نے اس خیال سے ڈھیلا کر دیا ہو کہ مجھ سے یہ شرف چھن جائے اور آپ یہ خدمت کسی دوسرے کے سپرد کر دیں۔''

حضور نے فرمایا: تم اطمینان رکھو میں یہ خدمت تمہارے علاوہ کسی دوسرے کے سپرد نہ کروں گا۔'' حضور ﷺ کا ارشاد سن کر حضرت مَعمر رضی اللہ عنہ خوش ہو گئے۔ اسی حج کے موقعہ پر انہیں حضور ﷺ کے موئے اقدس تراشنے کا شرف بھی حاصل ہوا۔

(۴)

حضرت مَعمر رضی اللہ عنہ کے سالِ وفات کے بارے میں تمام کتب سیَر خاموش ہیں۔ صحیح مسلم کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضور ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی بڑی سختی سے پابندی کرتے تھے اور اس معاملہ میں مطلقاً کسی مصلحت کو روا نہ رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے اپنے غلام کو کچھ گندم دی کہ اس کو بیچ کر جو قیمت وصول ہو اس سے جَو خرید لائے۔ غلام نے گندم بیچنے کے بجائے اس کو جَو سے بدل لیا اور جَو کی مقدار گندم کی مقدار سے زیادہ لی۔ حضرت مَعمر رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو وہ غلام پر خفا ہوئے اور اس کو اسی وقت جَو کی زائد مقدار اور واپس کرنے کے لیے بھیجا، اس کے ساتھ ہی اس کو نصیحت کی کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ کھانے کی چیزیں ایک دوسرے کے ساتھ برابر برابر تبدیل کرو۔

حضرت مَعمر رضی اللہ عنہ کا دامنِ روایتِ حدیث سے بھی خالی نہیں رہا۔ کتبِ احادیث میں ان سے مروی دو حدیثیں موجود ہیں۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

راہِ حق کے تین مسافر

○ حضرت عیاش بن ابی ربیعہ رضی اللہ عنہ

○ حضرت سلمہ بن ہشام رضی اللہ عنہ

○ حضرت ولید بن ولید رضی اللہ عنہ

(۱)

ابو عبدالرحمن عیاش رضی اللہ عنہ بن ابی ربیعہ مخزومی اور ابوجہل دونوں نے ایک ہی ماں کا دودھ پیا تھا لیکن قدرتِ خداوندی کا کرشمہ دیکھئے کہ ایک بھائی (عیاش رضی اللہ عنہ) تو دینِ حق کا جانباز سپاہی بنا اور دوسرا (ابوجہل) دینِ حق کا بدترین دشمن۔ عیاش رضی اللہ عنہ بن ابی ربیعہ ان جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ہیں جن کے لیے السابقون الاوّلون کا خطاب نازل ہوا۔ وہ دولت اسلام سے اس وقت بہرہ یاب ہوئے جب سرورِ کونین ﷺ حضرت ارقم رضی اللہ عنہ کے مکان میں پناہ گزین نہیں ہوئے تھے اور دینِ حق قبول کرنا تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف تھا۔ ان کے ماں جائے بھائی ابوجہل نے بہتیری کوشش کی کہ عیاش رضی اللہ عنہ کو بادۂ توحید پینے سے روکے لیکن ناکام رہا اور عیاش رضی اللہ عنہ کلمہ توحید پڑھ کر مشرکین کے ظلم وستم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں بے خطر کود پڑے۔ جب اس آگ کی شدت انتہا کو پہنچ گئی تو دوسرے مظلوم مسلمانوں کے ساتھ حضرت عیاش رضی اللہ عنہ اور ان کی بیوی اسماء رضی اللہ عنہا بھی حضور ﷺ کی اجازت سے حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے۔ کچھ مدت غریب الوطنی کی زندگی گزارنے کے بعد مکہ واپس آگئے اور پھر چند دن بعد حضرت عمر

فاروق رضی اللہ عنہ کے ہمراہ ہجرتِ مدینہ کا شرف حاصل کیا۔

(۲)

ابوجہل اپنے بھائی کے قبولِ اسلام سے سخت آزردہ تھا۔ وہ کچھ عرصہ کے بعد مدینہ آیا (ایک روایت کے مطابق رحمتِ عالم ﷺ ابھی مدینہ تشریف نہیں لائے تھے) اور حضرت عیاش رضی اللہ عنہ سے مل کر کہنے لگا۔ ''جانِ برادر ہماری بوڑھی ماں تمہاری آتشِ فراق میں جل رہی ہے۔ اس نے عہد کیا ہے کہ جب تک تمہاری صورت نہ دیکھ لے گی نہ سایہ میں بیٹھے گی اور نہ سر میں تیل ڈالے گی۔ ایک دفعہ اُسے اپنی صورت دکھا آؤ۔'' حضرت عیاش رضی اللہ عنہ کو ماں سے بے پناہ محبت تھی۔ بڑے بھائی کی باتوں میں آگئے اور اس کے ہمراہ ماں کو تسکین دینے چل پڑے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو عیاش رضی اللہ عنہ کے عزمِ مکہ کی اطلاع ملی تو وہ ان کے پاس تشریف لے گئے اور کہا: ''عیاش مجھے تمہارے بھائی کی باتوں سے فریب کی بُو آتی ہے۔ جب مکہ کی دھوپ تمہاری ماں کو ستائے گی تو وہ خود بخود اٹھ کر سایہ میں چلی جائے گی اور جب اس کے سر میں خارش ہوگی تو کنگھی بھی کر لے گی۔ میری مانو تو مکہ ہرگز نہ جاؤ۔''

لیکن حضرت عیاش رضی اللہ عنہ پر ابوجہل کی ملمع سازی کا کچھ ایسا اثر ہو گیا تھا کہ وہ اپنا ارادہ ترک کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ اور کہا کہ ''ماں کی قسم پوری کر کے واپس آ جاؤں گا۔''

چنانچہ وہ ابوجہل کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ جونہی مکہ پہنچے بدطینت ابوجہل نے آنکھیں بدل لیں اور اپنے مشرک ساتھیوں کی مدد سے فریب خوردہ عیاش رضی اللہ عنہ کی مشکیں کس کر انہیں زندان میں ڈال دیا جہاں ان سے پہلے شمعِ رسالت ﷺ کا ایک اور پروانہ بھی طوق وسلاسل میں پابند تھا۔ راہِ حق کے یہ اسیر حضرت سلمہ بن ہشام رضی اللہ عنہ تھے۔

حضرت سلمہ بن ہشام المخزومی رضی اللہ عنہ، ابوجہل کے صُلبی بھائی تھے۔ وہ بھی دعوتِ توحید کے ابتدائی دَور میں مشرّف بہ اسلام ہو گئے تھے اور اپنے سنگدل بھائی اور دوسرے

مشرکین کی مشقِ ستم کا نشانہ بن گئے تھے۔ جب مشرکین کی سختیاں حد سے تجاوز کر گئیں تو وہ بھی حضور ﷺ کے ایماء پر عازمِ حبشہ ہوئے۔ ابھی حبشہ میں ان کے قیام کو تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ ان کے کانوں تک یہ افواہ پہنچی کہ اہلِ مکہ نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ بڑے خوش ہوئے اور دوسرے مہاجرین کے ساتھ مکہ واپس آ گئے۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط تھی۔ چنانچہ انہوں نے پھر حبشہ جانے کا قصد کیا۔ لیکن ابوجہل مزاحم ہوا اور اس نے ان کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر ایک کوٹھڑی میں محبوس کر دیا۔ کھانا پینا بند کر دیا اور ان کو ستانے لگا۔ لیکن مار پیٹ کی سختیوں کے باوجود اس مردِ حق آگاہ کی جبینِ ہمت پر شکن تک نہ آئی۔ فرماتے "او دشمنِ خدا خواہ مجھے مار ڈال لیکن جو قدم راہِ حق میں اٹھ گئے وہ کبھی پیچھے نہیں ہٹیں گے۔"

ایک طویل مدت انہیں طرح طرح کی روح فرسا مصیبتیں جھیلتے گزر گئی حتیٰ کہ ان کے دوسرے حامیِ حق بھائی عیاش رضی اللہ عنہ بھی ان کی بلاکشی میں شریک ہو گئے۔ یہ دونوں ثابت قدم بھائی قیدِ محن میں گرفتار تھے کہ ایک تیسرے فدائی توحید کو بھی اس زندانِ بلا میں آنا پڑا۔ راہِ حق کے یہ تیسرے مسافر ولید بن ولید رضی اللہ عنہ تھے۔

(۳)

حضرت ولید بن ولید بن مغیرۃ المخزومی رضی اللہ عنہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سیف اللہ کے بھائی تھے۔ ولید رضی اللہ عنہ دعوتِ اسلام کی ابتداء میں اسلام کی نعمت سے محروم رہے اور جنگِ بدر میں مشرکین کے ہمراہ مسلمانوں سے لڑنے گئے۔ جب مشرکین کو شکست ہوئی تو ولید رضی اللہ عنہ حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے ہاتھ گرفتار ہو گئے۔ ان کے بھائیوں خالد بن ولید اور ہشام بن ولید نے فدیہ دے کر رہا کرایا اور اپنے ہمراہ مکہ لے چلے۔ اس دوران میں حضرت ولید رضی اللہ عنہ کا دل نورِ ایمان سے روشن ہو چکا تھا۔ ذوالحلیفہ میں پہنچ کر اپنے بھائیوں کی نظر بچا کر بھاگ نکلے اور سیدھے مدینہ منورہ رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں پہنچ کر مشرف بہ اسلام ہو گئے۔ (ایک روایت یہ بھی ہے کہ ولید رضی اللہ عنہ نے اوائلِ بعثت

میں اسلام قبول کر لیا تھا)۔

حضور ﷺ نے پوچھا: "ولید تم فدیہ ادا کرنے سے پہلے کیوں نہ مسلمان ہو گئے؟"

عرض کی۔ "یارسول اللہ اس طرح قریش یہ کہتے کہ فدیہ کے ڈر سے مسلمان ہو گیا۔ حالانکہ میں اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی خوشنودی کے لیے مسلمان ہونا چاہتا تھا۔"

اسلام لانے کے بعد وہ مکہ واپس تشریف لے گئے۔ ان کے مغلوب الغضب بھائیوں نے انھیں بھی طوق و سلاسل میں جکڑ کر سلمہ بن ہشام رضی اللہ عنہ اور عیاش بن ابی ربیعہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ محبوس کر دیا اور طرح طرح کی اذیتیں دینی شروع کر دیں۔

سرورِ کائنات ﷺ جب ان تینوں مظلوموں کی قیدِ محن کا حال سنتے تو چہرۂ اقدس پر حزن و ملال کے آثار نمایاں ہو جاتے اور (اس زمانے میں) ہر نماز کے بعد آپ دُعا فرمایا کرتے۔ "اے اللہ! سلمہ بن ہشام رضی اللہ عنہ، عیاش بن ابی ربیعہ رضی اللہ عنہ اور ولید بن ولید رضی اللہ عنہ کو مشرکین کے پنجۂ ستم سے رہائی دلا۔

(۴)

راہِ حق کے یہ تینوں اسیر بڑے صبر اور استقامت کے ساتھ اپنے ایامِ مصیبت کاٹ رہے تھے کہ ایک دن موقعہ پا کر ولید رضی اللہ عنہ اپنے آپ کو طوق و سلاسل سے آزاد کرانے میں کامیاب ہو گئے اور چھپتے چھپاتے مدینہ منوّرہ رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں پہنچے۔ حضور ﷺ انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور سلمہ رضی اللہ عنہ اور عیاش رضی اللہ عنہ کا حال پوچھا۔ انہوں نے عرض کیا:

"یارسول اللہ وہ سخت مصیبت میں ہیں۔ مشرکین نے دونوں کے پاؤں ایک بیڑی میں جکڑ رکھے ہیں اور ان پر نت نئے مظالم ڈھاتے ہیں۔"

حضور ﷺ ان مظلوموں کا حال سن کر بڑے ملول ہوئے۔ اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''تم میں کون ایسا اللہ کا بندہ ہے جو سلمہ اور عیاش کو قید سے چھڑا لائے؟''

حضرت ولید بن ولید رضی اللہ عنہ کھڑے ہو گئے اور عرض کی:

''یا رسول اللہ یہ خدمت اس نیاز مند کو تفویض فرمائیے۔''

حضور ﷺ نے فرمایا۔ ''اچھا تم ہی جاؤ اور مکہ پہنچ کر وہاں کے لوہار کے ہاں ٹھہرو۔ وہ دینِ حق قبول کر چکا ہے۔ اس کی وساطت سے پوشیدہ طور پر سلمہ اور عیاش سے ملو اور ان سے کہو کہ مجھے رسول اللہ نے بھیجا ہے تم دونوں میرے ساتھ نکل چلو۔''

رسولِ کریم ﷺ کے ارشاد کے مطابق حضرت ولید رضی اللہ عنہ مکہ پہنچے اور وہاں کے مسلمان لوہار کے ہاں فروکش ہوئے۔ اس نے بتایا کہ ''مشرکین سلمہ رضی اللہ عنہ اور عیاش رضی اللہ عنہ کا قید خانہ تمہارے فرار کے بعد بدلتے رہتے ہیں۔ معلوم نہیں وہ آج کل کہاں محبوس ہیں۔''

حضرت ولید رضی اللہ عنہ قید خانے کا پتہ لگانے کی ٹوہ میں رہے۔ ایک دن ایک عورت کو دیکھا کہ سر پر کھانا رکھے کہیں جا رہی ہے۔ اس سے پوچھا: ''بہن کس کا کھانا لیے جاتی ہو؟''

بولی: ''سلمہ بن ہشام اور عیاش بن ابی ربیعہ کو جو صابی (بے دین) ہو گئے ہیں، یہ کھانا دینے جا رہی ہوں۔''

حضرت ولید رضی اللہ عنہ نے بظاہر بے اعتنائی سے اس کی بات سنی لیکن جب وہ آگے بڑھی تو یہ اس کی نظر بچا کر پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ حتیٰ کہ انہوں نے وہ مکان دیکھ لیا جس میں دونوں پرستارانِ حق مقیّد تھے۔ قیام گاہ پر واپس آ کر لوہار کو سارا قصہ سنایا اور کہا کہ سلمہ اور عیاش کے طوق و سلاسل کاٹنے کی کوئی ترکیب بتاؤ۔''

اس نے کہا کہ ''زنجیر کے نیچے ایک مضبوط پتھر رکھنا اور اس کی ایک کڑی پر تلوار رکھ کر اس پر پتھر سے ضربیں لگانا۔ زنجیر آہستہ آہستہ کٹ جائے گی۔''

رات کی تاریکی میں حضرت ولید رضی اللہ عنہ اپنے مقدس مشن کی تکمیل کے لیے نکلے۔

اتفاق سے قید خانہ بغیر چھت کے تھا۔ حضرت ولید رضی اللہ عنہ دیوار پھاند کر قید خانے میں جا کودے۔ مظلوم قیدیوں کو حضور ﷺ کا پیغام دیا۔ پھر لوہار کی ہدایت کے مطابق عمل کر کے ان کی زنجیر کاٹ ڈالی اور دونوں کو ساتھ لے کر باہر آئے۔ اپنا اونٹ باہر باندھ آئے تھے۔ تینوں اس پر سوار ہو کر مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

صبح ہوئی تو قیدیوں کو نہ پا کر مشرکین نے اپنا سر پیٹ لیا۔ کئی شوریدہ سروں نے تیز رفتار سانڈنیوں پر تعاقب کیا لیکن ناکام رہے کیونکہ راہِ حق کے تینوں مسافر بہت دور نکل گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بخیر و عافیت مدینہ منورہ پہنچا دیا۔ حضور ﷺ انہیں دیکھ کر بیحد مسرور ہوئے اور حضرت ولید رضی اللہ عنہ کے حق میں دعائے خیر کی۔

حضرت سلمہ بن ہشام رضی اللہ عنہ، عیاش بن ابی ربیعہ رضی اللہ عنہ اور ولید بن ولید رضی اللہ عنہ تینوں کا شمار بڑے جلیل القدر صحابہ میں ہوتا ہے۔ حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ قیدِ محن سے نجات پا کر مدینہ پہنچے تو اس وقت غزوۂ بدر گزر چکا تھا۔ اس کے بعد وہ تقریباً تمام غزوات میں رسولِ اکرم ﷺ کے ہمرکاب رہے۔ عہدِ صدیقی میں جہادِ شام میں حصہ لیا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں (۱۴ھ میں) مرج روم کی لڑائی میں درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔

حضرت عیاش بن ابی ربیعہ رضی اللہ عنہ بھی اپنے اسیری کے سبب غزوۂ بدر میں شریک نہ ہو سکے مگر دوسرے کئی غزوات میں مجاہدانہ حصہ لیا۔ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں شام پر لشکر کشی ہوئی تو حضرت عیاش رضی اللہ عنہ بھی لشکرِ اسلام میں شریک ہو گئے اور عیسائیوں کے خلاف کئی معرکوں میں دادِ شجاعت دی۔ وفات کے بارے میں مختلف روایات ہیں۔ ایک روایت کے مطابق جنگِ یرموک میں شہادت پائی اور ایک دوسری روایت کے مطابق شام سے بخیریت مکہ واپس آ گئے اور یہیں انتقال کیا۔ ان سے کئی احادیث مروی ہیں۔

حضرت ولید بن ولید رضی اللہ عنہ کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ اس وقت دولتِ اسلام سے بہرہ ور ہوئے جب ان کے عظیم بھائی خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جنھیں بعد میں نطق

رسالت ﷺ نے ''سیف اللہ'' کا خطاب مرحمت فرمایا، ابھی کفر و شرک کی بھول بھیوں میں بھٹک رہے تھے۔

علامہ ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ ولید عمرۃ القضا میں رسولِ اکرم ﷺ کے ہمرکاب تھے اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کہیں روپوش ہو گئے تھے۔ اس موقع پر حضور ﷺ نے ولید سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''اگر خالد میرے پاس آ جاتا تو میں اس کی تکریم کرتا۔ مجھے حیرت ہے کہ ایسا ذہین و فریس آدمی ابھی تک اسلام سے بیگانہ ہے۔''

حضور ﷺ کا ارشاد سُن کر حضرت ولید رضی اللہ عنہ نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو ایک خط لکھا جس میں انھیں بڑی دردمندی اور اخلاص کے ساتھ اسلام کی دعوت دی۔ یہی خط خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو اسلام کی طرف مائل کرنے کا باعث ہوا۔

حضرت ولید رضی اللہ عنہ نے عمرۃ القضا کے کچھ ہی عرصہ بعد ۸ھ میں وفات پائی۔ ان کی والدہ حضرت لبابہ رضی اللہ عنہا ابھی حیات تھیں۔ انہیں جوان فرزند کی موت نے نڈھال کر دیا اور انہوں نے ایک دلدوز مرثیہ کہا جس کا ایک شعر یہ تھا:

یا عین فابکی للولید بن الولید بن المغیرہ

کان الولید بن الولید ابو الولید فتی العشیرہ

(اے آنکھو اس ولید کی یاد میں آنسو بہاؤ جو شجاعت اور بہادری میں اپنے باپ کی طرح خاندان کا ہیرو تھا)

حضور ﷺ نے یہ مرثیہ سنا تو ان سے فرمایا کہ یہ نہ پڑھو بلکہ قرآن کی یہ آیت تلاوت کرو۔

وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ

ترجمہ (اور موت کی بے ہوشی ضرور آ کر رہے گی (اس وقت کہا جائے گا کہ) یہ ہے وہ جس سے تو بھاگتا تھا)

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

حضرت وہب بن قابوس مزنی رضی اللہ عنہ

حضرت حارث بن عقبہ مزنی رضی اللہ عنہ

(۱)

سیّدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے سامنے کبھی غزوۂ اُحد کا تذکرہ چھڑ جاتا تو آپ فرمایا کرتے ''کاش اس مزنی کی شہادت مجھے نصیب ہوتی'' اسی طرح فارس الاسلام فاتح عراقِ عرب حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے سامنے کبھی غزوۂ اُحد کا ذکر ہوتا تو وہ بھی فرماتے ''میری آرزو ہے کہ میری موت بھی مزنی کی شہادت جیسی ہو۔''

یہ مزنی جن کی شہادت پر فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جیسے اساطینِ اُمت رشک کیا کرتے تھے، بنومزینہ کے چشم و چراغ حضرت وہب بن قابوس رضی اللہ عنہ تھے۔ یہ اللہ کی دین ہے جس کو چاہے فرش سے اٹھا کر تخت پر بٹھا دے اور جس کو چاہے تخت سے گرا کر تحت الثریٰ میں ڈال دے۔ وہب بن قابوس رضی اللہ عنہ صحرائے عرب کے ایک بدوی ہی تو تھے۔ دارِ آخرت کو سدھارنے سے پہلے نہ انہوں نے کوئی روزہ رکھا اور نہ کسی وقت کی نماز پڑھی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو وہ شان اور رفعت عطا کی اوجِ ثریا نے منہ چھپالیا اور چشمِ فلک دنگ رہ گئی۔ ع

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

(۲)

حضرت وہب بن قابوس رضی اللہ عنہ کے حسب ونسب اور وطن کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ قبیلہ مزینہ سے تعلق رکھتے تھے جو مضر کی مشہور شاخ ہے۔ چونکہ بنومزینہ کا قیام بلادِ غطفان میں تھا اس لیے بعض اہلِ سیَر نے انہیں قبیلہ غطفان کی ایک شاخ خیال

کیا ہے لیکن یہ صحیح نہیں۔ بنو مزینہ کا تعلق اُد بن طانجہ بن الیاس بن مضر سے ہے۔ قصیدہ بانت سعاد کے زندۂ جاوید خالق حضرت کعب بن زہیر رضی اللہ عنہ کا تعلق بھی بنو مزینہ سے تھا۔

حضرت وہب بن قابوس رضی اللہ عنہ کے حالاتِ زندگی گوشۂ خموشی میں ہیں وہ پہلی اور آخری بار شوال ۳ھ ہجری میں غزوۂ اُحد کے دن صفحۂ تاریخ پر نمودار ہوئے اور اسی دن شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دربار میں ایسے بلند مقام پر فائز ہو گئے کہ ملّتِ اسلامیہ تا ابد اُن پر ناز کرتی رہے گی۔

علامہ ابنِ سعد کاتب الواقدی کا بیان ہے کہ حضرت وہب بن قابوس رضی اللہ عنہ اپنے بھتیجے حارث بن عقبہ بن قابوس رضی اللہ عنہ کے ساتھ بکریاں لے کر خاص اس دن مدینہ منوّرہ آئے۔ جب سرورِ عالم ﷺ اپنے جاں نثاروں کے ہمراہ غزوۂ اُحد کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ خداوندِ علیم وخبیر ہی جانتا ہے کہ وہ دونوں کس غرض کے لیے مدینہ منوّرہ آئے تھے، بکریاں فروخت کرنے یا اسلام کی سعادت کے حصول کے لیے۔ مدینہ پہنچ کر انھوں نے ہر طرف سنّاٹا دیکھا تو حیران رہ گئے۔ اوس اور خزرج کے محلوں میں عورتوں اور بچّوں کے سوا کوئی شخص نظر نہ آتا تھا۔ ان سے پوچھا، یہ کیا ماجرا ہے کہ آج مدینہ مردوں سے خالی نظر آتا ہے؟ جواب ملا کہ سب لوگ رسول اللہ ﷺ کی معیت میں مشرکینِ مکہ کے مقابلہ کے لیے جبلِ اُحد کی طرف گئے ہیں۔ یہ سن کر دونوں چچا بھتیجے اسی وقت میدانِ اُحد میں سرورِ عالم ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور مشرّف بہ اسلام ہو گئے۔ اس وقت لڑائی شروع ہو چکی تھی اور مسلمان مشرکین کو برابر پیچھے دھکیل رہے تھے۔ حضرت وہب رضی اللہ عنہ بھی تلوار کھینچ کر مشرکین پر ٹوٹ پڑے۔ شوقِ شہادت سے سرشار مسلمانوں نے اپنے پُر جوش حملوں سے جلد ہی مشرکین کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ میدان صاف ہو گیا تو بیشتر مسلمانوں نے مالِ غنیمت سمیٹنا شروع کر دیا۔ لڑائی کا آغاز ہونے سے پہلے حضور ﷺ نے کوہِ اُحد کے درّہ عینین پر حضرت عبداللہ بن جبیر انصاری رضی اللہ عنہ کو سرکردگی میں پچاس تیر انداز مقرر کر دیے تھے تاکہ دشمن اس درّہ کے راستے پشت کی

جانب سے اچانک مسلمانوں پر نہ آپڑے۔ ان تیر اندازوں کو حضور ﷺ نے حکم دیا تھا کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے (ہم غالب ہوں یا مغلوب) تم اس دَرّہ کو نہ چھوڑنا۔ جب لڑائی میں مسلمان غالب آگئے تو بدقسمتی سے ان میں سے اکثر تیر اندازوں کو حضور ﷺ کا حکم یاد نہ رہا اور وہ درّے کو چھوڑ کر مالِ غنیمت سمیٹنے میں مشغول ہو گئے۔ صرف حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ سات یا دس تیر اندازوں کے ساتھ دَرّے پر موجود رہ گئے۔ عین اس وقت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور عکرمہ بن ابو جہل (جو ابھی تک اسلام نہ لائے تھے) اپنے رسالے (گھڑ سوار دستے) کے ساتھ درّے میں آگھسے۔ حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ نے اپنے مٹھی بھر ساتھیوں کے ساتھ جم کر مقابلہ کیا لیکن مشرکین کی کثیر تعداد کے سامنے ان کی کچھ پیش نہ چلی اور راہِ حق کے یہ سبھی جانباز ایک ایک کر کے شہید ہو گئے۔ مشرکین نے اب درّے سے نکل کر مسلمانوں کی بڑی جمعیت پر ہلّہ بول دیا۔

(۳)

لڑائی کے پہلے دَور میں مشرکین کو پسپا کر کے مسلمان پہلے ہی اپنی صف بندی توڑ چکے تھے۔ دَرّے کے راستے قریش مکہ کے اچانک طوفانی حملے نے انہیں سنبھلنے کا موقع ہی نہ دیا اور وہ مختلف ٹکڑیوں میں بٹ کر حملہ آروں کا مقابلہ کرنے لگے۔ اسی دوران میں مشرکین کا ایک جتھا مسلمانوں کے اس گروہ کی جانب بڑھا جس میں سرورِ عالم ﷺ موجود تھے۔ حضور ﷺ نے اپنے جاں نثاروں کی طرف دیکھا اور فرمایا، اس غول کو کون روکے گا؟ حضرت وہب بن قابوس رضی اللہ عنہ قریب ہی تھے، انہوں نے آگے بڑھ کر عرض کیا: ”یارسول اللہ اس کام کے لیے میں حاضر ہوں۔“ یہ کہہ کر مشرکین پر اس شدت سے تیر بازی کی کہ ان کو منہ پھر گیا اور وہ پیچھے ہٹ گئے۔ اتنے میں مشرکوں کے ایک اور جتھے نے ادھر کا رُخ کیا۔ حضور؟ ﷺ نے فرمایا، اس سے کون نبٹے گا؟ حضرت وہب رضی اللہ عنہ پھر آگے بڑھے اور عرض کی: ”یارسول اللہ میں ان سے نپٹوں گا۔“ یہ کہہ کر تلوار لہراتے ہوئے اس جوش کے ساتھ اس جتھے پر حملہ کیا کہ اس کے دانت کھٹے ہو گئے اور وہ بھی پیچھے ہٹ

گیا۔ اس سے فارغ ہوئے تھے کہ کفار کا ایک اور پُر جوش گروہ اس طرف یلغار کرتا نظر آیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا، اس گروہ سے کون نبرد آزما ہو گا؟ اب کی بار بھی حضرت وہب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، یارسول اللہ میں حاضر ہوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا، جاؤ جنت تمہاری منتظر ہے۔ یہ بشارت سُن کر فرطِ مسرت سے حضرت وہب رضی اللہ عنہ کے قدم زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ یہ کہتے ہوئے کہ کسی کو نہ چھوڑوں گا اور نہ خود بچنے کی کوشش کروں گا۔ تلوار کھینچ کر مشرکین کے لشکر میں گھس گئے اور اس جوش اور وارفتگی سے لڑے کہ جانبازی اور سرفروشی کا حق ادا کر دیا۔ لڑتے مارتے گروہِ کفار کی دوسری طرف نکل گئے۔ جب سامنے کوئی شخص نہ رہا تو پھر پلٹے اور دوبارہ مشرکوں کے جمِ غفیر میں گھس گئے۔ حضور ﷺ ان کی معرکہ آرائی کو بنظرِ تحسین دیکھ رہے تھے اور فرما رہے تھے۔ اللھم ارحمہ (الٰہی اس پر رحم کر)

وہب رضی اللہ عنہ دیر تک اسی طرح دادِ شجاعت دیتے رہے۔ آخر مشرکین نے انھیں نرغے میں لے لیا اور ہر طرف سے تلواروں اور نیزوں کا مینہ برسا دیا۔ حضرت وہب رضی اللہ عنہ برابر مردانہ وار مقابلہ کرتے رہے لیکن انسانی طاقت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ آخر بیسیوں زخم کھا کر زمین پر گر گئے اور اِن کی روحِ مطہ عالمِ بالا کو پرواز کر گئی۔ یوں تو ان کے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جو زخمی نہ ہوا ہو لیکن بیس زخم ایسے شدید تھے کہ ان میں سے ہر ایک کسی انسان کی موت کے لیے کافی تھا۔ اتنے کاری زخموں کے باوجود ان کا آخر دم تک جم کر لڑنا تحیّر خیز تھا۔ فی الحقیقت یہ ان کا جوشِ ایمان تھا جس نے ان کی نس نس میں شجاعت، حوصلے اور استقامت کی بجلیاں بھر دی تھیں۔ چونکہ انہوں نے مشرکین کو سخت زِچ کیا تھا اور ان کے بہت سے آدمی ہلاک یا زخمی کیے تھے' اس لیے انہوں نے اپنے دل کی بھڑاس یوں نکالی کہ شہید راہِ حق وہب رضی اللہ عنہ کی لاش کا بُری طرح مُثلہ کیا (ناک، کان، ہونٹ کاٹ ڈالے اور جسم کو جگہ جگہ سے پھاڑ ڈالا) یہ ایسا دلدوز منظر تھا کہ کسی کو دیکھنے کی تاب نہ تھی۔ حضرت وہب رضی اللہ عنہ کے نوجوان بھتیجے حارث بن عقبہ رضی اللہ عنہ نے شفیق چچا کی نعش کا یہ حال دیکھا تو بے تاب ہو گئے اور تلوار کھینچ کر مشرکین پر جا پڑے، دیر تک حضرت

وہب رضی اللہ عنہ کی طرح بے جگری سے لڑتے رہے آخر مشرکوں نے انھیں بھی گھیر کر شہید کر ڈالا۔ اس طرح چچا بھتیجے دونوں نے بکریاں انسانوں کے ہاتھ فروخت کرنے کے بجائے اپنی جانیں راہِ حق میں فروخت کر ڈالیں۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

رحمتِ عالم ﷺ پر ان دونوں سرفروشوں کے اخلاصِ عمل کا اس قدر اثر ہوا کہ آپ ﷺ لڑائی کے بعد بہ نفسِ نفیس ان کی لاشوں پر تشریف لے گئے اور فرمایا: "میں تم سے راضی ہوں۔" ان کی قبر کھدنے تک حضور ﷺ ان کے پاؤں کی جانب کھڑے رہے۔ حضرت وہب رضی اللہ عنہ کو سُرخ لکیروں یا سرخ بُوٹیوں کی ایک چادر کا کفن پہنایا۔ چادر چھوٹی تھی پاؤں ننگے رہ گئے حضور ﷺ نے ان پر حرملہ گھاس ڈلوادی اور پھر اپنے ہاتھوں سے ان کو سُپردِ خاک کیا۔

سیّدنا حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ "جو ہمت اور دلاوری وہب بن قابوس رضی اللہ عنہ نے غزوۂ اُحد میں دیکھی گئی ویسی کسی معرکہ میں کسی سے دیکھنے میں نہیں آئی۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ باوجود ان زخموں کے جو آپ ﷺ کے جسم اطہر پر تھے، آپ ﷺ نے وہب رضی اللہ عنہ کو خود جا کر قبر میں اتارا۔ آپ ﷺ کے پاس ایک چادر سرخ لکیروں یا سرخ بوٹیوں کی تھی اس کو اوڑھا کر دفن فرمایا، کاش میری موت بھی ایسی ہی ہوتی۔"

اسی طرح اور بھی بڑے بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم حضرت وہب رضی اللہ عنہ کی شہادت پر رشک کیا کرتے تھے۔

اللہ اللہ۔ یہ صحرانشین جو قبولِ اسلام کے بعد دنیا کی آلودگیوں میں ایک لمحہ کے لیے بھی ملوث نہ ہوئے اور جن کو خود رحمتِ عالم ﷺ نے جنت کی بشارت دی اُن کی خوش بختی پر کون مسلمان رشک نہ کرے گا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

حضرت ذُوالبجادَین رضی اللہ عنہ

(۱)

جب مرکزِ رسالت مکہ سے مدینہ منورّہ کو منتقل ہوا تو عرب کے گوشے گوشے سے متلاشیانِ حق مدینہ پہنچنے شروع ہوئے۔ یہ لوگ گھربار تج کر اور دنیا کے زرومال، آسائش و آرام کو چھوڑ کر تعلیمِ دین کے لیے بارگاہِ رسالت میں آتے تھے۔ انہوں نے فقر و فاقہ اور عسرت و افلاس کی زندگی محض رضائے الٰہی کی خاطر اختیار کی تھی۔ سفر کی صعوبت، بھوک، پیاس کی مصیبت اور گرمی سردی کی تکلیف غرض کوئی چیز بھی اسلام کی تعلیم اور کلامِ الٰہی کا درس لینے سے ان کی روک نہ بن سکتی تھی۔ حالتِ امن میں وہ اللہ کے مسکین ترین بندے تھے اور میدانِ جہاد میں شیرانِ نر سے بڑھ کر تھے۔ جب ان درویشانِ اسلام کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہونے لگا تو رحمتِ عالم ﷺ ان کے قیام و طعام اور تعلیم و تربیت کے خود کفیل بن گئے۔ آپ ﷺ نے ان کے مستقل قیام کے لیے مسجدِ نبوی ﷺ سے جانبِ مشرق ایک مسقف چبوترہ بنوا دیا۔ عربی میں سائبان یا مسقف دالان کو صُفّہ کہتے ہیں۔ اس لیے یہ مردانِ حق آگاہ بھی اصحابِ صُفّہ کہلانے لگے۔ ان بزرگوں کو اضیاف الاسلام (اسلام کے مہمان) یا اضیاف اللہ (اللہ کے مہمان) بھی کہا جاتا ہے۔

○ اصحابِ صُفّہ میں ایک نوجوان بھی تھے جنہیں مبداء فیض نے کمال درجے کا سوزِ ایمان اور قلبِ گداز عطا فرمایا تھا۔ ان کا عنفوانِ شباب تھا لیکن دنیا کی رنگینیوں سے مطلق کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ آقائے دو جہاں ﷺ سے قرآن مجید سیکھتے اور دن رات عجب ذوق و شوق اور جوش و نشاط سے پڑھا کرتے تھے۔ ایک دن سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بارگاہِ رسالت میں عرض کی: ''یارسول اللہ ﷺ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص دکھاوے کے

لیے اتنی بلند آواز سے کلامِ الٰہی پڑھتا ہے۔"

حضور پُر نور ﷺ نے فرمایا: "عمر! اسے کچھ نہ کہو یہ تو سوزِ قلب رکھنے والوں میں ہے اور اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے لیے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آیا ہے۔"

یہ سعادت مند نوجوان جن کے اخلاص اور سوزِ قلب کی خود سیّد المرسلین فخرِ موجودات، خیر الخلائق ﷺ نے تصدیق فرمائی، حضرت عبداللہ ذوالبجادین رضی اللہ عنہ تھے۔

حضرت عبداللہ ذوالبجادین رضی اللہ عنہ کا شمار رحمت عالم ﷺ کے ان جاں نثاروں میں ہوتا ہے جن کی سعادت مندی اور خوش بختی پر نہایت جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم بھی رشک کیا کرتے تھے۔ ان کا تعلق بنو مزینہ سے تھا۔ سلسلہ نسب یہ ہے:

عبداللہ بن عبدنہم بن عفیف بن سحیم بن عدی بن ثعلبہ بن سعد بن عدی بن عثمان بن عمرو۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کا ابھی عہدِ طفلی تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ عبدنہم کے بھائی نے یتیم بھتیجے کو اپنے سایہ عاطفت میں لے لیا اور نہایت شفقت و محبت سے اس کی پرورش کی۔ اس بچے کو اللہ تعالیٰ نے فطرتِ سلیم اور قلبِ گداز عطا کیا تھا۔ جب اس نے ہوش سنبھالا تو مکہ میں دینِ حق کا آوازہ بلند ہو چکا تھا۔ ہوتے ہوتے عبداللہ کے کانوں میں بھی دعوتِ توحید کی صدا پہنچ گئی۔ بلا تامل اس پر لبیک کہا لیکن چچا ابھی تک کفر و شرک کی دلدل میں پھنسے ہوئے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عبداللہ رضی اللہ عنہ کے دل میں اسلام کی محبت بڑھتی چلی گئی لیکن چچا کے خوف سے اس کا اظہار نہ کرتے تھے اور اس بات سے منتظر تھے کہ اللہ تعالیٰ کب چچا کو بھی قبولِ حق کی توفیق دیتا ہے۔ اسی طرح کئی سال گزر گئے لیکن چچا کو قبول حق کی سعادت نصیب نہ ہوئی۔ اس اثناء میں سرورِ عالم ﷺ مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ منورّہ تشریف لے گئے۔

(۲)

آخر عبداللہ رضی اللہ عنہ کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ ایک دن وہ چچا کے پاس گئے اور کہا،

''پیارے چچا! میں عرصہ سے انتظار کر رہا ہوں کہ آپ کب جھوٹے معبودوں سے منہ موڑ کر لوائے توحید تھامتے ہیں لیکن آپ کا جو حال پہلے تھا وہی اب ہے۔ اللہ نے مجھے توفیق دی ہے کہ حق اور باطل میں تمیز کر سکوں۔ آپ آگاہ ہو جائیے کہ میں خدائے واحد اور اس کے سچے رسول ﷺ پر ایمان لاتا ہوں۔''

چچا نے برافروختہ ہو کر کہا، ''اگر تو نے محمد ﷺ کا دین قبول کر لیا ہے تو اس سے بڑھ کر میرے لیے صدمہ کی کوئی بات نہیں۔ کیا میں نے اسی دن کے لیے تیری پرورش کی تھی کہ اپنے معبودوں کو جھٹلائے۔ بہتری یہی ہے کہ نیا دین فوراً ترک کر دے ورنہ اونٹ، بکریاں، مال، کپڑے جو کچھ میں نے تمہیں دے رکھا ہے، سب چھین لوں گا۔''

عبداللہ رضی اللہ عنہ نے بے دھڑک جواب دیا۔ ''چچا جان! اب تو خواہ میری جان چلی جائے میں اللہ اور اللہ کے سچے رسول ﷺ سے منہ نہ موڑوں گا۔''

چچا یہ جواب سن کر غضب ناک ہو گیا۔ اس نے توحید کے متوالے عبداللہ رضی اللہ عنہ سے سب کچھ چھین لیا۔ حتیٰ کہ ان کے کپڑے تک اتروا لیے۔ صرف کپڑے کی ایک دھجی باقی رہنے دی تا کہ اس سے ستر ڈھانک سکیں۔

عبداللہ رضی اللہ عنہ برہنہ تن لنگوٹی باندھے اپنی ماں کے پاس گئے اور اسے سارا واقعہ سنایا۔ بیوہ ماں کو اپنے لختِ جگر سے بے پناہ محبت تھی۔ جب لڑکے کو اس حال میں دیکھا تو بے تاب ہو گئی۔ ایک چادر تھی انہیں دے دی کہ اپنے جسم پر ڈال لو۔ عبداللہ رضی اللہ عنہ نے چادر کے دو ٹکڑے کیے ایک کا تہہ بند بنایا اور دوسرے کو بدن پر ڈال لیا اور پھر مدینہ کی طرف چل پڑے۔

(۳)

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ پہنچے تو رات ڈھل چکی تھی اور نمازِ فجر کا وقت ہو چکا تھا۔ وہ سیدھے مسجدِ نبوی ﷺ میں گئے اور رسولِ اکرم ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی۔ نماز کے بعد حضور ﷺ معمول کے مطابق لوگوں سے مصافحہ کرنے لگے تو عبداللہ رضی اللہ عنہ پر نظر پڑی۔ پوچھا، ''تم کون ہو؟'' انہوں نے عرض کیا، ''میرا نام عبدالعزیٰ ہے۔ مسافر ہوں

اور اسلام قبول کرنے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔"

حضور ﷺ نے فرمایا، "آج سے تمہارا نام عبدالعزیٰ نہیں بلکہ عبداللہ ہے اور لقب ذوالبجادین (دو چادروں والا) ہے۔ تم ہمارے قریب ہی ٹھہرو۔"

حضور ﷺ پُر نور کا ارشاد سن کر عبداللہ فرطِ مسرّت سے باغ باغ ہو گئے اور اصحابِ صُفّہ میں شامل ہو کر صبح و شام آستانہ نبوی ﷺ کی حاضری کو اپنا معمول بنالیا۔ محبوبِ ﷺ ربّ العالمین کے کاشانہ اقدس کی دربانی ان کو دنیا کی ہر شی سے محبوب تھی۔ حضور ﷺ بھی ان پر بڑی شفقت فرماتے تھے اور ان کو بہت عزیز جانتے تھے۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو ذکرِ الٰہی سے بے انتہا شغف تھا۔ ہر وقت پُر سوز آواز میں تہلیل و تسبیح اور تلاوتِ قرآن میں مشغول رہتے تھے۔ سرورِ عالم ﷺ ان کے سوز و اخلاص کو دیکھتے تو بہت خوش ہوتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ نوجوان قلبِ تپاں رکھنے والے لوگوں میں ہے۔

(۴)

سنہ ۹ ہجری میں سرورِ عالم ﷺ غزوۂ تبوک کے لیے روانہ ہوئے تو تیس ہزار جان نثار آپ ﷺ کے ہم رکاب تھے۔ حضرت عبداللہ ذوالبجادین رضی اللہ عنہ بھی ان جان نثاروں میں شامل تھے۔ چلنے سے پہلے یا اثنائے راہ میں وہ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کی:

"یارسول اللہ دعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے رتبہ شہادت پر فائز کرے۔"

حضور ﷺ نے فرمایا: "جاؤ کسی درخت کی چھال اتار لاؤ۔"

جب وہ چھال اتار کر لائے تو حضور ﷺ نے وہ چھال ان کے بازو پر باندھ دی اور فرمایا:

"میں عبداللہ کا خون کافروں پر حرام کرتا ہوں۔" حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی "یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان، آپ میرا خون کافروں پر حرام کر رہے ہیں لیکن میں تو شہادت پانے کا طلب گار ہوں۔"

حضور ﷺ نے فرمایا: ''جب تم راہِ خدا میں جہاد کی نیت سے نکل آئے اور پھر لڑائی سے پہلے تمہیں بخار آ جائے اور اس بخار سے تم وفات پا جاؤ تب بھی تم شہید ہی ہو گے۔''

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کا ارشاد سن کر مطمئن ہو گئے۔ خدا کی قدرت لشکرِ اسلام جب تبوک پہنچا تو حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو شدید بخار آ گیا اور اسی بخار سے وہ لشکر گاہ میں عالمِ بقاء کو سدھار گئے۔ تدفین رات کے وقت عمل میں آئی۔ اس وقت چشمِ فلک نے عجیب منظر دیکھا۔ حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں مشعل تھی اور اس کی روشنی میں سرورِ کون و مکاں ﷺ، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر قبر کھود رہے تھے۔ جب قبر کھد چکی تو حضور ﷺ نے اپنے دونوں رفیقوں کی مدد سے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی میت کو لحد میں رکھا۔ اس وقت آپ ﷺ ان سے فرما رہے تھے۔ ''ادباً الیٰ اخاکما (اپنے بھائی کا ادب ملحوظ رکھو)۔ جب قبر پر مٹی ڈالی جا چکی تھی تو سیّد المرسلین ﷺ نے دُعا مانگی: ''الٰہی میں اس سے راضی تھا تو بھی اس سے راضی رہ۔''

فقیہِ اُمت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بھی اس موقع پر موجود تھے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی دُعا سُن کر میرا جی چاہا کہ اے کاش! عبداللہ ذوالبجادین رضی اللہ عنہ کی بجائے مجھے موت آ جاتی۔ (یعنی اس قبر والے کی جگہ میں ہوتا کہ خود حضور ﷺ اپنے دستِ مبارک سے مجھے دفن کرتے اور میرے لیے اسی طرح دعا فرماتے)

حضرت عبداللہ ذوالبجادین رضی اللہ عنہ کی تدفین جس شان سے ہوئی اس سے ان کی جلالتِ قدر اور بارگاہِ رسالت ﷺ میں ان کی محبوبیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ عبداللہ ذوالبجادین رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا کرتے تھے یہ شخص بارگاہِ الٰہی میں سچے دل سے فریاد کرتا ہے۔

حضرت عبداللہ ذوالبجادین رضی اللہ عنہ نے اپنے جوشِ ایمان اور سوزِ قلب کی جو مثال قائم کی لاریب وہ ہماری عروقِ مردہ میں تا ابد زندگی کی حرارت پیدا کرتی رہے گی۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

حضرت بُریدہ بن حُصیبؓ اسلمی رضی اللہ عنہ

(۱)

بعثت کے بعد رحمتِ عالم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا مکّی دَور بڑا ہی پُر صعوبت تھا۔ اس دَور میں مشرکینِ قریش جہاں اپنی تمام توانائیاں دعوتِ حق کو روکنے اور اہلِ حق کو ستانے میں صَرف کرتے رہے، وہاں وہ اہلِ عرب کو توحید کے داعی اعظم ﷺ سے متنفر اور بد گمان کرنے کے لیے جھوٹ کی ایک مسلسل مہم بھی چلاتے رہے۔ عرب کے مختلف حصوں سے لوگ عُکاظ اور مجنّہ وغیرہ کے میلوں میں شریک ہونے یا حج کے لیے مکہ آتے، تو قریش کے وفود اُن کے پاس جا کر حضور ﷺ کے خلاف ہر ناگفتنی بات کہتے اور اُن کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے کہ محمد ﷺ کی باتوں پر دھیان کرنا گویا اپنے (خودساختہ) معبودوں کے غضب کو دعوت دینا ہے۔

قدرت کی کرشمہ سازیاں بھی عجیب ہیں۔ اگر مشرکین یہ ناپاک مہم نہ چلاتے تو شاید عرب جیسے وسیع و عریض ملک کے دُور دراز گوشوں تک دعوتِ حق کے پہنچنے میں کئی برس لگ جاتے، لیکن حق کے خلاف مشرکین کی اس تگ و دو نے رحمتِ عالم ﷺ کے اسمِ گرامی اور آپ ﷺ کی دعوت کو بہت تھوڑے عرصے میں سارے عرب سے متعارف کرا دیا اور کئی قبیلوں اور علاقوں کے سعید الفطرت لوگ حق کی طرف راغب ہو گئے۔ ایسے ہی لوگوں میں بنو اسلم بن افصٰی کا قبیلہ بھی تھا۔ اس قبیلے کے سادہ مزاج اور نیک طبع لوگ ایک صحرائی بستی انعیم میں آباد تھے۔ یہ بستی ساحلِ بحر کے قریب ایک ایسے راستے پر واقع تھی جو مکہ کو مدینہ سے ملاتا تھا۔ ہجرتِ نبوی ﷺ سے پہلے اس قبیلے کے لوگوں تک دعوتِ توحید کسی ذریعے سے پہنچ چکی تھی اور وہ اس سے خاصے متاثر ہوئے تھے۔

سنہ ۱۳ بعدِ بعثت میں سرورِ عالم ﷺ اپنے سفرِ ہجرت میں جب انعمیم کے مقام پر پہنچے، تو ایک ذی وجاہت بدوی، ستر اسّی آدمیوں کے ساتھ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اُن کی باوقار اور رعب دار شخصیّت کو دیکھ کر صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں کے سردار ہیں۔ انھوں نے عرض کیا:

''ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ آپ اپنے وطن سے نکل کر یثرب جا رہے ہیں۔ آپ کی قوم نے سارے عرب میں یہ خبر مشہور کر دی ہے اور آپ کو پکڑنے کے لیے گرانقدر انعام مقرر کیا ہے لیکن اے صاحبِ قریش! ہم آپ کی دعوت کا حال سُن چکے ہیں اور ہمارے دل نے گواہی دی ہے کہ اللہ ایک ہے، آپ اُس کے سچّے رسول ہیں اور جس بات کی طرف آپ بُلاتے ہیں، وہ سراسر حق ہے۔''

حضور ﷺ نے تعجب سے بدوی سردار کی طرف دیکھا اور فرمایا: ''اللہ کا شکر ہے کہ اس نے تم لوگوں کو قبولِ حق کی توفیق دی۔''

بدوی سردار معاً آگے بڑھے اور عرض کیا: ''یارسول اللہ! لائیے اپنا ہاتھ، میں اور میرے ساتھی اس پر اسلام کی بیعت کرتے ہیں۔''

حضور ﷺ اُن کی بات سُن کر بہت مُسرور ہوئے۔ بدوی سردار اور اُن کے ساتھیوں سے بیعت لی اور پھر اُن سب کو دعائے خیر سے نوازا۔ بدوی سردار کو اس سعادت یابی پر اس قدر مسرّت ہوئی کہ انھوں نے اپنی پگڑی اتار کر نیزے پر باندھ لی اور اس کو علَم کی طرح لہراتے ہوئے حضور ﷺ کے آگے آگے چل پڑے۔ رحمتِ عالم ﷺ نے ان کو روکا اور فرمایا:

''تم لوگ ابھی یہیں رہو۔ جب مناسب وقت آئے گا، تو میرے پاس آ جانا۔ یا میں خود تمھیں بُلا لوں گا۔''

یہ بدوی سردار جنھوں نے اس وقت رحمتِ عالم ﷺ کا دامنِ اقدس تھاما جب

آپ ﷺ اپنے وطن اور گھربار کو خیرباد کہہ کر ایک اجنبی سرزمین میں تشریف لے جا رہے تھے اور سارے عرب کی مخالفت کو دیکھتے ہوئے بظاہر آپ ﷺ کی کامیابی کا کوئی امکان نہ تھا، حضرت بُریدہ بن الحُصَیبُ اسلمی رضی اللہ عنہ تھے۔

(۲)

سیّدنا حضرت ابوعبداللہ بریدہ بن حُصَیب رضی اللہ عنہ کا شمار نہایت عظیم المرتبت صحابہ رضی اللہ عنہم میں ہوتا ہے۔ علاّمہ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ ان کا تعلق بنواَسلم بن افصٰی سے تھا۔ نسب نامہ یہ ہے:

بریدہ رضی اللہ عنہ بن حُصَیب بن عبداللہ بن حارث بن اعرج بن سعد بن زراح بن عدی بن سہم بن مازن بن حارث بن سلامان بن اسلم بن افصٰی۔

بنواَسلم اصل میں بنوخُزاعہ کی ایک شاخ تھے جو خُزاعہ کے خاندان سے الگ ہو گئی تھی۔ اس کے برعکس واقدی نے لکھا ہے کہ حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ کا تعلق بنواسلم سے تھا جو بنوقضاعہ سے نکلے تھے۔ تاہم جمہور اہلِ سِیَر نے ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ کے بیان کو ترجیح دی ہے۔

حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کے بارے میں دو روایتیں ہیں۔ پہلی روایت یہ ہے کہ وہ اَسّی خاندانوں کو ساتھ لے کر اس وقت اسلام لائے جب سرورِ عالم ﷺ مکہ معظّمہ سے مدینہ منورہ جاتے ہوئے اُن کی بستی غمیم میں ٹھہرے۔ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ اور حافظ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت میں یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ، حضور ﷺ کے ساتھ (یا ہجرت کے فوراً بعد) مدینہ منورہ آئے اور چند دن قرآنِ حکیم کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد واپس اپنے قبیلے میں چلے گئے۔

دوسری روایت، جسے حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ''اِصابہ'' میں درج کیا ہے، یہ ہے کہ حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ، غزوۂ بدر کے بعد اسلام سے مشرّف ہوئے، تاہم اُن کا قیام اپنے وطن ہی میں رہا۔ وہ ۶ھ یا اس سے کچھ پہلے ہجرت کر کے مدینہ آئے اور پھر یہیں مستقل

سکونت اختیار کر لی۔

واقدی کا بیان ہے کہ سرورِ عالم ﷺ (ایک سفر کے دوران میں) غدیر الاشطاط نامی ایک تالاب پر خیمہ زن تھے کہ وہاں کے سردار بُرَیدہ بن الخُصَیب رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی قوم کا سلام پیش کرتے ہوئے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! یہ ہماری بستی اور جانور ہیں۔ کچھ لوگ ہجرت کر کے مدینہ جا چکے ہیں، باقی یہیں ہیں۔ اب آپ کا جوار شاد ہو؟''

حضور ﷺ نے انھیں وہیں رہنے کی ہدایت فرمائی اور اُن کے قبیلے بنو اسلم کو ایک پروانہ عطا فرمایا۔ علامہ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق اس پروانہ نبوی کا متن یہ تھا:

(۱) بنو اَسلَم کے لیے جو خُزاعہ کی شاخ ہے۔ اُن لوگوں کے لیے جو ان میں سے ایمان لائے ہیں، نماز پڑھتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے دین کے بہی خواہ ہیں۔

(۲) اُنھیں ایسوں کے خلاف مدد دی جائے گی جو ظلم سے اُن پر اچانک حملہ کر دیں۔

(۳) اور اُن پر رسول (نبی) اللہ کی مدد واجب ہوگی جب اُنھیں بُلایا جائے گا۔

(۴) اور اُن کے خانہ بدوش بدویوں کے لیے بھی وہی حقوق ہیں جو ان کی بستی میں رہنے والوں کے لیے ہیں۔

(۵) اور وہ مہاجر ہی ہیں جہاں بھی وہ رہیں۔

اسے علا بن حضرمی رضی اللہ عنہ نے لکھا اور گواہی ثبت کی۔

اس متن کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ پروانہ نبوی فتحِ مکہ سے پہلے لکھا گیا، کیونکہ فتحِ مکہ کے بعد ہجرت ختم ہوگئی۔ اہلِ سِیَر نے اس کے زمانہ تحریر کی صراحت تو نہیں کی، لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ پروانہ نبوی لکھا گیا تو اس وقت حضرت بُرَیدہ رضی اللہ عنہ اور اُن کے قبیلے کے بہت سے لوگ مشرّف بہ اسلام ہو چکے تھے۔ اور ان میں سے بعض ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے تھے گویا یہ واقعہ فتحِ مکہ سے بہت پہلے کا ہے۔

حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئے۔ تو اس وقت بدر اور اُحد کے معرکے گزر چکے تھے۔ ۶ ھ میں اُنھیں سب سے پہلے اُن چودہ سو نفوس رضی اللہ عنہم قدسی میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا جو بیعتِ رضوان کی سعادتِ عظمیٰ سے بہرہ یاب ہوئے اور بارگاہِ خداوندی سے اُن کے لیے کھلے لفظوں میں جنت کی بشارت آئی:

لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ

(تحقیق اللہ راضی ہوا ایمان والوں سے جب وہ تجھ سے اس درخت کے نیچے بیعت کرنے لگے)

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ بیعتِ رضوان کے بعد حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ نے عہدِ رسالت کے سولہ غزوات سرایا میں شرکت کی۔ اُن میں سے خیبر، فتح مکہ، حنین، طائف اور تبوک کے غزوات خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ مُسندِ احمد بن حنبل میں غزوۂ خیبر کے بارے میں حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم لوگوں نے خیبر کا محاصرہ کیا۔ پہلے دن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ علمبردار تھے، لیکن قلعہ فتح نہ ہوا۔ دوسرے دن بھی یہی صورت پیش آئی۔ لوگ بہت تھک چکے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کل میں ایک ایسے آدمی کو عَلَم دوں گا جو اللہ اور اُس کے رسول کا محبوب ہے اور وہ بھی اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہے، اللہ اس کے ہاتھ پر فتح دے گا۔ لوگ حضور ﷺ کا ارشاد سن کر خوش ہوگئے۔ دوسرے دن رسول اللہ ﷺ نے فجر کی نماز سے فارغ ہو کر عَلَم منگوایا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بُلا بھیجا۔ اُن کی آنکھیں آئی ہوئی تھیں۔ حضور ﷺ نے اُن کو عَلَم عطا فرمایا اور پھر اللہ نے اُن کے ذریعے خیبر کو مسخر کر دیا۔

فتحِ مکہ (۸ ھ) کے موقع پر حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ، رحمتِ عالم ﷺ کے ہمرکاب اُن دس ہزار قدوسیوں میں شامل تھے جن کے بارے میں صدیوں پہلے کتاب استثناء میں یوں پیشین گوئی کی گئی تھی:

''خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے اُن پر طلوع ہوا۔ کوہِ فاران سے وہ جلوہ گر

ہوا۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے ہاتھ میں ایک آتشیں شریعت تھی۔"

حضرت بُرَیدہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، فتح مکہ کے دن میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک وضو سے کئی نمازیں پڑھیں اور موزوں پر مسح کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، یارسول اللہ! اس سے پہلے آپ نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "میں نے قصداً ایسا کیا ہے تاکہ لوگوں کو اس کا جواز معلوم ہو جائے۔" (مسلم)

فتحِ مکہ کے بعد حضرت بُرَیدہ رضی اللہ عنہ نے حنین اور طائف کے معرکوں میں اپنی تلوار کے جوہر دکھائے۔ ۸ھ کے آخر میں سرورِ عالم ﷺ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو مجاہدین کی ایک جماعت کے ساتھ تبلیغ اسلام کے لیے یمن بھیجا، تو حضرت بُرَیدہ رضی اللہ عنہ بھی اُس جماعت میں شامل ہو گئے اور چند ماہ یمن میں مقیم رہ کر تبلیغ و ہدایت کا فریضہ انجام دیتے رہے۔

۹ھ میں رسولِ اکرم ﷺ نے صدقہ و زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے ہر قبیلے کے لیے الگ الگ مُحصّلین مقرر فرمائے۔ یہ وہ اصحاب تھے جن کی دیانت و امانت، تفقہ فی الدین اور فراست پر حضور ﷺ کو خاص اعتماد تھا۔ یہ مُحصّلین، قبائل کا دورہ کر کے لوگوں سے صدقات اور زکوٰۃ وصول کر کے بارگاہِ رسالت میں پیش کرتے تھے۔

ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت بُرَیدہ رضی اللہ عنہ کو قبیلہ غفار اور اسلم کا مُحصّل مقرر فرمایا، وہ اُن قبیلوں سے زکوٰۃ اور صدقات وصول کر کے مدینہ آئے، تو غزوۂ تبوک کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ حضور ﷺ نے حضرت بُرَیدہ رضی اللہ عنہ کو دوبارہ اُن قبائل کی طرف بھیجا کہ اُن کو جہاد (غزوۂ تبوک) میں شریک ہونے کی دعوت دیں۔ حضرت بُرَیدہ رضی اللہ عنہ نے بڑے موثر طریقے سے اُن لوگوں کو اسلامی لشکر میں شامل ہونے کی ترغیب دی۔ یہاں تک کہ اُن کی ایک بڑی تعداد حضور ﷺ کی ہمرکابی میں جہاد فی سبیل اللہ کے لیے آمادہ، بلکہ بے تاب ہو گئی۔ حضرت بُرَیدہ رضی اللہ عنہ اُن سب کو ساتھ لے

کر بارگاہِ نبوی ﷺ میں حاضر ہوئے اور پھر حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ سمیت اُن سب کو تیس ہزار مجاہدین کے اُس لشکر میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ جس نے رحمتِ عالم ﷺ کی ہمرکابی میں سفرِ تبوک کی لرزہ خیز صعوبتیں برداشت کیں۔

(۳)

سنہ ۱۰ ہجری میں رحمتِ عالم ﷺ نے حضرت علی کرّم اللہ وجہہ کو تین سو سواروں کے ساتھ یمن کے قبیلے مذحج کی طرف روانہ فرمایا۔ ان سواروں میں حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ یمن پہنچ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بنو مذحج کو اسلام کی دعوت دی۔ لیکن اُنہوں نے یہ دعوت قبول کرنے کے بجائے مسلمانوں سے لڑائی چھیڑ دی۔ مسلمانوں نے پُر زور مقابلہ کیا اور بہت جلد مذحجی جنگوؤں کو مغلوب کر لیا۔ مالِ غنیمت کی تقسیم ہوئی، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک لونڈی اپنے لیے رکھی۔ حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ کو یہ بات پسند نہ آئی، تاہم وہ اس وقت خاموش رہے۔

یمن سے واپس آ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ حجۃ الوداع میں شریک ہوئے۔ حج سے فارغ ہونے کے بعد سرورِ عالم ﷺ نے مدینہ منورہ کو مراجعت فرمائی۔ تمام مہاجرین و انصار بھی آپ ﷺ کے ہمرکاب تھے۔ راہ میں ایک مقام غدیرِ خُم پر آپ ﷺ نے تھوڑی دیر کے لیے قیام فرمایا اور تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کو جمع کر کے ایک مختصر سا خطبہ دیا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ یمن سے واپس آنے کے بعد (غالباً اسی موقع پر) حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ سے شکایت کی کہ مالِ غنیمت میں سے علی رضی اللہ عنہ نے ایک لونڈی اپنے لیے رکھ لی ہے۔ حضور ﷺ نے ان کی بات سُن کر فرمایا:

”بُریدہ رضی اللہ عنہ کیا تم کو علی رضی اللہ عنہ سے کچھ رنجش ہے؟“

اُنھوں نے عرض کیا: ”جی ہاں، یا رسول اللہ!“

حضور ﷺ نے فرمایا: علی رضی اللہ عنہ کے خلاف کوئی رنجش دل میں نہ رکھو، اُن کو خُمس میں اس سے زیادہ کا حق تھا۔“

مسندِ احمد بن حنبل کی روایت کے مطابق حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ کی شکایت سُن کر حضور ﷺ کے روئے انور پر تکدّر کے آثار پیدا ہوئے اور آپ ﷺ نے فرمایا:

"بُریدہ رضی اللہ عنہ! کیا مسلمان اپنی ذات پر میرے حق کو ترجیح نہیں دیتے؟"

انھوں نے عرض کیا: "بے شک یارسول اللہ! آپ کا حق فائق ہے۔"

فرمایا: "تو پھر سُنو کہ جس کا میں مولا ہوں، علی رضی اللہ عنہ بھی اُس کا مولا ہے۔"

امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ، ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اور بعض دوسرے محدثین نے لکھا ہے کہ اس موقع پر حضور ﷺ نے اپنے خطبے میں یہ الفاظ استعمال فرمائے:

من کنت مولاہ فعلی مولاہ، اللھم وال من والاہ وعاد من عاداہ (میں جس کو محبوب ہوں، علی رضی اللہ عنہ بھی اُس کو محبوب ہونا چاہیے۔ الٰہی! جو علی رضی اللہ عنہ سے محبت رکھے، تو بھی اُس سے محبت رکھ اور جو علی رضی اللہ عنہ سے عداوت رکھے، تو بھی اُس سے عداوت رکھ۔)

حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ کے ارشادات سُن کر میری ساری شکایت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یکسر دُور ہوگئی، بلکہ میرے دل میں اُن کے لیے ایسی محبت پیدا ہوگئی کہ اس کی کوئی انتہا نہیں تھی۔

صفر ۱۱ ہجری میں سرورِ عالم ﷺ نے حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو ایک لشکر دے کر شام جانے کا حکم دیا۔ اس مہم کا مقصد رومیوں سے شہدائے موتہ کا انتقام لینا تھا۔ حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ اگرچہ سترہ، اٹھارہ برس کے نوجوان تھے، لیکن حضور ﷺ نے اس لشکر کی قیادت کے لیے اُنھیں ہی منتخب فرمایا؛ حالانکہ لشکر میں حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ اور متعدد دوسرے اکابر صحابہ بھی شامل تھے۔

علامہ ابنِ سعد رحمۃ اللہ کا بیان ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ کو حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کی ماتحتی میں اس لشکر کا علمبردار مقرر فرمایا۔ اس لشکر نے مدینہ سے چل کر

جُرف کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ اسی جگہ حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کو ان کی والدہ حضرت اُمِ ایمن رضی اللہ عنہا کا پیغام ملا کہ رسول اللہ ﷺ اس دنیائے فانی سے رخصت ہو رہے ہیں۔ فوراً مدینہ آؤ!

یہ پیغام ملتے ہی حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ، حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور کچھ دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ مدینہ واپس آگئے۔ حضور ﷺ کا وصال ہو گیا، تو ساری فوج جُرف سے مدینہ آ گئی اور یہ مہم ملتوی ہو گئی۔

حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ سریر آرائے خلافت ہوئے، تو اُنھوں نے دوبارہ لشکر مرتب کر کے حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کو روانگی کا حکم دیا۔ حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ حسبِ سابق اس لشکر کے علمبردار مقرر ہوئے۔ یہ لشکر ابھی جرف تک پہنچا تھا کہ سارے عرب میں فتنہ ارتداد کے شعلے بھڑک اٹھے اور حالات بڑی نازک صورت اختیار کر گئے۔ بعض اصحاب نے حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا کہ ایسے مخدوش حالات میں ان جانبازانِ اسلام کو مدینہ سے باہر بھیجنا مناسب نہیں، اس لیے یہ مہم ملتوی کر دیجیے، لیکن حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ نے اُن کی رائے سے اتفاق نہ کیا اور فرمایا:

"خدا کی قسم! جس مہم کا خود رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا، میں اس کو ہرگز نہیں روکوں گا۔ اگر حضور ﷺ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے مجھ کو پرندے نوچ کر کھا جائیں، تو پروا نہیں۔"

اس کے بعد خلیفۃ الرسول رضی اللہ عنہ نے تھوڑی دُور پا پیادہ اس لشکر کی مشایعت کی اور اپنی دعاؤں کے ساتھ اس کو رخصت کیا۔ یہ لشکر، جو جیشِ اُسامہ رضی اللہ عنہ کے نام سے مشہور ہے۔ دشمنوں کو قرار واقعی سزا دے کر مظفر و منصور واپس آیا، تو حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ نے مہاجرین و انصار کو ساتھ لے کر مدینہ منورہ سے باہر اس کا استقبال کیا جیش کے آگے آگے حضرت بُریدہ بن حصیب رضی اللہ عنہ پرچم اڑا رہے تھے اور اُن کے پیچھے امیرِ لشکر، حضرت

اُسامہ رضی اللہ عنہ اپنے والد حضرت زید رضی اللہ عنہ کے گھوڑے سبحہ پر سوار تھے۔

اس مہم کے بعد حضرت بُرَیدہ رضی اللہ عنہ عہدِ صدیقی و فاروقی کے کئی اور معرکوں میں بھی مجاہدانہ شریک ہوئے، لیکن اہلِ سیَر نے اُن کی تفصیل بیان نہیں کی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں بصرہ آباد ہوا، تو حضرت بُرَیدہ رضی اللہ عنہ متعدد دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ وہاں چلے گئے اور وہیں ایک مکان تعمیر کر لیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں خراسان پر لشکر کشی ہوئی، تو حضرت بُرَیدہ رضی اللہ عنہ بھی اسلامی لشکر میں شامل ہو گئے اور اس سلسلے کے کئی معرکوں میں دادِ شجاعت دی۔

البلاذری نے فتوح البلدان میں لکھا ہے کہ ۵۱ھ ہجری میں زیاد بن ابیہ نے ایک فرمان جاری کیا کہ بصرہ اور کوفہ سے زیادہ سے زیادہ لوگ خراسان جا کر مستقل اقامت اختیار کر لیں؛ چنانچہ لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد، جو پچاس ہزار بتائی جاتی ہے، الرّبیع بن زیاد کے ہمراہ ان شہروں سے منتقل ہو کر خراسان میں سکونت پذیر ہو گئی۔ اُن میں حضرت بُرَیدہ بن حُصَیب رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ اُنھوں نے مَرو میں مستقل سکونت اختیار کی اور اُسی جگہ ۶۰ھ یا ۶۳ھ میں پیکِ اجل کو لبیک کہا۔

انھوں نے اپنے پیچھے دو سعادت مند بیٹے عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ اور سلیمان رحمۃ اللہ علیہ چھوڑے۔ ان دونوں نے اپنے جلیل القدر والد سے کئی حدیثیں روایت کی ہیں۔

(۴)

حضرت بُرَیدہ بن حُصَیب رضی اللہ عنہ کی کتابِ سیرت میں اخلاص فی الدّین، حُبِّ رسول، شوقِ جہاد، حق گوئی اور جذبہ خیر خواہی اُمت سب سے نمایاں ابواب ہیں۔ انھوں نے قبولِ اسلام کے بعد نہ صرف اپنے آپ کو ہمہ تن حق کی تبلیغ و حمایت کے لیے وقف کر دیا، بلکہ اپنے قبیلے کے لوگوں کو بھی دائرہ اسلام میں لا کر اُن کو حق کے جانباز سپاہی بنا دیا۔

رحمتِ عالم ﷺ سے اُن کی محبت اور عقیدت کی یہ کیفیت تھی کہ حضور ﷺ کے ہر ارشاد

کو حرزِ جان بنا کر رکھتے تھے اور اس پر عمل کرنے میں کوشاں رہتے تھے۔ اپنے جذبہ فدویت اور اخلاص فی الدین کی بدولت اُن کو بارگاہِ نبوی ﷺ میں خصوصی تقرب حاصل ہوگیا تھا اور حضور ﷺ اُن پر بے حد شفقت فرماتے تھے۔

مُسندِ احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ کہیں جا رہے تھے کہ راستے میں سرورِ عالم ﷺ سے ملاقات ہوگئی۔ حضور ﷺ نے بے تکلفانہ اُن کا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر اسی طرح اُن کے ساتھ آگے بڑھے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے اس لطفِ خاص سے کئی اور موقعوں پر بھی مستفیض ہوئے ہوں گے۔

حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ کی حُبِّ رسول ﷺ کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ گو حضور ﷺ نے انھیں اپنے وطن میں رہتے ہوئے بھی مہاجر قرار دیا تھا، لیکن اُن کی سیّد الانام ﷺ سے دُور رہنا گوارا نہ ہوا اور انھوں نے اپنا گھر بار چھوڑ کر مدینہ منورہ میں مستقل اقامت اختیار کر لی، کیونکہ اُن کے شوقِ لقاء اور فیضانِ نبوی سے مسلسل بہرہ یاب ہونے کے جذبے کی تسکین اسی طرح ہو سکتی تھی۔

حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ ایک شجاع اور نڈر آدمی تھے اور اُن کے دل میں جہادِ فی سبیل اللہ کی بے پناہ تڑپ تھی۔ مدینہ منورہ آنے کے بعد حضور ﷺ کے وصال تک وہ تمام غزوات اور متعدد سرایا میں بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ شریک ہوئے۔ اُن کا یہ جوش اور جذبہ حضور ﷺ کے وصال کے بعد بھی برقرار رہا اور وہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے عہدِ باسعادت میں بھی میدانِ جہاد سے پیچھے نہ رہے۔ فرمایا کرتے تھے کہ زندگی کا لطف میدانِ جہاد میں گھوڑا دوڑانے ہی سے حاصل ہوتا ہے۔

کفار و مشرکین کے مقابلے میں تو حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ کے جوش اور ولولے کی کوئی انتہا ہی نہ تھی، لیکن مسلمانوں کو باہمی خانہ جنگیوں میں اُن کی تلوار ہمیشہ کند رہی۔ انہوں نے ان خانہ جنگیوں سے نہ صرف اپنا دامن بچائے رکھا، بلکہ اُن میں شریک ہونے

والوں کے بارے میں بھی کبھی کوئی رائے قائم نہ کی اور فریقین کے بارے میں ہمیشہ حُسنِ ظن سے کام لیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اُن کے دل میں ہر وقت اُمت کی خیر خواہی کا جذبہ موجزن رہتا تھا۔

ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ نے بکر بن وائل کے ایک آدمی سے روایت کی ہے کہ میں حضرت بُریدہ بن حصیب رضی اللہ عنہ کے ساتھ سجستان (کے میدانِ جہاد) میں تھا۔ ایک دن میں نے اُن کے سامنے حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ پر کئی اعتراضات کیے۔ میرا مقصد یہ تھا کہ اس طرح ان اصحاب کے بارے میں مجھے حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ کی رائے معلوم ہو جائے گی۔ میرے اعتراضات سن کر حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ یکا یک قبلہ رُو ہو گئے اور دونوں ہاتھ اٹھا کر یوں دُعا کی:

''الٰہی! علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی مغفرت فرما، عثمان رضی اللہ عنہ کی مغفرت فرما، طلحہ رضی اللہ عنہ کی مغفرت فرما، زبیر رضی اللہ عنہ کی مغفرت فرما۔''

اس کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوئے اور کہا: ''تیرا باپ تجھے گم کر دے، معلوم ہوتا ہے کہ تو مجھے قتل کرنا چاہتا ہے۔''

میں نے کہا: ''خدا کی قسم! میں نے ہرگز آپ کے قتل کا ارادہ نہیں کیا۔ میرا مقصد، تو اُن اعتراضات سے یہ تھا کہ آپ کی رائے ان اصحاب کے بارے میں معلوم کروں۔''

فرمایا: ''ان اصحاب کو اللہ تعالیٰ نے السابقون الاوّلون قرار دیا ہے۔ اب اُن کا معاملہ اُسی کے ہاتھ میں ہے، چاہے تو اُن کی نیکیوں کے بدلے میں بخش دے، چاہے، تو ان کا غلطیوں کا مواخذہ کرے۔''

حق گوئی اور حق پژوہی بھی حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ کا نمایاں وصف تھا اور وہ حق بات کہنے میں لومۃ لائم کی مطلق پروانہ کرتے تھے۔ اس سلسلے میں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ، امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لے گئے۔ اس وقت ایک اور شخص اُن سے مصروفِ گفتگو تھا۔ اُس نے حضرت علی کرم اللہ

وجہہٗ کے بارے میں کچھ نامناسب باتیں کہیں جو حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ کو سخت ناگوار گزریں۔ انھوں نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: کیا میں بھی کچھ کہہ سکتا ہوں؟''

انھوں نے کہا: ''ہاں بڑے شوق سے۔''

فرمایا: ''میں نے رسول اللہ ﷺ کو خود فرماتے سنا ہے کہ مجھے اُمید ہے کہ بروزِ حشر میں اتنے لوگوں کی شفاعت کروں گا جتنے زمین میں کنکر اور درخت ہیں۔ معاویہ! اگر تم اس شفاعتِ عام کے مستحق ہو سکتے ہو، تو علی رضی اللہ عنہ کیوں نہیں ہو سکتے؟''

اُن کی بات سُن کر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ خاموش ہو گئے اور اس شخص نے بھی اس موضوع پر پھر زبان نہ کھولی۔

(۵)

حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ کو مسلسل کئی سال تک فیضانِ نبوی ﷺ سے براہِ راست بہرہ یاب ہونے کا موقع ملا، اس لیے اُن کا پایہ علم و فضل بہت بلند ہو گیا تھا۔ روایتِ حدیث کے اعتبار سے حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ کا شمار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طبقہ سوم میں ہوتا ہے۔ اُن سے ایک سو چونسٹھ احادیث مروی ہیں۔ راویوں میں اُن کے صاحبزادے سلیمان رحمۃ اللہ علیہ اور عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ شعبی رحمۃ اللہ علیہ اور عبداللہ بن اوس خزاعی رحمۃ اللہ علیہ قابلِ ذکر ہیں۔

حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ کی مرویات میں ایک متفق علیہ ہے، دو میں بخاری اور گیارہ میں مسلم منفرد ہیں۔

حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ نہایت راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ سرورِ عالم ﷺ سے جو کچھ سُنتے تھے۔ اُس کے ایک ایک حرف پر یقین رکھتے تھے۔ مُسندِ احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ میں ہے کہ حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ ایک دن بارگاہِ رسالت میں حاضر تھے اور حضور ﷺ کے ارشادات سے مستفیض ہو رہے تھے۔ اثنائے گفتگو میں حضور ﷺ نے فرمایا:

''وہ وقت آنے والا ہے جب میری اُمت کے لوگوں پر ایک چوڑے چکلے

چھرے اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں والی قوم تین مرتبہ یلغار کرے گی اور اُن کو دھکیلتے دھکیلتے جزیرۃ العرب کے اندر محدود کر دے گی۔ اُس کی پہلی یلغار میں بھاگ جانے والے بچ جائیں گے۔ دوسری یلغار میں کچھ بچ جائیں گے اور کچھ قتل ہو جائیں گے۔ تیسری یلغار میں سب لوگ اس مصیبت کا شکار ہو جائیں گے۔"

لوگوں نے پوچھا: "یارسول اللہ! حملہ آور کون لوگ ہوں گے؟" حضور ﷺ نے فرمایا: "ترک" پھر فرمایا: "خدا کی قسم! وہ لوگ اپنے گھوڑوں کو مسجدوں میں باندھیں گے۔"

حضور ﷺ نے اگرچہ فتنے کے ظہور کے وقت کی صراحت نہیں فرمائی، لیکن آپ ﷺ کے ارشادات سُننے کے بعد حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ نے اپنا معمول بنالیا کہ دو تین اونٹ اور پانی کا برتن ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اس سے اُن کا مقصد یہ تھا کہ اگر اُن کی زندگی میں فتنہ ظاہر ہو، تو اُس سے بچ کر نکل جائیں۔

حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ نہ صرف خود رحمتِ عالم ﷺ کے ارشادات کو اپنی زندگی کا لائحہ عمل سمجھتے تھے، بلکہ اُن کو بڑے لطف وانبساط کے ساتھ دوسروں تک بھی پہنچاتے رہتے تھے۔ اُن کی مرویات میں سے بیشتر کا تعلق عقائد، اخلاق اور اعمال سے ہے۔ یہ نہ صرف کئی اہم دینی مسائل پر روشنی ڈالتی ہیں، بلکہ اعمالِ حَسَنہ کی طرف رغبت بھی دلاتی ہیں۔ اُن سے مروی چند احادیث کا خلاصہ یہ ہے:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس نے عصر کی نماز چھوڑ دی، اُس کے عمل اکارت ہوئے۔ (بخاری)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ہمارے اور اُن (کافروں) کے درمیان جس چیز کی بنا پر عہد ہے، وہ نماز ہے، تو جس نے نماز چھوڑ دی، وہ کافر ہو گیا۔ (نسائی)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اُن لوگوں کو خوشخبری دو جو اندھیرے میں مسجدوں کی طرف جاتے ہیں کہ قیامت کے دن اس (عمل) کے سبب سے اُن کو کامل روشنی نصیب ہوگی۔ (ترمذی۔ ابوداؤد)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص قرآن پڑھے اور اس کے ذریعے لوگوں سے کھائے (یعنی قرآن کو دنیا حاصل کرنے کا ذریعہ بنائے) وہ قیامت کے دن اس صورت میں آئے گا کہ اس کے چہرے پر گوشت نہ ہوگا ہڈی ہی ہڈی ہوگی۔'' (بیہقی)

''عید الفطر کے دن جب تک رسول اللہ ﷺ کچھ کھا نہ لیتے، نمازِ عید کے لیے نہ جاتے اور عید الاضحیٰ کے دن اس وقت تک کچھ نہ کھاتے جب تک نماز نہ پڑھ لیتے۔'' (ابنِ ماجہ۔ دارمی)

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ نمازِ وتر حق ہے۔ جس نے نمازِ وتر نہیں پڑھی وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ (یہ بات آپ ﷺ نے تین بار فرمائی)''۔

(ابوداؤد)

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آدمی کے جسم میں تین سو ساٹھ جوڑ ہیں۔ انسان کو چاہیے کہ ہر جوڑ کے بدلے میں صدقہ دے۔ صحابہ نے عرض کیا۔ اے اللہ کے نبی! کون اس کی طاقت رکھتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا مسجد میں پڑے ہوئے تھوک کو مٹی کے اندر دفن کرنا بھی صدقہ ہے اور ضرر رساں چیز کو راستے سے اٹھا کر پھینک دینا بھی صدقہ ہے۔'' (ابوداؤد)

ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے نماز کے اوقات دریافت کیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا تو ہمارے ساتھ نماز پڑھ، چنانچہ جب سورج ڈھل گیا، تو آپ ﷺ نے ظہر کی نماز پڑھی۔ پھر آپ ﷺ نے عصر کی نماز ادا کی جب کہ آفتاب بلند تھا اور سفید و صاف۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے

سورج کے غائب ہونے پر مغرب کی نماز ادا کی اور جب شفق غائب ہو گئی، تو آپ ﷺ نے عشاء کی نماز پڑھی جب صبح ہوئی، تو آپ ﷺ نے فجر کی نماز ادا کی۔ دوسرے دن آپ ﷺ نے ظہر کی نماز اُس وقت پڑھی جب وقت خوب ٹھنڈا ہو گیا اور عصر کی اس وقت جب آفتاب آخری بلندی پر تھا، پھر مغرب کی نماز شفق کے غائب ہونے سے پہلے تک پڑھی اور عشاء کی نماز تہائی رات گزر جانے پر ادا کی اور فجر کی نماز خوب روشنی ہونے پر پڑھی۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا نماز کے اوقات پوچھنے والا کہاں ہے؟ اُس شخص نے کہا۔ یارسول اللہ! میں حاضر ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تمہاری نماز کا وقت وہ ہے جو اُن دنوں اوقات کے درمیان ہے۔ (صحیح مسلم)

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ
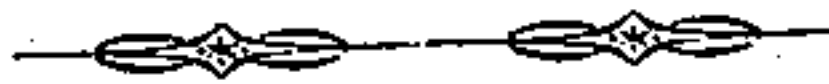
حضرت نعیم بن مسعود اشجعی رضی اللہ عنہ

(۱)

غزوۂ خندق (۵ ہجری) میں عرب کے تمام دشمنانِ اسلام نے متحد ہو کر مدینہ منوّرہ پر یلغار کر دی تھی اور اہلِ حق کو اپنے دفاع کے لیے خندق کھودنے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔ مزید ستم یہ ہوا کہ مدینہ کے اندر یہود بنی قریظہ مارِ آستین بننے پر تُل گئے تھے۔ اس سے پہلے انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ کر رکھا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف کسی لڑائی میں شریک نہیں ہوں گے لیکن غزوۂ احزاب کے موقع پر وہ اپنے عہد و پیاں سے منحرف ہو گئے اور اعدائے اسلام سے مل کر منصوبہ بنایا کہ باہر سے وہ حملہ آور ہوں گے اور شہر کے اندر سے بنو قریظہ مسلمانوں کی پشت میں خنجر گھونپیں گے۔ اہلِ حق کے لیے یہ بڑا نازک وقت تھا۔ لیکن انہوں نے بڑے عزم اور حوصلے سے کام لیا۔ ایک طرف تو وہ حملہ آوروں کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گئے اور دوسری طرف بنو قریظہ کی طرف سے کسی امکانی شرارت کا سدِّ باب کرنے کے لیے دو سو جان باز مختص کر دیئے۔ محاصرے کے دوران میں کفار نے کئی بار خندق عبور کر کے شہر کے اندر گھسنے کی کوشش کی لیکن مسلمان بہادروں نے ان کا منہ پھیر دیا۔ بہر صورت رحمتِ عالم ﷺ کو کفار کے شیطانی جمگھٹے اور بنو قریظہ کی غداری سے بہت تشویش تھی۔ اسی پُر آشوب زمانے کا ذکر ہے کہ عشاء اور مغرب کے درمیان ایک بدوی سردار کسی نہ کسی ترکیب سے بارگاہِ رسالت ﷺ میں پہنچ گئے۔ حضور ﷺ اس وقت نماز پڑھ رہے تھے۔ سلام پھیرا تو بدوی سردار پر نظر پڑی۔ وہ صورت آشنا نکلا۔ پوچھا، اس وقت کیسے آنا ہوا۔ بدوی سردار نے عرض کی:

"اے محمد (ﷺ) میں خدائے واحد پر ایمان لاتا ہوں اور آپ ﷺ کی رسالت کی تصدیق کرتا ہوں۔ مجھے اپنے حلقہ بگوشوں میں شامل کر لیجیے۔"

اس کڑے وقت میں بدوی سردار کے قبولِ اسلام پر حضور ﷺ نے خوشنودی کا اظہار فرمایا۔ اب بدوی سردار نے عرض کیا:

"یارسول اللہ اب تک قریش اور بنو قریظہ سے میری دوستی تھی اور کوئی میرے قبولِ اسلام سے آگاہ نہیں ہے۔ اس لڑائی کے سلسلے میں میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ارشاد فرمائیے، خدائے لایزال کی قسم میں اسے ضرور انجام دوں گا۔"

سرورِ عالم ﷺ نے فرمایا: "قبائل کے اس اجتماع اور یہود بنی قریظہ کے ساتھ اس کے گٹھ جوڑ کا کوئی تدارک کر سکتے ہو تو کرو۔"

بدوی سردار نے عرض کیا: "یارسول اللہ یہ کام آپ ﷺ مجھ پر چھوڑ دیں۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ کس طرح منتشر ہوتے ہیں۔"

یہ بدوی سردار جنہوں نے مسلمانوں پر انتہائی مصیبت کے زمانے میں لوائے توحید کو تھاما اور پھر اہلِ حق کو خطرے سے نکالنے کے لیے ایک بہت بڑا کام اپنے ذمہ لیا۔ حضرت نعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ اشجعی تھے۔

(۲)

حضرت ابوسلمہ نعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ کا تعلق غطفان کے خاندانِ اشجع سے تھا۔ سلسلہ نسب یہ ہے:

نعیم بن مسعود بن عامر بن انیف بن ثعلبہ بن قنفذ بن حلاوہ بن سبیع بن بکر بن اشجع بن ریث بن غطفان۔

حضرت نعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ کا شمار اپنے قبیلہ کے سربرآوردہ لوگوں میں ہوتا تھا وہ بڑے زیرک اور معاملہ فہم آدمی تھے اور بنو اشجع ان کو بہت مانتے تھے۔ ان کے اثر ورسوخ

کی یہ کیفیت تھی کہ ایک طرف قریش مکہ ان سے دوستی کا دم بھرتے تھے اور دوسری طرف یہود مدینہ سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے۔ حضرت نعیم رضی اللہ عنہ سرورِ عالم ﷺ کے مدّت سے شناسا تھے۔ اور آپ ﷺ کی دعوت سے بھی آشنا اور متاثر تھے لیکن معلوم نہیں کیا اسباب تھے کہ ان جیسا دانا آدمی غزوۂ احزاب تک اپنا آبائی مذہب ترک نہ کر سکا۔ غزوۂ احزاب میں وہ اپنے قبیلہ کے ساتھ حملہ آور لشکر میں شامل تھے۔ مدینہ منوّرہ کے محاصرہ کے دوران میں ایک دن ان کے ضمیر نے ملامت کی کہ تو محمد ﷺ اور ان کے دین کو برحق سمجھتا ہے لیکن پھر بھی مشرکین کے ساتھ مل کر دینِ حق کے نام لیواؤں کو تباہ و برباد کرنے کے درپے ہے، یہ جوانمردی نہیں۔ چنانچہ ایک رات کو چُپ چاپ حضور ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور نعمتِ اسلام سے بہرہ یاب ہو کر اعدائے حق کے جَمِ غفیر کو منتشر کرنے کا بیڑا اٹھا لیا۔ یہ کام بڑا دشوار اور خطرناک تھا لیکن حضرت نعیم رضی اللہ عنہ کو اپنے آپ پر اس قدر اعتماد تھا کہ انہوں نے ہر قسم کے خطرات سے بے پروا ہو کر اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا عزم بالجزم کر لیا۔

(۳)

حضور ﷺ سے رخصت ہو کر حضرت نعیم رضی اللہ عنہ یہود بنو قریظہ کے پاس پہنچے اور ان کو جمع کر کے اس طرح گفتگو کی طرح ڈالی:

نعیم رضی اللہ عنہ: ''اے برادرانِ بنو قریظہ تم جانتے ہو کہ مجھے تمہارے ساتھ کس قدر محبت ہے۔''

بنو قریظہ: ''ہاں ہم کو بخوبی علم ہے۔''

نعیم رضی اللہ عنہ: ''قریش اور بنو غطفان محمد ﷺ سے لڑنے کے لیے آئے ہیں۔''

بنو قریظہ: ''ہاں ہم بھی ان کی مدد کریں گے۔''

نعیم رضی اللہ عنہ: ''لیکن تمہاری ان سے کیا نسبت، وہ تو تم سے دُور رہتے ہیں۔''

بنو قریظہ: ''یہ درست ہے لیکن محمد ﷺ ان کے بھی اور ہمارے بھی دشمن ہیں۔ اگر

ان کو غلبہ حاصل ہو گیا تو وہ انھیں چھوڑیں گے نہ ہمیں۔"

نعیم رضی اللہ عنہ: "یہ بھی تو سوچو کہ قریش اور غطفان کو مناسب موقع ملا تبھی وہ محمد ﷺ سے لڑیں گے ورنہ واپس چلے جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ وہ تمہیں اپنے ساتھ تو نہیں لے جائیں گے۔ تمہیں تو اسی جگہ مسلمانوں کے ساتھ رہنا ہے۔ خواہ مخواہ ان سے جھگڑا کیوں مول لیتے ہو؟"

بنو قریظہ: "تو پھر ہم کیا کریں۔"

نعیم رضی اللہ عنہ: "قریش اور بنو غطفان کا ساتھ چھوڑ دو اور لڑائی میں کسی کا ساتھ نہ دو۔"

بنو قریظہ: "لیکن ہم تو قریش سے قول و قرار کر چکے ہیں ان کو کیا منہ دکھائیں گے۔"

نعیم رضی اللہ عنہ: "قول و قرار تو تم نے مسلمانوں سے بھی کیا تھا۔ ذرا اپنے دل میں سوچو کہ قریش کامیابی سے مایوس ہو کر واپس چلے گئے تو یہاں تم اکیلے مسلمانوں کا مقابلہ کیسے کرو گے؟"

بنو قریظہ: "بلا شبہ تم سچ کہتے ہو لیکن اب ہم اس جھمیلے سے نکلنے کے لیے کیا تدبیر کریں۔"

نعیم رضی اللہ عنہ: "تم لوگ مجھے بہت عزیز ہو اس لیے میری مانو تو قریش اور بنو غطفان کے چند آدمی ضمانت کے طور پر اپنے یہاں رکھ لو۔ اگر قریش اور بنو غطفان بد عہدی کریں اور بلا حصولِ مقصد واپس چلے جائیں تو تمہارے پاس ان کے آدمی موجود ہوں گے۔ اگر مسلمانوں نے تمہارا قصد کیا تو اپنے آدمیوں کی خاطر وہ ضرور تمہاری مدد کو پہنچیں گے۔"

بنو قریظہ: "تورات کی قسم تمہارا مشورہ نہایت صائب ہے۔ ہم اسی کے مطابق عمل کریں گے۔"

بنو قریظہ کی طرف سے مطمئن ہو کر حضرت نعیم رضی اللہ عنہ سردارِ قریش ابو سفیان کے پاس

گئے اور ان سے اس طرح گفتگو کی:

نعیم رضی اللہ عنہ: ''مسلمانوں سے میری عداوت کا حال آپ کو معلوم ہے اور آپ کے میرے درمیان دوستی کا جو رشتہ ہے اس کا بھی آپ کو علم ہے۔''

ابوسفیان: ''ہاں ہاں ہمیں معلوم ہے اس کے کہنے کی کیا ضرورت ہے۔''

نعیم رضی اللہ عنہ: ''ایک خبر میں نے سُنی ہے وہ آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔''

ابوسفیان: ''کہو وہ کیا ہے؟''

نعیم رضی اللہ عنہ: ''شرط یہ ہے کہ اس کو پوشیدہ رکھیں خصوصاً بنوقریظہ کے کانوں میں اس کی بھنک نہ پڑ جائے۔''

ابوسفیان: ''ہم تمہاری خبر کو پوشیدہ رکھیں گے اور کسی صورت میں اس کو افشا نہ کریں گے۔''

نعیم رضی اللہ عنہ: ''میں نے معتبر ذریعہ سے سنا ہے کہ بنوقریظہ نے آپ کے ساتھ جو عہد و پیمان کیے ہیں وہ ان سے پھر گئے ہیں اور دوبارہ اپنے تعلقات مسلمانوں سے استوار کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے یہ منصوبہ بنایا ہے کہ قریش اور بنوغطفان کے ستّر آدمی اپنے قبضہ میں کر کے ان کو محمد ﷺ کے پاس بھیج دیں تاکہ وہ ان کی گردن اڑا کر اپنا بدلہ لے لے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے محمد ﷺ کے پاس پیغام بھیج دیا ہے اور وہ بھی اس بات پر راضی ہے۔''

ابوسفیان: ''تمہاری اس معاملہ میں کیا رائے ہے؟''

نعیم رضی اللہ عنہ: ''میرا تو مشورہ یہ ہے کہ بنوقریظہ آپ سے ضمانت کے طور پر کچھ آدمی مانگیں تو صاف انکار کر دیں اور ان کے دامِ فریب میں ہرگز نہ آئیں۔''

ابوسفیان: ''تمہارا مشورہ قرینِ صواب اور مستحسن ہے ہم ایسا ہی کریں گے۔''

قریش کی جانب سے دلجمعی ہونے کے بعد حضرت نعیم رضی اللہ عنہ بنوغطفان کے پاس گئے اور جو باتیں قریش سے کہی تھیں وہی ان سے کہیں۔ چونکہ وہ خود بھی بنوغطفان ہی

سے تعلق رکھتے تھے اس لیے سب اہلِ قبیلہ نے متفق ہو کر ان کی تائید کی۔

(۴)

جس دن یہ سب باتیں ہوئیں اتفاق سے وہ جمعہ کا دن تھا۔ اسی رات کو ابو سفیان نے بنو قریظہ کے پاس پیغام بھیجا کہ ہم کو یہاں پڑے ہوئے بہت دن ہو گئے ہیں آدمیوں اور مویشیوں کو بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ بہتر ہو گا کہ آج ہی رات کو جنگ کی تیاری کی جائے اور علی الصباح ہم اور تم مل کر مسلمانوں سے فیصلہ کُن جنگ کریں۔ بنو قریظہ نے جواب میں کہلا بھیجا کہ کل یومِ شنبہ ہے اور اس دن ہم کوئی کام نہیں کرتے۔ اس کے بعد بھی ہم اسی صورت میں تمہارے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف لڑیں گے جب تم اپنے قبیلہ کے ستّر عمائد و اشراف کو ہمارے پاس بھیج دو گے کیونکہ ہمیں خدشہ ہے کہ محاصرہ طویل ہو جانے کی صورت میں تم گھبرا کر واپس چلے جاؤ گے اور ہم بے یار و مدد گار رہ جائیں گے۔ اگر مسلمان ہم پر آ پڑے تو پھر اپنے آدمیوں کی خاطر تم ہماری مدد کے لیے آ جاؤ گے بصورتِ دیگر تمہیں اتنی دُور سے بُلانا محال ہو گا۔

قریش نے جب بنو قریظہ کا جواب سنا تو اُن کے کان کھڑے ہوئے اور کہنے لگے واللہ جو کچھ نعیم نے کہا تھا وہ سچ نکلا۔ چنانچہ انھوں نے بنو قریظہ کو جواب بھیجا کہ ہم ہرگز اپنا کوئی آدمی تمہارے سپرد نہیں کریں گے اگر تمہیں ہمارے ساتھ ہو کر مسلمانوں سے لڑنا ہے تو بہتر ورنہ ہم جب چاہیں گے واپس چلے جائیں گے پھر تم جانو اور مسلمان۔ بنو قریظہ نے بنو غطفان کو بھی اپنے کچھ آدمی ضمانت میں دینے کے لیے پیغام بھیجا تو انھوں نے بھی کورا جواب دے دیا۔ اب بنو قریظہ برملا کہنے لگے کہ نعیم اشجعی نے جو کچھ ہمیں بتایا تھا وہ سب درست نکلا، ہم قریش اور غطفانیوں کے ساتھ مل کر ہرگز مسلمانوں سے نہیں لڑیں گے۔ غرض دونوں حلیف ایک دوسرے سے بدظن ہو گئے اور ان میں سخت پھوٹ پڑ گئی۔ یہ سب کچھ حضرت نعیم رضی اللہ عنہ کی بدولت ہوا۔ ادھر خدا کا کرنا چہار شنبہ کے دن ایسی خوفناک آندھی آئی کہ محاصرین کے خیمے گر گئے، آگ بُجھ گئی اور دیگیں چولھوں

پراوندھی ہو گئیں...... کفار کچھ اس طوفان کی وجہ سے اور کچھ باہمی ناچاقی کی بناء پر ایسے بددل ہوئے کہ محاصرہ اٹھا کر بحالِ خراب اپنے وطن کی راہ لی۔

(۵)

غزوۂ احزاب کے بعد حضرت نعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے اسلام کا کھلم کھلا اعلان کر دیا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر اپنے قبیلہ کے بہت سے لوگوں کو دائرہ اسلام میں داخل کیا۔ اس کے بعد ہجرت کر کے مدینہ منورّہ چلے گئے اور کئی غزوات میں سرورِ عالم ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔ ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر وہ اپنے قبیلے بنو اشجع کو مشرکینِ مکہ کے خلاف جہاد کی ترغیب دینے کے لیے گئے۔ اسی طرح غزوۂ تبوک میں بھی وہ اپنے قبیلے کو ابھار کر لائے۔ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف حضرت نعیم رضی اللہ عنہ کے اپنے دل میں جذبہ جہاد موجزن رہتا تھا بلکہ وہ اپنے اہلِ قبیلہ کو بھی اس کارِ خیر میں شریک کرنے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔

سرورِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد حضرت نعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ بہت عرصہ زندہ رہے۔ اس عرصے میں ان کے کیا مشاغل رہے، اہلِ سِیَر نے ان کی تصریح نہیں کی۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضرت نعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ نے حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ کے دَورِ خلافت کی ابتداء میں وفات پائی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ انھوں نے جنگِ جمل میں شہادت پائی۔ اہلِ سِیَر نے حضرت نعیم رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے سلمہ رضی اللہ عنہ کا ذکر خصوصیت سے کیا ہے وہ بھی شرفِ صحابیت سے بہرہ ور تھے۔ ان سے پانچ حدیثیں مروی ہیں جن میں سے کچھ انہوں نے اپنے والد سے روایت کی ہیں۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

حضرت عُروہ بن مَسعُود ثقفی رضی اللہ عنہ

(ہم شبیہ مسیح علیہ السلام)

(۱)

ذیعقدہ ۶ھ ہجری میں رحمتِ عالم ﷺ چودہ سو جاں نثاروں کے ہمراہ عُمرہ کے لیے مکہ روانہ ہوئے۔ قربانی کے اونٹ ساتھ تھے اور حضور ﷺ کے حکم کے مطابق تمام مسلمانوں نے اپنی تلواریں نیاموں میں ڈال رکھی تھیں کیونکہ اس سفر کا مقصد محض خانہ کعبہ کے طواف اور زیارت سے مشرّف ہونا تھا اور اس میں لڑائی کے ارادہ کا مطلق کوئی دخل نہ تھا۔ اہلِ حق کا یہ مقدّس قافلہ جب مکہ سے چند میل ادھر حُدیبیہ کے مقام پر پہنچا تو حضور ﷺ کو اطلاع ملی کہ قریش مسلمانوں کو ہر قیمت پر مکہ میں داخل ہونے سے روکنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور اس غرض کے لیے انہوں نے ایک بڑی جمعیت اکٹھی کر لی ہے۔ یہ اطلاع پا کر حضور ﷺ نے ایک سفیر کو یہ پیغام دے کر قریش کے پاس بھیجا کہ ہم صرف عُمرہ ادا کرنے آئے ہیں، لڑنا مقصود نہیں، بہتر یہ ہے کہ قریش ایک معیّن مدت کے لیے ہم سے صلح کر لیں اور ہمارا اور قوم کا معاملہ عرب کے ہاتھوں میں چھوڑ دیں۔ اگر ہم غالب ہوں گے تو یہ ان کی صوابدید پر منحصر ہوگا کہ ہماری جماعت میں شامل ہوں یا نہ ہوں اگر ان کو صلح منظور نہیں ہے تو پھر خدا کی قسم میں ان سے آخری دم تک لڑوں گا......
حضور ﷺ کے سفیر نے قریش کے پاس جا کر کہا کہ میں محمد ﷺ کا پیغام تمہارے لیے لایا ہوں اگر تم پسند کرو تو بیان کروں؟ بعض جوشیلے لوگوں نے کہا، ہم کو سننے کی ضرورت نہیں...... لیکن قریش کے سنجیدہ اور تجربہ کار آدمیوں نے کہا کہ تم جو پیغام لائے ہو بیان

کرو...... سفیر نے یہ پیغام بیان کیا تو مشرکین میں سے پختہ عمر کے ایک وجیہ اور خوبصورت آدمی کھڑے ہو گئے اور انہوں نے قریش سے مخاطب ہو کر کہا:

''یا معشرِ قریش! کیا تم میں سے بعض میرے والد کے برابر نہیں؟'' لوگوں نے کہا، ''کیوں نہیں ضرور ہیں۔'' پھر وہ صاحب بولے، ''کیا تم میں سے بعض میری اولاد کے برابر نہیں؟ سب نے جواب دیا'' ہاں ضرور ہیں'' ......ان صاحب نے پھر پوچھا۔ ''تم کو مجھ پر کوئی بدگمانی ہے؟'' ......قریش نے یک زبان ہو کر کہا ''ہرگز نہیں'' ...... وہ صاحب بولے، تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے اہلِ عکاظ کو تمہاری مدد کے لیے کہا تھا اور جب انہوں نے انکار کیا تھا تو میں اپنے بچوں اور حامیوں کو ساتھ لے کر تمہاری مدد کے لیے آیا تھا'' ......قریش نے جواب دیا۔ ''جی ہاں ہمیں آپ کا احسان خوب یاد ہے۔'' ...... جب یہ سوال و جواب ہو چکے تو ان صاحب نے کہا، ''محمد ﷺ کا پیغام نہایت معقول معلوم ہوتا ہے۔ اگر تم مجھے اجازت دو تو میں محمد ﷺ سے مل کر اس معاملہ کو طے کروں۔'' سب نے رضامندی ظاہر کی تو وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دیر تک آپ سے گفت و شنید کرتے رہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ گرد و پیش کا بھی بغور جائزہ لیتے رہے۔ جب قریش کے پاس گئے تو ان کو حضور ﷺ کے ساتھ اپنی گفتگو کی تفصیل سُنائی اور پھر نہایت دردمندی کے ساتھ انہیں بتایا کہ ''برادرانِ قریش! مجھے دنیا کے بڑے بڑے فرمانرواؤں کے درباروں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے، میں نے قیصر و کسریٰ کے دربار اور نجاشی کی شان و شوکت دیکھی ہے، لیکن خُدا کی قسم میں نے کسی زرخرید غلام کو بھی اپنے بادشاہ کی اتنی عزت کرتے نہیں دیکھا جتنی کہ محمد ﷺ کے ساتھی ان کی کرتے ہیں۔ محمد ﷺ تھوکتے ہیں تو یہ لوگ آگے بڑھ کر ان کے تھوک کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہیں اور جوشِ عقیدت میں اپنے چہرے اور ہاتھوں پر مل لیتے ہیں۔ محمد ﷺ وضو کرتے ہیں تو یہ لوگ مستعمل پانی کے ایک ایک قطرے پر اس طرح ٹوٹ پڑتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے اس کی خاطر آپس میں لڑ مریں گے۔ محمد ﷺ کوئی حکم دیتے ہیں تو ہر شخص بجا آوری

کے لیے لپکتا ہے، محمد ﷺ جب کوئی بات کرتے ہیں تو سب کی آوازیں پست ہو جاتی ہیں۔ محمد ﷺ کی عظمت کا یہ حال ہے کہ ان کا کوئی ساتھی ان کی طرف نظر بھر کر نہیں دیکھ سکتا۔ میری مانو تو محمد ﷺ کی تجویز منظور کر لو، یہ نہایت پسندیدہ اور معقول ہے۔''

یہ صاحب جنہوں نے خونریزی روکنے کے لیے مسلمانوں اور قریش کے مابین صلح کے لیے نہایت اخلاص اور دردمندی کے ساتھ سر توڑ کوشش کی، بنو ثقیف کے ایک سردار ابو مسعود عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تھے۔

(۲)

سیّدنا حضرت ابو مسعود عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اگرچہ صحابہ متاخرین کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کا شمار اکابر صحابہ میں ہوتا ہے۔ وہ طائف کے مشہور قبیلہ بنو ثقیف کے اشراف میں سے تھے۔ سلسلہ نسب یہ ہے:

عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بن مالک بن کعب بن عمرو بن سعد بن عوف بن ثقیف بن منبہ بن بکر بن ہوازن بن عکرمہ بن خصفہ بن قیس عیلان۔

عروہ رضی اللہ عنہ نہایت نیک دل، صائب الرائے اور دلیر آدمی تھے اور بنو ثقیف میں نہایت عزت و احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ قریش مکہ سے بھی ان کے گہرے مراسم تھے اور مکہ میں ان کا اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر وہ مکہ میں موجود تھے، ایک روایت کے مطابق وہ قریش کے بلاوے پر مکہ آئے تھے اور بقول بعض وہ از خود اس قضیے کا تصفیہ کرانے مکہ آئے تھے۔ حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ اور حافظ ابنِ عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت بسر بن سفیان خزاعی رضی اللہ عنہ کو قریش کے ارادوں کی تحقیق کے لیے مکہ روانہ کیا تھا۔ وہ تحقیق کر کے عسفان کے مقام پر حضور ﷺ سے ملے اور عرض کی:

''یارسول اللہ قریش نے مزاحمت کا فیصلہ کر لیا ہے اور وہ لڑائی پر تلے ہوئے ہیں۔''

صحیح بخاری کی روایت کے مطابق سب سے پہلے حضرت بدیل بن ورقا

خزاعی رضی اللہ عنہ نے حضور کو قریش کی مزاحمت کی خبر دی تھی اور انہوں نے ہی حضور ﷺ کا پیغام قریش کو پہنچایا تھا۔

حضرت عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قریش کے سفیر بن کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے ان کے سامنے بھی وہی تجویز پیش کی جو اپنے سفیر کی زبانی قریش کو بھیج چکے تھے۔ عروہ رضی اللہ عنہ نے نفسیاتی حربے سے کام لینا چاہا اور کہا:

''محمد ﷺ اگر تم بالفرض اپنی قوم کی بیخ کنی کرنے میں کامیاب ہو گئے تو کیا تم نے عرب کے کسی آدمی کے بارے میں آج تک سنا ہے کہ اس نے خود اپنی قوم کو برباد کر دیا ہو اور اگر لڑائی کا نتیجہ کچھ اور نکلا تو خدا کی قسم یہ لوگ جو تمہارے گرد نظر آ رہے ہیں، سب بھاگ جائیں گے اور تمہیں تنہا چھوڑ دیں گے۔''

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ' عروہ رضی اللہ عنہ کی بات سن کر غصہ سے بیتاب ہو گئے اور فرمایا:

''جا جا اپنے معبود 'لات'' کی پیشاب گاہ چوس، ارے ہم محمد ﷺ کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے اور آپ ﷺ کو تنہا چھوڑ دیں گے؟''

عروہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ابوبکر اگر تمہارے بعض احسانات مجھ پر نہ ہوتے تو خدا کی قسم میں تمہاری سخت کلامی کا ضرور جواب دیتا۔''

بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بات سن کر کہ عروہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ جب ان کو بتایا گیا کہ یہ ابوبکر بن ابی قحافہ ہیں تو انہیں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے قدیمی احسانات کا حوالہ دے کر کوئی سخت جواب دینے سے گریز کیا۔ لیکن ان روایتوں کی صحت محلِ نظر ہے کیونکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ قریش کی بڑی مشہور و معروف ہستی تھے۔ یہ ناممکن تھا کہ حضرت عروہ رضی اللہ عنہ ان کو چہرے یا آواز سے نہ پہچانتے ہوں۔

اس کے بعد عروہ رضی اللہ عنہ پھر حضور ﷺ سے گفتگو میں مشغول ہو گئے۔ عربوں کی عادت تھی کہ گفتگو کرتے وقت وہ ایک دوسرے کی ڈاڑھی کو ہاتھ لگاتے تھے یا اسے پکڑ لیتے تھے، عروہ رضی اللہ عنہ بھی دورانِ گفتگو میں بار بار حضور ﷺ کی ریشِ مبارک کی طرف ہاتھ بڑھاتے تھے۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ خود پہنے شمشیر بدست حضور ﷺ کی پشت کی جانب کھڑے تھے، جونہی عروہ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی ریشِ مبارک کی طرف ہاتھ بڑھاتے، حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ تلوار کے پرتلہ سے ان کے ہاتھ کو ٹھوکا دیتے اور کہتے ''خبردار اپنا ہاتھ حضور ﷺ کی ریشِ مبارک سے پرے رکھ۔''

حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کا چہرہ خود میں چھپا ہوا تھا، عروہ رضی اللہ عنہ نے برہم ہو کر کہا، یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا یہ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ ہیں۔''

عروہ رضی اللہ عنہ نے ان سے مخاطب ہو کر کہا: ''او غدار کیا میں نے فلاں موقع پر تیری غداری کے معاملہ میں تیری مدد نہیں کی تھی؟...... (زمانہ جاہلیت میں حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے چند آدمیوں کو قتل کر دیا تھا اور ان کا مال لے لیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کر لیا تھا، حضور ﷺ نے مغیرہ رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام پر تو صاد فرمایا تھا لیکن ساتھ ہی ان پر واضح کر دیا تھا کہ تم نے جو مال لوٹا ہے ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔ صحیح بخاری میں ہے کہ عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے مغیرہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے مقتولوں کا خون بہا ادا کیا تھا، اس موقع پر انہوں نے اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا تھا)۔

حدیبیہ میں اپنی سفارت کے دوران میں حضرت عروہ رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عقیدت اور شیفتگی کے جو حیرت انگیز مناظر دیکھے وہ ان سے بہت متاثر ہوئے۔ واپس جا کر قریش کے سامنے ان کی کیفیت بڑے موثر پیرایہ میں تفصیل سے بیان کی اور انہیں مشورہ دیا کہ مسلمانوں سے صلح کر لو اور ان کو مکہ میں داخل ہونے سے نہ روکو۔ قریش نے اس وقت تو ان کا مشورہ نہ مانا لیکن بیعتِ رضوان کے بعد وہ صلح

نامہ حدیبیہ پر دستخط کرنے پر مجبور ہو گئے۔

(۳)

۸ھ ہجری میں سرورِ عالم ﷺ غزوۂ طائف سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ کو واپس تشریف لا رہے تھے کہ اثنائے راہ میں حضرت عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور قبولِ اسلام کی سعادت حاصل کی اس کے بعد انہوں نے عرض کی:

''یارسول اللہ مجھے اجازت دیں کہ میں اپنے قبیلہ کو حق کی دعوت دوں۔''

بنِ ثقیف بڑے جنگجو اور مغرور لوگ تھے۔ حضور ﷺ نے فرمایا، ''تمہاری سنگدل قوم تم سے لڑے گی۔'' (یا بروایتِ دیگر تمہاری قوم تم کو قتل کر دے گی) انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ بنوثقیف میرا بہت احترام کرتے ہیں یہاں تک کہ اگر میں سو رہا ہوں تو مجھے بیدار بھی نہیں کرتے کہ مبادا مجھے تکلیف ہو۔ ان کی بات سن کر حضور ﷺ نے انہیں تبلیغ حق کی اجازت دے دی۔

سعادت اندوزِ اسلام ہو کر حضرت عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ عشاء کے قریب طائف پہنچے، بنوثقیف ان کی آمد کی خبر سُن کر ملاقات کے لیے آئے اور جاہلیت کے طریقے پر ان کو سلام کیا، انہوں نے اس پر سختی سے اعتراض کیا اور کہا کہ تم کو اہلِ جنت کی طرح سلام کرنا چاہیے اور السلام علیکم کہنا چاہیے پھر انہوں نے بنوثقیف کو اسلام کی دعوت دی اس پر وہ بھڑک اٹھے اور حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کو سخت سست کہہ کر چلے گئے۔

صبح کو حضرت عروہ رضی اللہ عنہ نے اپنے مکان کے بالا خانے میں کھڑے ہو کر فجر کی اذان دی۔ اس کو سُن کر بنوثقیف مشتعل ہو گئے اور حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کا رتبہ و احترام بالائے طاق رکھ کر ان پر تیر برسانے شروع کر دیئے۔ علامہ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ بنو مالک (ثقیف کی ایک شاخ) کے ایک شخص اوس بن عوف نے تک کر ایسا تیر مارا کہ ان کی رگِ اکحل میں پیوست ہو گیا۔ یہ تیر پیغامِ قضا ثابت ہوا۔ جب ان کی جانبری

کی کوئی امید نہ رہی تو ان کے اہلِ خاندان ہتھیار باندھ کر ان کے پاس آئے اور کہا کہ ہم آپ کا بدلہ ضرور لیں گے، خواہ ہمارا بچہ بچہ مارا جائے، جب تک ہم بنو مالک کے دس سردار نہ قتل کرلیں گے ہم کو چین نہ آئے گا۔

حضرت عروہ رضی اللہ عنہ نیک نفسی میں اپنی مثال آپ تھے۔ انہوں نے فرمایا، ''یہ تو اللہ تعالیٰ کا مجھ پر خاص احسان ہے کہ اس نے رتبہ شہادت پر مجھے فائز کیا، میرے بدلہ میں کسی کو قتل نہ کرو۔ میں نے اپنا خون معاف کیا۔ میری تو اب صرف یہ آرزو ہے کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کے ان ساتھیوں کے پاس دفن کرنا جو محاصرہ طائف کے دوران میں شہید ہوئے۔''

ایک اور روایت میں ان سے یہ الفاظ بھی منسوب ہیں۔ ''میرے بارے میں جنگ وجدل نہ کرو میں نے تم لوگوں میں مصالحتِ باہمی کے لیے اپنا خون معاف کردیا، میرا قتل تو اللہ تعالیٰ کی نوازش ہے، اس کا شکر ہے کہ اس نے مجھے اپنی جان راہِ حق میں قربان کرنے کی توفیق دی، میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں جنھوں نے مجھے اس بات کی خبر دی تھی کہ تمہاری قوم تمہیں قتل کرڈالے گی۔''

اس وصیت کے بعد حضرت عروہ رضی اللہ عنہ نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کردی۔ اہلِ خاندان نے طائف کے گنجِ شہیداں میں سپردِ خاک کرکے ان کی آخری تمنا پوری کردی۔[1]

رحمتِ عالم ﷺ کو حضرت عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی شہادت کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ نے فرمایا، ''عروہ رضی اللہ عنہ کی مثال صاحب یٰسین جیسی ہے کہ انہوں نے اپنی قوم کو حق کی طرف بلایا اور قوم نے ان کو مارڈالا۔''

---

[1] حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کے قاتل اوس بن عوف نے بعد میں اسلام قبول کرلیا لیکن انہیں حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کے بیٹے حضرت ابوملیح رضی اللہ عنہ اور ان کے بھتیجے حضرت قارب بن اسود رضی اللہ عنہ کی طرف سے انتقام کا کھٹکا لگا رہتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے اس خدشے کا اظہار حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے کیا تو انہوں نے ان دونوں صاحبوں کو بلا کر انتقام سے روک دیا اور ان کو اوس بن عوف رضی اللہ عنہ سے گلے ملوادیا۔

سرورِ عالم ﷺ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ مجھے انبیاء کی مثال صورتیں دکھائی گئیں۔ ابراہیم علیہ السلام میرے ہم شبیہ تھے اور حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ہم شکل تھے۔

حافظ ابنِ عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے الاستیعاب میں لکھا ہے کہ سیّدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو حضرت عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی شہادت سے اتنا صدمہ پہنچا کہ انہوں نے اس سانحہ جانگداز پر ایک پُر درد مرثیہ کہا۔

طَبری رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضرت عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جُرش (ایک صنعتی شہر) میں جا کر دبابہ ضبور اور منجنیق بنانے کا طریق سیکھا تھا۔ ان کے ساتھ حضرت غیلان بن سلمہ ثقفی رضی اللہ عنہ بھی گئے تھے۔ ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ اور ابنِ ہشام کا بیان ہے کہ ان دونوں کو حضور نے جُرش بھیجا تھا۔ اس لیے وہ غزوۂ حنین اور محاصرہ طائف میں شریک نہ ہو سکے۔ اگر یہ روایت درست ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فتح مکہ سے کچھ پہلے یا اس کے فوراً بعد اسلام قبول کر لیا تھا لیکن عام طور پر یہی مشہور ہے کہ انہوں نے غزوۂ طائف کے بعد اسلام قبول کیا اور طائف واپس پہنچتے ہی ان کی شہادت کا واقعہ پیش آ گیا، اس صورت میں ان کا جُرش جانا قرینِ قیاس نہیں ہے اور اگر وہ جُرش گئے بھی تھے تو پھر یہ ان کے قبولِ اسلام سے پہلے کا واقعہ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عامر بن اَکوَع رضی اللہ عنہ

بنو قمعہ کی ایک شاخ بنو اسلم کے چشم و چراغ تھے۔ نسب نامہ یہ ہے:
عامر رضی اللہ عنہ بن سنان بن اکوع بن عبداللہ بن قشیر بن خزیمہ بن مالک بن سلامان بن اسلم

دادا کے نام کی نسبت سے عامر بن اکوع رضی اللہ عنہ مشہور ہوئے۔ نامور صحابی حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ ان کے برادرِ مادری (یا رضاعی) اور ایک دوسری روایت کے مطابق بھتیجے تھے۔

اہلِ سِیَر نے حضرت عامر رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کے زمانے کی تصریح نہیں کی البتہ یہ بات ثابت ہے کہ وہ غزوۂ خیبر سے پہلے سعادت اندوزِ اسلام ہو چکے تھے اور سرورِ عالم ﷺ سے کمال درجے کی عقیدت اور محبت رکھتے تھے۔ شعر و شاعری کا ستھرا مذاق پایا تھا اور نہایت خوش الحانی سے اپنے اشعار پڑھا کرتے تھے۔

سرورِ عالم ﷺ غزوۂ خیبر کے لیے روانہ ہوئے تو آپ ﷺ کی ہمرکاب صحابہ میں حضرت عامر رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔

صحیح مسلم میں حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خیبر کی طرف روانہ ہوئے۔ تمام رات سفر کرتے رہے اثنائے راہ میں ایک شخص نے عامر بن اکوع رضی اللہ عنہ سے کہا کہ عامر ہم کو کچھ سناؤ گے نہیں؟ عامر رضی اللہ عنہ شاعر آدمی تھے اور ان کا دل جوشِ ایمان سے لبریز تھا وہ سواری سے اتر کر یہ حدی سنانے لگے۔

والله! لولاانت ما اهتدينا ولا تصدقنا ولا صلينا[1]

ونحن من فضلك ما استغنينا فانزلن سكنته علينا

فاغفر فداألك ما ابقينا و ثبت الاقدام ان لا قينا

ترجمہ: (خدا کی قسم اگر آپ ﷺ نہ ہوتے تو ہم ہدایت نہ پاتے۔ نہ صدقہ وخیرات کرتے اور نہ نماز پڑھتے۔ اور ہم لوگ آپ کے فضل سے بے نیاز نہیں ہیں۔ اے اللہ ہم لوگوں پر اطمینان نازل فرما۔ جب تک کہ ہم زندہ ہیں تجھ پر فدا ہوں۔ ہماری مغفرت فرما اور جب ہم دشمنوں کے مقابلے پر اٹھیں تو ہمیں ثابت قدمی نصیب کر)۔

حضور ﷺ کے سمع مبارک میں ان کی آواز پڑی تو پوچھا: ''یہ ہانکنے والا (حدی خوان) کون ہے؟'' لوگوں نے کہا ''عامر بن اکوع'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ اس کی مغفرت فرمائے۔'' حضور ﷺ کا ارشاد سن کر لوگوں کو یقین ہو گیا کہ عامر کو شہادت نصیب ہو گی۔ کیونکہ حضور ﷺ جب کسی مجاہد کو رحمت کی دعا دیتے تھے تو وہ بہت جلد شرف شہادت حاصل کر لیتا تھا۔ چنانچہ اس موقع پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔ ''یارسول اللہ آپ نے ہم کو ان کی شجاعت سے نفع نہ اٹھانے دیا'' (یا بروایتِ دیگر انہوں نے اس حسرت کا اظہار کیا کہ یارسول اللہ آپ نے اپنی دُعا میں عامر کے ساتھ ہمیں بھی شریک فرما لیا ہوتا۔)

اثنائے جنگ میں ایک دن حضرت عامر رضی اللہ عنہ یہ رجز پڑھتے ہوئے یہودیوں کے مقابلے پر نکلے۔

قد علمت خيبرانى عامر شاكى السلاح بطل غامر

(خیبر جانتا ہے کہ میں عامر ہوں۔ ہتھیاروں سے لیس ہوں اور خطروں میں

---

[1] بعض کتابوں میں یہ شعر یوں درج ہے۔ اللّٰهم لو لا انت ما اهتدينا ۔ لا تصدقنا و لا صلينا یعنی اے اللہ اگر تو ہدایت نہ کرتا تو ہم ہدایت نہ پاتے نہ ہم صدقہ کرتے اور نہ نماز پڑھتے۔

گھس جانے والا بہادر ہوں)

یہودیوں کا نام جنگجو مرحب ان کے مقابلے کے لیے آگے بڑھا۔ حضرت عامر رضی اللہ عنہ نے مرحب پر تلوار کا وار کیا، تلوار چھوٹی تھی مرحب کو نہ لگی اور زور میں گھوم کر خود ان کے گھٹنے پر لگ گئی جس کے صدمے سے وہ شہید ہو گئے۔ ایک اور روایت کے مطابق مرحب کی تلوار حضرت عامر رضی اللہ عنہ کی ڈھال میں گھس گئی وہ اسے جھٹک کر چھڑانے لگے تو ان کی اپنی تلوار اُچٹ کر انہیں کو لگ گئی جس سے ان کی رگِ اکحل کٹ گئی اور وہ جامِ شہادت پی کر روضہ رضواں کو سدھارے۔ چونکہ ان کی شہادت اپنی ہی تلوار سے ہوئی تھی اس لیے بعض لوگوں نے اس پر خودکشی کا گمان کیا اور کہا کہ اُن کا عمل برباد ہو گیا۔

حضرت مسلمہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں ایسی باتیں سن کر روتا ہوا بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا "یارسول اللہ ﷺ میرے ماں باپ آپ پر قربان، لوگ کہتے ہیں کہ عامر کا عمل باطل ہو گیا"

آپ ﷺ نے فرمایا، یہ کس نے کہا؟

میں نے عرض کیا:

"آپ کے چند صحابہ نے۔"

حضور ﷺ نے فرمایا: "ان لوگوں نے غلط کہا بلکہ عامر رضی اللہ عنہ کے لیے دوہرا اجر (دو چند ثواب) ہے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ
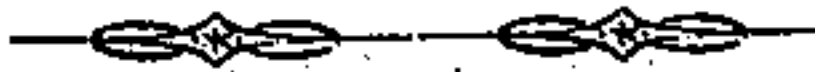
حضرت اسلم حبشی رضی اللہ عنہ

بعض نے ان کو اسلم راعی رضی اللہ عنہ لکھا ہے۔ فی الحقیقت وہ حبشی بھی تھے اور راعی بھی۔ حبشی اس لیے کہ حبش کے رہنے والے تھے اور راعی اس لیے کہ یہودِ خیبر کی بکریاں چرایا کرتے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ خیبر کے ایک یہودی عامر نامی کے غلام تھے اور اس کی بکریاں چرایا کرتے تھے۔

۷ ہجری کے آغاز میں سرورِ عالم ﷺ غزوۂ خیبر کے لیے تشریف لے گئے تو یہودیوں نے اپنے قلعوں میں محصور ہو کر مزاحمت کے لیے زبردست تیاری کی۔ حضرت اسلم رضی اللہ عنہ اور عامر یہودی نطاۃ کے قلعے میں تھے۔ حضرت اسلم رضی اللہ عنہ نے یہودیوں سے پوچھا کہ تم کس لیے مسلح ہو رہے ہو۔ انہوں نے کہا کہ ایک شخص محمد ﷺ جو اپنے آپ کو اللہ کا نبی کہتا ہے ہم پر حملہ آور ہوا ہے ہم اسی سے جنگ کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔

ان کی باتیں سن کر اسلم رضی اللہ عنہ کے دل میں عجیب کیفیت پیدا ہوئی اور وہ غائبانہ حضور ﷺ پُر نور ﷺ کے والہ وشیدا ہو گئے۔ حسبِ معمول بکریاں لے کر قلعے سے باہر نکلے اور سیدھے سرورِ عالم ﷺ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ پھر بارگاہِ رسالت ﷺ میں یوں عرض پیرا ہوئے:

''اے محمد (ﷺ) آپ کس چیز کی دعوت دیتے ہیں۔''

حضور ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کے سوا کسی کو معبود نہ بناؤ اور مجھے اللہ کا رسول ﷺ جانو۔''

حضرت اسلم رضی اللہ عنہ فوراً کلمہ شہادت پڑھ کر دولتِ ایمان سے بہرہ یاب ہو گئے اور

عرض کی: ''یارسول اللہ ﷺ یہ بکریاں میرے پاس امانت ہیں میں چاہتا ہوں کہ ان کو مالک کے پاس پہنچادوں۔''

حضور ﷺ نے فرمایا: بکریوں کو لشکر کے باہر لے جا کر ہانک دو اور تھوڑی سی کنکریاں ان کے پیچھے پھینک دو۔ اللہ تعالیٰ تجھ کو اس امانت سے بری الذّمہ کر دے گا۔

حضرت اسلم رضی اللہ عنہ نے ایسا ہی کیا اور بکریاں بھاگ کر اپنے مالک کے گھر میں گھس گئیں۔

لڑائی شروع ہوئی تو حضرت اسلم رضی اللہ عنہ بھی ہتھیار لے کر مجاہدین میں شامل ہو گئے اور مردانہ وار لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ حضور ﷺ نے ان کی شہادت کی خبر سنی تو فرمایا عمل قلیلا واجر کثیرا (اس نے تھوڑا عمل کیا اور کثیر اجر پایا)۔

ایک روایت میں ہے کہ مسلمانوں نے حضرت اسلم رضی اللہ عنہ کی لاش ایک خیمے میں رکھ دی۔ سرورِ عالم ﷺ نے اس بندۂ حبشی کا اکرام کیا اور اس کو بہشت میں پہنچا دیا، میں نے دیکھا کہ دو حوریں اس کے سرہانے بیٹھی ہیں۔

(ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ اس کے پاس اس کی بیوی جو حور عین ہے، بیٹھی ہے)

اللہ اللہ ایک حبشی چرواہے کے یہ نصیب کہ ایک وقت کی نماز پڑھنی بھی نصیب نہ ہوئی اور سیدھے جنت میں پہنچ گئے ع اسے فضل کرتے نہیں لگتی دیر

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ
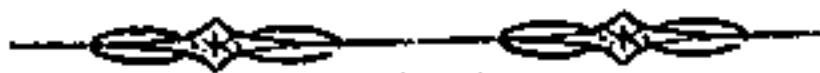
حضرت ابو محذورہ جُمحی رضی اللہ عنہ

(۱)

۸ھ ہجری میں رحمتِ عالم ﷺ غزوۂ حنین سے فارغ ہو کر واپس تشریف لا رہے تھے کہ راستے میں ایک مقام پر نماز کا وقت آ گیا۔ حضور ﷺ نے اپنے موذن کو اذان دینے کا حکم دیا۔ اتفاق سے وہاں مکہ کے چند شوخ نوجوان بھی موجود تھے جو ابھی تک شرفِ اسلام سے بہرہ ور نہیں ہوئے تھے۔ حضور ﷺ کے موذن اذان دے چکے تو وہ سب تمسخر کے طور پر اذان کی نقل اتارنے لگے۔ ان میں سے ایک نوجوان کی آواز بہت بلند اور دلکش تھی۔ حضور ﷺ نے ان سب نوجوانوں کو بُلا بھیجا۔ اور ان سے پوچھا تم میں سے کون ہے جو بلند آواز سے اذان کی نقل اتار رہا تھا۔ سب نے اس نوجوان کی طرف اشارہ کیا۔ حضور ﷺ نے اس نوجوان کو حکم دیا کہ میرے سامنے اذان دو، وہ مجبوراً حکم کی تعمیل کے لیے کھڑے ہو گئے لیکن اذان سے پورے واقفیت نہ تھی۔ اس لیے حضور ﷺ نے انہیں خود اذان بتانی شروع کی۔ انہوں نے لسانِ رسالت سے جو کلمات سُنے وہی دہرا دیئے۔ جوں جوں الفاظ دہراتے جاتے تھے، سینے سے کفر و شرک کا زنگ دُور ہوتا جاتا تھا۔ اذان ختم ہوئی اور ساتھ ہی ان کی قلبِ ماہیت ہو گئی۔ اسی وقت سچے دل سے کلمہ شہادت پڑھنے لگے۔ رحمتِ عالم ﷺ نے انہیں ایک تھیلی مرحمت فرمائی۔ جس میں کچھ چاندی تھی۔ پھر آپ ﷺ نے اپنا دستِ مبارک نوجوان کے ماتھے، چہرے، سینے اور پیٹ پر ناف کی جگہ تک پھیرا اور تین مرتبہ یہ دُعا دی: بارك الله فيك وبارك الله عليك

(اللہ مجھے برکت دے اور تجھ پر برکت نازل فرمائے)۔

حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ جمحی قرشی تھے۔

(۲)

حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کے نام میں بڑا اختلاف ہے۔ بعض نے ان کا نام سلمان بعض نے سلمہ، بعض نے اوس اور بعض نے سمرہ لکھا ہے۔ البتہ ان کی کنیت ابو محذورہ پر سب کا اتفاق ہے اور وہ تاریخ میں اپنی کنیت ہی سے مشہور ہیں۔ ان کا تعلق قریش کے خاندان بنو جمح سے تھا۔ سلسلہ نسب یہ ہے:

ابو محذورہ رضی اللہ عنہ بن معیر بن لوذان بن ربیعہ بن قریح بن سعد بن جمح۔

ابو محذورہ مکہ کے ان خوش باش نوجوانوں میں سے تھے جنہوں نے دعوتِ توحید کی طرف کبھی توجہ ہی نہیں کی تھی یہاں تک کہ مکہ پر اہلِ حق کا استیلا بھی انہیں راہِ راست پر نہ لا سکا تھا تاہم سرورِ کونین ﷺ کی شانِ رحمت تھی کہ آپ نے تقریباً سبھی اہلِ مکہ کو یہ کہہ کر معاف فرما دیا کہ جاؤ آج تم سے کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ جو لوگ اس وقت حضور ﷺ کے لطف و کرم سے مستفیض ہوئے وہ طلقا کہلاتے ہیں۔ سرورِ عالم ﷺ مکہ سے حنین کی طرف تشریف لے گئے تو آپ ﷺ کے ساتھ ایک خاصی بڑی تعداد طلقا کی بھی تھی۔ ان میں حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ اور ان کے نو یار دوست بھی شامل تھے۔ حضور ﷺ نے غزوۂ حنین سے فارغ ہو کر واپسی سفر کا آغاز فرمایا تو راستے میں وہ واقعہ پیش آیا جس کا ذکر اوپر آیا ہے۔ خود حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اذان کی نقل اتارنے پر رسول اللہ ﷺ نے مجھے اور میرے ساتھیوں کو بلا بھیجا۔ جب آپ ﷺ نے پوچھا کہ تم میں وہ کون ہے جس کی آواز بلند تھی تو سب نے میری طرف اشارہ کر دیا۔ چنانچہ حضور ﷺ نے اور سب کو تو چھوڑنے کا حکم دے دیا اور مجھے روک لیا۔ پھر آپ ﷺ نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ کھڑے ہو جاؤ اور پھر اذان دو۔ اس وقت میرا یہ حال تھا کہ رسول اللہ ﷺ سے اور آپ ﷺ نے جس اذان دینے کا حکم دیا تھا اس سے زیادہ مکروہ اور مبغوض میرے نزدیک کوئی شے نہیں تھی۔ طوعاً و کرہاً میں حکم کی

تعمیل کے لیے کھڑا ہو گیا۔ آپ ﷺ نے مجھے خود اذان بتائی۔ جب میں اذان ختم کر چکا تو آپ ﷺ نے ایک تھیلی میں سے کچھ چاندی مرحمت فرمائی اور میری پیشانی سے ناف تک اپنا دستِ مبارک پھیر کر تین دفعہ برکت کی دعا دی۔ حضور ﷺ کی دُعا اور دستِ مبارک کی برکت سے مجھے دولتِ ایمان نصیب ہو گئی۔ اور میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ مجھے مکہ معظمہ میں مسجدِ حرام کا موذن بنا دیجئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جاؤ اب مسجدِ حرام میں تم اذان دیا کرو۔

حافظ ابنِ عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے ''الاستیعاب'' میں لکھا ہے کہ اس کے بعد حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ مکہ جا کر مستقل اذان دینے کی خدمت انجام دینے لگے۔ مخدوم محمد ہاشم سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''بذل القوۃ'' میں بیان کیا ہے کہ جس وقت حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ اہلِ مکہ کے موذن مقرر ہوئے ان کی عمر سولہ برس کی تھی۔ وہ مدت العمر یہ خدمت انجام دیتے رہے اور ان کی وفات کے بعد یہ خدمت یا سعادت ان کی اولاد میں نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی رہی۔

(۳)

صحیح مسلم میں حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اذان پڑھنا مجھے رسول اللہ ﷺ نے خود سکھایا۔ آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہو:

اللّٰه اکبر، اللّٰه اکبر، اللّٰه اکبر، اللّٰه اکبر

اشهدان لا اله الا اللّٰه، اشهدان لا اله الا اللّٰه،

اشهدان محمداً رسول اللّٰه، اشهدان محمداً رسول اللّٰه،

حی علی الصلٰوة، حی علی الصّلٰوة، حی علی الفلاح، حی علی الفلاح

اللّٰه اکبر، اللّٰه اکبر، لا اله الا اللّٰه۔

اس روایت کی رُو سے حضور ﷺ نے حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ سے شہادت کے کلمے اشهدان لا اله الا اللّٰه اور اشهدان محمدًا رسول اللّٰه دو دو دفعہ کے

بجائے چار چار دفعہ کہلوائے۔ شارحینِ حدیث نے اس کی یہ توجیہہ وتوضیح کی ہے کہ حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کے دل پر اس وقت کفر وشرک کا زنگ چڑھا ہوا تھا اور وہ طوعاً وکرہاً اذان دینے کے لیے کھڑے ہوئے تھے۔ اس لیے حضور ﷺ نے ان کی اس خاص حالت کی وجہ سے شہادت کے یہ کلمے ان سے چار چار بار کہلوائے تاکہ اللہ تعالیٰ ان کلموں کو اپنے اس بندے کے دل میں خوب اچھی طرح اتار دے۔ ورنہ اور کسی مستند روایت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضور ﷺ نے اذان میں شہادت کے کلمے چار چار مرتبہ کہنے کا حکم دیا۔ تاہم حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں اکثر اہلِ سیَر نے لکھا ہے کہ وہ مکہ معظمہ میں ہمیشہ اسی طرح اذان دیتے رہے جس طرح حضور ﷺ نے ان کو سکھائی تھی یعنی وہ شہادت کے کلموں کو مذکورہ بالا ترتیب کے ساتھ ہر اذان میں ہمیشہ چار چار دفعہ کہتے تھے (اس کو اصطلاح میں ترجیع کہتے ہیں)۔

مولانا محمد منظور نعمانی نے ''معارف الحدیث'' میں لکھا ہے کہ ''اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ حضور ﷺ نے جس طرح ان سے اذان کہلوائی تھی اور جس کی برکت سے ان کی دین کی دولت ملی تھی وہ ایک عاشق کی طرح چاہتے تھے کہ ہو بہو وہی اذان ہمیشہ دیا کریں ورنہ وہ یہ ضرور جانتے ہوں گے کہ حضور ﷺ کے مؤذن بلال رضی اللہ عنہ کس طرح اذان دیتے ہیں۔''

(۴)

حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کی اذان اور خوش الحانی کو اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی کہ شعراء اس کی قسم کھاتے تھے۔ اس سلسلہ میں مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''سیر الصحابہ'' میں کسی قرشی شاعر کے یہ شعر نقل کیے ہیں:

اما و رب الکعبۃ المستورہ　　　وما تلا محمد من سورہ

پردہ میں چھپے ہوئے رب اور محمد ﷺ کی تلاوت کردہ سورتوں کی قسم

والنغمات من ابی محذورہ رضی اللہ عنہ　　　لا فعلن فعلہ مذکورہ

اور ابی محذورہ رضی اللہ عنہ کی خوش نوائی کی قسم میں یہ کلام ضرور کروں گا۔

حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ عمر بھر مکہ میں مقیم رہ کر اذان دیتے رہے اور یہیں ۵۸ھ میں پیکِ اجل کو لبیک کہا۔ انہوں نے اپنے پیچھے ایک لڑکا عبدالملک چھوڑا۔ حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ سے چند حدیثیں بھی مروی ہیں۔

حضرت محذورہ رضی اللہ عنہ اگرچہ بہت آخر میں اسلام لائے تھے لیکن سیّد المرسلین ﷺ کی دعائے برکت نے ان کے دل کو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی محبت سے معمور کر دیا تھا۔ حضور ﷺ سے ان کی محبت اور عقیدت کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے سر کے اگلے حصے (ناصیہ) کے بالوں کو کبھی نہیں کٹواتے تھے محض اس لیے کہ حضور ﷺ نے ان پر اپنا دستِ مبارک رکھا تھا۔ اسی طرح حضور ﷺ نے انہیں جس فریضے کی انجام دہی پر مامور فرمایا، زندگی کے آخری سانس تک اس کو نہایت استقلال سے ادا کرتے رہے۔ اذان میں ترجیع کو صرف اس لیے روا رکھتے رہے کہ حضور ﷺ نے ان سے یہ کلمات اسی طرح (چار مرتبہ) کہلوائے تھے۔ جس شخص کو خود آقائے دو جہاں، فخرِ موجودات رحمتِ عالم ﷺ نے خود مسجد الحرام کا مستقل موذن مقرر فرمایا ہو اس کے مقامِ رفیع کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ
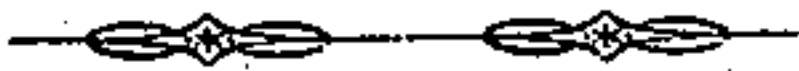
حضرت حارث بن ہشام مخزومی رضی اللہ عنہ

(۱)

ابو عبدالرحمٰن حارث بن ہشام (بن مغیرہ بن عبداللہ بن عمرو بن مخزوم) مخزومی مشہور دشمنِ اسلام ابوجہل کے حقیقی بھائی تھے، لیکن نیرنگِ زمانہ دیکھئے کہ ایک بھائی (ابو جہل) تو دنیا سے خائب و خاسر رخصت ہوا اور دوسرے بھائی (حارث رضی اللہ عنہ) کو اللہ تعالیٰ نے نہ صرف اسلام کی نعمت سے بہرہ ور کیا بلکہ رتبہ شہادت پر فائز کر کے روضہ رضواں کا مستحق بنا دیا۔

غ یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

اللہ تعالیٰ نے حضرت حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ کو نہایت کشادہ ظرف اور بلند حوصلہ عطا کیا تھا۔ وہ جود و سخا کے اعتبار سے اپنے قبیلے کے حاتم تھے اور صدہا غرباء و مساکین اُن کے خوانِ نعمت سے پرورش پاتے تھے۔ اپنی بے مثل فیاضی اور نرم دلی کے باوجود وہ فتح مکہ (۸ ھ) تک کفر و شرک کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے رہے۔ ان کی فیاضی اور غریب نوازی کو دیکھ کر رحمتِ عالم ﷺ چاہتے تھے کہ ایسا شخص ایمان کی دولت سے محروم نہ رہے۔ حافظ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے ''الاستیعاب'' میں لکھا ہے کہ ایک دن دربار رسالت (ﷺ) میں حضرت حارث رضی اللہ عنہ کا ذکر آیا تو حضورِ پُر نور ﷺ نے فرمایا، ''حارث سردار ہے، کیوں نہ ہو اس کا باپ بھی سردار تھا، کاش اسے خدا ہدایت کا راستہ دکھاتا۔'' شانِ الٰہی دیکھئے کہ محبوب ربّ العالمین کی زبانِ مبارک سے نکلے ہوئے یہ الفاظ ایک دن یوں پورے ہوئے کہ حضرت حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ ابد الآباد تک ملّتِ اسلامیہ کا سرمایہ افتخار بن گئے۔

(۲)

غزوۂ بدر (۲ھ) میں حضرت حارث رضی اللہ عنہ بھی اپنے بھائی ابو جہل کے ساتھ مسلمانوں سے لڑنے گئے۔ لیکن جب ابو جہل اور دوسرے بہت سے سردارانِ قریش ذِلّت کے ساتھ مارے گئے تو حارث رضی اللہ عنہ نے راہِ فرار اختیار کرنے میں ہی مصلحت سمجھی۔ ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ وہ غزوۂ اُحد میں بھی مشرکین کے ساتھ تھے۔

۸ھ میں مکہ معظمہ پر پرچمِ اسلام بلند ہوا اور رحمتِ عالم ﷺ اپنے جاں نثاروں کے ساتھ شہر میں داخل ہوئے تو حضرت حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ اور زہیر بن امیہ مخزومی (یا بروایتِ دیگر عبداللہ بن ابی ربیعہ مخزومی) نے حضور ﷺ کی چچا زاد بہن حضرت اُمِّ ہانی بنتِ ابی طالب رضی اللہ عنہا کے گھر پناہ لی۔ حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ کو معلوم ہوا تو وہ شمشیر بدست اپنی ہمشیرہ کے گھر پہنچے اور یہ کہہ کر دونوں مخزومیوں کو قتل کرنا چاہا کہ یہ واجب القتل ہیں۔ حضرت اُمِّ ہانی رضی اللہ عنہا نے کہا کہ انہوں نے میرے ہاں پناہ لی ہے، میں ان کو ہرگز قتل نہ ہونے دوں گی۔ پھر اپنا دروازہ بند کر لیا۔ اس کے بعد اُمِّ ہانی رضی اللہ عنہا دونوں مخزومیوں کو ساتھ لے کر بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئیں۔

سرورِ عالم ﷺ نے حضرت اُمِّ ہانی رضی اللہ عنہا کو دیکھ کر فرمایا:

''مرحباواہلاً یا اُمِّ ہانی، کیسے آنا ہوا؟''

حضرت اُمِّ ہانی رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: ''یارسول اللہ میں نے ان دونوں کو پناہ دی ہے اور علی رضی اللہ عنہ ان کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔''

حضور ﷺ نے فرمایا: جس کو تو نے پناہ دی، اس کو میں نے بھی پناہ دی۔''

حضرت حارث رضی اللہ عنہ اور زہیر رضی اللہ عنہ (یا عبداللہ) حضور ﷺ کی شانِ رحمت دیکھ کر دنگ رہ گئے اور اسی وقت صدقِ دل سے مسلمان ہو گئے۔

(۳)

قبولِ اسلام کے بعد حضرت حارث رضی اللہ عنہ کی زندگی کا وہ دَور شروع ہوا جس میں وہ

اسلام کے ایک جانباز سپاہی اور سرورِ کون و مکاں ﷺ کے نہایت مخلص جاں نثار نظر آتے ہیں۔ حافظ ابنِ عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حضرت حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ اُن مولفتہ القلوب اصحاب میں سے تھے جو سچے مسلمان تھے اور قبولِ اسلام کے بعد ان میں کبھی کوئی ایسی بات نہ دیکھی گئی جو اسلام کی سچی روح سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔

فتح مکہ کے بعد حُنین کا معرکہ پیش آیا تو حضرت حارث رضی اللہ عنہ اس میں بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ شریک ہوئے اور بڑی ثابت قدمی سے دادِ شجاعت دی۔ حضور ﷺ نے انہیں مالِ غنیمت سے سو اونٹ عطا کیے۔

غزوۂ حُنین کے بعد وہ مکہ واپس چلے گئے، لیکن بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوتے رہتے تھے۔ حافظ ابنِ عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے ''استیعاب'' میں ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حارث رضی اللہ عنہ بہت خاموش طبع و کم سخن آدمی تھے۔ ایک بار انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں عرض کی۔
''یارسول اللہ! کوئی ایسا عمل بتایئے جس پر میں ہمیشہ کاربند رہوں۔''

حضور ﷺ نے زبان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا ''اس کو قابو میں رکھو۔''

حضرت حارث رضی اللہ عنہ پہلے ہی کم سخن تھے انہوں نے فوراً کہا کہ یہ تو بہت آسان کام ہے۔ لیکن ان کا بیان ہے کہ جب میں نے اس پر عمل کرنا چاہا تو وہ نہایت مشکل معلوم ہوا۔

سنہ ۱۱ ہجری میں سرورِ عالم ﷺ نے وصال فرمایا تو حضرت حارث رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ ہی میں موجود تھے۔ انصار اور مہاجرین کے درمیان خلافت کے بارے میں اختلاف ہوا تو انہوں نے لوگوں کو حضور ﷺ کا قولِ مبارک ''الائمۃ من القریش'' یاد دلایا اور کہا کہ اگر حضور ﷺ نے یہ نہ فرمایا ہوتا تو ہم انصار کو بھی خلافت سے بے تعلق نہ کرتے۔ (اپنی قربانیوں اور سرفروشیوں کی بناء پر) وہ اس کے اہل ہیں، لیکن رسول اللہ ﷺ کے فرمان میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ اگر قریش میں صرف ایک شخص بھی باقی ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس کو

منصبِ خلافت پر فائز کرتا۔

(۴)

سیّدنا حضرت صِدّیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں شام سے معرکہ آرائیوں کا آغاز ہوا تو خلیفۃ الرسول (ﷺ) نے عرب کے تمام سرکردہ رؤسا کو جہاد میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ اس سلسلہ میں حضرت حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ کو بھی ایک خط بھیجا۔ انہیں یہ خط ملا تو انھوں نے صِدّیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی دعوت پر مردانہ وار لبیک کہا اور جہادِ فی سبیل اللہ کا عزم کر کے مکہ سے چل پڑے۔ لوگوں کو معلوم ہوا کہ حارث رضی اللہ عنہ مکہ سے جا رہے ہیں تو ان میں حشر برپا ہو گیا وہ ایک نہایت مخیّر شخص تھے اور صدہا غریبوں اور حاجت مندوں کی دستگیری کیا کرتے تھے۔ یہ سب لوگ آہ و فغاں کرتے ہوئے انہیں رخصت کرنے نکلے۔ جب حضرت حارث رضی اللہ عنہ بطحا کے بلند حصے پر پہنچے تو کچھ دیر کے لیے رُک گئے اس وقت سینکڑوں اشخاص ان کے گرداگرد کھڑے رو رہے تھے۔ حضرت حارث رضی اللہ عنہ نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''لوگو! خدا کی قسم میں تم سے ناراض ہو کر نہیں جا رہا اور نہ کسی ذاتی نفع کے حصول کے لیے تم سے جُدا ہو رہا ہوں۔ یہ بات بھی نہیں کہ ایک شہر کو چھوڑ کر دوسرا شہر اختیار کر رہا ہوں۔ اصل میں یہ دین کا معاملہ ہے۔ جہادِ فی سبیل اللہ ایک ایسا شرف ہے جس کو اس سے پہلے بہت سے ایسے لوگ حاصل کر چکے ہیں جو نہ حسب و نسب کے اعتبار سے امتیازی حیثیت رکھتے تھے اور نہ مال و منال کے لحاظ سے۔ اب اگر اللہ نے ہمیں اس شرف کو حاصل کرنے کا موقع عطا کیا ہے تو ہمیں کسی صورت میں بھی اس کو نہیں کھونا چاہیے۔ خدا کی قسم اگر مکہ کے تمام پہاڑ سونے کے ہو جائیں اور ہم اس تمام سونے کو راہِ خدا میں لٹا دیں تو جہادِ فی سبیل اللہ کے ایک دن کے برابر بھی اجر نہیں پا سکتے۔ اگر دنیا میں ہمیں ان لوگوں کے برابر فضیلت نہیں ملی تو کم از کم آخرت میں تو

ان کے شریک ہو جائیں، مکہ کو میں اللہ کی خاطر چھوڑ رہا ہوں اور راہِ حق میں لڑنے کے لیے شام کی طرف جا رہا ہوں۔''

یہ کہہ کر ان سب کو رخصت کیا اور لشکرِ مجاہدین میں شامل ہو کر شام جا پہنچے۔

(۵)

شام میں مسلمانوں کے رومیوں سے متعدد خونریز معرکے ہوئے۔ ان میں سے کئی معرکوں میں حضرت حارث رضی اللہ عنہ نے سرفروشانہ حصہ لیا اور اپنی شجاعت کی دھاک بٹھا دی۔ مورخین نے ان معرکوں میں فحل اور اجنادین کا نام خصوصیت سے لیا ہے ان کے بعد یرموک کی خونریز لڑائی پیش آئی۔ اس میں ہرقل نے چند ہزار فرزندانِ توحید کے مقابلے میں لاکھوں رومی جنگجو لا کھڑے کیے تھے، لیکن مسلمانوں نے تو اپنی جانیں راہِ خدا میں بیچ رکھی تھیں، وہ مطلق ہراساں نہ ہوئے اور اللہ کے بھروسے پر کفر کی مہیب طاغوتی قوت سے بھڑ گئے۔ مسلمان سرفروشوں میں حضرت حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ عین اس وقت جب لڑائی کی آگ پوری شدت سے بھڑک رہی تھی حضرت حارث رضی اللہ عنہ شدید زخمی ہو کر زمین پر گر گئے۔ دوسرے مجاہدین نے رومیوں کو پیچھے دھکیل دیا۔ ادھر حضرت حارث رضی اللہ عنہ پر نزع کا عالم طاری ہو گیا اس وقت انہیں شدید پیاس محسوس ہوئی اور منہ سے ''پانی'' کا لفظ نکلا۔ ایک مجاہد دوڑ کر پانی لائے۔ پیالہ ابھی منہ سے لگایا ہی تھا کہ ایک دوسرے جاں بلب زخمی مجاہد کے منہ سے ''پانی'' نکلا۔ حضرت حارث رضی اللہ عنہ نے پیالہ منہ سے ہٹا دیا اور اشارہ کیا کہ اس بھائی کے پاس پانی لے جاؤ۔ جب پانی ان کے پاس پہنچا تو ان کے پاس ایک اور زخمی مجاہد جان کنی کی حالت میں پانی مانگ رہے تھے۔ دوسرے مجاہد نے بھی پانی پینا گوارا نہ کیا اور اپنے قریب کے زخمی مجاہد کی طرف اشارہ کیا۔ ان کے پاس پانی پہنچا تو وہ واصل بحق ہو چکے تھے۔ دوسرے زخمی اور حضرت حارث رضی اللہ عنہ کے پاس دوبارہ پانی لایا گیا تو وہ دونوں بھی دم توڑ چکے تھے اور اپنے جذبہ ایثار و اخوت سے اپنے آپ کو حوضِ کوثر کے پانی کا مستحق بنا لیا تھا۔

حافظ ابنِ عبد البر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ کو خیار اور فضلاء صحابہ میں شمار کیا ہے۔ ان کی اہلیہ حضرت فاطمہ بنتِ ولید رضی اللہ عنہا (حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سیف اللہ کی ہمشیرہ) اور بیٹی اُمِ حکیم رضی اللہ عنہا کا شمار جلیل القدر صحابیات میں ہوتا ہے۔ ایک فرزند عبد الرحمٰن تھے جو علم و فضل کے اعتبار سے امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ حضرت حارث رضی اللہ عنہ کی نسل انہی سے چلی اور اللہ نے اس میں بڑی برکت دی۔

حضرت حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ اگرچہ متاخرین صحابہ میں سے ہیں، لیکن انھوں نے اپنے حسنِ عمل سے جس طرح گزشتہ زندگی کی تلافی کی، اس نے انہیں بقائے دوام کے دربار میں قابلِ رشک مقام عطا کر دیا۔ یہ اللہ کی دین ہے جسے چاہے اپنی رحمت سے نوازے اور جسے چاہے محروم کر دے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ
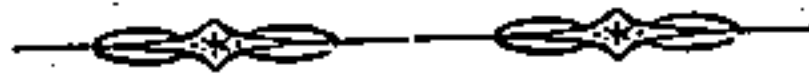
حضرت نوفل بن حارث ہاشمی رضی اللہ عنہ

(۱)

غزوۂ بدر میں کفر بڑے ساز و سامان کے ساتھ حق پر حملہ آور ہوا لیکن خدائے بزرگ و برتر نے اس کو خائب و خاسر کیا اور حق کو غالب و سر بلند کیا۔ مشرکین کے ستر آدمی میدانِ جنگ میں کھیت رہے اور تقریباً اتنی ہی تعداد کو مسلمانوں نے قیدی بنالیا۔ یہ قیدی جب سرورِ عالم ﷺ کے سامنے پیش کیے گئے تو حضور ﷺ نے دیکھا کہ ایک قیدی جس کے چہرے پر شرافت اور نجابت کے آثار نمایاں ہیں، یوں سر جھکائے کھڑا ہے گویا سخت نادم ہے اور آپ ﷺ کی نگاہوں سے بچنا چاہتا ہے۔ حضور ﷺ نے اس سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''بھئی تم فدیہ دے کر رہا کیوں نہیں ہو جاتے۔''

قیدی نے یاس بھرے لہجے میں کہا: ''میرے پاس کیا ہے کہ فدیہ ادا کر سکوں؟''

حضور ﷺ نے فرمایا: ''جدّہ والے نیزے فدیہ میں نہیں دے سکتے؟''

زبانِ رسالت ﷺ سے یہ الفاظ سُن کر قیدی پر سکتہ طاری ہو گیا۔ اس کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ ان نیزوں کا اس کے سوا کسی اور کو بھی علم ہو سکتا ہے۔ اس کے دل نے بے اختیار گواہی دی کہ محمد ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں جنہیں ربّ قدیر غیبی اطلاعوں سے نوازتا ہے۔ قیدی نے اسی وقت خدا کی وحدانیت اور حضور ﷺ کی رسالت کا اقرار کیا، نیزے منگوا کر فدیہ میں پیش کر دیئے اور اپنے اخلاص فی الدین کا اظہار ان اشعار میں کیا:

الیکم الیکم اننی لست منکم

تبرات من دین الشیوخ الاکابر

(دور ہو دور ہو میں تمہاری جماعت میں داخل نہیں...... میں قریش کے شیوخ اور اکابر کے دین سے بیزار ہوں)

شهدت على ان النبى محمد ﷺ
اتى بالهدىٰ من ربه و البصائر

(میں نے شہادت دی ہے کہ محمد ﷺ نبی ہیں اور وہ اللہ کی طرف سے ہدایت اور بصیرت لائے ہیں)

وان رسول الله يدعوا الى التقىٰ
وان رسول الله ليس بشاعر

(اور رسول اللہ پرہیز گاری کی طرف بلاتے ہیں اور رسول اللہ شاعر نہیں ہیں)

علىٰ ذلك احيىٰ ثم ابعث موقتًا
و اثوى عليه ميتًا فى المقابر

(میں اسلام پر ہی زندہ رہوں گا اور اسی پر قبر کے اندر موت کی حالت میں سوؤں گا اور پھر اسی پر قیامت کے دن اٹھوں گا)

یہ صاحب جن کی زندگی میں لسانِ رسالت سے نکلنے والے چند الفاظ سے انقلاب آ گیا اور جن کے جوشِ ایمان نے ان کو سیّد المرسلین ﷺ کا محبوب بنا دیا، حضرت نوفل بن حارث رضی اللہ عنہ ہاشمی تھے۔

(۲)

سیّدنا حضرت ابوحارث نوفل بن حارث رضی اللہ عنہ دودمانِ ہاشمی کے چشم و چراغ تھے اور سرورِ عالم ﷺ کے چچازاد بھائی تھے۔ نسب نامہ یہ ہے:

نوفل رضی اللہ عنہ بن حارث بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی ماں کا نام غزیہ بنتِ قیس تھا اور وہ بنوفہر سے تعلق رکھتی تھیں۔

حضرت نوفل رضی اللہ عنہ اگرچہ عہد رسالت کے مکّی دَور میں قبولِ اسلام کی سعادت حاصل نہ کرسکے لیکن ان کے دل میں ہمیشہ سرورِ عالم ﷺ کی محبت موجزن رہی۔ انہوں نے نہ کبھی حضور ﷺ کی مخالفت کی اور نہ کبھی حضور ﷺ کو ستایا تا آنکہ آپ ﷺ ہجرت کرکے مدینہ تشریف لے گئے۔ غزوہ بدر میں لشکرِ کفار میں شامل ہونا انہیں ناپسند تھا لیکن مشرکین نے اتنا مجبور کیا کہ وہ بادلِ ناخواستہ ان کے ساتھ ہو لیے۔ اس وقت بھی ان کی زبان پر اس قسم کے شعر جاری تھے:

حرام علی حرب احمد ﷺ انني　　　ارىٰ احمدًا مني قريبًا او اصره

میرے لیے احمد ﷺ سے جنگ کرنا حرام ہے　　　کیونکہ احمد ﷺ میرے قریبی عزیز ہیں

غزوہ بدر میں وہ مسلمانوں کے ہاتھ اسیر ہو گئے (ان کو حضرت عبید رضی اللہ عنہ بن اوس الظفری نے قید کیا) اور ان کی یہی اسیری ان کے ایمان لانے کا موجب بن گئی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت نوفل رضی اللہ عنہ ان ہاشمیوں میں جو مشرّف بہ اسلام ہوئے سب سے مُسِن تھے۔ شرفِ ایمان سے بہرہ ور ہونے کے بعد حضرت نوفل رضی اللہ عنہ مکہ معظمہ واپس آئے۔ فتح مکہ سے کچھ مدّت پہلے اپنے چھوٹے بھائی ربیعہ بن حارث رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہجرت کے ارادہ سے مدینہ روانہ ہوئے۔ علاّمہ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ ابواء پہنچ کر حضرت ربیعہ رضی اللہ عنہ نے مکہ لوٹ جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ حضرت نوفل رضی اللہ عنہ کی غیرتِ ایمانی نے یہ گوارا نہ کیا اور انہوں نے بھائی سے کہا، تم کفر و شرک کی اس آماجگاہ میں واپس جانا چاہتے ہو جہاں کے رہنے والے خدا کے سچّے رسول ﷺ کو جھٹلاتے ہیں اور آپ ﷺ پر تلوار اٹھاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو سرفراز کیا ہے اور اُن ﷺ پر ایمان لانے والے روز بروز بڑھتے جاتے ہیں بہتر ہے کہ میرے ساتھ چلو۔ غرض دونوں بھائی ہجرت کر کے مدینہ پہنچ گئے۔ سرورِ عالم ﷺ کو ان دونوں بھائیوں کے مدینہ پہنچنے پر بہت خوشی ہوئی اور آپ ﷺ نے انہیں اپنی سرپرستی میں لے لیا۔

ابن اثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ''اُسد الغابہ'' میں لکھا ہے کہ عمِ رسول ﷺ حضرت عباس رضی اللہ عنہ بن عبدالمطلب، حضرت نوفل رضی اللہ عنہ کے بھی چچا تھے۔ وہ عمر میں بھتیجے (حضرت نوفل رضی اللہ عنہ) سے کئی برس چھوٹے تھے تاہم چچا اور بھتیجے میں دلی لگاؤ تھا، حضور ﷺ کو ان دونوں کے تعلقات کا علم تھا چنانچہ جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی ہجرت کر کے مدینہ آ گئے تو حضور ﷺ نے حضرت نوفل رضی اللہ عنہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے درمیان مواخات قائم کرا دی اور رہنے کے لیے دو مکان مرحمت فرمائے۔ ایک ثنیۃ الوداع کے راستہ پر بازار میں اور دوسرا مسجدِ نبوی سے متصل رحبۃ القضاء میں۔

امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے ''مستدرک'' میں بیان کیا ہے کہ حضرت نوفل رضی اللہ عنہ کی معاشی حالت کمزور تھی اس لیے آقائے دوعالم ﷺ بسا اوقات ان کی خبر گیری فرمایا کرتے تھے۔ ان کو نکاح کی خواہش ہوئی تو حضور ﷺ نے ایک خاتون سے شادی کرا دی۔ ایک دفعہ تنگدستی اتنی غالب ہو گئی کہ گھر میں کھانے پینے کی کوئی چیز بھی نہیں تھی۔ حضور ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے ذریعے اپنی زرہ ایک یہودی کے پاس رہن رکھوائی اور اس کے عوض تیس صاع جو لے کر حضرت نوفل رضی اللہ عنہ کو عطا فرمائے۔

(۳)

ہجرت کے بعد حضرت نوفل رضی اللہ عنہ نے فتح مکہ کے موقع پر سرورِ عالم ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔ اس کے بعد غزوۂ حنین میں جانبازانہ شریک ہوئے، وہ ان اصحاب میں شامل تھے جو بنو ہوازن کی بے پناہ تیراندازی کے وقت بھی میدانِ رزم میں ثابت قدم رہے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت نوفل رضی اللہ عنہ کے پاس تین ہزار نیزوں کا ذخیرہ تھا۔ انہوں نے غزوۂ حنین کے موقع پر یہ تمام نیزے سرورِ عالم ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیئے۔ حضور ﷺ ان کے اس ایثار اور قربانی سے بہت خوش ہوئے اور یہ نیزے مجاہدین میں تقسیم کر دیئے۔ پھر حضرت نوفل رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''میں

دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے نیزے مشرکین کی پیٹھ توڑ رہے ہیں۔"

سرورِ عالم ﷺ کے وصال کے وقت حضرت نوفل رضی اللہ عنہ بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ اس لیے عہدِ صدیقی کی کسی مہم میں شریک نہ ہو سکے۔ انہوں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دوسرے سال پیکِ اجل کو لبیک کہا۔ خود امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع میں سپردِ خاک کیا۔

حضرت نوفل رضی اللہ عنہ نے اپنے پیچھے پانچ بیٹے چھوڑے عبداللہ، ربیعہ، مغیرہ، عبدالرحمٰن اور سعید، اللہ نے ان کی نسل میں بڑی برکت دی اور وہ مدینہ منورّہ، بصرہ اور بغداد میں بہت پھیلی۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ
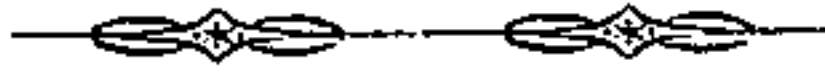
حضرت عبداللہ بن ارقم زہری رضی اللہ عنہ

(۱)

فتح مکہ (۸ ہجری) کے بعد کا ذکر ہے کہ ایک مرتبہ رحمتِ عالم ﷺ کو ایک خط موصول ہوا۔ اُس کا مضمون اس قسم کا تھا کہ جواب لکھنے کے لیے کسی معاملہ فہم اور زیرک شخص کی ضرورت تھی۔ بارگاہِ رسالت ﷺ میں چند صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حاضر تھے۔ حضور ﷺ نے اُن سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''اس خط کا جواب کون لکھے گا؟'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر ان میں سے ایک صاحب نے کھڑے ہو کر عرض کیا:

''یارسول اللہ! یہ خدمت مجھے تفویض فرمایئے میں اس کا مناسبت جواب لکھنے کی کوشش کروں گا۔''

ارشاد ہوا: ''اچھا تم ہی اس کا جواب لکھو۔''

ان صاحب نے جواب لکھ کر حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیا تو آپ ﷺ کو بہت پسند آیا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے بھی اس جواب کے طرزِ نگارش اور مضمون کی تعریف کی۔ سرورِ عالم ﷺ نے اسی دن سے ان صاحب کو اپنا کاتب خاص مقرر فرما دیا۔ نوشت وخواند اور مراسلات کی کتابت میں خداداد ملکہ رکھنے والے یہ صاحب حضرت عبداللہ بن ارقم رضی اللہ عنہ تھے۔

(۲)

حضرت عبداللہ بن ارقم رضی اللہ عنہ کو دربارِ نبوّت میں خاص رازدان کا رتبہ حاصل تھا اور سرورِ عالم ﷺ ان پر بہت اعتماد فرماتے تھے۔ ان کا تعلق قریش کے خاندانِ زُہرہ سے

تھا۔نسب نامہ یہ ہے:

عبداللہ رضی اللہ عنہ بن ارقم بن عبدِ یغوث بن عبدِ مناف بن زُہرہ بن کلاب بن مُرّہ

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے والد ارقم حضور ﷺ کے ماموں زاد بھائی تھے۔اس رشتہ سے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے بھتیجے ہوتے تھے۔وہ بڑے ذہین وفریس آدمی تھے،لیکن بعض وجوہ کی بناء پر فتح مکہ سے پہلے حلقہ بگوشِ اسلام نہ ہو سکے۔اس کے بعد انہوں نے اپنے آپ کو یکسر خدمتِ نبوی ﷺ کے لیے وقف کر دیا اور مدینہ منوّرہ میں مستقل اقامت اختیار کر لی۔تحریر و کتابت میں مہارت اور دوسرے اوصاف ومحاسن کی بدولت انہوں نے بہت جلد بارگاہِ نبوی ﷺ میں درجہ تقرب حاصل کر لیا۔حضور ﷺ کو جب کبھی سلاطین وامراء کو خطوط بھیجنے کی ضرورت پیش آتی آپ ﷺ یہ خطوط حضرت عبداللہ بن ارقم رضی اللہ عنہ ہی سے لکھواتے۔

''مستدرکِ حاکم'' میں ہے کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو اپنی ذمہ داری کا اس قدر احساس تھا کہ انتہائی پوشیدہ خطوط بھی ان کی تحویل میں رہتے تھے اور وہ ان کو حضور ﷺ کے حکم کے بغیر کبھی کھول کر نہ دیکھتے تھے۔اسی دیانت داری اور احساسِ فرض کی بدولت ہی وہ سیّد المرسلین ﷺ کے نہایت محبوب اور معتمد صحابہ رضی اللہ عنہم کی صف میں شامل ہو گئے تھے۔حضور ﷺ کے وصال تک وہ آپ ﷺ کے تمام مراسلات کی کتابت کا فرض نہایت حسن وخوبی سے انجام دیتے رہے۔

(۳)

۱۱ھ ہجری میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سریر آرائے خلافت ہوئے تو انہوں نے بھی حضرت عبداللہ بن ارقم رضی اللہ عنہ کو کتابتِ مراسلات کی خدمت میں بحال رکھا۔حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت آیا تو انہوں نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو کتابت کی خدمت کے علاوہ بیت المال کی نگرانی کا کام بھی سونپ دیا۔مزید براں اُن کو اپنی مجلسِ شوریٰ میں بھی شامل کر لیا۔علامہ ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ''اُسد الغابہ'' میں لکھا ہے کہ حضرت عمر

فاروق رضی اللہ عنہ ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ان سے مخاطب ہو کر اپنی خوشنودی کا اظہار بدیں الفاظ کیا کہ عبداللہ اگر تم کو سبقت فی الاسلام کا شرف حاصل ہوتا تو میں کسی کو تم پر ترجیح نہ دیتا۔

حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ مسند نشینِ خلافت ہوئے تو حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ حسبِ سابق کتابت اور بیت المال کے خزانچی کے فرائض انجام دیتے رہے، لیکن کچھ عرصہ بعد ان عہدوں سے استعفادے دیا۔ اربابِ سِیَر نے اُن کے مستعفی ہونے کی وجوہ بیان نہیں کیں، لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ قواء مضمحل ہو گئے تھے یا آنکھیں کمزور ہو گئی تھیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کا استعفا منظور کر لیا اور ساتھ ہی باختلافِ روایت تیس ہزار یا تین لاکھ درہم کی رقم ان کی خدمات کے معاوضہ کے طور پر پیش کی، لیکن حضرت عبداللہ بن ارقم رضی اللہ عنہ کی شانِ استغناء دیکھئے کہ انہوں نے یہ خطیر رقم قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں یہ خدمات محض رضائے الٰہی کی خاطر انجام دیتا رہا اور اللہ تعالیٰ ہی سے اس کا اجر چاہتا ہوں۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ آخری عمر میں آنکھوں سے معذور ہو گئے تھے۔ اسی حالت میں پیغامِ اجل آ پہنچا اور ۳۵ ہجری میں انہوں نے سفرِ آخرت اختیار کیا۔

حضرت عروہ رحمۃ اللہ علیہ اور اسلم عدوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے چند حدیثیں بھی روایت کی ہیں۔ ازواج واولاد کے بارے میں کتبِ سِیَر خاموش ہیں۔

ذہانت وفراست، دیانت وامانت، خدا ترسی اور استغنا حضرت عبداللہ بن ارقم رضی اللہ عنہ کی کتابِ زندگی کے درخشاں ابواب ہیں۔ سیّدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے عبداللہ بن ارقم رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر کسی کو خدا سے ڈرنے والا نہیں دیکھا۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

حضرت ابُو محجن ثقفی رضی اللہ عنہ

(۱)

طائف اپنی سرسبزی، شادابی، پانی کی فراوانی اور خوشگوار آب وہوا کی بدولت حجاز کی جنت کہلاتا ہے۔ رحمتِ عالم ﷺ کی بعثت کے وقت یہ شہر عرب کے نامور قبیلے بنوثقیف کا مسکن تھا۔ یہ لوگ سرسبز پہاڑوں کے دامن میں حدِ نظر تک پھیلے ہوئے انگوروں کے باغات کے مالک تھے اور بڑے آسودہ حال اور رنگین مزاج تھے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ بڑے شجاع اور جنگجو بھی تھے۔

سنہ ۱۰ بعدِ بعثت میں رحمتِ عالم ﷺ ان کو دعوتِ توحید دینے طائف تشریف لائے تو انہوں نے نشہ پندار میں نہ صرف دعوتِ حق کو رَدّ کر دیا بلکہ محسنِ انسانیت ﷺ سے بھی نہایت ناروا سلوک کیا۔ اس واقعہ کے بارہ سال بعد ۹ ہجری میں چشمِ فلک نے یہ تحیّر خیز منظر دیکھا کہ یہی متمرّد اور سرکش بنوثقیف خود بخود بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوتے ہیں اور اسلام کے جانباز سپاہی بن جاتے ہیں۔ سرورِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد جب فتنہ ردّہ نے قریب قریب سارے عرب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو قریشِ مکہ اور انصارِ مدینہ کے علاوہ یہ طائف کے بنوثقیف ہی تھے جو مکمل طور پر چٹان کی طرح اسلام پر ثابت قدم رہے۔ اس کے بعد ایران اور شام سے کشمکش کا آغاز ہوا تو بنوثقیف کے جوانمردوں نے میدانِ جہاد میں اپنی سرفروشیوں سے ایسی داستان رقم کی جو رہتی دنیا تک مسلمانوں کے خون کو گرماتی رہے گی۔

(۲)

بنوثقیف کے جن جیالوں نے تاریخ میں بڑا نام پایا ان میں سے ایک مجاہد ابو محجن

ثقفی رضی اللہ عنہ ہیں۔ ان کا اصل نام باختلافِ روایت عمرو یا عبداللہ یا مالک تھا، البتہ ان کی کنیت ابومحجن پر سب کا اتفاق ہے۔ یہ کنیت اتنی مشہور ہوئی کہ لوگوں کو ان کا اصلی نام بھول گیا۔ سلسلہ نسب یہ ہے:

ابومحجن رضی اللہ عنہ بن حبیب بن عمرو بن عمیر بن عوف بن عقدہ بن غیرہ بن عوف ثقفی

ظہورِ اسلام کے وقت حضرت ابومحجن رضی اللہ عنہ کا شمار بنوثقیف کے نامور بہادروں میں ہوتا تھا۔ وہ صرف ایک شجاع، جنگجو اور فیاض شخص ہی نہیں تھے بلکہ ایک بلند پایہ شاعر بھی تھے اور ان کی شجاعت وشہامت اور شاعری کی شہرت عرب میں دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ شمشیر زنی، نیزہ بازی، قدر اندازی اور شہسواری میں اپنی مثال آپ تھے۔ میدانِ جنگ میں وہ حریف پر جس شانِ تہوّر اور چابکدستی سے حملہ آور ہوتے تھے وہ انہی کے ساتھ مخصوص تھی ان کی شہسواری اور حملے کے خاص انداز کو دیکھ کر لوگ ہزاروں کے ہجوم میں بھی پہچان جاتے تھے کہ یہ ابومحجن رضی اللہ عنہ ہیں۔ بنوثقیف کے یہ مردِ میدان قبولِ اسلام سے پہلے اپنے قبیلے کے ساتھ مل کر اسلام کی مخالفت میں پیش پیش رہے۔ غزوۂ حنین کے بعد سرورِ عالم ﷺ نے طائف کا محاصرہ کیا تو ابومحجن رضی اللہ عنہ نے دوسرے اہلِ طائف کی طرح شہر کی مدافعت میں بڑھ چڑھ کر ہر روز حصہ لیا اور دورانِ محاصرہ میں جب کبھی مسلمان جانبازوں نے شہر پر ہلّہ بولا۔ انہوں نے ان پر تیروں اور پتھروں کا مینہ برسا دیا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ محاصرہ کے دوران میں ایک دن ابومحجن ہی کے تیر سے زخمی ہو گئے اور تیر کا یہی زخم بعد میں ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔

۹ھ ہجری میں اپنے قبیلہ کے ساتھ حضرت ابومحجن رضی اللہ عنہ بھی شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہو گئے۔ چونکہ وہ بہت آخر میں ایمان لائے اس لیے عہدِ رسالت میں انھیں کسی غزوہ میں شریک ہونے کا موقع نہ ملا۔ جہاد فی سبیل اللہ کے سلسلے میں ان کا نام سب سے پہلے عہدِ فاروقی میں منظرِ عام پر آتا ہے۔ ابوحنیفہ الدینوری نے ''اخبار الطوال'' میں لکھا ہے

کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کی ابتداء میں حضرت ابوعبید ثقفی رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں جو لشکر عراقِ عرب بھیجا، حضرت ابومحجن رضی اللہ عنہ بھی اس میں شامل تھے اور معرکہ جسر میں اسلامی لشکر کے رسالے کی قیادت کر رہے تھے اس لڑائی میں ان کے بھائی قیس بن حبیب رضی اللہ عنہ بھی ان کے ساتھ تھے۔ قیس رضی اللہ عنہ نے تو اسی معرکہ میں شہادت پائی البتہ ابومحجن رضی اللہ عنہ بچ گئے۔ قیاس یہ ہے کہ بعد میں انہوں نے بویب کے معرکے میں شریک ہو کر دادِ شجاعت دی جو معرکہ جسر کا جواب تھا۔

اس کے بعد ان کا نام پھر پس منظر میں چلا گیا یہاں تک کہ اس خونریز لڑائی کا آغاز ہو گیا جس نے بڑی حد تک ایران کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ یہ جنگِ قادِسیّہ تھی جو حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی قیادت میں ایران کے خلاف لڑی گئی۔

(۳)

اہلِ سیَر کا بیان ہے کہ جس زمانے میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ قادِسیّہ کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے۔ حضرت ابومحجن ثقفی رضی اللہ عنہ امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حکم سے جزیرہ حضوضہ میں نظر بند تھے انھیں کس جرم میں جلاوطنی اور قید و بند کی سزا دی گئی تھی؟ اس کے بارے میں عام روایات یہی ہیں کہ وہ بار بار شراب نوشی کی جرم کے مرتکب ہوئے تھے۔ مورخین نے یہ بات تواتر کے ساتھ بیان کی ہے کہ اہلِ طائف انگوروں کی کثرت کی وجہ سے شراب کے بڑے رسیا تھے قبولِ اسلام کے بعد انھوں نے اس قبیح عادت کو ترک کر دیا تھا لیکن پھر بھی کبھی کبھار کوئی ثقفی پرانی عادت کا اعادہ کر لیتا تھا۔ اس کی یہ حرکت ظاہر ہو جاتی تو اس پر حد جاری ہوتی تھی (یعنی اس کو کوڑے لگتے تھے)

حافظ ابن حجر رضی اللہ عنہ، حافظ ابنِ عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ، امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ اور بعض دوسرے اربابِ سیَر کے بیان کے مطابق حضرت ابومحجن رضی اللہ عنہ بھی ایسے ہی لوگوں میں شامل تھے۔ ان پر کئی بار شراب نوشی کے جرم میں حد جاری کی گئی۔ آخر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تنگ آ کر انہیں جزیرہ حضوضہ میں قید کر دیا۔ حضرت ابومحجن رضی اللہ عنہ نے حضوضہ میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ

کی لشکر کشی کا حال سنا تو وہ راہِ حق میں لڑنے کے لیے بے تاب ہو گئے اور کسی طریقے سے پہرے داروں کی نگرانی سے بھاگ کر سیدھے اسلامی لشکر میں جا شامل ہوئے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو حدودِ مملکت میں ہونے والے تمام واقعات کی خبر بہت جلد مل جایا کرتی تھی۔ انھیں حضرت ابو محجن رضی اللہ عنہ کے فرار اور اسلامی لشکر میں شامل ہونے کا حال معلوم ہوا تو انہوں نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو لکھ بھیجا کہ ابو محجن رضی اللہ عنہ کو گرفتار کر کے زندان میں ڈال دیں۔ اس وقت حضرت سعد رضی اللہ عنہ قادسیہ پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے حکم کی تعمیل میں حضرت ابو محجن رضی اللہ عنہ کو گرفتار کر لیا اور ان کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر اپنی اقامت گاہ سے متصل ایک پرانے محل کے کمرے میں قید کر دیا۔

(۴)

قادسیہ کی خونریز لڑائی کا آغاز ہوا۔ اور مجاہدینِ اسلام کے نعرہ ہائے تکبیر، تلواروں کی جھنکار، گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور سرفروشوں کے رجز بار بار حضرت ابو محجن رضی اللہ عنہ کے کانوں سے ٹکرائے تو جوشِ شجاعت نے ان کو شعلہ جوالہ بنا دیا، یہی چاہتے تھے کہ پَر لگ جائیں اور اڑ کر میدانِ جہاد میں جا پہنچیں لیکن مجبور تھے۔ پاؤں کی بیڑیوں اور قید خانے کی مضبوط دیواروں نے ان کا راستہ روک رکھا تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ وہ گھسٹتے گھسٹتے قید خانے کی کھڑکی کے پاس گئے اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ وہ انہیں لڑائی میں شریک ہونے کی اجازت دے دیں لیکن انھوں نے حضرت ابو محجن رضی اللہ عنہ کی درخواست منظور نہ کی اور وہ بصد حسرت ویاس واپس آ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ لڑائی کا پہلا دن تو جوں توں کر کے گزر گیا۔ دوسرے دن لڑائی کا آغاز ہوا اور دشمن نے مسلمانوں پر شدید دباؤ ڈالا تو قید خانے کے دریچے سے یہ منظر دیکھ کر حضرت ابو محجن رضی اللہ عنہ کی قوتِ برداشت بالکل جواب دے گئی۔ کسی طرح آواز دے کر حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی اہلیہ سلمیٰ بنتِ حفص کو کھڑکی کے قریب بلایا اور نہایت لجاجت کے ساتھ ان سے درخواست کی کہ میری بیڑیاں کھول دو اور ایک گھوڑا ہتھیاروں سمیت مجھے دے دو پھر دیکھو کہ میں اللہ

کے دشمنوں کے مقابلے میں کیا کرتا ہوں۔ اگر زندہ رہا تو خدا کی قسم واپس آ کر خود بیڑیاں پہن لوں گا۔ سلمٰی نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے ڈر سے حضرت ابو محجن رضی اللہ عنہ کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ اس پر وہ مایوس ہو کر اپنی کوٹھڑی کی طرف چلے اور بڑی حسرت کے ساتھ یہ اشعار پڑھنے لگے۔ ساتھ ہی جوشِ شجاعت میں اپنے ہونٹ دانتوں میں دباتے تھے اور رانوں پر ہاتھ مارتے تھے۔

کفیٰ حزناً ان تردی الخیل بالقنا
و اترک مشدود اَعلیّ و ثاقِیا

''اس سے بڑھ کر اور کیا غم ہوگا کہ سوار نیزے لے کر جنگ میں شریک ہیں اور میں زنجیروں میں جکڑا پڑا ہوں۔''

اذاقمت عنانی الحدید و اُغلقت
مصاریع دونی قدتصم المنا دیا

''کھڑا ہونا چاہتا ہوں تو زنجیریں نہیں اٹھنے دیتیں اور دروازے اس طرح بند کر دیئے جاتے ہیں کہ پکارنے والا پکارتے پکارتے تھک جاتا ہے۔''

و قد کنت ذا اھلٍ کثیرۃٍ واخوۃٍ
فقد ترکونی واحدًا لا اخالیا

''میرے بہت سے عزیز اور بھائی ہیں لیکن ان سب نے مجھے تنہا چھوڑ دیا ہے اور کسی کو میرا خیال نہیں۔''

و اللہ عھد لا اخیس بعھدہٖ
لئن فرجت ان لا ازور الحوانیا

''میں نے بارگاہِ الٰہی میں عہد کیا ہے اور میں اس عہد کو نہیں توڑوں گا کہ میخانوں کے دروازے مجھ پر کھول بھی دیئے جائیں تو بھی میں ادھر کا رُخ نہ کروں گا۔''

یہ اشعار سن کر سلمٰی پر رقت طاری ہوگئی اور ان کے دل نے گوارانہ کیا کہ بنوثقیف کے اس جوانمرد کو قید خانے میں ایڑیاں رگڑنے کے لیے چھوڑ دیں۔ وہ اسی وقت اپنی باندی کو ساتھ لے کر قید خانے میں گئیں اور حضرت ابو محجن رضی اللہ عنہ کی بیڑیاں کھول دیں۔ پھر وہ انہیں قید خانے سے اصطبل لائیں اور ایک اعلیٰ نسل کا عربی گھوڑا اور ہتھیار ان کے سپرد کر کے کہا:

''جاؤ خدا کے حوالے، مجھے یقین ہے کہ تم اپنا عہد ہر حال میں پورا کرو گے۔''

حضرت ابو محجن رضی اللہ عنہ کو گویا ہفت اقلیم کی دولت مل گئی، منہ سر پر کپڑا لپیٹا، گھوڑے پر سوار ہوئے ایڑ لگائی اور نیزہ ہاتھ میں ہلاتے اس شان سے ایرانیوں پر حملہ آور ہوئے جیسے آسمان سے بجلی گرتی ہے۔ جدھر کا رُخ کرتے ایرانیوں کی صفیں درہم برہم ہو جاتی تھیں۔ مسلمانوں کے وہ دستے جو ایرانیوں کے شدید دباؤ کے سامنے پسپا ہو رہے تھے۔ ان کے لیے اس جوانمرد کی میدانِ جنگ میں اچانک آمد تائید غیبی سے کم نہ تھی۔ ابو محجن رضی اللہ عنہ کبھی ایرانیوں کے میسرے میں گھس جاتے اور کبھی میمنے میں تباہی مچا دیتے۔ اس طرح انھوں نے آناً فاناً جنگ کا پانسہ پلٹ دیا اور مسلمانوں نے اپنے مقابل ایرانی صفوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جو عرق النساء یا رانوں میں دنبل کی وجہ سے خود میدانِ جنگ میں جانے سے معذور تھے اور قریب کی ایک قدیم عمارت میں بیٹھ کر لڑائی کی تمام کیفیت دیکھ رہے تھے۔ وہ ابو محجن رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر عش عش کر رہے تھے اور دل میں کہہ رہے تھے کہ اگر ابو محجن رضی اللہ عنہ قید میں نہ ہوتا تو میں یہ سمجھتا کہ یہ مجاہد ابو محجن ہی ہے کہ اس شان سے لڑنا اسی کا کام ہے۔ شاید اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی مدد کے لیے کوئی فرشتہ آسمان سے نازل کیا ہے۔

بعض روایتوں میں ہے کہ سلمٰی نے حضرت ابو محجن رضی اللہ عنہ کو حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا خاص ذاتی گھوڑا ''بلقاء'' دیا تھا اور اس پر بیٹھ کر انہوں نے میدانِ جنگ میں دادِ شجاعت دی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی جب ہم اکثر دوسری روایتوں میں پڑھتے ہیں کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ آخیر تک نہ حضرت ابو محجن رضی اللہ عنہ کو پہچان سکے اور نہ گھوڑے کو تو یہی گمان ہوتا

ہے کہ یہ بلقاء کی بجائے کوئی دوسرا گھوڑا تھا۔ اگر یہ بلقاء ہی تھا تو پھر میدانِ جنگ میں گرد وغبار کی وجہ سے حضرت سعد رضی اللہ عنہ اسے پہچان نہ سکے ہوں گے۔

حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ''اصابہ'' میں لکھا کہ ابومحجن رضی اللہ عنہ نے اس دن بہت سخت لڑائی لڑی۔ وہ تکبیر پڑھتے جاتے اور کفار کو بُری طرح پچھاڑے جاتے تھے۔ لوگ ان کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوتے تھے اور کوئی ان کو پہچان رہا تھا۔ حافظ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت میں یہ اضافہ کیا ہے کہ لوگوں نے انھیں فرشتوں میں سے ایک فرشتہ گمان کیا تھا۔

(۵)

شام کو لڑائی ختم ہوئی تو حضرت ابومحجن رضی اللہ عنہ اپنے عہد کے مطابق واپس آ گئے، گھوڑا اصطبل میں باندھ دیا اور قید خانے میں جا کر اپنے پاؤں میں خود ہی بیڑیاں ڈال لیں۔

ادھر حضرت سعد رضی اللہ عنہ بالا خانے سے نیچے اترے تو سلمیٰ نے اُن سے دریافت کیا کہ میدانِ جنگ کی کیا خبریں ہیں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

لقينا لقينا حتّٰى بعث الله رجلاً على فرس ابلق ۔ لو لا انى تركت ابا محجن فى القيود نطتت ۔ انما بعض شمائل ابى محجن (الاستیعاب، حافظ ابنِ عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ)

(یعنی ہم دشمنوں سے لڑتے رہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ابلق گھوڑے پر سوار کسی آدمی کو بھیج دیا (جس نے دشمنوں کا منہ پھیر دیا) اگر میں نے ابومحجن کو قید میں نہ ڈالا ہوتا تو میرا یہی گمان تھا کہ اس شخص کے انداز ابومحجن رضی اللہ عنہ کے سے تھے۔)

سلمیٰ رضی اللہ عنہا نے کہا: اے امیر یہ ابومحجن رضی اللہ عنہ ہی تھے۔''

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے متعجب ہو کر پوچھا۔ ''یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟

سلمیٰ رضی اللہ عنہا نے انہیں سارا واقعہ بلا کم و کاست سنا دیا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ بے حد متاثر ہوئے اور چشم پُر آب ہو کر فرمایا: ''خدا کی قسم مسلمانوں پر جو شخص یوں نثار ہو، میں اس کو

قید میں نہیں رکھ سکتا۔''

یہ فرما کر فوراً حضرت ابو محجن رضی اللہ عنہ کو رہا کر دیا۔ ابو محجن رضی اللہ عنہ بھی مردِ مومن تھے رہا ہو کر انہوں نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے کہا:

''اے امیر حد (سزا) کا خوف مجھے شراب نوشی سے باز نہ رکھ سکا لیکن آج میں خدا کے خوف سے عہد کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی شراب کو ہاتھ نہ لگاؤں گا۔''

ایک اور روایت میں بیان کیا گیا ہے، حضرت ابو محجن رضی اللہ عنہ کو حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی اُمِ ولد زبراء نے قید سے آزاد کیا تھا اور گھوڑا بھی اسی نے دیا تھا۔ علامہ بلاذری رحمۃ اللہ علیہ نے اسی روایت کو اپنایا ہے۔ حافظ ابنِ کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی سلمٰی رضی اللہ عنہا کا ذکر نہیں کیا لیکن ابنِ جریر طَبری اور دوسرے بہت سے اربابِ سِیَر نے سلمٰی رضی اللہ عنہا کا نام خصوصیت سے لے لیا ہے ان میں سے بعض نے تو اس روایت میں یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ سلمٰی رضی اللہ عنہا نے حضرت ابو محجن رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ امیر (سعد رضی اللہ عنہ) نے تمہیں کیوں قید میں ڈالا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا:

''مجھے کسی حرام چیز کے استعمال پر قید نہیں کیا گیا میں جاہلیت میں شراب پیتا تھا اور چونکہ شاعر بھی ہوں اس لیے رندانہ شعر کبھی کبھی زبان سے نکل جاتے ہیں مجھے ان شعروں پر قید کیا گیا ہے۔

اذا مت فادفنی الی جنب کرمۃٍ

تروّی عظامی بعد موتی عروقها

(جب میں مر جاؤں تو مجھے پہلوئے تاک میں دفن کرنا تاکہ میری ہڈیاں اس کا رس چوستی رہیں)

ولا تدفننی فی الفلاۃ فاننی

اخاف اذا مامت ان لا اذوقها

(اور مجھے خشک مٹی میں دفن نہ کرنا کیونکہ میں ڈرتا ہوں کہ مرنے کے بعد اس کا مزہ نہ چکھ سکوں گا۔)

سلمٰی رضی اللہ عنہا نے یوم الاغواث (قادِسیہ کی لڑائی کا وہ دن جس میں حضرت ابو محجن رضی اللہ عنہ قید خانے سے نکل کر شریک ہوئے) کے بعد حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے ان کی سفارش کی تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اسے مان لیا اور ابو محجن رضی اللہ عنہ کو رہا کرتے وقت فرمایا۔ ''جو کچھ تم نے اپنے شعروں میں کہا ہے جب تک اس پر عمل نہ کرو گے میں تمہیں کچھ نہ کہوں گا۔''

حضرت ابو محجن رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''خدا کی قسم ایسی بیہودہ باتیں اب میری زبان پر کبھی نہ آئیں گی۔''

یہاں یہ ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا کہ حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ نے مذکورہ بالا اشعار حضرت ابو محجن رضی اللہ عنہ کے بیٹے عبید بن ابی محجن رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کیے ہیں۔

(۶)

جنگِ قادِسیہ کے بعد حضرت ابو محجن رضی اللہ عنہ تاریخ کی پہنائیوں میں مستور ہو جاتے ہیں اور ان کی سرگرمیوں اور مشاغل کا پتہ نہیں ملتا۔ یہاں تک کہ ان کا سالِ وفات بھی کسی نے متعین نہیں کیا البتہ بہت سے اہلِ سِیَر نے لکھا ہے کہ انہوں نے آذربائیجان میں وفات پائی۔

دائرہ معارف اسلامیہ ''جلد اوّل'' میں جنگِ قادِسیہ کا واقعہ بیان کر کے حضرت ابو محجن رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ بھی ممکن ہے کہ ابو محجن رضی اللہ عنہ نے اُلَّیس (Vologasias) کی جنگ میں حصہ لیا ہو لیکن ۱۶ھ ۶۳۷ء میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں پھر جلاوطن کر دیا اور ناصع بھیج دیا جہاں کچھ عرصے کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کا مزار آذربائیجان یا جرجان کی سرحد پر موجود ہے۔

اس بیان کی روشنی میں قیاس کیا جا سکتا ہے کہ حضرت ابو محجن رضی اللہ عنہ نے جنگِ قادِسیہ کے جلد ہی بعد ۱۶ ہجری میں وفات پائی۔

حضرت ابو محجن رضی اللہ عنہ کی جلاوطنی کے اسباب کیا تھے؟ اس کے بارے میں ''دائرہ معارف اسلامیہ'' کے فاضل مقالہ نگار نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ان کی بعض نظموں میں

شراب کی تعریف وتوصیف کی گئی ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان نظموں کو قرآنِ حکیم کے حکمِ تحریم خمر کے خلاف قرار دیتے ہوئے شاعر (حضرت ابو محجن رضی اللہ عنہ) کو جلاوطنی کی سزا دی۔ (واللہ اعلم بالصواب)

حضرت ابو محجن رضی اللہ عنہ کو شعر وسخن سے فطری لگاؤ تھا، جنگِ قادسیہ کے موقع پر جو شعر انہوں نے قید خانے میں پڑھے وہ ان کی طبع زاد بیان کیے جاتے ہیں۔ حضرت ابو محجن رضی اللہ عنہ کا دیوان بھی تقریباً ایک صدی قبل یورپ اور قاہرہ میں طبع ہو چکا ہے۔ ان کا شمار مخضرمی شاعروں میں ہوتا ہے یعنی جاہلیت اور اسلام دونوں زمانوں میں انہوں نے شعر کہے ہیں۔

علامہ ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو محجن رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ نہایت شجاع، کریم اور فیاض شخص تھے۔

امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بڑے رعب اور دبدبہ کے آدمی تھے لیکن حضرت ابو محجن رضی اللہ عنہ ان کے سامنے بھی بیباکانہ گفتگو کرتے تھے۔ حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ''اصابہ'' میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ وہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آئے تو انہیں (امیر المومنین رضی اللہ عنہ کو) شک گزرا کہ انہوں نے شراب پی ہے۔ لوگوں سے کہا کہ ان کا منہ سونگھو۔ حضرت ابو محجن رضی اللہ عنہ نے کہا: ''یہ تجسس ہے اور آپ کو اس کی ممانعت کی گئی ہے۔'' اس پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان کو فوراً چھوڑ دیا۔

ابنِ عساکر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو محجن رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اَخاف علیٰ امتی ثلاثًا حیف الائمۃ و ایمانا بالنجوم و تکذیبًا بالقدر

یعنی، میں اپنی اُمت کے بارے میں تین چیزوں سے خطرہ محسوس کر رہا ہوں (۱) آئمہ کا ظلم (۲) نجوم پر ایمان (۳) اور قضاؤ قدر کی تکذیب ...... گویا حضرت ابو محجن رضی اللہ عنہ کا دامن روایتِ حدیث سے بھی خالی نہ تھا۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

حضرت عبداللہ بن مُغَفَّل مزنی رضی اللہ عنہ

(۱)

وسط ۹ ہجری کا ذکر ہے کہ شامی تاجروں کا ایک قافلہ مدینہ منوّرہ میں وارد ہوا۔ ان تاجروں نے اہلِ مدینہ کو بتایا کہ قیصرِ روم مدینہ منوّرہ پر دھاوا بولنے کے لیے پر تول رہا ہے اور اس مقصد کے لیے اس نے ایک زبردست لشکر جمع کیا ہے جس میں کچھ غیر مسلم عرب قبائل لخم، جذام، غسان وغیرہ بھی شامل ہو گئے ہیں۔ سرورِ عالم ﷺ تک یہ خبر پہنچی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ انشاء اللہ ہم رومیوں کو سرزمینِ عرب پر قدم نہ رکھنے دیں گے اور آگے بڑھ کر ان کا مقابلہ عرب کی سرحد پر کریں گے۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے مسلمانوں کو طویل صحرائی سفر اور جہاد کے لیے تیاری کا حکم دے دیا۔ ان ایام میں خشک سالی، قحط اور شدید گرمی نے قیامت ڈھا رکھی تھی، پھر کھجوروں کے پکنے کا زمانہ بھی قریب تھا اور لوگ بے تابی سے پھل پکنے کا انتظار کر رہے تھے۔ ان حالات میں دور دراز کا سفر جس میں منزلوں تک پانی بھی نہیں ملتا تھا بڑا جان جوکھوں کا کام تھا لیکن اہلِ ایمان نے جونہی اپنے آقا و مولا ﷺ کا حکم سنا وہ سب کچھ بھول بھال گئے اور ارشادِ نبوی پر لبیک کہتے ہوئے دیوانہ وار جہاد کی تیاریوں میں مشغول ہو گئے۔ اسی موقع پر جب حضور ﷺ نے مسلمانوں کو مالی قربانی کی ترغیب دی تو انہوں نے ایثار و قربانی کے ایسے نمونے دکھائے کہ چشمِ فلک نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھے تھے۔ سیّدنا صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے گھر میں جھاڑو پھیر دی اور سوئی سلائی تک لا کر راہِ حق میں پیش کر دی۔ سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے گھر کا آدھا اثاثہ لا کر بارگاہِ رسالت میں پیش کر دیا۔ حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ نے ایک ہزار دینار طلائی، نو سو اونٹ اور ایک سو گھوڑے مع ساز و سامان نذر کیے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے چالیس ہزار درہم نقرئی پیش کیے۔ اسی طرح دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم اور صحابیات رضی اللہ عنہن نے بھی انفاقِ فی سبیل اللہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یہاں تک کہ خواتین نے اپنے زیور تک اتار کر دے دیے لیکن اللہ کے ان پاکباز بندوں میں کچھ ایسے بھی تھے۔ جو اپنی ناداری اور تہی دستی کے سبب نہ سواری کا انتظام کر سکتے تھے اور نہ زادِ راہ مہیا کرنے کی مقدرت رکھتے تھے دوسری طرف ان کے جوشِ ایمان اور شوقِ جہاد کا یہ عالم تھا کہ گھر میں بیٹھے رہنا کسی صورت میں گوارہ نہ تھا دوسرے مسلمان بھائیوں کو جہاد کی تیاری کرتے دیکھتے تو دل مسوس کر رہ جاتے۔ ایسے ہی کچھ نادار اصحابِ رسول ﷺ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کی:

''یارسول اللہ ہمارے ماں باپ پر قربان، ہماری حالت آپ سے مخفی نہیں نہ ہمارے پاس سواری ہے اور نہ ہم زادِ راہ مہیا کرنے کی مقدرت رکھتے ہیں۔ اگر حضور اس کا بندوبست فرما دیں تو ہم بھی جہادِ فی سبیل اللہ کی سعادت حاصل کرلیں گے۔''

چونکہ لشکر کی تعداد کثیر تھی اور سواریوں اور دوسرے سامان کی شدید قلت، اس لیے حضور ﷺ نے ان کی درخواست قبول کرنے سے معذرت فرمائی۔ سواری اور زادِ راہ کے بغیر بے آب وگیاہ صحرا میں طویل سفر کرنا انسانی طاقت سے باہر تھا اس لیے بارگاہِ نبوی ﷺ سے صاف جواب پا کر یہ لوگ سخت دل شکستہ ہوئے اور اپنی محرومی پر مایوس ہو کر رونے لگے۔ اللہ تعالیٰ کو ان کا جذبہ اخلاص اس قدر پسند آیا کہ ان کے حق میں سورۂ توبہ میں یہ آیات نازل ہوئیں:

وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ○

ترجمہ: ''اور نہ ان لوگوں پر کوئی الزام ہے کہ جب وہ تمہارے پاس آئے کہ

تم ان کے لیے سواری کا انتظام کرو تو تم نے کہا کہ میرے پاس کوئی سواری نہیں ہے۔ یہ سن کر وہ پلٹ گئے اور خرچ میسّر نہ آنے کے غم میں اُن کی آنکھیں اشکبار تھیں۔''

ان مخلصِ اہلِ ایمان میں قبیلہ مزنیہ کے ایک صاحب بھی تھے۔ گرد سے اَٹا ہوا ان کا بوسیدہ لباس ان کی ناداری کا غماز تھا لیکن ان کے چہرے پر نورِ سعادت کی ایسی چمک تھی کہ کوئی دیکھنے والا اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا ان کی بے قرار اور جوشِ گریہ کو مدینہ کے ایک نیک دل بزرگ ابنِ یمین رضی اللہ عنہ نے دیکھا تو پوچھا بھائی یہ رونا دھونا کس لیے ہے؟ انہوں نے کہا، جہاد میں شریک ہونے کے لیے حضور ﷺ سے سواری مانگی تھی مگر نہیں مل سکی اور مجھ میں اتنی استطاعت نہیں کہ سفر کا سامان مہیا کرسکوں، اسی لیے اپنی بدقسمتی پر رو رہا ہوں۔

یہ سن کر ابنِ یمین رضی اللہ عنہ نے انہیں ایک اونٹ اور کچھ کھجوریں ہدیۃً پیش کیں۔ خلافِ توقع سواری اور زادِ راہ پا کر وہ صاحبِ رسول رضی اللہ عنہ اتنے مسرور ہوئے کہ قدم زمین پر نہ ٹکتے تھے بڑے ذوق وشوق سے اسلامی لشکر میں جا شامل ہوئے اور مدینہ منوّرہ سے تبوک تک رحمتِ دوعالم ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔ یہ صاحبِ رسول رضی اللہ عنہ جن کے جوشِ ایمان اور جذبہ اخلاص کی بارگاہِ الٰہی میں پُرزور الفاظ میں پذیرائی ہوئی اور جن کی دلی تمنّا کو پورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک اور نیک بندے کو وسیلہ بنا دیا، حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ تھے۔

(۲)

سیّدنا ابوسعید عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کا تعلق قبیلہ مزینہ سے تھا جو مضر کی مشہور شاخ ہے۔ حضرت کعب بن زہیر رضی اللہ عنہ (قصیدہ بانت سعاد کے خالق) بھی اسی قبیلے سے تھے۔ انہوں نے ایک شعر میں اپنے مزنی ہونے پر اس طرح فخر کا اظہار کیا ہے۔

هُمُ الْاَصْلُ مِنِّیْ حَیْثُ کُنْتِ وَ اِنَّنِیْ
مِنَ الْمُزَیْنِیِّیْنَ الْمُصْفِیْنِ بِالْکَرَمِ

''وہی لوگ میرے بزرگ ہیں جہاں کہیں بھی میں ہوں بلاشبہ میں شریف اور معزز مزینوں میں سے ہوں۔''

یہ قبیلہ نجد میں آباد تھا اور حضرت عبداللہ بن مُغَفَّل رضی اللہ عنہ بھی وہیں کے رہنے والے تھے سلسلہ نسب یہ ہے:

عبداللہ رضی اللہ عنہ بن مُغَفَّل بن عبدنہم بن عفیف بن مہم بن ربیعہ بن عدی بن ثعلبہ بن زویب بن سعد بن عدی بن عثمان بن مزینہ

حضرت عبداللہ بن مُغَفَّل رضی اللہ عنہ ۶ھ ہجری میں شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہوئے۔ ان کے قبولِ اسلام کے تھوڑے عرصہ بعد (ذیقعدہ ۶ ھ میں) سرورِ عالم ﷺ عمرہ کے لیے مکہ روانہ ہوئے۔ اس سفر میں چودہ سو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور ﷺ کے ہم کاب تھے۔ ان میں حضرت عبداللہ بن مُغَفَّل رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ جب حضور ﷺ کو خبر ملی کہ قریشِ مکہ مسلمانوں کی مزاحمت کا ارادہ رکھتے ہیں تو آپ ﷺ نے حدیبیہ کے مقام پر پڑاؤ ڈال دیا۔ اسی جگہ ''بیعتِ رضوان'' کا عظیم الشان واقعہ پیش آیا جس میں اس موقع پر موجود تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور ﷺ کے دستِ مبارک پر بڑے ذوق وشوق سے جاں نثاری کی بیعت کی۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے بھی یہ سعادت حاصل کی اور یوں وہ ان خوش بخت اصحاب میں شامل ہو گئے جن کو اللہ تعالیٰ نے کھلے لفظوں میں اپنی خوشنودی کی بشارت دی۔ صلح حدیبیہ کے بعد غزوۂ خیبر پیش آیا، حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ اس غزوے میں بھی جانبازانہ شریک ہوئے۔ صحیح بخاری میں ان سے یہ واقعہ منقول ہے کہ ہم نے خیبر کا محاصرہ کر رکھا تھا، میں بھی محاصرین میں شامل تھا اثنائے محاصرہ میں کسی نے چربی سے بھری ہوئی تھیلی اوپر سے پھینکی۔ میں اسے اٹھانے کے لیے آگے بڑھا لیکن جب دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ دیکھ رہے ہیں۔ تو میں سخت نادم ہوا۔

فتح مکہ (۸ ہجری) میں حضرت عبداللہ بن مُغَفَّل رضی اللہ عنہ ان دس ہزار ''قدسیوں'' میں شامل تھے جنھیں اس موقع پر سرورِ عالم ﷺ کی ہم کابی کا شرف حاصل ہوا۔

صحیح بخاری میں ان سے روایت ہے کہ میں نے فتح مکہ کے روز رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ اونٹنی پر سوار تھے اور سورۂ فتح پڑھتے جاتے تھے اور اس کو دہراتے تھے۔ بخاری ہی کی ایک اور روایت میں حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ فتح مکہ کے دن رسول اللہ ﷺ مکہ میں داخل ہوئے تو اس وقت کعبہ میں تین سو ساٹھ بت تھے۔ آپ ﷺ ان کو ہاتھ کی لکڑی سے مار مار کر فرماتے جاتے تھے۔ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ جَآءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَ مَا يُعِيْدُ ؕ

۹ ہجری میں غزوۂ تبوک پیش آیا۔ اس موقع پر حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے جس اخلاص اور جوشِ ایمان کا مظاہرہ کیا اس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ انہوں نے اپنے جذبہ فدویت اور اخلاص فی الدین کی بدولت بارگاہِ نبوی میں درجہ تقرب حاصل کر لیا تھا۔ قبولِ اسلام کے بعد برابر کئی سال تک مدینہ منورہ میں مقیم رہ کر فیضانِ نبوی سے بہرہ یاب ہوتے رہے یہاں تک کہ فضلاء صحابہ میں شمار ہونے لگے۔ ۱۱ ہجری میں سرورِ عالم ﷺ نے رحلت فرمائی تو حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ پر کوہِ غم ٹوٹ پڑا۔ علامہ ابنِ سعد کا بیان ہے کہ حضور ﷺ کے وصال کے بعد حضرت عبداللہ بن مُغفَّل رضی اللہ عنہ نے مدینہ منورہ کی سکونت ترک کر دی اور اپنے وطن جا کر مقیم ہو گئے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں بصرہ آباد ہوا تو امیر المومنین کو چند ایسے لوگوں کی تلاش ہوئی جو وہاں کے باشندوں کو قرآن و حدیث اور فقہی مسائل کی تعلیم دے سکیں۔ اس سلسلے میں ان کی نگاہِ انتخاب حضرت عبداللہ بن مُغفَّل رضی اللہ عنہ پر بھی پڑی جنہیں انہوں نے پانچ دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ اہلِ بصرہ کی تعلیم و تربیت پر مامور کر دیا۔

(۳)

امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے ارشاد کی تعمیل میں حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بصرہ چلے تو گئے لیکن اُن کے دل میں ہر وقت شوقِ جہاد موجزن رہتا تھا جو انہیں چین سے نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد عراقِ عرب جانے والے مجاہدین میں شامل ہو گئے اور ایرانی فوجوں کے

خلاف کئی معرکوں میں اپنی سرفروشی کے جوہر دکھائے ۱۷ھ ہجری میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ حاکمِ بصرہ نے خوزستان پر فوج کشی کی تو حضرت عبداللہ بن مُغَفَّل رضی اللہ عنہ بھی ان کے لشکر میں شامل ہو گئے۔ حافظ ابنِ عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے ''الاستیعاب'' میں لکھا ہے کہ خوزستان کے صدر مقام شوستر پر مسلمانوں کا استیلا ہوا تو حضرت عبداللہ بن مُغَفَّل رضی اللہ عنہ شہر میں داخل ہونے والے مجاہدین میں سب سے آگے آگے تھے۔ اس طرح عراق کے کئی معرکوں میں دادِ شجاعت دینے کے بعد حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ واپس بصرہ آ گئے۔ اس حسبِ سابق درس وافتاء میں مشغول ہو گئے۔ ۵۹ھ یا ۶۰ھ میں سخت بیمار ہو گئے۔ جب جانبری کی کوئی اُمید نہ رہی تو گھر والوں کو وصیت کی کہ غسل کے آخری پانی میں کافور ملانا، غسل کے وقت صرف احباب موجود ہوں اور رسول اللہ ﷺ کے صحابی غسل دیں۔ کفن میں دو چادریں اور ایک قمیص ہو کہ رسول اللہ ﷺ کا کفن ایسا ہی تھا۔ جنازے کے پیچھے آگ نہ روشن کی جائے۔ ابنِ سعد کا بیان ہے کہ اس موقع پر حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے یہ وصیت بھی کی کہ حاکمِ بصرہ عبیداللہ ان کی نماز جنازہ میں شریک نہ ہو۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے پیکِ اجل کو لبیک کہا تو ان کے ورثاء نے ان کی وصیتوں پر پورا پورا عمل کیا۔ جب جنازہ اٹھایا گیا تو ابنِ زیاد انتظار میں کھڑا تھا۔ اس کو حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی وصیّت سے آگاہ کیا گیا تو تھوڑی دور جنازے کے ساتھ جا کر واپس چلا گیا۔ جلیل القدر صحابی حضرت ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور پھر اس معدنِ فضل وکمال کو سرزمینِ بصرہ میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ حافظ ابنِ عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ کے بیان کے مطابق انہوں نے سات اولادیں اپنی یادگار چھوڑیں۔

(۴)

حضرت عبداللہ بن مُغَفَّل رضی اللہ عنہ علم وفضل کے اعتبار سے بڑے بلند مقام پر فائز تھے ان کے علمی مرتبہ کا اندازہ اسی بات سے کیا جا سکتا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسی مردم شناس شخصیت نے انہیں اہلِ بصرہ کی تعلیم وتربیت کے لیے منتخب کیا۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے ۴۳ احادیث مروی ہیں، ان میں سے ۴ متفق علیہ ہیں، ایک میں امام

بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور ایک میں امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ منفرد ہیں۔ ان کے ارشد تلامذہ میں حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ' حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ' حضرت حمید بن ہلال رحمۃ اللہ علیہ' حضرت مطرب رحمۃ اللہ علیہ بن عبداللہ کے اسماء گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مُغفّل رضی اللہ عنہ کے صحیفہ اخلاق میں حبِ رسول ﷺ، شوقِ جہاد، اخلاص فی الدّین، اسوۂ حسنہ کی پیروی اور بدعات سے اجتناب سب سے نمایاں ابواب ہیں۔ لوگوں کو بڑے لطف وانبساط سے حضور ﷺ کے ارشادات سناتے تھے اور ایسے کاموں سے منع فرماتے تھے جن کو حضور ﷺ نے ناپسند فرمایا تھا۔ صحیح بخاری میں ان سے روایت ہے کہ میں نے ایک شخص کو کنکر پھینکتے ہوئے دیکھا تو اس سے کہا کہ بھائی کنکر نہ پھینکو ایسا کرنے سے رسول اللہ ﷺ نے منع کیا ہے۔ میں نے آپ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اس سے نہ شکار مرتا ہے اور نہ کوئی دشمن زخمی ہوسکتا ہے۔ البتہ کسی کا دانت ٹوٹ جائے گا یا آنکھ پھوٹ جائے گی۔ چند روز بعد اسے میں نے پھر اینٹ مارتے ہوئے دیکھا تو کہا کہ کیا میں نے تجھ سے رسول اللہ ﷺ کی حدیث بیان نہیں کی تھی تو پھر بھی اینٹیں مارتا ہے۔ جا میں تجھ سے اتنے روز بات نہیں کروں گا۔

مسندِ احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ میں حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے سے روایت ہے کہ میں نے اپنے والد سے بڑھ کر بدعات کو بُرا سمجھنے والا کوئی نہیں دیکھا، ایک مرتبہ میں نے نماز میں بسم اللہ جہر کے ساتھ پڑھی جب سلام پھیرا تو والد نے کہا، بیٹا اسلام میں باتیں نہ بڑھاؤ۔ میں نے رسول اللہ ﷺ، ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ کے پیچھے نمازیں پڑھی ہیں ان میں سے کوئی بھی نماز میں بسم اللہ جہر کی ساتھ نہیں پڑھتے تھے۔

سنن ابی داؤد میں حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہدایت فرمائی کہ تم میں سے کوئی ہرگز ایسا نہ کرے کہ اپنے غسل خانہ میں پہلے پیشاب کرے اور پھر اس میں غسل کرے یا وضو کرے۔ کیونکہ اکثر وسوسے اسی سے پیدا ہوتے ہیں۔ غرض حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ اسی طرح لوگوں کو حضور ﷺ کے ارشادات سنا سنا کر دم آخر تک حسنِ اخلاق اور حسنِ معاشرت کی تعلیم دیتے رہے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

حضرت حنظلہ بن رُبیع تمیمی رضی اللہ عنہ

(کاتبِ رسول ﷺ)

(۱)

سرورِ کونین ﷺ کی بعثت سے پہلے عرب کے ظلمت کدہ میں کئی ایسے سلیم الفطرت لوگ بھی موجود تھے جو توحید کے قائل تھے اور علماء یہود و نصاریٰ کی باتیں سن کر نبی آخر الزماں ﷺ کی آمد کے منتظر تھے۔ ایسے ہی لوگوں میں بنو تمیم کے ایک بزرگ اکثم بن صیفی بھی تھے۔ وہ ایک سو نوے برس کی عمر کو پہنچ چکے تھے اور اپنی حکمت و دانش کی بناء پر عرب بھر میں شہرت رکھتے تھے۔ وہ لوگوں کو اکثر عرب میں اللہ کے آخری رسول ﷺ کے ظہور کی خبر دیا کرتے تھے۔

سرورِ عالم ﷺ نے بعثت کے بعد دعوتِ حق کا آغاز فرمایا تو اکثم کے کانوں میں بھی آپ ﷺ کی بعثت کی خبر پہنچی۔ ان کے دل نے گواہی دی کہ یہ وہی نبی ہیں جن کو سرزمینِ عرب میں جلوہ افروز ہونا تھا۔ انہوں نے مکہ کے دُرِّ یتیم ﷺ کی خدمت میں ایک خط روانہ کیا جس میں آپ ﷺ کی دعوت کی تفصیل پوچھی۔ حضور ﷺ نے اس خط کا جواب اکثم کو بھیجا تو اس کو پڑھ کر ان کی مسرّت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ان کے نہاں خانہ دل میں شمعِ ایمان روشن ہو گئی اور انہوں نے تمام اہلِ قبیلہ کو بلا بھیجا۔ جب سب لوگ جمع ہو گئے تو ان سے مخاطب ہو کر کہا:

"اے میرے فرزندو! میری بات غور سے سنو، مکہ میں قریش کے جو صاحب لوگوں کو توحید کی دعوت دیتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ میں خدا کا رسول ہوں، فی الواقع وہ خدا کے سچے رسول ہیں۔ تم لوگ فوراً ان کی طرف لپکو اور ان کا دامنِ اقدس تھام لو کہ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔ دیکھنا عرب کے

دوسرے لوگ تم سے بازی نہ لے جائیں۔''

حاضرین میں بنو تمیم کا ایک سر برآوردہ رئیس مالک بن نویرہ بھی موجود تھا۔ اس کو اکثم کی یہ باتیں ناگوار گزریں، اس نے لوگوں سے کہا، بڈھا سٹھیا گیا ہے، اس کی باتوں پر مت جاؤ۔ آخر اس کی خاطر ہم اپنا آبائی دین کیوں چھوڑیں؟

مالک کی باتیں سُن کر لوگ منتشر ہو گئے تاہم اکثم کے ایک فرزند، ایک بھتیجے اور کچھ دوسرے نیک فطرت تمیمی اکثم کی باتوں سے بڑے متاثر ہوئے اور انہوں نے اکثم سے کہا کہ آپ نے ہمیں جو مشورہ دیا ہے، ہم اس پر ضرور عمل کریں گے۔

اکثم نے ان سب لوگوں کو ہدایت کی کہ جلد از جلد عازمِ مکہ ہو جاؤ اور صاحبِ قریش ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی دعوت قبول کر لو۔

حافظ ابنِ عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ یہ لوگ اپنے وطن سے مکہ کے لیے روانہ ہوئے، لیکن معلوم نہیں کون سے موانع پیش آئے کہ یہ لوگ اُس وقت بارگاہِ رسالت میں حاضری کی سعادت حاصل نہ کر سکے البتہ کچھ عرصہ بعد اکثم بن صیفی کے بھتیجے کسی نہ کسی طرح رحمتِ عالم ﷺ کی خدمت میں پہنچ گئے اور بڑے ذوق وشوق سے سعادت اندوزِ ایمان ہو گئے۔ دانائے بنو تمیم اکثم بن صیفی کے یہ خوش بخت بھتیجے حضرت حنظلہ بن رُبیع رضی اللہ عنہ تھے۔

(۲)

سیّدنا حضرت حنظلہ بن رُبیع رضی اللہ عنہ کا شمار بڑے جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم میں ہوتا ہے۔ ان کی کنیت ابو ربعی تھی اور وہ حکیمِ عرب اکثم بن صیفی تمیمی کے حقیقی برادر زادے تھے۔ سلسلہ نسب یہ ہے:

حنظلہ رضی اللہ عنہ بن رُبیع بن صیفی بن ریاح بن حارث بن مخاشن بن معاویہ بن شریف بن رُوہ بن اسید بن عمرو بن تمیم۔

حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کے زمانے کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تاہم اہلِ سِیَر نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ بعثتِ نبوی کے ابتدائی زمانے میں

نعمتِ ایمان سے بہرہ یاب ہوئے کیونکہ ان کے گھرانے میں اکثم بن صیفی مدّت سے حضورِ پُرنور ﷺ کے ظہور کی اکثر خبر دیا کرتے تھے۔

حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ نے اپنے وطن کو چھوڑ کر مدینہ منوّرہ میں مستقل اقامت کب اختیار کی؟ کتبِ سیَر سے اس سوال کا بھی کوئی حتمی جواب نہیں ملتا۔ البتہ تمام مورّخین نے یہ بات تواتر کے ساتھ بیان کی ہے کہ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ لکھنے پڑھنے میں اعلیٰ قابلیت کے مالک تھے اور سرورِ کونین ﷺ ان پر بہت اعتماد فرماتے تھے۔ ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ''اُسد الغابہ'' میں لکھا ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کو عہدۂ کتابت پر مامور فرمایا تھا اور وہ دربارِ رسالت کی طرف سے حکمرانوں، رئیسوں اور دوسرے لوگوں کو بھیجے جانے والے خطوط قلمبند کیا کرتے تھے۔ اسی لیے ''کاتبِ رسول اللہ'' کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔ دوسرے اہلِ سیَر نے بھی دربارِ رسالت کے کتّاب میں حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کا نام تخصیص کے ساتھ لیا ہے۔

حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ صرف قلم ہی کے دھنی نہیں تھے بلکہ راہِ حق کے ایک جانباز مجاہد بھی تھے۔ اہلِ سیَر نے اگرچہ ان کے جہاد بالسیف کی تفصیل بیان نہیں کی، لیکن بعض روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے کئی غزوات میں رحمتِ عالم ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔ مسندِ احمد بن حنبل میں خود حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ غزوہ کیا کرتے تھے۔ ایک غزوہ میں ہم نے دیکھا کہ ایک عورت مقتول پڑی ہے۔ لوگ اس کی لاش کے گرد جمع ہو گئے۔ اسی اثناء میں رسول اللہ ﷺ تشریف لائے۔ لوگ ایک طرف ہٹ گئے۔ حضور ﷺ نے لاش کو دیکھ کر فرمایا: ''یہ عورت تو لڑائی میں شریک نہ تھی۔'' پھر آپ ﷺ نے ایک شخص کو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے پاس یہ حکم دے کر بھیجا کہ لڑائی میں عورتوں اور بچّوں کو ہرگز قتل نہ کرو۔

ابنِ اثیر کا بیان ہے کہ غزوۂ طائف سے پہلے رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کو یہ خدمت سونپی کہ وہ اہلِ طائف (بنو ثقیف) کے پاس جائیں اور ان کا

عندیہ معلوم کریں کہ وہ مسلمانوں سے مصالحت کرنے پر تیار ہیں یا نہیں۔ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ طائف جا کر وہاں کے عمائد سے ملے تو ان کو ہوا کے گھوڑے پر سوار پایا۔ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ نے واپس آ کر حضور ﷺ کو ان لوگوں کی متمردانہ روش سے آگاہ کیا تو آپ ﷺ نے طائف کے محاصرے کا حکم دے دیا۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ ایک صاحبِ تدبیر اور دانا آدمی تھے اسی لیے سیّد الانام ﷺ نے سفارت جیسے نازک کام کی ذمہ داری ان کے کندھوں پر ڈالی تھی۔

(۳)

اللہ تعالیٰ نے حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کو بڑی حساس طبیعت عطا کی تھی۔ صحیح مسلم اور مشکوٰۃ میں انس سے روایت ہے کہ (ایک مرتبہ) میری حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے پوچھا، حنظلہ کیا حال ہے؟ میں نے کہا، اے ابوبکر (کیا بتاؤں) مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں نفاق کے مرض میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حیران ہو کر فرمایا، سبحان اللہ، یہ تم کیا کہہ رہے ہو، میں نے کہا (درست کہہ رہا ہوں کیونکہ) جب ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے گویا جنت اور دوزخ ہمارے سامنے ہیں اور ہم ان کے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں لیکن جب ہم آپ ﷺ کی مجلس سے اٹھ کر باہر آتے ہیں تو پھر بیوی بچوں اور جائیدادوں کے قِصّوں میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور آپ ﷺ کے ارشاد و تذکیر کو بھلا دیتے ہیں۔

اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، خدا کی قسم یہ بات تو ہمیں بھی پیش آتی ہے۔ اس کے بعد میں اور ابوبکر رضی اللہ عنہ دونوں رسول اللہ ﷺ کی طرف روانہ ہوئے یہاں تک کہ آپ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں پہنچ گئے۔ میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ، حنظلہ تو منافق ہو گیا، رسول اللہ ﷺ نے پوچھا، کیا بات پیش آئی؟ میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ ﷺ جب ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور آپ ہمیں جنت و دوزخ کی یاد دلاتے ہیں تو ہمیں یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں،

لیکن جب آپ کے پاس سے اٹھ کر جاتے ہیں تو پھر وہی بیوی بچّوں اور زمینوں کی دلچسپیوں میں کھو جاتے ہیں اور آپ کے ارشادات و ہدایات کا بیشتر حصہ بھول جاتے ہیں۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر تمہاری ہمیشہ یہی حالت رہے جو میری مجلس میں ہوتی ہے تو فرشتے تمہارے بچھونوں پر اور راستوں پر کھلم کھلا تم سے مصافحہ کیا کریں، لیکن اے حنظلہ وقت وقت کی بات ہے (ساعة و ساعة) یہ الفاظ تین مرتبہ ارشاد فرمائے۔''

شارحینِ حدیث نے لکھا ہے کہ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ نے مجلسِ نبوی میں موجودگی کے وقت اپنی جس قلبی کیفیت کا اظہار کیا، شریعت کی اصطلاح میں اس کو احسان کہا جاتا ہے جو فی الحقیقت یقین ہی کہ ایک منزل ہے جس کے بعد کوئی اور منزل نہیں۔ اس کے بعد جتنے مدارج نصیب ہوتے ہیں اسی مرتبہ احسان میں نصیب ہوتے ہیں۔ سیّد المرسلین ﷺ کی صحبتِ اقدس میں احسان کا مرتبہ پہلے ہی قدم پر حاصل ہو جاتا تھا۔ حضور ﷺ نے یہ واضح فرمایا کہ میری صحبت میں تمہارے قلب کی جو کیفیت ہوتی ہے اگر یہ دائمی بن جائے تو تم اس کو برداشت نہیں کر سکتے اس طرح تم انسانوں کی دُنیا سے نکل کر فرشتوں کی دنیا میں شامل ہو جاؤ گے حالانکہ شریعت کا مقصد بشریت کی تکمیل ہے قلبِ ماہیت نہیں بیوی بچّوں کے بھی تم پر حقوق ہیں۔

سرورِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ نے قلم چھوڑ کر تلوار سنبھال لی اور میدانِ جہاد میں پہنچ گئے۔ حافظ ابنِ حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں قادسیہ کی خونریز جنگ پیش آئی تو حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ نے اس میں سرفروشانہ حصہ لیا۔ کوفہ آباد ہوا تو انہوں نے وہاں اقامت اختیار کر لی۔ جنگِ جمل کے بعد کوفہ سے قرقیسا چلے گئے اور وہیں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہدِ حکومت میں سفرِ آخرت اختیار کیا۔ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ سے آٹھ حدیثیں مروی ہیں۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ'

حضرت عمرو بن مُرّہ جُہَنی رضی اللہ عنہ

(۱)

بعدِ بعثت کے ابتدائی زمانے کا ذکر ہے کہ ایک دن ایک اعرابی سرورِ دو عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یوں عرض پیرا ہوئے:

''اے ابنِ عبدالمُطّلب میں پچھلے حج کے موقعہ پر مکہ آیا تو یہاں ایک عجیب خواب دیکھا۔ سوتے ہوئے مجھے یوں نظر آیا کہ ایک نور کعبہ سے نکل کر یثرب کی پہاڑیوں تک جا پہنچا ہے اور قبیلہ جُہینہ کو ڈھانپ لیا ہے۔ پھر میں نے اس نور میں سے ایک آواز سُنی کہ ظلمت کے بادل چھٹ گئے۔ اُجالا پھیل گیا، آخری نبی تشریف لے آئے۔ اس کے بعد ایک تیز روشنی برآمد ہوئی جس میں حیرہ کے محل اور مدائن کے قصر ہائے ابیض دکھائی دینے لگے اس وقت میرے کان میں یہ آواز آئی کہ اسلام آ گیا، بُت ٹوٹ گئے اور صلہ رحمی کا دَور دورہ ہوا۔

یہ خواب دیکھ کر مجھ پر وحشت طاری ہوئی اور میں نے اپنی قوم کے لوگوں کے سامنے جو میرے ساتھ حج کے لیے مکہ آئے تھے، خواب کا ماجرا بیان کیا، وہ بھی بہت حیران ہوئے۔ جب حج سے فارغ ہو کر ہم اپنے قبیلے میں واپس گئے تو ہم نے سنا کہ آپ لوگوں کو توحید کی دعوت دیتے ہیں اور بُت پرستی سے باز رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اب میں آپ کی خدمت میں یہ معلوم کرنے کے لیے آیا ہوں کہ آپ کس چیز کی طرف دعوت دیتے ہیں۔''

حضور ﷺ نے اعرابی کی باتیں بڑی توجہ سے سُنیں اور پھر فرمایا:

''بھائی! میں نبی مرسل ہوں اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمام بندگانِ خدا کو اسلام کی طرف بُلاؤں۔ بُت پرستی ترک کرنے کی تلقین کروں اور اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت اور صلہ رحمی کا حکم دوں۔ جو کوئی اس دعوت کو قبول کرے گا وہ جنت کا حقدار ہوگا اور جو اس کو رَدّ کرے گا اس کا ٹھکانا جہنم میں ہوگا۔ تم میری دعوت کو قبول کرلو تو دوزخ کی آگ سے محفوظ رہو گے۔''

حضور ﷺ کا ارشاد سن کر اعرابی نے بلا تامل عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول میں آپ پر ایمان لاتا ہوں اور جو دعوت آپ دیتے ہیں صِدقِ دل سے قبول کرتا ہوں اگرچہ عرب کے درودیوار سے اس کی مخالفت ہورہی ہے۔''

یہ اعرابی جنہوں نے اس وقت لوائے توحید کو تھاما جب ایسا کرنا تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف تھا، حضرت عمرو بن مُرّہ جُہنی رضی اللہ عنہ تھے۔

(۲)

حضرت ابو مریم عمرو رضی اللہ عنہ بن مُرّہ کا تعلق بنو جہنیہ سے تھا۔ نسب نامہ یہ ہے:

عمرو رضی اللہ عنہ بن مُرّہ بن عبس بن مالک بن حارث بن مازن بن سعد بن مالک بن رفاعہ بن نصر بن مالک بن غطفان بن قیس بن جہنیہ۔

حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کا شمار اپنے قبیلے کے عمائد میں ہوتا تھا اور لوگ ان کو بہت مانتے تھے۔ شعر گوئی کا نہایت پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہوئے تو حضور ﷺ کے سامنے یہ اشعار پڑھے:

شهدت بان الله حق و انني ـــ لالهة الاحجار اوّل تارك

فشمرت عن ساق الازار مهاجر ـــ اليك ادب الغور بعد الدكادك

لا صحب خير الناس نفسًا ووالدًا ـــ رسُول مليك الناس فوق الحبائك

(ترجمہ) میں اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ اللہ حق ہے اور میں پتھروں

کے معبودوں کو سب سے پہلے پسِ پشت ڈالنے والا ہوں میں نے پوری سر
گرمی کے ساتھ آپ کی طرف ہجرت کی ہے (یا میں نے ہجرت کے ارادہ
سے تہبند پنڈلیوں سے اوپر چڑھا لیا ہے) میں دشوار گزار راستوں سے
آپ کی طرف چل رہا ہوں تاکہ اس ذاتِ گرامی کا شرفِ صحبت حاصل
کروں، جو بذاتِ خود بھی اور خاندانی حیثیت سے بھی تمام لوگوں میں
بہترین ہے، زمین اور آسمان کے مالک کے رسول ﷺ کا جو تمام نیکیوں
سے اعلیٰ و برتر ہے۔

یہ اشعار سُن کر سرورِ عالم ﷺ کے روئے انور پر بشاشت پھیل گئی اور آپ ﷺ
نے فرمایا: ''اے عمرو! تمہیں مبارک ہو (یا شاباش اے عمرو)'' حضرت عمرو رضی اللہ عنہ نے عرض
کیا: ''یارسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں آپ مجھے اپنی قوم میں جا کر تبلیغ
کرنے کی اجازت مرحمت فرمایئے شاید اللہ تعالیٰ میرے ذریعہ سے ان پر احسان کرے
جس طرح اس نے آپ کے طفیل مجھ پر احسان کیا۔''

حضور ﷺ نے فرمایا: ''ہاں تم اپنی قوم کو ہدایت کی دعوت دے سکتے ہو۔''

حضرت عمرو رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کا ارشاد سن کر بہت خوش ہوئے۔ جب حضور ﷺ
سے رخصت ہونے لگے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''عمرو رضی اللہ عنہ میری چند باتیں یاد رکھنا اور
ہر حال میں ان پر عمل کرنا وہ باتیں یہ ہیں کہ ہمیشہ نرمی سے کام لینا سختی نہ کرنا، کسی سے حسد
نہ کرنا، خود پسندی اور تکبر سے باز رہنا، اپنی گفتگو میں تلخی اور ترشروئی سے کام نہ لینا۔''

حضرت عمرو رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کے ارشادات پر عمل کرنے کا عہد کیا اور اپنی قوم
کی طرف روانہ ہو گئے۔

(۳)

حضرت عمرو رضی اللہ عنہ اپنے قبیلے میں پہنچے تو سب سے پہلا کام انہوں نے یہ کیا کہ جس
بُت کی پرستش کیا کرتے تھے اس کو توڑ ڈالا پھر انہوں نے سب لوگوں کو جمع کیا اور ان سے

یوں خطاب کیا:

''اے بنو رُفاعہ، اے بنو جہنیہ میں تمہارے پاس اللہ کے رسول کی طرف سے قاصد بن کر آیا ہوں اور تمہیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں اور اس بات کی تلقین کرتا ہوں کہ قتل و غارت اور خونریزی کو چھوڑ دو، آپس میں صلہ رحمی کرو، خدائے واحد کی عبادت کرو اور بتوں کو چھوڑ دو، جو میری دعوت پر لبیک کہے گا اس کے لیے جنت ہے اور جو کوئی اس سے روگردانی کرے گا اس کے لیے جہنم ہے۔ اے میرے جہنی بھائیو! قبائلِ عرب میں اب بھی تمہاری ایک امتیازی شان ہے۔ دوسرے لوگوں میں رواج ہے کہ دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں رکھ لیتے ہیں اور باپ کے مرنے کے بعد بیٹا سوتیلی ماں سے شادی کر لیتا ہے لیکن تم نے ہمیشہ ان باتوں کو مکروہ جانا۔ اب تم اللہ کے سچے رسول ﷺ کا اتباع کر لو تو دنیا اور آخرت کی بھلائیاں تمہارے حصے میں آئیں گی۔''

حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کی باتوں میں کچھ ایسی تاثیر تھی کہ ایک شخص کے سوا سارا قبیلہ چند دن کے اندر اندر شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہو گیا۔ یہ شخص بڑا سیاہ باطن اور شقی القلب تھا۔ حضرت عمرو رضی اللہ عنہ سے کہا کرتا تھا:

''اے عمرو بن مُرّہ، تیری زندگی تلخ ہو جائے کیا تو ہمیں اپنے معبودوں کو چھوڑنے کی تلقین کرتا ہے۔ کیا تیرا ارادہ ہے کہ ہم پارہ پارہ ہو جائیں، کیا تو چاہتا ہے کہ ہم اپنے آباؤ اجداد کے دین کی مخالفت کریں۔ یہ تہامہ کا رہنے والا قُرشی (محمد ﷺ) ہمیں کس بات کی طرف بُلاتا ہے جس میں نہ کوئی کرامت ہے نہ کوئی شرافت۔''

بعض اہلِ سِیَر نے اس شخص سے یہ اشعار منسوب کیے ہیں:

ان بن مرة قداتی بمقالة — لیست مقالة من یرید صلاحا

انی لا حسب قولہ و فعالہ　　یوما وان طال الزمان زباحا
لیسفہ الاشیاخ ممن قد مضی　　من رام ذٰلك لا اصاب فلاحا

(ترجمہ) ''عمرو بن مُرّہ وہ بات لے کر آیا ہے جو صلاح پسند لوگوں جیسی نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ عمرو بن مُرّہ کا قول و فعل ایک دن غلط ثابت ہوگا اگرچہ اس میں کچھ دیر ہو جائے۔

...... وہ ہمارے گزرے ہوئے بزرگوں کو بیوقوف ثابت کرنا چاہتا ہے اور جس خلف کا ارادہ ایسا ہو وہ کبھی بھلائی کا منہ نہیں دیکھ سکتا۔''

حضرت عمرو بن مُرّہ رضی اللہ عنہ اس نابکار کے جواب میں فرماتے تھے:

''ہم میں سے جو جھوٹا ہو خدا اس کے عیش کو تلخ اس کی آنکھوں کو اندھا اور اس کی زبان کو گونگا کر دے۔''

حافظ ابنِ کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ''تاریخ'' میں خود حضرت عمرو بن مُرّہ رضی اللہ عنہ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ خدا کی قسم یہ شخص اس وقت تک نہ مرا جب تک وہ گونگا بہرا اور اندھا نہ ہو گیا اور اس کا منہ گل کر گر نہ پڑا۔ یہ اس کے لیے ایسی مصیبت تھی جس نے اس کو کھانا کھانے سے بھی محروم کر دیا تھا۔

کچھ مدّت بعد حضرت عمرو بن مُرّہ رضی اللہ عنہ اپنے قبیلے کو ساتھ لے کر بارگاہِ رسالت ﷺ میں حاضر ہوئے۔ حضور ﷺ نے انہیں زندگی میں برکت اور رزق میں کشائش کی دعا دی اور ان کے لیے ایک فرمان لکھ دیا جس کا خلاصہ یہ ہے:

''اے مسلمانانِ جہینہ، تمہارے لیے جہینہ کی ساری زمین ہے نرم اور پتھریلی، چشمے اور وادیاں، تم جہاں چاہو اپنے جانوروں کو چراؤ اور جہاں پانی پاؤ اپنے استعمال میں لاؤ۔ بشرطیکہ مالِ غنیمت کا پانچواں حِصّہ دیتے رہو اور پانچوں وقت کی نمازیں ادا کرتے رہو اور بھیڑ بکریوں کے دو ریوڑ یکجا ہوں (یعنی ایک سو بیس بکریاں ہوں) تو دو بکریاں نکالی جائیں گی اور

اگر ایک ایک ریوڑ ہو تو چالیس میں سے ایک بکری نکالی جائے گی۔ کھیتی میں کام آنے والے بیلوں پر کوئی صدقہ نہیں اور نہ کسی کنوئیں سے زمین کو پانی دینے والی اونٹنیوں پر''

اس فرمان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اس وقت لکھا گیا جب حضور ﷺ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے آئے تھے اور اسلام ایک غالب قوت کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عمرو بن مُرّہ رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کا صحیح زمانہ کیا تھا۔ علامہ ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ''اُسد الغابہ'' میں لکھا ہے کہ انہوں نے ہجرتِ نبوی سے پہلے مکہ آ کر اس وقت سعادتِ ایمانی حاصل کی جب مشرکین نے اسلام کی مخالفت میں طوفان برپا کر رکھا تھا۔ لیکن حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ''اِصابہ'' میں یہ بیان کیا ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد حضرت عمرو بن مُرّہ رضی اللہ عنہ نے سیّدنا حضرت مُعاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے قرآن کی تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد اپنے قبیلہ میں واپس جا کر لوگوں کو اسلام کی دعوت دی۔ ان کی تبلیغی مساعی کے نتیجہ میں سارا قبیلہ چند دن کے اندر اندر سعادت اندوزِ اسلام ہو گیا۔ اگر حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کو درست مانا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عمرو بن مُرّہ رضی اللہ عنہ نے ہجرتِ نبوی کے بعد مدینہ آ کر اسلام قبول کیا۔ ان دونوں روایتوں کی تطبیق اس طرح ہو سکتی ہے کہ حضرت عمرو بن مُرّہ رضی اللہ عنہ نے ہجرتِ نبوی سے پہلے مکہ آ کر اسلام قبول کیا اور اپنے وطن واپس چلے گئے۔ ہجرتِ نبوی کے بعد وہ دوبارہ حضور ﷺ کی خدمت میں مدینہ منوّرہ آئے، حضرت مُعاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے قرآن کی تعلیم حاصل کی اور پھر اپنے قبیلے میں واپس جا کر اسے بھی مشرّف بہ اسلام کیا۔ اس کے بعد اپنے اہلِ قبیلہ کو ساتھ لے کر بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور محولہ بالا فرمان یا وثیقہ حاصل کیا۔

(۴)

اربابِ سِیَر نے حضرت عمرو بن مُرّہ رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کا واقعہ تفصیل سے بیان،

کیا ہے لیکن انہوں نے عہدِ رسالت میں حضرت عمرو بن مُرّہ رضی اللہ عنہ کی دوسری سرگرمیوں کا ذکر نہیں کیا۔ البتہ "طبقات الکبیر" میں علامہ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ کاتب الواقدی نے اتنا ضرور لکھا ہے کہ عمرو بن مُرّہ رضی اللہ عنہ کو جہادِ فی سبیل اللہ کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت عمرو بن مُرّہ رضی اللہ عنہ بعض غزواتِ نبوی میں ضرور شریک ہوئے ہوں گے۔ مخدوم محمد ہاشم سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "بذل القوۃ" میں لکھا ہے کہ حضور ﷺ نے ۷ ہجری میں ایک مہم حضرت عمرو بن مُرّہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں اپنے چچازاد بھائی ابوسفیان بن حارث بن عبدالمُطّلِب کی طرف بھیجی۔ وہ قبیلہ جہینہ اور مزینہ کے چند رفقاء کے ساتھ اس مہم پر گئے اور مخالف فریق کو شکست دے کر واپس آئے۔ (ابوسفیان فتحِ مکہ کے موقع مشرّف بہ اسلام ہو گئے) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے خلافت میں شام فتح ہوا تو بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے شام میں مستقل سکونت اختیار کر لی ان میں حضرت عمرو بن مُرّہ رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ شام میں ان کی زندگی کے لیل و نہار لوگوں کو قرآن و سُنّت اور اوامر و نواہی کی تعلیم دینے میں گزرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں قلبِ گداز عطا کیا تھا، مخلوقِ خدا کی خدمت اور خیر خواہی کو اپنا جزوِ ایمان سمجھتے تھے۔ حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ نے "اِصابہ" میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ انہوں نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر یہ حدیث بیان کی کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ جو امام (حاکم) محتاجوں، دوستوں اور حاجت مندوں کے لیے اپنا دروازہ بند کرے گا تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی حاجتوں اور دُعاؤں کے لیے آسمان کے دروازے بند کر دے گا۔

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث بڑے غور سے سُنی اور اسی وقت ایک خاص افسر اس کام کے لیے مقرر کر دیا کہ وہ لوگوں کی حاجتیں اور ضرورتیں معلوم کرے اور انہیں پورا کرے۔

حضرت عمرو بن مُرّہ رضی اللہ عنہ نے طویل عمر پائی اور اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان کے عہدِ حکومت میں کسی وقت سفرِ آخرت اختیار کیا۔

حضرت عمرو بن مُرّہ رضی اللہ عنہ کے صحیفہ اخلاق میں اخلاص فی الدین کا پہلو سب سے نمایاں ہے۔ اپنے اشعار میں بڑے جوش وخروش سے اسلام پر فخر کا اظہار کیا کرتے تھے اس کا نمونہ یہ شعر ہیں۔

انی شرعت الان فی حوض التقی
و خرجت من عقد الحیاۃ سلیما
و لبست الثواب الحلیم فاصبحت
اُمّ الغوایۃ من ھویٰ عقیما

یعنی میں تقویٰ کے حوض میں تیرا اور زندگی کی مشکلات سے صحیح سالم نکل آیا۔ میں نے حلیم کا لباس پہن لیا اور گمراہیوں کی ماں میری خواہش سے نا امید ہوگئی۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ
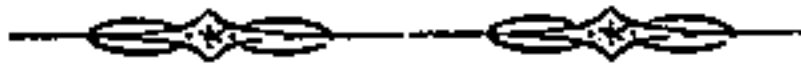
حضرت سعد الاسود سہمی رضی اللہ عنہ

(۱)

رحمتِ عالم ﷺ ایک دن اپنے چند جاں نثاروں کے حلقے میں تشریف فرما تھے کہ نہایت بے ڈول جسم اور بھدے چہرے مہرے کے ایک سیاہ فام شخص ڈرتے جھجکتے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

''اے اللہ کے رسول ﷺ، جیسا کہ آپ ﷺ دیکھ رہے ہیں میں نہایت بدصورت اور سیاہ فام آدمی ہوں۔ لوگ مجھ کو دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیتے ہیں، کیا مجھ جیسا کریہہ منظر آدمی بھی جنت میں داخل ہو سکے گا۔''

سرورِ عالم ﷺ نے ان پر لطف و کرم سے بھرپور نظر ڈالی اور فرمایا:

''اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، تمہیں تمہاری بدصورتی اور سیاہ رنگت جنت میں داخل ہونے سے ہرگز نہ روکے گی، لیکن شرط یہ ہے کہ اللہ سے ڈرو اور میری رسالت پر ایمان لاؤ۔''

حضور ﷺ کا ارشاد سن کر ان صاحب کا چہرہ فرطِ مسرت سے چمک اٹھا اور ان کی زبان پر بے اختیار کلمہ شہادت جاری ہو گیا۔ سعادت اندوزِ اسلام ہونے کے بعد انہوں نے بارگاہِ رسالت ﷺ میں عرض کیا:

''یا رسول اللہ میرے حقوق کیا ہیں؟''

فرمایا:

''تمہارے حقوق وہی ہیں جو دوسرے مسلمانوں کے ہیں اور تم پر وہی فرائض ہیں جو دوسرے مسلمانوں کے ہیں اور تم ان کے بھائی ہو......''

یہ سیاہ فام کم رُو صاحب جن کو اسلام لانے کے صلے میں خود سیّد المرسلین ﷺ نے جنت کی بشارت دی، سیّدنا حضرت سعد الاسود رضی اللہ عنہ تھے۔

(۲)

حضرت سعد الاسود رضی اللہ عنہ کا اصل نام تو سعد تھا لیکن ان کی غیر معمولی سیاہ رنگت کی وجہ سے لوگ ان کو ''سعد الاسود'' یا ''اسود'' کہا کرتے تھے (جیسا کہ ہمارے ملک میں سیاہ فام آدمی کو لوگ کالو یا کالا کہہ کر پکارتے ہیں) اربابِ سِیَر نے حضرت سعد الاسود رضی اللہ عنہ کا سلسلہ نسب تو بیان نہیں کیا۔ البتہ یہ بات تواتر کے ساتھ لکھی ہے کہ ان کا تعلق قریش کے قبیلہ بنو سہم سے تھا۔ (مشہور صحابی حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فاتح مصر بھی اسی قبیلے سے تھے) ان کے قبولِ اسلام کے زمانے کی بھی کسی کتاب میں صراحت نہیں کی گئی۔ لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس وقت شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہوئے جب حضور ﷺ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں تشریف فرما تھے اور غزوات و سرایا کا آغاز ہو چکا تھا۔

علامہ ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ قبولِ اسلام کے بعد (اسی مجلس میں یا ایک دوسری روایت کے مطابق چند دن بعد) حضرت سعد الاسود رضی اللہ عنہ نے بارگاہِ رسالت میں عرض کیا:

> ''یارسول اللہ میں نکاح کرنا چاہتا ہوں لیکن کوئی شخص میری بدصورتی کے سبب مجھ کو رشتہ دینے پر راضی نہیں ہوتا۔ میں نے بہت سے لوگوں کو پیام دیئے لیکن سب نے رَد کر دیئے۔ ان میں سے کچھ یہاں موجود ہیں اور کچھ غیر حاضر ہیں۔''

رحمتِ عالم ﷺ جانتے تھے کہ اس سیاہ فام شخص کو اللہ تعالیٰ نے نورانی جبلّت عطا کی ہے اور جوشِ ایمان اور اخلاص فی الدین کے اعتبار سے اس کا مرتبہ بہت بلند ہے۔
حضور ﷺ سراپا رحمت تھے۔ بیکسوں اور حاجت مندوں کے ملجا و ماویٰ تھے، اپنے

ایک جان نثار کی بیکسانہ درخواست سُن کر آپ ﷺ کی شانِ رحیمی نے گوارا نہ کیا کہ لوگ اس کو محض اس وجہ سے ٹھکرائیں کہ وہ ظاہری حسن و جمال سے محروم ہے۔ آپ نے فرمایا: ''سعد، گھبراؤ نہیں، میں خود تمہاری شادی کا بندوبست کرتا ہوں، تم اسی وقت عمرو بن وہب ثقفی رضی اللہ عنہ کے گھر جاؤ اور سلام کے بعد ان سے کہو کہ رسول اللہ ﷺ نے آپ کی بیٹی کا رشتہ میرے ساتھ کر دیا ہے۔''

حضور ﷺ کا ارشاد سن کر حضرت سعد الاسود رضی اللہ عنہ شاداں و فرحاں حضرت عمرو بن وہب رضی اللہ عنہ کے گھر کی طرف چل دیئے۔

(۳)

حضرت عمرو بن وہب ثقفی رضی اللہ عنہ نئے نئے مسلمان ہوئے تھے اور ابھی ان کے مزاج میں زمانہ جاہلیت کی درشتی موجود تھی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ان کے گھر پہنچ کر انہیں سرورِ عالم ﷺ کے فرمان سے مطلع کیا تو ان کو بڑی حیرت ہوئی کہ میری ماہ پیکر ذہین و فطین لڑکی کی شادی ایسے کریہہ منظر شخص سے کیسے ہو سکتی ہے۔ انہوں نے سوچے سمجھے بغیر حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا پیام رَد کر دیا اور بڑی سختی کے ساتھ انہیں واپس جانے کے لیے کہا۔ سعادت مند لڑکی نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ اور اپنے باپ کی گفتگو سن لی تھی، جونہی حضرت سعد رضی اللہ عنہ واپس جانے کے لیے مڑے وہ لپک کر دروازے پر آئی اور آواز دی:

> ''اللہ کے بندے واپس آؤ، اگر واقعی رسول اللہ ﷺ نے تمہیں بھیجا ہے تو میں بخوشی تمہارے ساتھ شادی کے لیے تیار ہوں جس بات سے اللہ اور اس کا رسول ﷺ راضی ہیں میں بھی اس پر راضی ہوں۔''

اس اثناء میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ آگے بڑھ چکے تھے، معلوم نہیں انہوں نے لڑکی کی بات سنی یا نہیں بہر صورت بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر سارا واقعہ عرض کر دیا۔ اُدھر ان کے جانے کے بعد نیک بخت لڑکی نے اپنے والد سے کہا۔ ''ابا قبل اس کے کہ اللہ آپ کو رسوا کرے آپ اپنی نجات کی کوشش کیجئے۔ آپ نے بڑا غضب کیا کہ رسول اللہ ﷺ

کے فرمان کی پروانہ کی اور حضور ﷺ کے فرستادہ کے ساتھ درشت سلوک کیا۔''

عمرو بن وہب رضی اللہ عنہ نے لڑکی کی بات سنی تو اپنے انکار پر سخت پشیمان ہوئے اور ڈرتے ہوئے بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوئے۔ حضور ﷺ نے ان کو دیکھ کر فرمایا:

''تم ہی نے میرے بھیجے ہوئے آدمی کو لوٹایا تھا۔''

عمرو بن وہب رضی اللہ عنہ نے عرض کی ''یارسول اللہ بیشک میں نے اس آدمی کو لوٹایا تھا لیکن یہ غلطی لاعلمی میں سرزد ہوئی۔ میں اس شخص سے واقف نہ تھا۔ اس لیے اس کی بات کا اعتبار نہ کیا اور اس کا پیام نامنظور کر دیا، خدا کے لیے مجھے معاف فرما دیجئے۔ مجھے اپنی لڑکی کی شادی اس شخص سے بسرو چشم منظور ہے۔''

حضور ﷺ نے حضرت عمرو بن وہب رضی اللہ عنہ کا عذر قبول فرمایا اور حضرت سعد الاسود رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''سعد میں نے تمہارا عقد بنتِ عمرو بن وہب سے کر دیا۔ اب تم اپنی بیوی کے پاس جاؤ۔''

(۴)

رحمتِ عالم ﷺ کا ارشاد سن کر حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو بے حد مسرت ہوئی، بارگاہِ نبوی ﷺ سے اٹھ کر سیدھے بازار گئے اور ارادہ کیا کہ نو بیاہتا بیوی کے لیے کچھ تحائف خریدیں۔ ابھی کوئی چیز نہیں خریدی تھی کہ ان کے کانوں میں ایک منادی کی آواز پڑی جو پکار رہا تھا:

''اے اللہ کے شہسوارو، جہاد کے لیے سوار ہو جاؤ اور جنت کی بشارت لو۔''

سعد رضی اللہ عنہ نوجوان تھے۔ نئی نئی شادی ہوئی تھی، دل میں ہزار امنگیں اور ارمان تھے بار ہا مایوس ہونے کے بعد شادی کا مژدہ فردوسِ گوش ہوا تھا لیکن منادی کی آواز سن کر تمام جذبات پر جوشِ ایمانی غالب آ گیا اور نو عروس کے لیے تحائف خریدنے کا خیال دل سے یکسر کافور ہو گیا، جو رقم اس مقصد کے لیے ساتھ لائے تھے، اس سے گھوڑا، تلوار اور نیزہ

خریدا اور سر پر عمامہ باندھ کر سرورِ عالم ﷺ کی قیادت میں غزوہ پر جانے والے مجاہدین میں جا شامل ہوئے۔ اس سے پہلے نہ اُن کے پاس گھوڑا تھا، نہ نیزہ و تلوار اور نہ انہوں نے کبھی عمامہ اس طرح باندھا تھا اس لیے کسی کو معلوم نہ ہوا کہ یہ سعد الاسود رضی اللہ عنہ ہیں۔ میدانِ جہاد میں پہنچ کر سعد رضی اللہ عنہ ایسے جوش و شجاعت کے ساتھ لڑے کہ بڑے بڑے بہادروں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ ایک موقعہ پر گھوڑا اڑ گیا تو اس کی پشت پر سے کود پڑے اور آستینیں چڑھا کر پیادہ پا ہی لڑنا شروع کر دیا۔ اس وقت حضور ﷺ نے ان کے ہاتھوں کی سیاہی دیکھ کر شناخت کر لیا اور آواز دی ''سعد'' لیکن سعد رضی اللہ عنہ اس وقت دنیا و مافیہا سے بے خبر اس جوش و وارفتگی کے ساتھ لڑ رہے تھے کہ اپنے آقا و مولا ﷺ کی آواز کی بھی خبر نہ ہوئی، اسی طرح دادِ شجاعت دیتے ہوئے جُرعہ شہادت نوش کیا اور عروسِ نو کے بجائے حورانِ جنت کی آغوش میں پہنچ گئے۔

رحمتِ عالم ﷺ کو حضرت سعد الاسود رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر ہوئی تو آپ ﷺ ان کی لاش کے پاس تشریف لائے، ان کا سر اپنی گود میں رکھ کر دُعائے مغفرت کی اور پھر فرمایا:

''میں نے سعد رضی اللہ عنہ کا عقد عمرو بن وہب کی لڑکی سے کر دیا تھا اس لیے اس کے متروکہ سامان کی مالک وہی لڑکی ہے۔ سعد رضی اللہ عنہ کے ہتھیار اور گھوڑا اسی کے پاس پہنچا دو اور اس کے ماں باپ سے جا کر کہہ دو کہ اب خدا نے تمہاری لڑکی سے بہتر لڑکی سعد کو عطا کر دی اور اس کی شادی جنت میں ہو گئی۔''

قبولِ اسلام کے بعد حضرت سعد الاسود رضی اللہ عنہ نے اس دنیائے فانی میں بہت کم عرصہ قیام کیا لیکن اس مختصر مدّت میں انہوں نے اپنے جوشِ ایمان اور اخلاصِ عمل کے جو نقوش صفحہ تاریخ پر ثبت کیے وہ اُمّتِ مسلمہ کے لیے تا ابد مشعلِ راہ بنے رہیں گے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

حضرت سُراقہ بن جُعشُم مُدلجی

(۱)

رحمتِ عالم ﷺ نے غزوۂ حُنین وطائف (۸ ھ) سے فارغ ہونے کے بعد چند دن جِعرانہ کے مقام پر قیام فرمایا اور پھر مدینہ منوّرہ کو مراجعت فرمائی۔ اسی زمانے میں چوڑے چکلے ہاڑ کے ایک قوی ہیکل اعرابی مدینہ منوّرہ میں وارد ہوئے۔ یہ صاحب تازہ تازہ سعادت اندوزِ اسلام ہوئے تھے اور اب اپنی گزشتہ زندگی کی تلافی کرنے کے لیے ذاتِ رسالت مآب ﷺ کے فیوض و برکات سے مقدور بھر متمتع ہونا چاہتے تھے چنانچہ ان کے وقت کا بیشتر حصّہ بارگاہِ رسالت ﷺ میں گزرتا تھا اور وہ اکثر حضور ﷺ سے دینی مسائل پوچھتے رہتے تھے۔ سرورِ عالم ﷺ بھی ان پر بڑی شفقت فرماتے تھے اور ان کی تعلیم و تربیت پر خاص توّجہ دیتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"جانتے ہو دوزخیوں اور جنتیوں کی کیا پہچان ہے؟"

انھوں نے عرض کیا: "میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان آپ ہی ارشاد فرمایئے۔"

ہادیٔ کونین ﷺ نے فرمایا: "دوزخی وہ ہے جو متکبر، درشت مزاج اور اکڑ کر چلنے والا ہو اور جنتی وہ (صاحبِ ایمان) ہے جو ضعیف درماندہ اور زیرِ دست ہو۔"

ایک اور موقع پر اُن صاحب حضور ﷺ سے دریافت کیا "یارسول اللہ ﷺ، میں نے اپنے اونٹ کے لیے ایک حوض میں پانی بھرا ہو اور کوئی بھٹکا ہوا اونٹ میرے حوض پر آجائے تو کیا اس بھٹکے ہوئے اونٹ کو پانی پلانے سے مجھے کوئی اجر ملے گا۔"

حضور ﷺ نے فرمایا: ''کیوں نہیں کسی بھی ذی روح کو پانی پلانا ثواب کا باعث ہے۔''

غرض ان صاحب نے بڑے ذوق وشوق کے ساتھ فیضانِ نبوی ﷺ سے بہرہ یاب ہونے کا سلسلہ برابر جاری رکھا یہاں تک کہ آفتابِ رسالت ﷺ اللہ تعالیٰ کی شفقِ رحمت میں مستور ہو گیا...... یہ صاحبِ رسول رضی اللہ عنہ جن کے دل میں تعلیمِ دین کے حصول کی اس قدر تڑپ تھی اور جن کو سرورِ عالم ﷺ غیر معمولی لطف وکرم سے نوازتے تھے، حضرت سراقہ بن جُعشم مُدلجی رضی اللہ عنہ تھے۔

(۲)

حضرت سُراقہ رضی اللہ عنہ جُعشم تاریخِ اسلام کی ایک نامور شخصیت ہیں۔ ان کے والد کا نام مالک اور دادا کا نام جُعشُم تھا، چونکہ عرب میں باپ کے بجائے دادا کی طرف ابنیت کے منسوب کرنے کا رواج بھی پایا جاتا تھا اس لیے اہلِ سِیَر نے ان کا نام سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ اور سُراقہ بن جُعشُم رضی اللہ عنہ دونوں طرح لکھا ہے۔ خود حضرت سراقہ رضی اللہ عنہ سے جو روایات مروی ہیں۔ ان میں انہوں نے اپنے آپ کو سُراقہ بن جُعشُم رضی اللہ عنہ ہی کہا ہے۔ حضرت سراقہ رضی اللہ عنہ کی کنیت ابوسفیان تھی اور ان کا تعلق کنانہ کی شاخ بنو مُدلج سے تھا۔ سلسلہ نسب یہ ہے:

سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ بن جُعشُم بن مالک بن عمرو بن تیم بن مدلج بن مرہ بن عبد مناۃ بن علی بن کنانہ

بنو مُدلج کا علاقہ مکہ اور مدینہ کے راستے میں قدید کے قریب واقع تھا۔ سُراقہ رضی اللہ عنہ اپنے قبیلے کے رئیس اور بڑے قد کاٹھ کے آدمی تھے۔ شعر وشاعری میں بھی درک رکھتے تھے اور ان کی شجاعت اور شہسواری کی دُور دُور تک دھوم مچی ہوئی تھی۔ بنو مُدلج سخت بُت پرست تھے اور انہوں نے ''لات'' کو اپنا معبودِ اعظم بنا رکھا تھا۔ رحمتِ عالم ﷺ تیرہ برس تک اہلِ مکہ اور عرب کے دوسرے قبائل کو توحید کی دعوت دیتے رہے، لیکن اس

طویل عرصے میں بہت کم لوگوں کو قبولِ حق کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس دوران میں حضور ﷺ عرب میں ''صاحبِ قریش'' کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔ بنومُدلج کو بھی حضور ﷺ کی بعثت کا حال معلوم ہو چکا تھا اور ان کے کان آپ ﷺ کی دعوت سے بھی آشنا ہو چکے تھے، لیکن انہوں نے اپنے آبائی مذہب کو ترک کرنا گوارا نہ کیا اور بدستور کفر و شرک کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے رہے۔

۱۴ھ بعدِ بعثت میں سرورِ عالم ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ کی معیت میں سفرِ ہجرت کا آغاز فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے مشرکین کی آنکھیں چٹم کر دیں اور حضور ﷺ ان کے درمیان سے نکل کر عازمِ مدینہ ہو گئے۔ کفارِ مکہ کو آپ ﷺ کی ہجرت کا علم ہوا تو وہ سٹپٹا کر رہ گئے اور انہوں نے آپ ﷺ کی تلاش میں دن رات ایک کر دیئے۔ جب وہ اپنی سعی و جستجو میں بالکل ناکام ہو گئے تو انہوں نے مکہ سے مدینہ تک ہر معروف اور غیر معروف راستے اور ان پر آباد بستیوں میں منادی کرا دی کہ:

> ''جو شخص محمد (ﷺ) اور ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کو زندہ گرفتار کر کے ہمارے حوالے کر دے یا انہیں قتل کر کے ہمارا اطمینان کر دے تو اسے ان میں سے ہر ایک کی پوری دِیَت دی جائے گی۔'' (یعنی سو۱۰۰ سو۱۰۰ اشتر انعام میں دیئے جائیں گے)۔

(صحیح بخاری ج ا باب ہجرۃ النبی)

قریشِ مکہ کے قاصدوں نے بنومُدلج تک بھی یہ اعلان پہنچا دیا۔ اس کے بعد سراقہ رضی اللہ عنہ اپنے قبیلے بنومُدلج کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص بھاگا بھاگا آیا اور ان سے کہا، ابھی میں نے ساحلِ بحر کی طرف کچھ سائے دیکھے ہیں۔ میرا گمان یہ ہے کہ وہ محمد (ﷺ) کے ساتھی ہیں۔ سراقہ رضی اللہ عنہ بڑے ذہین و فریس آدمی تھے وہ سمجھ گئے کہ اس آدمی کا گمان درست ہے تاہم انہوں نے مصلحتاً اس شخص کے بیان کی تصدیق نہ

کی بلکہ یہ کہہ کر تردید کر دی کہ یہ فلاں فلاں آدمی ہوں گے جو کچھ دیر پہلے ہمارے سامنے سے گزر کر گئے ہیں۔ اس تردید کا مقصد یہ تھا کہ وہ اپنے قبیلے کے کسی دوسرے آدمی کو شریک کیے بغیر اکیلے ہی انعام حاصل کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ مجلس میں تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد گھر گئے۔ ہتھیار سجائے اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر خاموشی کے ساتھ گھر کی پچھلی جانب سے ساحلِ بحر کی طرف روانہ ہو گئے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ انہوں نے اپنی قابلِ اعتماد لونڈی سے کہا کہ میرا گھوڑا تیار کر کے اور ترکش باندھ کر فلاں مقام پر لے چلو پھر نیزہ سنبھال کر چپکے سے گھر کی پشت سے نکلے اور لونڈی سے گھوڑا لے کر حضور ﷺ کے تعاقب میں روانہ ہو گئے۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ اس وقت حضور ﷺ رابغ کے موجودہ قلعہ اور ساحلِ بحر کے درمیانی میدان سے گزر رہے تھے۔ سُراقہ گھوڑا اڑاتے ہوئے حضور ﷺ کی طرف بڑھ رہے تھے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انہیں دیکھ لیا، بے تاب ہو کر حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کی، ''یا رسول اللہ ﷺ دشمن ہمارے سر پر آ پہنچا'' حضور ﷺ نے فرمایا: ''غم نہ کرو اللہ ہمارے ساتھ ہے۔'' اتنے میں سُراقہ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے قریب پہنچ گئے۔ اس وقت یکا یک ان کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور وہ نیچے گر پڑے۔ انہوں نے اپنے ترکش سے ازلام (تفاول میں کام آنے والے تیر) نکالے اور فال دیکھی تو وہ ان کی خواہش کے خلاف نکلی، تاہم انہوں نے اس کی کچھ پروا نہ کی۔ دوبارہ گھوڑے پر سوار ہو کر حضور ﷺ کے پیچھے روانہ ہوئے اور اس قدر قریب پہنچ گئے کہ حضور ﷺ کی تلاوت کی آواز ان کے کانوں میں پہنچنے لگی۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اب یک لخت ان کے گھوڑے کے پاؤں زمین میں رانوں تک دھنس گئے اور وہ منہ کے بل زمین پر گر پڑے۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے خود حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے یہ روایت کی ہے کہ اس وقت ہم سخت زمین سے گزر رہے تھے، میں نے حضور ﷺ کی خدمت میں التماس کی، یا رسول اللہ ﷺ ہمارا تعاقب کرنے والا ہمارے بہت قریب آ پہنچا ہے۔ اس پر حضور ﷺ نے بارگاہِ ربّ

العزت میں دُعا کی اور سُراقہ کا گھوڑا زمین میں پیٹ تک دھنس گیا۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اس موقع پر حضور ﷺ نے یہ دعا کی کہ الٰہی اسے گرا دے۔ دوبارہ گرنے کے بعد سراقہ نے پھر فال نکالی اور اب بھی وہ ان کی خواہش کے خلاف تھی۔ انہوں نے بہت کوشش کی کہ گھوڑے کے پاؤں زمین سے باہر نکل آئیں، لیکن ناکام رہے آخر نہ اُمید ہو کر پکارے، ''یا محمد ﷺ! مجھ پر جو کچھ بیتی ہے اس نے میری آنکھیں کھول دی ہیں، آپ دعا کریں کہ میرا گھوڑا زمین سے نکل آئے خدا کی قسم مجھ سے آپ ﷺ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔'' رحمتِ عالم ﷺ کو ان پر رحم آ گیا اور آپ ﷺ نے دستِ دُعا اٹھا دیئے معاً گھوڑے کے پاؤں زمین سے نکل آئے۔ اب سُراقہ نے آواز دی کہ میں سُراقہ بن جُعشُم ہوں اور آپ ﷺ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں، خدا کی قسم میں آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچاؤں گا اور نہ کوئی ایسی بات کروں گا جسے آپ ﷺ ناپسند کریں گے۔ پھر انہوں نے آگے بڑھ کر حضور ﷺ کو بتایا کہ قریش مکہ نے آپ کے لیے دِیَت کا اعلان کیا ہے اور لوگ انعام کے لالچ میں آپ کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ آپ میرا یہ تیر بطور نشان لیتے جایئے، فلاں مقام پر آپ کو کچھ غلام ملیں گے جو میرے اونٹ چرا رہے ہوں گے ان میں سے جتنے غلاموں اور اونٹوں کی ضرورت ہو اپنے ساتھ لیتے جایئے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ سُراقہ رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کو زادِ راہ اور سامان کی پیش کش کی، لیکن آپ ﷺ نے فرمایا، ہمیں کسی چیز کی حاجت نہیں البتہ تم ہماری اطلاع کسی کو نہ دو۔ حضرت سراقہ رضی اللہ عنہ نے قسم کھا کر کہا کہ میں دشمنوں کی جستجو کو آپ کی طرف سے پھیر دوں گا۔ پھر انہوں نے حضور ﷺ سے درخواست کی کہ مجھے ایک امان نامہ عطا فرمایئے جو بطورِ نشانی میرے پاس رہے۔ حضور ﷺ نے حضرت عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ اور بہ روایتِ دیگر حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ اس کو امان نامہ دے دو۔ انہوں نے چمڑے کے ایک ٹکڑے پر لکھ کر ان کی طرف ڈال دیا۔ سُراقہ رضی اللہ عنہ نے اس امان نامہ کو اپنے توشہ دان میں رکھ لیا اور واپس چل

پڑے۔راستے میں اُن کو جو شخص حضور ﷺ کی تلاش میں آتا دکھائی دیتا، اس سے کہتے، واپس جاؤ۔ میں ہر طرف سے دیکھ بھال کر آیا ہوں وہ اُدھر نہیں ہیں، تم سب لوگ جانتے ہو کہ تیزی نظر اور سراغ لگانے میں مجھ سے بڑھ کر اس علاقے میں اور کوئی نہیں۔

(۳)

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سراقہ رضی اللہ عنہ اپنی خداداد فراست سے جان گئے تھے کہ حضور ﷺ، اللہ کے رسول ہیں اور ایک دن ضرور غالب آئیں گے۔ یہی سبب تھا کہ انہوں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر حضور ﷺ سے امان نامہ حاصل کر لیا۔ اس واقعہ کے بارے میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے جو روایت منقول ہے اس میں حضرت سراقہ رضی اللہ عنہ سے یہ الفاظ منسوب ہیں کہ ''اے اللہ کے نبی ﷺ آپ جو چاہیں مجھے اس کا حکم دیں۔'' اس پر حضور ﷺ نے فرمایا، تم اپنی جگہ ٹھہرو اور کسی کو ہم تک نہ پہنچنے دو، چنانچہ انہوں نے آپ ﷺ کے ارشاد کی تعمیل کی۔''

حضرت سراقہ رضی اللہ عنہ کے بھتیجے عبدالرحمٰن بن حارث (بن مالک بن جعشم) نے یہ واقعہ قدرے مختلف انداز میں بیان کیا ہے وہ کہتے ہیں:

''سُراقہ بدن پر ہتھیار سجائے، سر پر خُود پہنے، نیزہ تانے اپنی گھوڑی (عُوذ) پر رسول اللہ ﷺ کے تعاقب کے لیے روانہ ہوئے۔ جب حضور ﷺ پر نظر پڑی تو سمجھے کامیاب ہو گیا۔ یکا یک گھوڑی گھٹنوں کے بَل گری سُراقہ بھی گرے، پھر اُٹھے، گھوڑی کو اٹھا کر سوار ہوئے، رسول اللہ ﷺ قرآنِ حکیم کی تلاوت کرتے ہوئے اطمینان سے جا رہے تھے کہ آپ ﷺ کو دشمن کے قریب پہنچنے کی اطلاع کی گئی۔ آپ ﷺ نے دُعا کی، خدایا ہمیں اس کے شر سے بچا۔ معاً گھوڑی کے پاؤں زمین میں دھنس گئے۔ سراقہ گر پڑے اور سمجھ گئے کہ جس کی اللہ حفاظت کر رہا ہو اس پر غالب آنا محال ہے۔ انہوں نے بڑی عاجزی سے امان مانگی جوان کو مل

گئی۔ اب انہوں نے آگے بڑھ کر عرض کیا، اب میں ہر تعاقب کرنے والے کو پیچھے ہی روک لوں گا۔ پھر ان کی درخواست پر حضور ﷺ نے حضرت عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ کو حکم دیا اور انہوں نے امان نامہ لکھ کر سراقہ رضی اللہ عنہ کے حوالے کر دیا۔" (صحیح بخاری)

اس واقعہ کے چند روز بعد سُراقہ رضی اللہ عنہ مکہ گئے تو ابوجہل سے ملاقات ہوگئی اس کو علم ہو چکا تھا کہ سُراقہ رضی اللہ عنہ نے دانستہ رسولِ اکرم ﷺ کو چھوڑ دیا، چنانچہ اس نے شکوہ و شکایت کے دفتر کھول دیئے۔ حضرت سراقہ رضی اللہ عنہ نے ابوجہل کی شکایتوں کا جواب ان اشعار میں دیا: (ترجمہ)

"اے ابوالحکم (ابوجہل) کاش تم میرے گھوڑے کی حالت دیکھتے کہ کس طرح اس کی ٹانگیں زمین میں دھنس گئی تھیں تو تم کو تعجب ہوتا اور تم کو اس میں کوئی شک نہ رہتا کہ محمد ﷺ نبی اور نشانِ ہدایت ہیں۔ پھر کون ہے جو ان کی حالت کو مخفی اور مستور کر سکے تمہارے قوم کو چاہیے کہ ان سے تعرض نہ کرے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ ان کے غلبہ اور عروج کے آثار جلد ہی سب دنیا پر ظاہر ہونے لگیں گے۔"

ہجرتِ نبوی کے موقعہ پر حضرت سراقہ رضی اللہ عنہ پر جو کچھ بیتی اس کی بناء پر انہیں سرورِ عالم ﷺ کی صداقت کا یقین ہو گیا تھا لیکن معلوم نہیں کیا موانع پیش آئے کہ وہ پورے آٹھ برس تک دربارِ نبوّت میں حاضر ہو کر شرفِ اسلام سے بہرہ ور نہ ہو سکے۔ ۸ھ میں مکہ پر پرچم اسلام بلند ہوا تو اس کی خبر عرب کے گوشے گوشے میں پھیل گئی اور دشمنانِ حق پر ہیبت طاری ہوگئی۔ ایک روایت کے مطابق فتح مکہ کے بعد جب حضور ﷺ بیت اللہ میں تشریف فرما تھے اور ایک دوسری روایت کے مطابق جب آپ ﷺ حنین اور طائف کے معرکوں سے فارغ ہو کر چند دن کے لیے جعرانہ ٹھہر گئے تھے، سراقہ رضی اللہ عنہ بارگاہِ رسالت ﷺ میں حاضر ہوئے۔ اس وقت حضور ﷺ اپنی اونٹنی پر سوار تھے اور

آپ ﷺ کے گرد چند انصاری جاں نثار کھڑے تھے، انہوں نے سراقہ رضی اللہ عنہ کو حضور ﷺ کی جانب بڑھتے دیکھا تو ٹوکا کہ کدھر جا رہے ہو؟ سراقہ رضی اللہ عنہ نے وہی امان نامہ جو انہوں نے ہجرت کے موقع پر حاصل کیا تھا، ہاتھ میں لے کر بلند کیا اور گزارش کی:

''اے اللہ کے رسول ﷺ، میں سراقہ بن جُعشم رضی اللہ عنہ ہوں اور یہ آپ ﷺ کا عطا کیا ہوا امان نامہ ہے۔''

حضور ﷺ نے فرمایا: ''آج ایفائے عہد اور عام کا دن ہے قریب آ جاؤ۔''

سراقہ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے قریب گئے اور کلمہ شہادت پڑھ کر سعادت اندوزِ اسلام ہو گئے۔

(۴)

حافظ ابنِ حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے ''الاصابہ'' میں لکھا ہے کہ حضرت سراقہ رضی اللہ عنہ کی کلائیوں پر گنجان بال تھے۔ حضور ﷺ نے انہیں دیکھ کر فرمایا: ''سراقہ اس وقت تمہاری کیا حالت ہو گی جب تم اپنی ان گچھے دار بالوں سے اٹی ہوئی کلائیوں میں کسریٰ کے کنگن پہنو گے۔''

قبولِ اسلام کے بعد حضرت سراقہ رضی اللہ عنہ زیادہ تر مدینہ منورّہ میں رہے اور فیضانِ نبوی سے بہرہ یاب ہوتے رہے۔ اس دوران میں غزوۂ تبوک پیش آیا۔ قیاس یہ ہے کہ انہوں نے اس غزوے میں حضور ﷺ کی ہم رکابی کا شرف ضرور حاصل کیا ہو گا۔ اس کے بعد حجۃ الوداع میں شریک ہوئے۔ مُسندِ احمد بن حنبل میں ہے کہ حجۃ الوداع کے سفر میں حضور ﷺ عسفان کے مقام پر پہنچے تو حضرت سراقہ رضی اللہ عنہ نے بارگاہِ نبوی ﷺ میں عرض کیا:

''یارسول اللہ ہم کو اس نوزائیدہ قوم کی طرح تعلیم دیجیے جو گویا ابھی ظہور میں آئی ہے، کیا ہمارا یہ عمرہ اسی سال کے لیے ہے یا ہمیشہ کے لیے۔''

حضور ﷺ نے فرمایا، ''نہیں ہمیشہ کے لیے۔''

سرورِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد حضرت سراقہ رضی اللہ عنہ کہاں اور کس حال میں رہے؟ کتبِ سیَر اس کے بارے میں خاموش ہیں، البتہ بہت سے اربابِ سیَر نے یہ واقع تواتر کے ساتھ بیان کیا ہے کہ چند سال بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ایران کا دارالسلطنت مدائن فتح ہو اور کسریٰ کا خزانہ مسلمانوں کے ہاتھ آیا تو اس میں کسریٰ کا تاج، زیور، لباس اور دوسرے شاہی لوازمات بھی تھے۔ یہ سب چیزیں مالِ غنیمت کے اس حصے میں شامل کر دی گئیں جو بارگاہِ خلافت میں بھیجی گئیں۔ حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ''اصابہ'' میں بیان کیا ہے کہ مالِ غنیمت تقسیم ہونے لگا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت سراقہ رضی اللہ عنہ کو بلا کر کسریٰ کا تاج ان کے سر پر رکھا اور شاہی کنگن ان کے ہاتھوں میں پہنا کر شاہی پٹکا ان کی کمر میں باندھا۔ امام سہیلی رضی اللہ عنہ نے ''روض الانف'' میں لکھا ہے کہ اس موقع پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت سُراقہ رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

> ''اے سراقہ رضی اللہ عنہ ہاتھ اٹھاؤ اور کہو کہ حمد اس اللہ کی جس نے یہ چیزیں اس کسریٰ بن ہُرمُز سے چھین لیں جس کا دعویٰ تھا کہ میں لوگوں کا ربّ ہوں اور انہیں بنو مُدلج کے ایک اعرابی سراقہ بن مالک بن جُعشم کو پہنا دیا۔''

حافظ ابنِ قیم رحمۃ اللہ علیہ نے ''زاد المعاد'' میں بیان کیا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت سراقہ رضی اللہ عنہ کو کسریٰ کے کنگن پہنا کر فرمایا: ''اے سراقہ رضی اللہ عنہ اس غنیمت میں یہ کنگن تمہارے حصے میں آئے ہیں۔''

محمد حسین ہیکل مصری نے اپنی کتاب ''عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ'' میں یہ واقعہ اس طرح بیان کیا ہے۔ ''سراقہ بن جُعشم جن کا ہاڑ عرب میں مشہور تھا، بلائے گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا، کسریٰ کا لباس انہیں پہنایا جائے۔ جب وہ لباس پہن کر، ہتھیار سجا کر اور تاج سر پر رکھ کر کھڑے ہوئے تو فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا، پیچھے ہٹو! وہ پیچھے ہٹ گئے۔ پھر فرمایا، آگے بڑھو اور وہ آگے بڑھ گئے۔ اس کے بعد ارشاد ہوا، اللہ اللہ! بنو مُدلج کا ایک

اعرابی اور اس کے جسم پر کسریٰ کا یہ ملبوس! اے سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ! ایسے دن کب کب آتے ہیں کہ تیرے جسم پر کسریٰ اور آلِ کسریٰ کا یہ پُرتکلف شاہانہ لباس تیرے اور تیری قوم کے لیے مجد و شرف کا سبب بنے۔"

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے بیان کے مطابق حضرت سُراقہ بن جُعشُم رضی اللہ عنہ نے ۲۴ھ میں وفات پائی۔ یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا عہدِ خلافت تھا۔ ان سے اٹھارہ حدیثیں مروی ہیں۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ
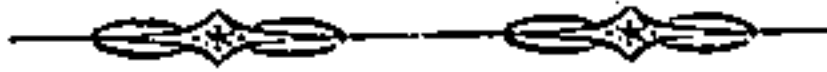
حضرت عِکرمہ بن عَمرو مَخزُومی رضی اللہ عنہ

(۱)

رمضانِ المبارک ۸ ھ ہجری میں فتح مکہ کے بعد رحمتِ عالم ﷺ نے چند دن مکہ معظمہ میں قیام فرمایا۔ اُسی زمانے کا ذکر ہے کہ ایک دن ادھیڑ عمر کے ایک گرانڈیل جوان ، جن کے خدو خال ان کے قرشی اور مکّی ہونے کی غمّازی کر رہے تھے، جھجکتے جھجکتے حضور ﷺ کے کاشانہ اقدس پر حاضر ہوئے۔ ان پر نظر پڑتے ہی سرورِ عالم ﷺ کے روئے انور پر بشاشت پھیل گئی، آپ ﷺ معاً اٹھ کھڑے ہوئے اور اُن صاحب کی طرف اتنی تیزی سے بڑھے کہ ردائے مبارک دوشِ اقدس سے گرگئی، پھر آپ ﷺ نے نہایت گرمجوشی سے ان صاحب کو گلے لگاتے ہوئے فرمایا:......

مرحبا بالزاکب المهاجر   مرحبا بالراکب المهاجر
خوش آمدید اے پردیسی سوار   خوش آمدید اے پردیسی سوار

اُن صاحب نے پاس کھڑی ہوئی ایک نقاب پوش خاتون کی طرف اشارہ کر کے کہا:......

''یا محمد ﷺ اس سے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے مجھے امان دے دی ہے۔''
حضور ﷺ نے فرمایا: ''اس نے سچ کہا ہے، تمہارے لیے امن ہے۔''
حضور ﷺ کا ارشاد سن کر ان صاحب پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ انہوں نے فرطِ ندامت سے سر جھکا لیا اور رِقّت بھرے لہجے میں یوں عرض پیرا ہوئے:......

''میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور میں

شہادت دیتا ہوں کہ بے شک آپ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ خدا کی قسم آپ تمام لوگوں میں سب سے بھلے، سب سے زیادہ صادق و امین اور سب سے زیادہ قول و اقرار کو پورا کرنے والے ہیں۔ بلاشبہ آپ ﷺ نے ہمیں ہمیشہ حق کی طرف بلایا۔ یا رسول اللہ اس سے پہلے میں بارہا اپنی شقاوت اور اسلام دشمنی کا ثبوت دے چکا ہوں آپ کی تکذیب اور آپ کو ستانے کے لیے میں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ اب میری التجا ہے کہ آج تک میں نے آپ کے ساتھ جو دشمنی کی ہے، جس قدر لڑائیاں آپ کے خلاف لڑی ہیں، حق کے راستے میں جس طرح روڑے اٹکائے ہیں اور جو جو ناگفتنی باتیں آپ کے روبرو یا پسِ پشت کہی ہیں، ان سب کو آپ معاف فرمادیں اور میرے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب فرمائیں۔"

رحمتِ عالم ﷺ نے اسی وقت ہاتھ اٹھائے، آسمان کی طرف نظر کی اور بارگاہ ربّ العزت میں یوں دُعا کی:

"الٰہی ہر وہ عداوت جو اس شخص نے میرے ساتھ برتی، اس کی ہر وہ کوشش اور لشکر کشی جو اس نے تیرے نور کو بجھانے کے لیے کی اور اس کی ہر وہ بات جو اس نے میرے روبرو یا پسِ پشت میری آبرو ریزی کے لیے کی، ان سب کو معاف فرمادے۔"

لِسان رسالت ﷺ سے یہ دُعا سن کر ان صاحب کا چہرہ چمک اٹھا اور انہوں نے عرض کیا:

"یا رسول اللہ، آپ کے علم میں جو بات میرے لیے سب سے بھلی ہے، للہ وہ مجھ کو سکھائیے تا کہ میں اس پر ہمیشہ عمل کرتا رہوں۔"

حضور ﷺ نے فرمایا:

"صدقِ دل سے (یعنی اپنے قول اور عمل سے) اللہ کی وحدانیت اور میری

عبدیت اور رسالت کی شہادت دیا کرو اور اللہ کے راستے میں جہاد کرتے رہو۔''

اُن صاحب نے بڑے جوش سے عرض کیا:

''یارسول اللہ، خدا کی قسم میں نے آج تک جس قدر مال دعوتِ حق کو پھیلنے سے روکنے کے لیے صَرف کیا، اس سے دوگنا اب اللہ کی راہ میں خرچ کروں گا اور جس قدر لڑائیاں میں نے حق کے خلاف لڑی ہیں اب اللہ کے راستے میں ان سے دوگنا جہاد کروں گا۔''

سرورِ عالم ﷺ نے ان کے اس عہد اور جذبے کی تحسین فرمائی اور ان کی استقامت کے لیے مکرّر دُعا کی۔ جب وہ صاحب دربارِ رسالت ﷺ سے رخصت ہوئے تو اُن کی آنکھوں سے سیلِ اشک رواں تھا اور ان کا چہرہ نُورِ ایمان سے اس طرح روشن تھا کہ اس پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔

یہ صاحب جن کی آستانہ اسلام پر حاضری، سرورِ عالم ﷺ کی بے حد و نہایت مسَرت اور شادمانی کا باعث ہوئی اور جن کی مغفرت کے لیے ساقی کوثر ﷺ نے بلا تامّل دستِ دُعا پھیلا دیئے، مشہور دُشمنِ اسلام ابوجہل عَمرو بن ہشام کے فرزند عِکرمہ رضی اللہ عنہ تھے۔

(۲)

حضرت عِکرمہ رضی اللہ عنہ کا شمار ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ہوتا ہے جو زمانہ جاہلیت میں اسلام دشمنی میں اپنی نظیر آپ تھے لیکن جنھوں نے قبولِ اسلام کے بعد اپنے جوشِ ایمان، اخلاصِ عمل اور ایثار و قربانی کے ایسے نقوش صفحۂ تاریخ پر ثبت کیے کہ اُن کی تابانی سے آج تک بزمِ عالَم جگمگا رہی ہے۔

حضرت عِکرمہ رضی اللہ عنہ کا تعلق قریش کی مشہور شاخ بنومخزوم سے تھا۔ دورِ جاہلیت میں قریش نے جو عسکری نظام قائم کیا تھا، اس میں فوج کی سپہ سالاری (الاعِنّہ) اور فوجی

کیمپوں کے انتظام اور دیکھ بھال (القُبہ) کی ذمہ داری بنومخزوم ہی سے متعلق تھی۔ اس اعتبار سے امارت اور حکومت حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کے گھر کی لونڈی تھی، سلسلہ نسب یہ ہے:

عکرمہ رضی اللہ عنہ بن عمروؓ (ابوجہل) بن ہشام بن مغیرہ بن عبداللہ بن عمرو بن مخزوم بن یقظہ بن مرّہ بن کعب بن لوی۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے اس دشمنِ اسلام کے گھر جنم لیا جو مشرکینِ قریش کا سرخیل تھا، عقل کے ان اندھوں سے اپنے لیے ''ابوالحکم'' کا لقب سن کر اس بددماغ شخص کی اکڑ اور رعونت میں اور اضافہ ہو جاتا تھا لیکن اس کی اسی بددماغی، تکبّر اور اسلام دشمنی نے اس کو اہلِ حق سے ''ابوجہل'' کا خطاب دلوایا تھا۔ اس خطاب نے ایسی شہرت پائی کہ آج ابوجہل کے اصل نام عَمرو بن ہشام سے بہت کم لوگ آگاہ ہیں۔ ابوجہل نے رحمتِ دوعالم ﷺ کی ایذا رسانی اور حق کی آواز کو دبانے کے لیے مسلسل تیرہ سال تک جو مذموم حرکتیں کیں وہ اس کی شقاوت اور تیرہ بختی کا منہ بولتا ثبوت اور تاریخ کا ایک المناک باب ہیں۔ ابوجہل کی زندگی کا یہی پس منظر تھا کہ جب وہ غزوۂ بدر (۲ ہجری) میں ہلاک ہوا اور اس کا ناپاک سر حضور ﷺ کے سامنے لایا گیا تو آپ ﷺ نے بے ساختہ اس کو خطاب کر کے فرمایا: الحمد لله الذی اخزاك یا عدو الله (ہر قسم کی حمد وستائش اُس اللہ کو سزاوار ہے جس نے اے خدا کے دشمن تجھے ذلیل کیا) پھر آپ ﷺ نے فرمایا، ''مات فرعون هذه الامة'' (اِس اُمت کا فرعون مرگیا)...... حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے اسی دشمنِ خدا باپ کی آغوشِ تربیت میں پرورش پائی تھی ظاہر ہے کہ کفر و شرک کے اس ماحول کا انہوں نے کیا اثر قبول کیا ہوگا۔ باپ نہ صرف اپنے قبیلے کا رئیس بلکہ ایک کامیاب تاجر بھی تھا اور اس کے گھر میں دولت کی ریل پیل تھی۔ اس نے عکرمہ رضی اللہ عنہ کو بڑے ناز و نعم سے پالا اور انہیں اپنے رنگ میں رنگنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے فرزندِ دلبند کی جسمانی اور عسکری تربیت اس انداز سے کی کہ جب وہ بڑے ہوئے تو پہلوانی، قدر اندازی، شمشیرزنی، نیزہ

بازی اور شہسواری میں اپنے قبیلے کی ناک متصور ہوتے تھے۔ اسلام دشمنی میں بھی وہ اپنے باپ کے دست و بازو ثابت ہوئے اور سالہا سال تک ان کی جسمانی قوت، شجاعت و بسالت اور فنونِ حرب میں مہارت، حق کی بیخ کنی میں صَرف ہوتی رہی۔ غزوۂ بدر میں وہ اپنے باپ کے ساتھ گئے اور بڑے جوش و خروش سے لڑائی میں حصہ لیا۔ ہنگامہ کارزار میں حضرت مُعاذ بن حارث انصاری رضی اللہ عنہ نے (جنھیں مُعاذ بن عفراء رضی اللہ عنہ بھی کہا جاتا ہے) ابوجہل کو سخت مجروح کر دیا تو عکرمہ رضی اللہ عنہ باپ کا بدلہ لینے کے لیے حضرت مُعاذ رضی اللہ عنہ پر جھپٹ پڑے اور اپنی تلوار کے وار سے ان کا بازو کاٹ ڈالا۔ حضرت مُعاذ رضی اللہ عنہ اسی حالت میں عکرمہ کے مقابلے پر ڈٹ گئے۔ عکرمہ ان کے جوشِ ایمان کی تاب نہ لا سکے اور اپنا گھوڑا دوڑا کر دوسری طرف چلے گئے۔

بدر کے بعد جن لوگوں نے مشرکینِ مکہ کو ہزیمتِ بدر کا انتقام لینے پر ابھارا ان میں بھی عکرمہ رضی اللہ عنہ پیش پیش تھے۔ چنانچہ میدانِ اُحد میں وہ مشرکین کی فوج کے سرکردہ افسروں میں سے ایک تھے۔ کوہِ احد کے درّہ عینین پر حضور ﷺ نے پچاس تیرانداز اس غرض سے متعین فرمائے تھے کہ مشرکین اس درّے میں سے گزر کر مسلمانوں کی پشت کی جانب سے حملہ آور نہ ہو سکیں، لڑائی کے پہلے دَور میں مشرکین کو ہزیمت ہوئی اور درّہ پر متعین بیشتر تیراندازوں نے اپنی جگہ چھوڑ دی تو یہ عکرمہ رضی اللہ عنہ اور خالد رضی اللہ عنہ ہی تھے جنھوں نے مسلمانوں کی اس کمزوری کو بھانپا اور اپنے فوجی دستوں کے ساتھ اس درّہ سے گزر کر مسلمانوں پر طوفانی حملہ کر دیا۔ اس اچانک حملے کی وجہ سے اہلِ حق کو سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ کہا جاتا ہے کہ غزوۂ اُحد میں عکرمہ رضی اللہ عنہ مشرکین کے میسرہ کے افسر تھے اور وہ اپنی اہلیہ کو بھی ہودج میں سوار کر کے میدانِ جنگ میں ساتھ لائے تھے۔

سنہ ۵ ہجری میں عرب کے مشرکین اور یہود نے ایکا کر کے مرکزِ اسلام مدینہ منورہ پر یلغار کی تو عکرمہ رضی اللہ عنہ بھی بنو کنانہ کو ابھار کر اپنے ساتھ لے گئے اور غزوۂ احزاب میں مسلمانوں کے خلاف بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

۶ ہجری میں سرورِ عالم ﷺ اور قریش مکہ کے مابین صلحنامہ حدیبیہ معرض تحریر میں آیا۔ اس صلحنامے میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ جو قبیلے طرفین میں سے کسی ایک کے حلیف بن جائیں گے دوسرا فریق ان کو کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچائے گا اور نہ ان کے دشمنوں کی مدد ان کے مقابلے پر کرے گا۔ اس معاہدے کی رُو سے بنوخزاعہ نے سرورِ عالم ﷺ کی حمایت قبول کر لی اور بنوبکر نے قریش کی۔ ان دونوں قبیلوں میں مدّت سے عداوت چلی آرہی تھی۔ اٹھارہ مہینے تو انہوں نے امن و امان سے گزارے لیکن پھر ایک دن بنی بکر نے اچانک بنوخزاعہ پر حملہ کر دیا اور بڑی بے رحمی سے ان کے بچّوں اور عورتوں تک کو قتل کیا یہاں تک کہ حرم میں پناہ لینے والوں کو بھی اپنی تیغِ جفا کا نشانہ بنانے سے گریز نہ کیا۔ اس قتل و غارت میں قریش کے کئی سرداروں نے بنوبکر کی مدد کی ان میں عکرمہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ اس طرح انہوں نے صلحنامہ حدیبیہ کو عملاً توڑ ڈالا۔ ان کی یہی حرکت مکہ پر مسلمانوں کی چڑھائی کا باعث ہوئی۔ رمضان المبارک ۸ ہجری میں سرورِ عالم ﷺ مکہ معظمہ میں فاتحانہ داخل ہوئے تو اس وقت بھی عکرمہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بعض ساتھیوں سے مل کر مسلمانوں کے ایک دستے کی مزاحمت کی لیکن لشکرِ اسلام کے سیل بے پناہ کے سامنے ان کی کچھ پیش نہ چلی اور وہ اپنے چوبیس آدمی کٹوا کر پسپا ہو گئے۔ مکہ معظمہ پر قبضہ کے بعد حضور ﷺ چاہتے تو مشرکینِ قریش کی تِکّا بوٹی کروا سکتے تھے یہ وہی لوگ تو تھے جنہوں نے آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کو ستانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی، آپ ﷺ کو وطن سے نکالا تھا اور پھر مدینہ منوّرہ میں بھی سات سال تک اہلِ حق کو چین سے نہ بیٹھنے دیا تھا۔ لیکن آپ ﷺ رؤف و رحیم اور رحمۃ للعالمین تھے آپ ﷺ کی شان رحیمی نے ان کو ہلاک کرنا گوارا نہ کیا بلکہ آپ ﷺ کا ابرِ عفو و کرم ان پر ایسا جھوم جھوم کر برسا کہ سبھی خواص و عوام اس سے مقدور بھر فیض یاب ہوئے ان میں عکرمہ رضی اللہ عنہ کی اہلیہ اُمِ حکیم بنتِ حارث رضی اللہ عنہا بھی تھیں، فتح مکہ کے فوراً بعد وہ رحمتِ عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر سعادت اندوزِ اسلام ہو گئیں لیکن خود عکرمہ رضی اللہ عنہ کو

حضور ﷺ کے سامنے پیش ہونے کی ہمت نہ پڑی۔ اپنے ماضی کے پیش نظر ان کو قطعاً یہ اُمید نہیں تھی کہ سرورِ عالم ﷺ ان کو زندہ چھوڑ دیں گے چنانچہ اپنی جان بچانے کے لیے انہوں نے مکہ سے راہِ فرار اختیار کی اور یمن جانے کی نیت سے ساحلِ بحر پر پہنچ گئے۔

(۳)

حضرت عِکرمہ رضی اللہ عنہ کی اہلیہ اُمِ حکیم بنتِ حارث رضی اللہ عنہا ان کے چچا کی بیٹی تھیں اور ان سے والہانہ محبت کرتی تھیں، وہ فتح مکہ کے بعد زیورِ اسلام سے آراستہ ہوئیں تو ان کو عِکرمہ رضی اللہ عنہ کی فکر دامن گیر ہوئی۔ ان کا جی نہیں چاہتا تھا کہ عِکرمہ رضی اللہ عنہ کفر و شرک کی ظلمتوں میں بھٹکتے رہیں اور نہ ان کو یہ گوارا تھا کہ وہ ذِلت کی موت مارے جائیں، انہوں نے بارگاہِ رسالت میں عرض کی۔ ”یارسول اللہ میرے چچا کا بیٹا اور شوہر جان کے خوف سے روپوش ہو گیا ہے اگر آپ اس کو امان دیں تو میں اس کو تلاش کر کے آپ کی خدمت میں لاؤں۔“

حضور ﷺ کا دریائے رحمت جوش پر تھا آپ ﷺ نے فرمایا۔ ”تیرے شوہر کو امان ہے اس کو لے آؤ۔“

اُدھر حضرت عِکرمہ رضی اللہ عنہ ایک کشتی پر سوار ہو گئے تھے، کچھ دُور جا کر یہ کشتی بادِ مخالف کی لپیٹ میں آ گئی اور آگے جانے کی بجائے پیچھے ہٹنے لگی، طوفانِ باد اس کو ہچکولے پر ہچکولے دیتا تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ اب ڈوبی کہ اب ڈوبی۔ اس نازک گھڑی میں حضرت عِکرمہ رضی اللہ عنہ نے لات و عزیٰ کو پکارنا شروع کر دیا۔ ملاحوں اور دوسرے اہلِ کشتی نے کہا، لات و عزیٰ یہاں کیا کام آئیں گے یہ تو اللہ کو پکارنے کا وقت ہے۔

حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ”اصابہ“ میں لکھا ہے کہ ملاحوں کی بات نے حضرت عِکرمہ رضی اللہ عنہ کے دل پر خاص اثر کیا، ان کی چشمِ بصیرت وا ہو گئی اور بے اختیار اُن کی زبان سے یہ الفاظ آ گئے:

''اے اللہ میں عہد کرتا ہوں کہ اگر اس طوفان سے زندہ سلامت بچا تو میں خود کو محمد (ﷺ) کے سامنے پیش کر دوں گا۔ وہ بڑے رحیم و کریم ہیں مجھ سے کبھی مواخذہ نہ فرمائیں گے۔''

خدا کی قدرت ان کی کشتی پیچھے ہٹتے ہٹتے اسی جگہ کنارے آ لگے جہاں سے چلی تھی اسی اثناء میں حضرت اُمِ حکیم رضی اللہ عنہا بھی شوہر کی تلاش کرتی ہوئی ساحل پر آ پہنچیں۔ ایک اور روایت کے مطابق حضرت عِکرمہ رضی اللہ عنہ کی کشتی بھنور میں پھنسی اور انہوں نے ملاحوں کے مشورہ پر خدا کو پکارا تو کشتی بھنور سے نکل آئی عین اس وقت حضرت اُمِ حکیم رضی اللہ عنہا بھی ساحل پر پہنچ گئیں۔ انہوں نے کنارے پر کھڑے ہو کر اپنی چادر کی جھنڈی بنالی اور اسے ہلا ہلا کر کشتی کو واپس بُلانے لگیں۔ کشتی نے لنگر ڈال دیا اور حضرت عِکرمہ رضی اللہ عنہ ایک چھوٹی کشتی پر سوار ہو کر واپس کنارے پر آ گئے۔ حضرت اُمِ حکیم رضی اللہ عنہا نے ان سے کہا کہ ''میں صاحب ﷺ کے پاس سے آ رہی ہوں تو تمام لوگوں میں سب سے زیادہ بھلے اور سب سے بڑھ کر صلہ رحم کرنے والے ہیں، تم نے ناحق اپنے آپ کو جلاوطنی کی مصیبت میں ڈالا، میں نے ان سے تمہارے لیے امن حاصل کر لیا ہے۔ اب میرے ساتھ ان کی خدمت میں چلو۔'' چنانچہ حضرت عِکرمہ رضی اللہ عنہ اپنی سعادت مند بیوی کے ساتھ سرورِ عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضور ﷺ کو ان کی آمد پر انتہائی مسرت ہوئی اور آپ ﷺ نے ان کا پُرتپاک خیر مقدم کیا، اس موقع پر حضرت عِکرمہ رضی اللہ عنہ نے قبولِ اسلام کی سعادت حاصل کی اور صدقِ دل سے تلافی مافات کا عہد کیا، اس کی تفصیل اوپر آ چکی ہے۔ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے مستدرک میں لکھا ہے کہ اگرچہ حضرت عِکرمہ رضی اللہ عنہ نے سچے دل سے اسلام قبول کر لیا تھا اور رحمتِ عالم ﷺ نے ان کی مغفرت کے لیے دُعا بھی کی تھی لیکن لوگوں کو ان کے باپ اور ان کی اپنی اسلام دشمنی کا زمانہ کسی طرح بھلائے نہ بھولتا تھا اور وہ حضرت عِکرمہ رضی اللہ عنہ کی ابنِ عدوّ اللہ (اللہ کے دشمن کا بیٹا) کہہ کر پکارتے تھے۔ حضور ﷺ کے سمعِ مبارک تک یہ بات پہنچی تو آپ ﷺ نے لوگوں کو جمع کر کے

مخصوص خطبہ دیا جس میں فرمایا: ”لوگو سُن لو کہ جو جاہلیت میں معزز تھا وہ اسلام میں بھی معزز ہے، کسی کافر کی وجہ سے کسی مسلمان کا دل نہ دُکھاؤ۔“ حضور ﷺ کے اس خطبے کے بعد لوگ متنبہ ہو گئے اور پھر کبھی کسی نے ان کو ”دشمنِ خدا کا بیٹا“ ہونے کا طعنہ نہ دیا۔

(۴)

قبولِ اسلام کے بعد حضرت عِکرمہ رضی اللہ عنہ کی زندگی میں یکسر انقلاب آ گیا اور وہ مثالی سیرت و کردار کے ایک پیکرِ جمیل بن گئے۔ شوقِ جہاد، انفاقِ فی سبیل اللہ، زہد و عبادت اور شغفِ قرآن اُن کی زندگی کے اس دَور کے نمایاں پہلو تھے۔ اب ان کو ایک ہی فکر تھی کہ کسی طرح اپنے زمانہ جاہلیت کی تلافی کر دیں۔ حافظ ابنِ عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے ”استیعاب“ میں لکھا ہے کہ اسلام لانے کے بعد وہ نہایت کثرت سے نمازیں پڑھتے تھے اور اکثر توبہ واستغفار میں مشغول رہتے تھے۔ دل میں ایسا سوز و گداز پیدا ہو گیا تھا کہ کسی کو تکلیف میں دیکھ کر چشم پُر آب ہو جاتے تھے، قرآنِ حکیم سے ایسا عشق ہو گیا تھا کہ اس کو جوشِ عقیدت میں بے تابانہ چہرہ پر رکھ لیتے اور میرے اللہ کی کتاب، میرے اللہ کی کتاب (کتاب ربی، کتاب ربی) کہہ کر رونے لگتے، تلاوتِ قرآن نہایت تاثر کے ساتھ کرتے، پڑھتے وقت آنکھوں سے سیلِ اشک رواں رہتا تھا۔

فتح مکہ کے بعد حنین، طائف اور تبوک کے غزوات پیش آئے۔ ان سب میں حضرت عِکرمہ رضی اللہ عنہ نے سرورِ عالم ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ ۱۰ ہجری میں حضور ﷺ نے حضرت عِکرمہ رضی اللہ عنہ کو صدقہ کی وصولی کے لیے عامل بنا کر قبیلہ ہوازن کی طرف روانہ کیا تھا۔ ۱۱ ہجری میں حضور ﷺ کا وصال ہوا تو اس وقت حضرت عِکرمہ رضی اللہ عنہ یمن کے ایک شہر تبالہ میں تھے۔ آفتابِ رسالت کے رحمتِ الٰہی کی شفق میں غروب ہونے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سریر آرائے خلافت ہونے کی خبر اکنافِ ملک میں پھیلی تو دفعتہً سارے عرب میں فتنہ ارتداد کے شعلے بھڑک اٹھے اس پُر آشوب دَور میں صرف مہاجرین وانصارِ مدینہ، قریشِ مکہ اور بنو ثقیف بحیثیت

مجموعی نہایت پختگی سے ایمان پر قائم رہے، صورتِ حالات اگرچہ سخت نازک تھی لیکن خلیفۃ الرسول ﷺ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ عزم واستقلال اور قوتِ ایمانی کا کوہِ گراں تھے انہوں نے مرتدین کو کسی قسم کی رعایت دینے سے صاف انکار کر دیا اور ان سے نبردآزما ہونے کا عزمِ مصمم کر لیا اس مقصد کے لیے انہوں نے گیارہ جیوش مرتب کیے اور ان کو مختلف علاقوں کے مرتدین کے استیصال پر مامور فرمایا۔ ان میں سے ایک جیش کی قیادت حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کو سونپی گئی جو مرتدین کے خلاف جہاد کے لیے مدینہ منورہ پہنچ گئے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کو مسیلمہ کذاب کی سرکوبی کے لیے یمامہ کی طرف جانے کا حکم دیا، وہ روانہ ہوئے تو ان کے بعد حضرت شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ کو ان کی کمک کی غرض سے روانہ فرمایا۔ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ مسیلمہ کی قوت کا صحیح اندازہ نہ کر سکے اور جوشِ شجاعت میں امدادی فوج کے پہنچنے سے پہلے ہی مسیلمہ سے لڑائی چھیڑ دی، مسیلمہ کا کثیر التعداد فوج نے ان پر اتنا زبردست دباؤ ڈالا کہ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی تو وہ ناراض ہوئے اور لکھ بھیجا کہ تمہیں شرحبیل رضی اللہ عنہ کے پہنچنے سے پہلے لڑائی نہیں چھیڑنی چاہیے تھی خیر جو کچھ ہوا سو ہوا اب تم آگے جا کر حذیفہ رضی اللہ عنہ بن محصن اور عرفجہ رضی اللہ عنہ بن ہرثمہ سے مل جاؤ اور عمان اور مہرہ کے مرتدین کا مقابلہ کرو۔ ان سے فارغ ہو کر اپنے لشکر کے ساتھ مہاجرین رضی اللہ عنہ بن امیہ کے پاس یمن اور حضرموت کو چلے جاؤ۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا حکم ملتے ہی حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ عمان جا کر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عرفجہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہو گئے۔ مرتدینِ عمان (بنوازد) کا سردار لقیط بن مالک ایک زبردست فوج کے ہمراہ شہر دبا میں مقیم تھا چنانچہ اسلامی لشکر بھی دبا کی طرف بڑھا، اس لشکر کے مقدمہ کی قیادت حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کر رہے تھے، لڑائی شروع ہوئی تو مسلمان نیچی زمین پر تھے اور مرتدین بلندی پر تھے اس لیے مسلمانوں کی حالت

بڑی خطرناک تھی لیکن حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ درّانہ آگے بڑھتے گئے۔ لقیط بن مالک نے مسلمانوں کا یہ جو دیکھا تو اس نے بھی اپنے گھوڑے کو آگے بڑھایا۔ اس وقت اس کے ایک ہاتھ میں علَم اور دوسرے ہاتھ میں نیزہ تھا اور وہ اپنی فوج کو آگے بڑھنے کے لیے للکار رہا تھا۔ اب فریقین میں گھمسان کی جنگ شروع ہوگئی عین اس موقع پر قبیلہ ناجیہ اور عبدالقیس کے مجاہدین مسلمانوں کی مدد کے لیے آپہنچے اس سے مسلمانوں کی قوت دوچند ہوگئی اور انہوں نے مرتدین کو عبرتناک شکست دی۔ لقیط بن مالک اور اس کے بہت سے ساتھی میدانِ جنگ میں کام آئے اور سینکڑوں کو مسلمانوں سے قیدی بنالیا، ایک روایت میں ہے کہ اس لڑائی میں دس ہزار مرتدین مارے گئے اور جو قیدی خمس کے ساتھ دربارِ خلافت میں بھیجے گئے صرف ان کی تعداد آٹھ سو تھی...... اس شکست کے بعد قبیلہ ازد کے بقیۃ السیف مرتدین نے دوبارہ اسلام قبول کرلیا۔

علّامہ بلاذری رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ قبیلہ ازد کے سرکوبی کے بعد حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ مالِ غنیمت اور قیدی لے کر مدینہ منورہ پہنچے۔ ان کے جانے کے بعد عمان کے بعض دوسرے قبائل مرتد ہوگئے اور انہوں نے شحر کو اپنا مرکز بنایا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کی سرکوبی کے لیے بھی حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا۔ انہوں نے چند دن کے اندر اندر ان سب کا استیصال کردیا۔

لیکن ابنِ خلدون رحمۃ اللہ علیہ اور ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ لقیط بن مالک کو شکست دینے کے بعد حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سیدھے مہرہ چلے گئے اس وقت اپنی فوج کے علاوہ قبائل ناجیہ، عبدالقیس، سعدہ اور راسب کے لوگ بھی ان کے ساتھ تھے، اہلِ مہرہ اس وقت ریاست اور امارت کے سوال پر دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے، ایک فریق کا سردار سخریت تھا اور دوسرے فریق کا سردار مصبح تھا، حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے دونوں فریقوں کو اسلام کی دعوت دی۔ سخریت نے یہ دعوت قبول کرلی اور اپنے حامی قبائل کی زکوٰۃ ادا کردی لیکن مصبح نے اسلام کی دعوت ردّ کردی۔ چنانچہ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے

اپنے ساتھیوں اور تحریک کے طرفداروں کو لے کر مصبح پر حملہ کیا۔ ایک سخت جنگ کے بعد مصبح مارا گیا اور اس کے ساتھ بھاگ کھڑے ہوئے۔ مسلمانوں نے دُور تک تعاقب کر کے جگہ جگہ ان کی لاشیں بچھادیں اور ان کے مال و اسباب پر قبضہ کر لیا۔ اسکے بعد حضرت عِکرمہ رضی اللہ عنہ تبلیغِ اسلام میں مشغول ہو گئے اور بہت جلد آس پاس کے تمام قبائل کو دائرہٴ اسلام میں لے آئے۔ اسی دوران میں حضرت مہاجر بن امیہ رضی اللہ عنہ نے نجران اور صنعاء کے مرتدین کا خاتمہ کر دیا تھا اور حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ نے انہیں زیاد بن لبید انصاری رضی اللہ عنہ کی مدد کے لیے یمن پہنچنے کا حکم دیا تھا۔ حضرت عِکرمہ رضی اللہ عنہ بھی حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ کی ہدایت کے مطابق قبائل مہرہ، عبدالقیس، ناجیہ، ازد، کنانہ اور عنبر کو لے کر حضرت مہاجر رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل گئے اور پھر یہ متحد لشکر کندہ کی طرف بڑھا جہاں حضرت زیاد بن لبید رضی اللہ عنہ سخت مشکل میں تھے، انہوں نے شروع شروع میں یمن کے مرتد قبائل پر بڑی کاری ضربیں لگائیں تھیں لیکن بعد میں کندیوں کے سردار اشعث بن قیس نے ان پر حملہ کر کے بہت سا مال و اسباب چھین لیا تھا اور سارے مرتد قید چھڑا لیے تھے۔ حضرت زیاد رضی اللہ عنہ، حضرت مہاجر رضی اللہ عنہ اور حضرت عِکرمہ رضی اللہ عنہ کے متحدہ لشکر نے اشعث بن قیس کو گھیر لیا اور ایک خونریز لڑائی کے بعد اس کو شکست فاش دی وہ بھاگ کر قلعہ نجیر میں محصور ہو گیا۔ مسلمانوں نے اس قطعہ کا نہایت سختی سے محاصرہ کر لیا۔ اشعث محاصرہ سے تنگ آ گیا تو اس نے اپنے قبیلہ کے لیے امان طلب کی، حضرت زیاد بن لبید رضی اللہ عنہ نے اس کو منظور کر لیا اور کہلا بھیجا کہ امان نامہ لکھ لاؤ، وہ امان نامہ لکھ کر لایا اور حضرت زیاد رضی اللہ عنہ نے اس پر اپنی مُہر ثبت کر دی۔ بدقسمتی سے اشعث بن قیس امان نامہ میں اپنا نام لکھنا بھول گیا تھا، حضرت عِکرمہ رضی اللہ عنہ نے یہ تحریر پڑھی تو اس میں اشعث کا نام نہیں تھا۔ چنانچہ انہوں نے اسے گرفتار کر لیا اور کچھ دوسرے قیدیوں کے ساتھ اسے مدینہ منوّرہ لے آئے۔ یہاں پہنچ کر اشعث بن قیس نے ارتداد سے توبہ کر کے اسلام قبول کر لیا۔ وہ ایک بہادر اور فیاض آدمی تھا اس لیے حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ نے اس کو

معاف کر دیا۔ مختصر یہ کہ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ شروع سے اخیر تک فتنہ ارتداد کے استیصال کے لیے سرگرمِ جہاد رہے، جب یہ فتنہ فرو ہو گیا تو انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ان لڑائیوں میں انہوں نے سارا خرچ اپنی گرہ سے کیا اور بیت المال سے ایک پیسہ تک وصول نہیں کیا۔

(۵)

فتنہ ارتداد کے استیصال کے بعد شام اور ایران سے معرکہ آرائیوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ شام کی مہم پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ، حضرت مُعاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، حضرت یزید بن ابو سفیان رضی اللہ عنہ اور حضرت شُرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا اور ان کے بعد بھی برابر مجاہدین شام کو کمک بھیجتے رہے۔ اسی سلسلہ میں مشورہ کے لیے انہوں نے شرفائے مکہ کو بھی بُلا بھیجا۔ اس موقع پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں عرض کیا کہ ان لوگوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ اسلام کی مخالفت میں گزارا ہے اور حق کا راستہ روکنے کے لیے انہوں نے کسی حرکت سے گریز نہیں کیا ہے، آخر خدا نے انہیں مغلوب کر دیا۔ اب یہ مناسب نہیں ہے کہ ان کو مومنین سابقین کے ساتھ شریکِ مشورہ کیا جائے۔

معززینِ مکہ اور سردارانِ قریش کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی گفتگو کا علم ہوا تو حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ، حضرت حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ اور حضرت سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہ دربارِ خلافت میں حاضر ہوئے اور سب نے رو رو کو عرض کیا کہ اسلام سے پہلے ہمارے ساتھ ایسا سلوک جائز تھا لیکن اب ہمارے ساتھ ایسی سختی انصاف کے خلاف ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی دربارِ خلافت میں موجود تھے، حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے اُن سے مخاطب ہو کر یہاں تک کہہ دیا "اب آپ ہم سے زیادہ ان لوگوں کے دشمن نہیں جو اسلام کے منکر اور مسلمانوں کے مخالف ہیں۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "خدا کی قسم میں نے خلیفۃ الرسول کی خدمت میں جو کچھ کہا ہے وہ صرف سابقین اوّلین کی خیر خواہی اور تم میں اور تم

سے افضل مسلمانوں میں انصاف قائم کرنے کی غرض سے کہا ہے۔" اس پر تینوں سردارانِ قریش نے ولولہ انگیز تقریریں کیں جن میں اپنا سب کچھ راہِ حق میں قربان کر دینے کا عزم کا اظہار کیا، اس موقع پر حضرت عِکرمہ رضی اللہ عنہ نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

"لوگو گواہ رہو کہ میں نے اپنا نفس، اپنے ساتھیوں کے نفوس اور اپنا تمام مال اللہ کی راہ میں وقف کر دیا۔ ہم ہرگز جہاد سے مِنہ نہ موڑیں گے اور سپاہیوں کی طرح زندگی کے آخری سانس تک اسلامی عَلَم کے نیچے لڑتے رہیں گے بلالحاظ اس کے کہ یہ عَلَم کس کے ہاتھ میں ہے۔"

ان لوگوں کی تقریریں سُن کر حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ نے ان کے حق میں دعائے خیر کی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی خوش ہو گئے۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو ایک مضبوط لشکر کے ساتھ شام جانے کا حکم دیا۔ حضرت عِکرمہ رضی اللہ عنہ بھی اپنی اہلیہ اُمِ حکیم رضی اللہ عنہا اور دو فرزندوں کے ساتھ اس لشکر میں شامل ہو گئے۔ لشکر کی روانگی سے پہلے حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ اس کا معائنہ کرنے تشریف لائے۔ اثنائے گشت میں ان کا گزر ایک خیمہ پر ہوا جس کے چاروں طرف گھوڑے ہی گھوڑے تھے اور نیزے تلواریں اور دوسرا سامانِ جنگ بھی کثیر مقدار میں جمع تھا۔ حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ نے خیمے کے اندر جھانکا تو حضرت عِکرمہ رضی اللہ عنہ پر نظر پڑی۔ یہ سارا سامان انہوں نے اپنے پاس سے خریدا تھا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کو سلام کیا اور فرمایا: "عِکرمہ رضی اللہ عنہ تم نے سامانِ جنگ پر کثیر رقم خرچ کی ہے، میں چاہتا ہوں کہ تم یہ ساری رقم یا اس کا کچھ حصہ بیت المال سے لے لو۔"

حضرت عِکرمہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: "اے خلیفۃ الرسول، میرے پاس اب بھی دو ہزار دینار نقد موجود ہیں اور میں نے اپنا سارا مال راہِ حق کے لیے وقف کر دیا ہے، مجھ کو بیت المال پر بوجھ ڈالنے سے معذور رکھیے۔"

حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ ان کے جذبہ انفاق فی سبیل اللہ سے بڑے متاثر ہوئے

اوران کے لیے مکرر دعائے خیر کی۔

(۶)

حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر صدِیق رضی اللہ عنہ کی ہدایت کے مطابق سب سے پہلے فلسطین کا رُخ کیا۔ فلسطین اس زمانے میں شام کا ایک حِصّہ تھا اور رومی شہنشاہِ ہرقل کی سلطنت میں شامل تھا، ہرقل کو مسلمانوں کے حملے کی اطلاع ملی تو اس نے ایک لاکھ جنگجوؤں پر مشتمل ایک جرّار لشکر مسلمانوں کے مقابلے کے لیے فلسطین بھیج دیا۔ رومی اور اسلامی فوجوں کے درمیان کئی خونریز معرکے ہوئے جن میں رومیوں کو ہر بار ہزیمت کا منہ دیکھنا پڑا۔ ان معرکوں میں حضرت عِکرمہ رضی اللہ عنہ نے حیرت انگیز استقامت اور سرفروشی کا مظاہرہ کیا اور بعض موقعوں پر اسلامی فوج کے مقدمۃ الجیش کی قیادت بھی کی۔ اسی دوران میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو دشمن سے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا خط ملا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ رومیوں کا ایک بہت بڑا لشکر اجنادین میں جمع ہے، میں ان کے مقابلہ کے لیے اجنادین جارہا ہوں، تم بھی اپنی فوج لے کر وہاں پہنچ جاؤ۔

یہ خط ملتے ہی حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے اجنادین کی طرف کوچ کر دیا۔ حضرت یزید بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ اور شُرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ بھی اپنی فوجیں لے کر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے پاس اجنادین پہنچ گئے۔ مسلمانوں کے اس متحدہ لشکر اور رومیوں کے درمیان گھمسان کا رَن پڑا جس میں مسلمان غالب آئے۔ اس لڑائی میں بھی حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے شروع سے اخیر تک مردانہ وارِدادِ شجاعت دی۔ اِجنادَین کی فتح کے بعد حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ واپس فلسطین آ گئے اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے دوبارہ نہایت سختی سے دمشق کا محاصرہ کرلیا۔ یہ محاصرہ مسلمانوں کی کامیابی پر منتج ہوا اور دمشق پر ان کا استیلا ہوگیا۔ اس کے بعد مسلمانوں نے اردن کے ایک مقام فحل کا قصد کیا جہاں قریب ہی بیسان کے مقام پر اسی ۸۰ ہزار رومی جنگجو مسلمانوں سے لڑنے مرنے کے لیے جمع تھے۔ اس جمِ غفیر سے نبرد آزما ہونے کے لیے تمام مسلمان سپہ سالار ایک بار پھر فحل

میں جمع ہوئے۔ اس اثناء میں رومیوں نے اردگرد کی تمام نہروں اور ندیوں کے بن توڑ دیئے جس سے بیسان اور فحل کا علاقہ زیرِ آب ہو گیا اور دلدل بن گیا، اس کی وجہ سے مسلمانوں کا فحل سے آگے بڑھنا مشکل ہو گیا اور وہ ایک لمبے عرصے تک فحل میں ڈیرے ڈالے پڑے رہے۔ ایک دن رومیوں نے مسلمانوں کو غافل خیال کر کے رات کی تاریکی میں بڑے زور وشور سے ان پر حملہ کر دیا لیکن مسلمان بے خبر نہیں تھے، انہوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ رات بھر اور اگلے روز بھی رات تک برابر میدانِ کارزار گرم رہا۔ علامہ ابن اثیر رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ اس معرکے میں ایسی جانبازی سے لڑے کہ شجاعت اور ہمت آفرین پکار اٹھی۔ جدھر کا رُخ کرتے کُشتوں کے پُشتے لگا دیتے تھے۔ ایک مرتبہ لڑتے لڑتے دُور تک دشمن کی صفوں میں گھس گئے، سارا جسم زخموں سے چھلنی ہو گیا، لوگوں نے کہا، عکرمہ خدا کا خوف کرو، اس طرح اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو اور جوش کو ہوش پر غالب نہ آنے دو۔

جواب دیا، لوگو میں لات وعزیٰ کی خاطر جان پر کھیلا کرتا تھا، آج اللہ اور رسول ﷺ کے لیے جان پر نہ کھیلوں؟ خدا کی قسم یہ کبھی نہ ہوگا۔

آخر رومی ہمت ہار بیٹھے اور انہوں نے پسپا ہونا شروع کیا، بدحواسی کے عالم میں کیچڑ اور دلدل میں پھنس گئے اور اسی ہزار فوج میں سے چند آدمیوں کے سوا کوئی بچ کر نہ جا سکا۔ قریب قریب ساری فوج اسی جگہ مسلمانوں کے ہاتھوں ختم ہو گئی۔ فحل کے بعد حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے حمص کے معرکہ میں اپنی تلوار کے جوہر دکھائے اور پھر یَرمُوک کے میدانِ جہاد میں پہنچ گئے۔

(۷)

شام میں مسلمانوں کو جو لڑائیاں پیش آئیں ان میں سب سے سخت یَرمُوک کی لڑائی تھی۔ اس میں رومی فرمانروا ہرقل نے کئی لاکھ رومی جنگجوؤں کو کثیر سامانِ حرب و ضرب کے ساتھ مسلمانوں کے مقابلے پر لا ڈالا تھا۔ (رومیوں کی تعداد کے بارے میں

مورخین میں اختلاف ہے، ایک محتاط اندازے کے مطابق ان کی تعداد دو لاکھ اور پانچ لاکھ کے درمیان تھی)۔ شام میں موجود تمام مسلمان فوجوں کی تعداد مل کر چالیس ہزار کے لگ بھگ بنتی تھی۔ اللہ کے یہی چالیس ہزار سپاہی ہر طرف سے سمٹ سمٹا کر یرموک کے میدان (وقوصہ) میں جمع ہوئے اور رومیوں کی مہیب جنگی قوت سے بھڑ گئے۔ اس لڑائی میں مجاہدین نے جس سرفروشی، جوش اور صبر و استقامت سے رومیوں کا مقابلہ کیا وہ بھی اپنی نظر آپ ہے۔ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ جنگِ یرموک میں ایک فوجی دستے کے افسر تھے، وہ خود بھی جان ہتھیلی پر رکھ کر لڑے اور اپنے دستے کو بھی اس طرح لڑایا کہ افسری کا حق ادا کر دیا۔ ایک موقع پر رومیوں نے بڑے زور شور سے حملہ کیا اور مسلمانوں پر ایسا شدید دباؤ ڈالا کہ ان کے قدم لڑکھڑا گئے۔ یہ دیکھ کر حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کو سخت جوش آیا۔ انہوں نے اپنا گھوڑا آگے بڑھایا اور للکار کر کہا:

"رومیو! میں کسی زمانے میں (کفر کی حالت میں) خود رسول اللہ ﷺ سے لڑ چکا ہوں، کیا آج تمہارے مقابلے میں میرا قدم پیچھے ہٹ سکتا ہے؟ خدا کی قسم ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔"

پھر اپنی فوج کی طرف دیکھا اور پکارے "آؤ کون میرے ہاتھ پر موت کی بیعت کرتا ہے؟

ان کی آواز پر چار سو سرفروش آگے بڑھے اور اُن کے ہاتھ پر مرنے کی بیعت کی۔ ان میں حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کے دونوں بیٹے بھی تھے۔ اس کے بعد ان جانبازوں نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے خیمے کے سامنے نہایت بے جگری سے لڑنا شروع کر دیا، یہاں تک کہ ایک ایک شہید ہو گیا یا سخت زخمی ہو کر لڑنے سے معذور ہو گیا۔ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ اور ان کے دونوں فرزندوں کو مہلک زخم آئے، لڑکوں کی حالت سخت نازک تھی، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ انہیں دیکھنے آئے۔ ایک کا سر اپنی ران پر اور ایک کا پنڈلی پر رکھ لیا، پھر ان کے چہروں سے خون پونچھا اور حلق میں پانی ٹپکانا شروع کیا، ساتھ ساتھ کہتے جاتے

تھے:

"خدا کی قسم ابنِ حنتمہ (حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ) کا گمان درست ثابت نہیں ہوا کہ ہم (بنو مخزوم) شہادت حاصل کرنا نہیں چاہتے۔"

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کی لاش مقتولوں کے ڈھیر سے ملی، ابھی کچھ دَم باقی تھا حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے ان کا سر اپنے زانو پر رکھا اور حلق میں پانی ٹپکا کر مذکورہ الفاظ کہے (الفاروق۔ شبلی نعمانی)۔ ان الفاظ کا پس منظر یہ تھا کہ زمانہ کفر میں مخزومیوں نے اسلام دشمنی میں جو سرگرمی دکھائی تھی اس کے پیشِ نظر کسی وقت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ شاید مخزومیوں کو شہادت کی سعادت نصیب نہ ہو، اس موقع پر حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسی گمان کی طرف اشارہ کیا تھا اور شِدّتِ جذبات میں ان کا نام ان کی ماں (حنتمہ) کی نسبت سے لیا تھا۔

بعض مورخین نے لکھا ہے کہ جب حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ پر حالتِ نزع طاری تھی، انہوں نے پانی مانگا، ایک شخص دوڑ کر پانی لایا، جونہی انہوں نے پیالہ منہ کو لگایا، پاس سے ایک اور زخمی نے پانی مانگا۔ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے پیالہ ان کی طرف بڑھا دیا اور خود ابدی نیند ہو گئے۔ دوسرے زخمی نے ابھی پانی نہیں پیا تھا کہ ایک اور زخمی کو پانی پانی پکارتے سنا، انہوں نے بھی پیالہ اپنے منہ سے ہٹا کر ان کی طرف بھیج دیا۔ اسی طرح سات زخمی مجاہدین یکے بعد دیگرے پانی کا ایک قطرہ چکھے بغیر دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ہر ایک نے اپنی پیاس پر دوسرے کی پیاس کو ترجیح دی اور ایثار و بے نفسی کی ایک ایسی مثال قائم کر دی جو تاابد مسلمانوں کے لیے مشعلِ راہ بنی رہے گی۔

یہاں ایک اشکال کا جائزہ لینا ضروری معلوم ہوتا ہے، اوپر ہم نے لڑائیوں کی جو ترتیب بیان کی ہے وہ "تاریخ واقدی رحمۃ اللہ علیہ" سے ماخوذ ہے، ازدی رحمۃ اللہ علیہ، بلاذری رحمۃ اللہ علیہ اور یعقوبی رحمۃ اللہ علیہ بھی واقدی کی تائید کرتے ہیں۔ البتہ طبری رحمۃ اللہ علیہ، ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ اور اُن کی تقلید کرنے والے مورخین نے جنگِ یرموک پہلے (۱۳ ہجری میں) بیان کی ہے اور

فتحِ دمشق، جنگِ اجنادین، فحل وغیرہ اس کے بعد...... سِنین کے اس سخت اختلاف کے باوجود لڑائیوں کے واقعات تمام مورخین نے قریب قریب ایک جیسے ہی بیان کیے ہیں۔
ہماری تحقیق کے مطابق واقدی رحمۃ اللہ علیہ نے لڑائیوں کی جو ترتیب بیان کی ہے وہ زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ اور جمہور مورخین نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ ترتیب کے اس اختلاف نے حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے سال اور مقام کو بھی سخت مشکوک کی بنا دیا ہے۔ بعض نے ان کی شہادت یرموک میں بیان کی ہے، بعض نے اجنادین میں اور بعض نے فحل میں۔ مولوی شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم نے سیر الصحابہ جلد ہفتم میں لکھا ہے کہ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کی شہادت یرموک کا سالِ وقوع اجنادین اور فحل کے بعد ۱۵ ہجری بیان کیا ہے۔ دوسری طرف ہم "کتاب الاصابہ" میں حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ اور "الاستیعاب" میں حافظ ابنِ عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ کی یہ روایت نظر انداز نہیں کر سکتے کہ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ جنگِ مرج الصفر (۱۴ ھ) سے پہلے شہید ہو چکے تھے اور ان کی بیوہ امِ حکیم رضی اللہ عنہا نے مرج الصفر (۱۴ ھ) میں حضرت خالد بن سعید بن العاص رضی اللہ عنہ سے نکاح کر لیا تھا۔ اس صورت میں ہمیں طبری رحمۃ اللہ علیہ کے بیان پر انحصار کرنا پڑے گا۔ اور یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ جنگِ یرموک (۱۳ ھ) میں شہید ہو گئے، جنگِ اجنادین فحل وغیرہ میں شریک نہیں ہوئے اور ان کی بیوہ نے اگلے سال مرج الصفر میں حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ سے نکاح کر لیا۔ دوسری صورت میں حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ جنگِ اجنادین (۱۳ ھ) میں شہید ہوئے اور انہوں نے فحل (۱۴ ھ) اور یرموک (۱۵ ھ) میں سرے سے شرکت ہی نہیں کی۔ گویا دونوں صورتوں میں حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کا سالِ شہادت ۱۳ ہجری قرار پاتا ہے۔ ان کی سرفروشی، استقامت ایثار اور جوشِ ایمان کے جو واقعات فحل یا یرموک میں بیان کیے جاتے ہیں وہ فلسطین اور اردن کے معرکوں یا جنگِ اجنادین میں پیش آئے ہوں گے۔ (واللہ اعلم بالصواب)
حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کے علوِ مرتبت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ رحمت

عالم ﷺ نے دو موقعوں پر ان کے جنتی ہونے کی بشارت دی۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک دفعہ حالتِ کفر میں حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے ایک مسلمان کو شہید کر ڈالا۔ حضور ﷺ کو خبر ملی تو آپ ﷺ متبسّم ہو گئے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے متعجب ہو کر عرض کیا، یا رسول اللہ ہمارے ماں باپ آپ پر قربان آپ کے تبسّم کا کیا سبب ہے۔

فرمایا، میں نے (عالم غیب میں) دیکھا ہے کہ قاتل اور مقتول دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے جنت کو جا رہے ہیں۔

ایک روایت میں اُمّ المومنین حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے مجھے بتایا کہ میں عالمِ خواب میں جنت میں گیا، وہاں میں نے کھجور کا ایک درخت دیکھا جو دوسرے تمام درختوں سے بھلا معلوم ہوتا تھا، میں نے پوچھا، یہ کس کا درخت ہے، مجھے بتایا گیا کہ یہ ابوجہل کا درخت ہے۔ مجھے حیرہوئی کہ ابوجہل جیسے اسلام دشمن کا درخت جنت میں؟ اس واقعہ کے چند سال بعد جب حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ مشرف بہ اسلام ہوئے تو حضور ﷺ نے خوش ہو کر فرمایا، عکرمہ رضی اللہ عنہ ابوجہل کا وہی درخت ہے جس کو میں نے خواب میں (جنت میں) دیکھا تھا۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ
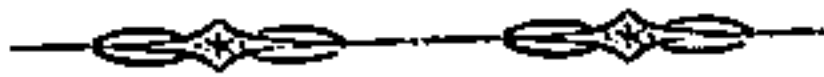
حضرت عثمان بن ابی العاص ثقفی رضی اللہ عنہ

(۱)

قبول اسلام سے پہلے طائف کے بنو ثقیف بڑے متمرّد اور بدخو لوگ تھے۔ دینِ حق سے ان کی دشمنی اور سرکشی کا یہ عالم تھا کہ ۱۰ بعدِ بعثت میں رحمتِ عالم ﷺ تبلیغِ حق کے لیے ان کے پاس تشریف لے گئے تو انہوں نے عربوں کی روایتی مہمان نوازی کو بالائے طاق رکھ دیا اور دعوتِ توحید کے جواب میں حضور ﷺ کو نہ صرف تضحیک و تمسخر کا نشانہ بنایا۔ بلکہ آپ ﷺ پر پتھر برسائے۔ یہاں تک کہ حضور ﷺ سخت زخمی حالت میں طائف سے نکلنے پر مجبور ہو گئے۔ پھر ۸ ہجری میں اہلِ حق نے طائف کا محاصرہ کر لیا تو بنو ثقیف نے شدید مزاحمت کی اور پتھر اور تیر برسا کر کئی مسلمانوں کو شہید کیا۔ لیکن قدرت کی کرشمہ سازیاں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ ابھی اس واقعہ کو زیادہ مدّت نہیں گزری تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ طائف کے دل پھیر دیئے اور ۹ ہجری میں انہوں نے خود بخود آستانہ اسلام کے سامنے سر جھکا دیا۔ اس سال بنو ثقیف کا ایک وفد عبدِ یالیل کی سر کردگی میں مدینہ منوّرہ آیا۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ ثقفی جو پہلے ہی شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہو کر مدینہ منوّرہ میں مقیم تھے، انہوں نے حضور ﷺ کے ایماء پر اس وفد کو صحنِ مسجد میں خیمے لگا کر ٹھہرایا اور اہلِ وفد کی بہت خاطر تواضع کی۔ اس وفد نے مدینہ منوّرہ میں کافی عرصہ قیام کیا۔ اس دوران میں رئیسِ وفد عبد یالیل نے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر کئی رعایتوں کی درخواست کی۔ جن میں ترکِ نماز، شراب نوشی اور سودی لین دین کی اجازت کے علاوہ جہاد سے استثناء کی رعایتیں بھی شامل تھیں۔ سرورِ عالم ﷺ نے پہلی تین رعایتیں دینے سے یکسر انکار فرما دیا۔ البتہ ان کو وقتی طور پر جہاد

سے مستثنیٰ کر دیا اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ جب اسلام ان کے دل میں راسخ ہو جائے گا تو یہ خود بخود ہی جہاد کے لیے نکلیں گے۔ اہلِ طائف نے ارشادِ نبوی ﷺ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا اور کلمہ توحید پڑھ کر حضور ﷺ کی بیعت سے مشرّف ہو گئے۔

بنو ثقیف کے وفد میں ایک صحت مند نوجوان بھی شامل تھا جو عمر میں سب سے چھوٹا تھا لیکن نہایت نیک فطرت اور دانا تھا۔ اس کی پیشانی نورِ سعادت سے چمک رہی تھی اور وہ سعادت اندوزِ اسلام ہونے کے لیے سخت بے چین تھا۔ یہ نوجوان مدینہ منوّرہ میں وارد ہوتے ہی اہلِ وفد سے الگ ہو گیا اور علیحدگی میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہو گیا۔ وفد کے اکابر تو مختلف مسائل کے بارے میں حضور ﷺ سے گفتگو میں مشغول ہو گئے اور اس نوجوان نے ان سے چھپ کر پہلے تو ...... سرورِ عالم ﷺ سے قرآنِ حکیم کا کچھ حصّہ پڑھا اور پھر بڑے ذوق و شوق سے حضرت اُبی بن کعب انصاری رضی اللہ عنہ سے قرآن کی تعلیم حاصل کرنے لگا۔ ایک دن سیّدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس کا علمی شوق دیکھا تو فرمایا: ''یہ لڑکا تفقہ فی الدین اور تعلیمِ قرآن کا بہت مشتاق ہے۔''

رحمتِ عالم ﷺ بھی اس نوجوان کے علمی شوق اور اعلیٰ صلاحیتوں سے آگاہ ہو گئے۔ چنانچہ جب بنو ثقیف کے وفد نے رخصت ہوتے وقت حضور ﷺ سے درخواست کی کہ ہمارے لیے کوئی امام مقرر فرما دیجیے۔ تو آپ ﷺ نے اس نوجوان کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: ''یہ دانا آدمی ہے اور یہی تمہارا امیر اور امام ہوگا۔''

تمام اہلِ وفد نے حضور ﷺ کے ارشاد کے سامنے سر جھکا دیا۔ پھر آپ ﷺ نے اس نوجوان سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''نماز پڑھاتے وقت لوگوں کی حالت کا خیال رکھنا۔ ان میں بوڑھے، بچے، بیمار، کمزور اور کاروباری ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔''

یہ جوانِ صالح جن کو حصولِ علم کا اس قدر شوق تھا اور جن کو کم عمر ہونے کے باوجود

بارگاہِ رسالت سے نہ صرف دانائی کی سند عطا ہوئی بلکہ بنوثقیف جیسے زبردست قبیلے کی امارت و امامت بھی تفویض ہوئی، حضرت عثمان بن ابی العاص ثقفی رضی اللہ عنہ تھے۔

(۲)

سیّدنا حضرت ابوعبداللہ عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کا شمار سیّد الانام ﷺ کے ان صحابہ رضی اللہ عنہم میں ہوتا ہے جو آسمانِ علم وفضل کے آفتاب و ماہتاب بھی تھے، اور شوقِ جہاد، شجاعت اور جوانمردی کے لحاظ سے بھی اپنی نظیر آپ تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا تعلق مشہور قبیلہ بنوثقیف سے تھا جس کا مسکن طائف کا پُرفضا اور شاداب شہر تھا۔ حضرت عثمان اسی شہر میں پیدا ہوئے اور یہیں سنِ رشد کو پہنچے۔ سلسلہ نسب یہ ہے:

عثمان رضی اللہ عنہ بن ابی العاص بن بشر بن وہمان بن عبداللہ بن ہمام بن آبان بن یسار بن مالک بن حطیط بن جشم ثقفی۔

بنوثقیف نہایت سخت مزاج اور کُھر درے لوگ تھے۔ لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نہایت سلیم الطبع اور نرم خو نوجوان تھے۔ بدِ شعور کو پہنچ کر انہوں نے دعوتِ توحید کا چرچا سنا تو نیکی کی طرف اپنے فطری رجحان کے باعث وہ اس سے بہت متاثر ہوئے اور حق کے داعی اعظم ﷺ کی زیارت اور اسلام کی تعلیمات سے پوری طرح آگاہ ہونے کے لیے بے چین رہنے لگے۔ چنانچہ غزوۂ طائف کے بعد جب بنوثقیف کے وفد نے بارگاہِ نبوّت میں حاضری کے لیے مدینہ کا رُخ کیا تو وہ بھی اس وفد میں شامل ہو گئے اور مدینہ منوّرہ پہنچ کر سب سے پہلے شرفِ ایمان سے بہرہ ور ہوئے۔ حضور ﷺ نے ان کو تبرکاً تھوڑا سا قرآن پڑھایا اور پھر وہ بڑے ذوق وشوق سے قیامِ مدینہ کے دوران میں حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سے قرآنِ کریم اور دینی مسائل کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اپنے علمی شوق اور اخلاص فی الدین کی بدولت وہ بہت جلد سرورِ عالم ﷺ کے موردِ الطاف بن گئے۔ اور بالآخر بارگاہِ رسالت سے بنوثقیف کی امارت اور امامت کا اعزاز حاصل کیا۔

اا ہجری میں سرورِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مسند نشینِ خلافت ہوئے تو دفعتہً سارے عرب میں فتنہ ارتداد (ردّہ) کے شعلے بھڑک اٹھے۔ ان شعلوں کی حرارت کا اثر طائف تک پہنچا تو حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ بے چین ہو گئے۔ انہوں نے تمام بنوثقیف کو جمع کیا اور ان کے سامنے ایک ولولہ انگیز تقریر کی جس میں فرمایا کہ ''اے ثقیف کے لوگو! تم سبقت فی الاسلام سے محروم رہے اور اس وقت یہ نعمت حاصل کی جب عرب کے دوسرے سب قبائل اس سے بہرہ یاب ہو چکے تھے۔ اس دیر کی تلافی اس نازک گھڑی میں تم دینِ حق پر ثابت قدم رہ کر کر سکتے ہو۔ تمہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ گمراہی کے اس طوفان کا اثر قبول کرو اور شرفِ ایمان کو کھو بیٹھو، دیکھنا اس وقت تمہارے قدم ہرگز نہ ڈگمگانے پائیں۔'' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی پُر اثر تقریر کا نتیجہ یہ ہوا کہ طائف پر ارتداد کے امڈتے ہوئے بادل آناً فاناً چھٹ گئے اور بنوثقیف نے فتنہ ارتداد کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

(۳)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پورے عہدِ خلافت میں حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ طائف کے امیر رہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی دور میں بھی وہ اسی منصب پر قائم رہے۔ ۱۴ ہجری میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بصرہ کا شہر آباد کرایا تو وہاں کے لوگوں کی تعلیم و تعلّم کے لیے ان کی نظر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ثقفی پر پڑی۔ چنانچہ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بصرہ بھیج دیا۔ ایک ہی سال بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی نگاہِ مردم شناس نے حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کو بحرین اور عمان کی امارت (گورنری) کے لیے منتخب کیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عمان کو اپنا مستقر بنایا اور اپنے بھائی حکم بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب بنا کر بحرین بھیج دیا۔

علامہ بلاذری رحمۃ اللہ علیہ نے ''فتوح البلدان'' میں لکھا ہے کہ عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ نے کچھ عرصہ بعد ایک بحری بیڑا تیار کیا اور اسے ہندوستان پر حملہ کرنے کے لیے روانہ

کیا۔ یہ بحری بیڑا گجرات اور کوکن بمبئی کی سرحد پر واقع بندرگاہ تھانہ تک پہنچا۔ مجاہدینِ اسلام نے اس شہر کو فتح کرلیا۔ لیکن اس پر اپنا قبضہ دیر تک نہ رکھا۔ کیونکہ ان کا مقصد بحری ڈاکوؤں کا انسداد اور ہندوستان کے حالات معلوم کرنا تھا۔ چنانچہ وہ چند دن بعد تھانہ سے بے شمار مالِ غنیمت لے کر واپس عمان آ گئے۔ مورخین کا بیان ہے کہ ہندوستان (گجرات کاٹھیاواڑ) پر عربوں کا یہ پہلا حملہ تھا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ بیڑا روانہ کرتے وقت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی اجازت نہیں لی تھی۔ اس لیے جب انہوں نے دربارِ خلافت میں اپنی کامیابی اور مالِ غنیمت حاصل کرنے کی اطلاع روانہ کی تو امیر المومنین نے ان کی اس مہم جوئی کو پسند نہ کیا۔ کیونکہ ان کے خیال میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کی جانوں کو خطرے میں ڈالا تھا۔ چنانچہ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ایک سخت خط بھیجا۔ جس میں لکھا کہ:

"اے برادرِ ثقفی! تم نے یہ لشکر نہیں بھیجا تھا بلکہ گویا ایک کیڑے کو لکڑی پر بٹھا کر سمندر میں ڈال دیا تھا۔ اگر یہ لوگ مصیبت میں پھنس جاتے تو خدا کی قسم میں تم سے اور تمہاری قوم سے اس کا مواخذہ کرتا۔"

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اس تہدیدی خط کے باوجود حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ نے ہندوستان پر بحری حملوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ کیونکہ ان کے نزدیک وہاں کے مقامی حالات ایسی ہی حملوں کا تقاضا کرتے تھے۔ علامہ بلاذری رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ دوسری دفعہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے بھائی مغیرہ بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کو ایک بیڑا دے کر ہندوستان روانہ کیا۔ وہ سندھ کے مشہور شہر دیبل پہنچے اور دشمنوں کو شکست دے کر مالِ غنیمت کے ساتھ بحرین واپس آئے۔ (ایک روایت یہ بھی ہے کہ مغیرہ دیبل میں شہید ہو گئے) تیسری مرتبہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے دوسرے بھائی حکم بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کو ایک بیڑے کا افسر بنا کر ہندوستان کی طرف روانہ کیا۔ وہ بھڑوچ کو مسخر کر کے واپس آئے۔

بعض مورخین کا بیان ہے کہ ان حملوں کا مقصد صرف ان بحری لٹیروں کا قلع قمع کرنا تھا جو عربوں کے جہاز لوٹ کر سندھ اور کاٹھیاواڑ کی بندرگاہوں میں پناہ لیا کرتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان حملوں کے ذریعے یہ مقصد بڑی حد تک حاصل کیا اور جہازوں کو بحری قزاقوں کی تاخت و تاراج سے کافی عرصہ کے لیے نجات مل گئی۔

(۴)

۲۱ھ ہجری میں حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کی زندگی کا وہ ولولہ انگیز دور شروع ہوا جس میں وہ عہدِ فاروقی اور عہدِ عثمانی کے نامور سپہ سالاروں کی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ اس سال حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایران پر عام لشکر کشی کا ارادہ کیا۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے متعدد علَم تیار کیے۔ اور ان کو اپنے چند مشہور افسروں کے سپرد کر کے مختلف شہروں اور علاقوں کی تسخیر پر مامور کیا۔ ان افسروں پر حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ بھی تھے جنہیں اصطخر کی تسخیر کا کام سونپا گیا۔ اصطخر فارس کا نہایت اہم شہر تھا۔ اور اس پر فوج کشی گویا فارس پر فوج کشی تھی۔ اہلِ فارس کو بھی دم دم کی خبریں پہنچ رہی تھیں۔ انہوں نے اپنا مرکز توج کو بنا کر بڑے زور شور سے مسلمانوں کے مقابلے کی تیاری کی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جزیرہ ابر کاوان فتح کر کے طوفان کی طرح توج کی طرف بڑھے۔ اور ایرانیوں کے تمام دفاعی انتظامات کو روند کر توج پر علَمِ اسلام کو بلند کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے اس شہر میں کچھ عرصہ قیام کر کے وہاں مسجدیں بنوائیں، اور عرب کے بہت سے قبائل آباد کیے۔ (ایک روایت یہ ہے کہ جزیرہ ابر کاوان اور توج حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بھائی حکم بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر فتح ہوئے)۔ اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسلامی لشکر کو مختلف مقامات پر پھیلا دیا۔ ایرانیوں کو ہر جگہ شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور سابور، اردشیر، اور اصطخر وغیرہ بہت سے اہم شہر باری باری فتح ہو گئے۔ اس زمانے میں فارس کا گورنر، "شہرک" نامی ایک جنگجو ایرانی سردار تھا۔ اس نے مسلمانوں کی پیشقدمی روکنے کے لیے ایک جرار لشکر جمع کیا اور رامشہر میں چھاؤنی ڈال

دی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سوار بن ہمام اور اپنے بھائی حکم بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کو شہرک کے مقابلے پر روانہ کیا۔ شہرک نے نہایت ترتیب سے صف آرائی کی اور اعلان کیا کہ جس شخص نے پیچھے قدم ہٹایا اسے قتل کر دیا جائے گا۔ اُدھر مسلمانوں کے جوش وخروش کی بھی کوئی انتہا نہیں تھی۔ غرض فریقین میں گھمسان کا رن پڑا۔ شہرک نے بڑی پامردی سے مقابلہ کیا۔ لیکن جوش میں بپھرے ہوئے مسلمانوں کی یلغار کے سامنے اس کی کچھ پیش نہ چلی۔ ایرانیوں کو زبردست شکست ہوئی اور شہرک میدانِ جنگ میں کام آیا۔ رامشہر کی تسخیر کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ہرم بن حیان عبدی رحمۃ اللہ علیہ کو قلعہ شیر پر چڑھائی کا حکم دیا۔ انہوں نے اس قلعہ کو فتح کر لیا۔ خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جرہ، کازورن نوبندخان اور ان کے نواحی علاقوں کو مفتوح کیا۔ اسی دوران میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ والی بصرہ کو حکم بھیجا کہ وہ فارس کی تسخیر میں حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کا ہاتھ بٹائیں۔ چنانچہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مدد کے لیے بصرہ سے وقتاً فوقتاً امدادی دستے بھیجنے شروع کر دیئے۔ کچھ عرصہ بعد وہ خود ایک فوج لے کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آ گئے اور دونوں نے مل کر شیراز، ارجان، سینسیر وغیرہ کو زیر نگین کیا۔ اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے لشکر کے ساتھ حصن جنایا، داراب جرد، جہرم اور فسا پر یلغار کی اور ان کو خلافتِ اسلامیہ کا مطیع بنایا۔ ۲۳ ہجری میں انہوں نے فارس کے دارالحکومت سابور پر چڑھائی کی۔ اس وقت فارس کا گورنر مقتول شہرک کا بھائی تھا۔ اس کو مسلمانوں سے مقابلے کی ہمت نہ پڑی اور اس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو صلح کا پیغام بھیجا۔ انہوں نے چند شرطوں پر اسے منظور کر لیا۔ اس طرح سارا فارس کچھ بزورِ شمشیر اور کچھ صلح کے ذریعے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر فتح ہو گیا۔

(۵)

فارس کی تسخیر کے ساتھ ہی یا اس کے معاً بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے شہادت پائی اور حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ سریر آرائے خلافت ہوئے۔ حضرت عثمان بن ابی

العاص رضی اللہ عنہ کی فوجی سرگرمیاں ان کے عہد میں بھی جاری رہیں۔ علامہ بلاذری رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کی خلافت کا ابھی آغاز ہی ہوا تھا کہ اہلِ سابور نے اسلامی حکومت کیخلاف بغاوت کردی اور اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ ۲۶ ہجری میں حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے سابور پر ایک پُر زور حملہ کیا اور باغیوں کو قرار واقعی سزا دے کر سابور پر پھر پرچم اسلام لہرا دیا۔ ابنِ جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ کے بیان کے مطابق اہلِ اصطخر بھی اسی زمانے میں باغی ہو گئے تھے۔ ۲۷ ہجری میں حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ نے دوبارہ یلغار کر کے ان کو مطیع و منقاد بنایا۔ امیر المومنین حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کو اصطخر کی تسخیر کی خبر ملی تو وہ بہت خوش ہوئے۔ اور حافظ ابنِ عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کے مطابق انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بن ابی العاص کو بارہ ہزار جریب زمین بطور انعام مرحمت فرمائی۔ فتح اصطخر کے بعد حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کی سرگرمیوں کے بارے میں کتبِ سِیَر خاموش ہیں۔ حافظ ابنِ حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے "تہذیب التہذیب" میں لکھا ہے کہ اپنے وقت کے اس رجلِ عظیم نے ۵۵ ہجری کے لگ بھگ سفرِ آخرت اختیار کیا۔ ازواج و اولاد کے بارے میں بھی اربابِ سِیَر خاموش ہیں۔

حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کا شمار فضلائے صحابہ میں ہوتا ہے۔ اگرچہ ان کو صحبتِ نبوی ﷺ سے فیض یاب ہونے کا زیادہ موقع نہ ملا پھر بھی ان سے انتیس ۲۹ حدیثیں مروی ہیں۔ ان کے راویوں میں سعید بن مسیّب رحمۃ اللہ علیہ، نافع بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ، موسیٰ بن طلحہ رحمۃ اللہ علیہ اور ابنِ سیرین رحمۃ اللہ علیہ جیسے اکابر تابعین شامل ہیں۔ حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کے بے حد مداح تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ عثمان رضی اللہ عنہ فضل و کمال میں اپنی نظیر آپ ہیں۔ فی الحقیقت حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کی ذات علم و عمل کی جامع تھی۔ انہوں نے اخلاص فی الدین اور راہِ حق میں سرفروشی کے جو نقوش صفحہ تاریخ پر ثبت کیے وہ تا ابد فروزاں رہیں گے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

حضرت فراس الاقرع تمیمی رضی اللہ عنہ

(۱)

فتح مکہ اور غزوۂ حنین (۸ ھ) کے بعد سارے عرب نے آستانہ اسلام کے سامنے سر جھکا دیا اور عرب کے گوشے گوشے سے لوگوں کے وفدوں نے مدینہ منورہ کا رُخ کیا ان میں سے بیشتر وفود شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہونے کے لیے بارگاہِ رسالت ﷺ میں حاضر ہوئے جو پہلے ہی سعادت اندوزِ اسلام ہو چکے تھے وہ حضور ﷺ کی زیارت اور بیعت سے مشرّف ہونے کے لیے آئے اور کچھ ایسے بھی تھے جو اہلِ حق سے صلح وامن کا معاہدہ کرنے کے لیے مدینہ منورّہ میں وارد ہوئے۔ ان میں سے بعض وفود نے اسلام کے مزاج سے ناآشنا ہونے کے باعث قبول اسلام یا اظہارِ اطاعت سے پہلے عجیب و غریب شرطیں پیش کیں جن کا رحمتِ عالم ﷺ نے مناسب جواب دیا۔ ایسا ہی ایک وفد بنو تمیم کا تھا۔ ستر یا اسی آدمیوں پر مشتمل یہ وفد ۹ ھ (عام الوفود) میں بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے مدینہ منورہ آیا۔ اس میں قبیلہ کے بڑے بڑے رؤسا اور اربابِ کمال شامل تھے۔ یہ لوگ بڑا اونچا دماغ رکھتے تھے اور اپنی زبان آوری، خطابت اور شعر و شاعری کے سامنے کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ انہوں نے بارگاہِ رسالت ﷺ میں حاضر ہو کر کہا کہ پہلے مسلمان ہم سے مفاخرہ کریں۔ اگر وہ اس میں جیت جائیں تو پھر اسلام کی بات ہو گی۔

حضور ﷺ نے ان کے جواب میں فرمایا کہ میں فخاری اور شعر بازی کے لیے مبعوث نہیں ہوا لیکن اگر تم کو اسی پر اصرار ہے تو ہم اس سے بھی عاجز نہیں ہیں۔ بسم اللہ...... اجازت پا کر بنو تمیم کی طرف سے پہلے عطارد بن حاجب کھڑے ہوئے، انہوں

نے ایک پُر زور اور پُر شکوہ تقریر کی جس میں اپنے قبیلے کے جاہ و حشم، اثر و اقتدار، بلند نسبی، تموّل، شجاعت اور مہمان نوازی کا نہایت موثّر انداز میں ذکر کیا۔ جب ان کی تقریر ختم ہوئی تو حضور ﷺ نے حضرت ثابت بن قیس انصاری رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ اس کا جواب دیں۔ انہوں نے کھڑے ہو کر پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ستائش کی، اس کے بعد رحمت عالم ﷺ کی بعثت، دعوتِ حق کی تفصیل، نزولِ قرآن اور مہاجرین و انصار کے فضائل کو ایسی فصاحت و بلاغت سے بیان کیا کہ ساری مجلس ساکت ہوگئی۔

اب بنو تمیم کی طرف سے زبرقان بن بدر شعر و شاعری کے مقابلے کے لیے کھڑے ہوئے اور نہایت پُر زور اشعار پڑھے جن میں اپنے قبیلے کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ جب وہ بیٹھے تو حضور ﷺ نے حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اٹھو اور جواب دو۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے تعمیلِ ارشاد کی اور ایسے اثر انگیز اشعار پڑھے کہ ان کے سامنے زبرقان بن بدر کے اشعار گرد ہو کر رہ گئے۔ جونہی وہ اپنے جوابی اشعار ختم کر کے بیٹھے، بنو تمیم کے وفد سے ایک بارُعب شخص کھڑے ہو گئے۔ ان صاحب کے سر کے بال اُڑے ہوئے تھے اور ایک ٹانگ میں لنگ بھی تھا۔ لیکن ان کے چہرے مہرے اور چال ڈھال میں امارت و ریاست اور تدبّر کی شان تھی اور صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ قبیلے کے سر برآوردہ آدمی ہیں۔ انہوں نے ارکانِ وفد سے مخاطب ہو کر بآواز بلند کہا:

> ''باپ کی قسم محمد ﷺ کا خطیب ہمارے خطیب سے افضل ہے اور ان کا شاعر ہمارے شاعر سے بہتر ہے۔ اُن کی آوازیں ہماری آوازوں سے زیادہ دلکش اور شیریں ہیں میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اس سے پہلے جو کچھ ہو چکا وہ اُن ﷺ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔''

تمام اہلِ وفد ان کے جواب میں بیک زبان پکار اٹھے: ''آپ نے سچ کہا، آپ

نے سچ کہا۔'' اور پھر آناً فاناً سارے تمیمیوں نے اپنے ہاتھ رحمتِ دوعالم ﷺ کے دستِ مبارک میں دے دیئے۔

یہ صاحب جنھوں نے مفاخرت میں اپنے قبیلے کی ہار کو برملا تسلیم کیا اور سب اہلِ قبیلہ کو دائرہ اسلام میں لے آئے حضرت فراس الاقرع تمیمی رضی اللہ عنہ تھے۔

(۲)

حضرت فراس الاقرع رضی اللہ عنہ جو تاریخ میں بالعموم اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ عرب کے مشہور قبیلہ بنوتمیم کے بہادر اور نامور سردار تھے۔ سلسلہ نسب یہ ہے:

فراس رضی اللہ عنہ (اقرع) بن حابس بن عبقان یا (عقال) بن محمد بن سفیان بن مجاشع بن دارم بن مالک بن حنظلہ بن مالک بن زید بن مناۃ بن تمیم۔

اہلِ سیَر نے حضرت فراس رضی اللہ عنہ کے تین القاب بیان کیے ہیں، الاقرع، الاعرج اور جرار۔ الاقرع اس لیے کہ ان کے سر کے بال اڑے ہوئے تھے۔ الاعرج اس لیے کہ ان کے ایک پیر میں لنگ تھا۔ جرار (یعنی ایک ہزار لشکریوں کی قیادت کرنے والا) اس لیے کہ وہ نہایت شجاع تھے اور انہوں نے زمانہ جاہلیت کی لڑائی یوم الکلاب الاوّل یا (الثانی) میں بنوحنظلہ کی قیادت کی تھی۔ نسب کی نسبت سے حضرت فراس الاقرع رضی اللہ عنہ کو التمیمی کے علاوہ المجاشعی الدارمیؔ اور الحنظلی بھی کہا جاتا ہے۔

حضرت اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ نہایت شجاع اور زیرک آدمی تھے۔ ابنِ اثیر کا بیان ہے کہ وہ شعر و شاعری میں بھی درک رکھتے تھے۔ وہ نہ صرف اپنے قبیلے کے سرکردہ فرد تھے بلکہ عرب بھر میں ان کی عزت و شرافت مسلّم تھی۔ حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ''الاصابہ'' میں اور محمد بن حبیب رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب المجر'' میں لکھا ہے کہ حضرت اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ زمانہ جاہلیت کے عرب داناؤں، ثالثوں اور رہنماؤں (سربراہوں) میں شمار ہوتے تھے۔

علامہ مجد الدّین فیروز آبادی صاحب القاموس کا بیان ہے کہ جاہلی دَور میں سُوقِ

عکاظ کے موقع پر عرب قبائل کے باہمی جھگڑوں کو نمٹانے کا فرض بنو تمیم کے سپرد تھا گویا بنو تمیم اہلِ عرب کے ثالث یا جج تھے۔ ظہورِ اسلام کے وقت یہ عہدہ حضرت اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ کے پاس تھا۔ شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہونے کے بعد بھی حضرت اقرع رضی اللہ عنہ کی دینوی حیثیت برقرار رہی اور لوگ ہمیشہ انہیں ایک شریف دانا اور ذی اثر سردار کے طور پر مانتے رہے۔

حضرت اقرع رضی اللہ عنہ نے قبولِ ایمان کی سعادت کب حاصل کی؟ اس کے بارے میں دو مختلف رائیں ہیں۔ ایک رائے کے مطابق وہ فتح مکہ سے پہلے اسلام لا چکے تھے اور انہوں نے ایک مسلمان مجاہد کی حیثیت سے فتح مکہ، غزوۂ حنین اور غزوۂ طائف میں سرورِ عالم ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔ (یہ رائے ابنِ حزم کی ہے) دوسری رائے جس کا اظہار ابنِ اثیر نے ''اُسد الغابہ'' میں کیا ہے، یہ ہے کہ حضرت اقرع رضی اللہ عنہ نے ۹ ھ میں وفدِ بنو تمیم کے ساتھ اسلام قبول کیا۔ تاہم یہ بات مسلّم ہے کہ وہ فتح مکہ، حنین اور طائف میں حضور ﷺ کے ساتھ تھے اور حضور ﷺ نے ان کے ساتھ ''مولفۃ القلوب'' جیسا سلوک کیا۔ (مولفۃ القلوب میں نو مسلم بھی شامل تھے اور وہ غیر مسلم بھی جو اسلام سے متاثر تھے) اگر ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کو درست تسلیم کیا جائے تو بھی اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت اقرع رضی اللہ عنہ فتح مکہ سے پہلے اسلام سے متاثر ضرور ہو چکے تھے اور اسی اثر پذیری نے انہیں میدانِ رزم میں حضور ﷺ کی حمایت میں لا کھڑا کیا تھا۔

غزوۂ حنین میں فتح کے بعد سرورِ عالم ﷺ نے مالِ غنیمت تقسیم فرمایا تو حضرت اقرع رضی اللہ عنہ کو بطور تالیفِ قلب ایک سو اونٹ مرحمت فرمائے۔ نامور شاعر صحابہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ بن مرداس سلمی کو حضرت اقرع رضی اللہ عنہ سے امتیازی سلوک پر بڑا رشک آیا کیونکہ انھیں کم اونٹ عطا ہوئے تھے۔ چنانچہ انھوں نے فی البدیہہ چند اشعار کہے جن سے آزردگی کا اظہار ہوتا تھا۔ حضور ﷺ نے یہ اشعار سنے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا:
اقطع عنی لسانہ (اس کی زبان کاٹ ڈالو) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عباس بن مرداس رضی اللہ عنہ کا

ہاتھ پکڑا اور کہا کہ میرے ساتھ چل۔ انھوں نے راستے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا، علی کیا میری زبان کاٹو گے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ تو میرے ساتھ چلا آ، میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کروں گا۔

اس طرح باتیں کرتے کرتے حضرت علی رضی اللہ عنہ، عباس بن مرداس رضی اللہ عنہ کو اونٹوں کے گلّے میں لے گئے اور ان سے کہا: ''سو اونٹ اس گلّے میں سے اپنی پسند کے چن لے۔'' حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے سو اونٹ چن لیے اور خوش ہو گئے۔

(۳)

سنہ ۹ ہجری میں وفدِ بنو تمیم کی مدینہ منورہ میں آمد عہدِ رسالت کا ایک اہم واقعہ ہے کیونکہ اس موقع پر قرآنِ حکیم کی کئی آیات نازل ہوئیں۔ اگرچہ اس سال عرب کے گوشے گوشے سے وفود بارگاہِ نبوّت میں حاضر ہو رہے تھے، لیکن امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور حافظ ابنِ قیّم کے قول کے مطابق وفدِ بنو تمیم کے ورودِ مدینہ کی تقریب یہ ہوئی کہ محرّم ۹ ہجری میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عینیہ بن حصن الفرازی کو پچاس سوار دے کر بنو تمیم کے ایک خانوادے بنو عنبر کی سرکوبی کے لیے روانہ فرمایا کیونکہ ان لوگوں نے دوسرے قبیلوں کو بہکا کر ادائے خراج سے منع کیا تھا۔ وہ لوگ اسلامی لشکر کو دیکھ کر بھاگ گئے۔ مسلمان ان کے باسٹھ ۶۲ افراد جن میں ۱۱ مرد اکیس عورتیں اور تیس بچّے تھے، پکڑ کر مدینہ منورہ لے آئے۔ بنو تمیم نے ان قیدیوں کو چھڑانے کے لیے اپنے سرکردہ آدمیوں کا ایک وفد مرتّب کیا جس میں اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ یہ وفد مدینہ منورہ پہنچا تو قیدیوں میں اپنی عورتیں اور بچے دیکھ کر سخت بے قرار ہوا۔ تمام ارکانِ وفد کاشانہ نبوی کے باہر کھڑے ہو گئے۔ اقرع رضی اللہ عنہ نے بے چینی اور عجلت کے عالم میں بآوازِ بلند پکارا:

''اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم باہر نکل کر ہماری بات سنو۔'' بعض مفسّرین نے لکھا ہے کہ اسی موقع پر یہ آیتیں نازل ہوئیں:

اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ ۝

وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ (سورہ الحجرات)

"بے شک جو لوگ آپ کو حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں ان میں سے اکثر سمجھ نہیں رکھتے۔ البتہ ان کے لیے بہتر ہوتا کہ وہ صبر کرتے یہاں تک کہ آپ ان کی طرف نکلتے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔"

مولوی سیّد امیر علی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر "مواہب الرحمٰن" میں خود حضرت اقرع رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اس وقت مجھ میں جہالت اور بدویت موجود تھی اور میں اپنی بے تمیزی سے حجرے کے باہر سے چلایا کہ اے محمد ﷺ نکل کر ہمارے پاس آؤ۔

فخاری کے مقابلے کے بعد جب بنو تمیم نے اپنی ہار کا اعتراف کر لیا تو حضرت اقرع رضی اللہ عنہ نے قیدیوں کی شفارش کی، حضور ﷺ نے ان کی سفارش مان لی اور قیدیوں کی رہائی کا حکم دے دیا۔ اس کے ساتھ ہی وفدِ بنو تمیم نے اسلام قبول کر لیا۔ حافظ ابنِ قیم نے "زاد المعاد" میں لکھا ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ نے ارکانِ وفد کو انعام واکرام سے خوب نوازا۔

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وفدِ بنو تمیم بارگاہِ رسالت ﷺ میں حاضر ہوا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ قعقاع بن معبد کو اُن کا امیر بنا دیجیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بولے اقرع بن حابس کو امیر مقرر فرمائیے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے (حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر) فرمایا تم نے تو بس میری مخالفت ہی پر کمر باندھ رکھی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میں آپ کی مخالفت نہیں کرتا (بلکہ میری رائے یہی ہے) دونوں کی آوازیں اس بحث وتکرار میں بلند ہو گئیں۔ اس پر یہ آیت اتری:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ

بَعۡضِكُمۡ لِبَعۡضٍ اَنۡ تَحۡبَطَ اَعۡمَالُكُمۡ وَ اَنۡتُمۡ لَا تَشۡعُرُوۡنَ ٥

(سورہ الحجرات)

''اے ایمان والو، اللہ اور اس کے رسول کے سامنے پیش قدمی مت کیا کرو اور ڈرو اللہ سے۔ تحقیق اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اے ایمان والو اپنی آوازوں کو نبی کی آواز سے بلند نہ کرو اور جب وہ بات کر رہے ہوں تو بھی بیچ میں اپنی آواز بلند نہ کرو جیسا کہ تم میں سے بعض کرتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے عمل اکارت جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔''

''فتح الباری'' میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان آیات کے نزول کے بعد میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ میں نے قسم کھائی ہے کہ اب میں آپ ﷺ سے اس طرح آہستہ بات کروں گا، جیسے کوئی اپنا راز کہتا ہے۔

دوسری طرف حضرت نافع رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی یہ کیفیت تھی کہ وہ بارگاہِ رسالت میں بے حد آہستہ گفتگو کرنے لگے اس قدر آہستہ کہ جب تک رسول اللہ ﷺ ان سے دوبارہ دریافت نہ فرماتے کچھ سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کہتے ہیں۔

(۴)

حضرت اقرع رضی اللہ عنہ نے اپنی دانائی، معاملہ فہمی، اصابتِ رائے، خاندانی وجاہت اور حق کی حمایت میں ہر وقت کمر بستہ رہنے کی بدولت بارگاہِ نبوّت میں درجہ خصوصیت حاصل کر لیا تھا۔ سرورِ عالم ﷺ ان پر بڑی شفقت فرماتے تھے اور اُن کو مولفۃ القلوب میں شمار کر کے مالِ غنیمت اور صدقات سے باقاعدہ حصہ دیا کرتے تھے۔ یہ اس ارشادِ الٰہی کے مطابق تھا:

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلۡفُقَرَآءِ وَالۡمَسٰكِيۡنِ وَالۡعٰمِلِيۡنَ عَلَيۡهَا وَالۡمُؤَلَّفَةِ قُلُوۡبُهُمۡ (توبہ)

''یہ صدقات تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں اور ان لوگوں کے

لیے جو صدقات کے کام پر مامور ہوں اور ان کے لیے جن کی تالیفِ قلب منظور ہو۔''

حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ''الاصابہ'' میں لکھا ہے کہ قبولِ اسلام کے بعد بھی حضرت اقرع رضی اللہ عنہ کی عزت و شرافت مسلّم رہی اور وہ ایمان و اسلام میں بھی پختہ تھے۔

حجۃ الوداع سے پہلے سرورِ عالم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قیادت میں ایک مہم یمن بھیجی۔ وہاں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کچھ سونا حضور ﷺ کی خدمت میں روانہ کیا۔ آپ ﷺ نے یہ سونا چار آدمیوں میں تقسیم کر دیا جن میں ایک حضرات اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ تھے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ''صحیح'' میں یہ واقعہ اس طرح بیان کیا ہے:

''علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے یمن سے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں کچھ سونا (سونے کا پتّر) دباغت شدہ چمڑے میں رکھ کر بھیجا۔ اس کی مٹی بھی ابھی جدا نہیں ہوئی تھی۔ آپ ﷺ نے اس کو چار شخصوں عیینہ بن بدر رضی اللہ عنہ، اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ، زید الخیل رضی اللہ عنہ اور چوتھے علقمہ رضی اللہ عنہ یا عامر بن طفیل رضی اللہ عنہ میں تقسیم کر دیا۔ آپ ﷺ کے صحابہ میں سے ایک شخص نے کہا کہ ہم ان لوگوں کی بہ نسب زیادہ حقدار تھے۔ آپ ﷺ کو معلوم ہوا تو فرمایا کیا تم لوگ مجھ کو امین نہیں سمجھتے حالانکہ میں آسمان والے کا امین ہوں۔ میرے پاس صبح و شام آسمان کی خبر آتی ہے۔'' الخ

(بخاری کتاب المغازی)

علامہ بلاذری رحمۃ اللہ علیہ نے انساب الاشراف میں لکھا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ کو بنو دارم بن مالک بن حنظلہ کے صدقات کی فراہمی کے لیے عامل مقرر فرمایا تھا۔

علامہ بلاذری رحمۃ اللہ علیہ ہی نے ''فتوح البلدان'' میں بیان کیا ہے کہ جب نجران کے عیسائیوں کا وفد مدینہ منورہ آیا تو حضور ﷺ نے ایک عہد نامہ لکھوا کر انہیں امان دے

دی۔اس عہد نامہ پر جن گواہوں نے دستخط ثبت کیے ان میں حضرت اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔

ان روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت اقرع رضی اللہ عنہ کو حضور ﷺ کا مکمل اعتماد حاصل تھا۔

حضرت اقرع رضی اللہ عنہ اکثر بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر فیضانِ نبوی سے بہرہ یاب ہوا کرتے تھے۔طبرانی نے حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ ایک دفعہ حضرت اقرع رضی اللہ عنہ دربارِ نبوّت میں حاضر تھے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کھیلتے کھیلتے وہاں آ گئے۔حضور ﷺ نے فرطِ محبت سے ان کا منہ سر چوما۔حضرت اقرع رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، یارسول اللہ ﷺ میری دس لڑکے ہیں میں نے کبھی کسی کا منہ سر نہیں چوما۔حضور ﷺ نے فرمایا: ''اللہ اس پر رحم نہیں کرتا جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا۔''

یہ روایت کچھ لفظی اختلاف کے ساتھ صحیح بخاری میں بھی موجود ہے، ایک دوسری روایت میں حضور ﷺ سے یہ الفاظ منسوب ہیں: ''اگر اللہ تمہارے دل سے محبت سلب کر لے تو میں کیا کروں۔'' اس طرح حضور ﷺ نے حضرت اقرع رضی اللہ عنہ کو یہ سبق دیا کہ اولاد سے پیار کرنا اور ان کا منہ سر چومنا بھی اولاد کے حقوق میں داخل ہے۔

حافظ ابنِ قیم نے ''زاد المعاذ'' میں ایک واقعہ بیان کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اقرع رضی اللہ عنہ بڑے اثر و رسوخ کے مالک تھے۔واقعہ یہ تھا کہ ایک مہم میں عامر بن اضبط الاشجعی کسی خطا کی بناء پر حضرت محلم بن جثامۃ اللیثی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے مارا گیا۔ بنو اشجع نے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر قصاص کا مطالبہ کیا۔آپ ﷺ نے دِیت دینی چاہی۔لیکن وہ لوگ راضی نہ ہوئے۔آخر حضرت اقرع رضی اللہ عنہ کے سمجھانے بجھانے پر انہوں نے دِیَت قبول کر لی۔

(۵)

سنہ ۱۱ھ میں سرورِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ سر

پرآرائے خلافت ہوئے تو دفعتاً سارے عرب میں فتنہ ارتداد (رِدّہ) کے شعلے بھڑک اٹھے۔ یہ سخت امتحان کا وقت تھا کیونکہ انصارِ مدینہ، قریشِ مکہ اور بنو ثقیف کے سوا شاید ہی کوئی قبیلہ اس فتنہ میں مبتلا نہ ہوا ہو۔ حضرت اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ اس پُر آشوب دور میں نہایت استقامت کے ساتھ اسلام کے جادۂ مستقیم پر قائم رہے اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہو کر یمامہ کی خونریز لڑائی میں مرتدین کے خلاف نہایت بہادری سے لڑے۔ اس سلسلے کے کچھ اور معرکوں میں بھی انہوں نے دادِ شجاعت دی۔ فتنہ ارتداد کے انسداد کے بعد ایران اور شام سے لڑائیوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس وقت حضرت اقرع رضی اللہ عنہ کافی عمر کو پہنچ چکے تھے لیکن بڑے چاق و چوبند اور صحت مند تھے۔ شوقِ جہاد نے انہیں گھر میں نہ بیٹھنے دیا اور انہوں نے زندگی کے آخری دور کا بیشتر حصّہ میدانِ جہاد میں گزارا۔ حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حضرت اقرع رضی اللہ عنہ نے حضرت شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہو کر دومۃ الجندل کے معرکے میں حصّہ لیا۔ (الاصابہ)

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضرت اقرع رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی زیرِ قیادت ایرانیوں کے خلاف کئی لڑائیوں میں اپنی تلوار کے جوہر دکھائے۔ مسلمانوں نے انبار پر لشکرکشی کی تو حضرت اقرع رضی اللہ عنہ ہراوّل فوج کے افسر تھے۔

(تجرید اسماء الصحابہ)

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے "تاریخِ صغیر" میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ یہ عیینہ بن حصن کے ہمراہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے جاگیر کی درخواست کی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی وہاں موجود تھے انہوں نے حضرت اقرع رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ تمہاری تالیفِ قلب کیا کرتے تھے لیکن اب تمہیں محنت کرنی چاہیے۔

مشہور مصری مصنف محمد حسین ہیکل نے اپنی کتاب "عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ" میں یہ واقعہ مختلف انداز سے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے زمامِ

خلافت سنبھالی تو انہوں نے عہدِ رسالت ﷺ کے تمام عطیوں کو برقرار رکھا۔ چند دن بعد عیینہ بن حصن اور اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ بارگاہِ خلافت میں حاضر ہوئے اور زمین طلب کی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے زمین کے لیے انہیں تحریری حکم دے دیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد یہ دونوں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا حکم نافذ کیا جائے۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی درخواست یہ کہہ کر رد کردی کہ اللہ نے اسلام کو سربلند اور تم سے بے نیاز کردیا ہے اب تم (جاگیروں اور عطیوں کے بغیر) اسلام پر مضبوطی سے قائم ہو جاؤ ورنہ ہمارے اور تمہارے درمیان تلوار ہوگی۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ''مولفۃ القلوب'' کہلانے والے تمام لوگوں کو عام مسلمانوں کے زمرے میں شامل کردیا۔

امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اس فیصلے کا حضرت اقرع رضی اللہ عنہ نے کوئی اثر نہ لیا اور خلوصِ دل کے ساتھ میدانِ جہاد میں دادِ شجاعت دیتے رہے اور جہاد کرتے کرتے ہی انہوں نے جامِ شہادت پیا۔

حضرت اقرع رضی اللہ عنہ کے سالِ شہادت اور جائے شہادت کے بارے میں اہلِ سیَر میں اختلاف ہے۔ بقول رضی الشاطبی انہوں نے جنگِ یرموک (۱۵ ہجری) میں اپنے دس بیٹوں کے ہمراہ شہادت پائی لیکن حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ بلاذری نے لکھا ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے حضرت اقرع رضی اللہ عنہ کو سالارِ لشکر بنا کر خراسان کے محاذ پر بھیجا تھا جہاں انہوں نے کئی معرکے سر کیے۔ جوزجان کا اہم شہر بھی ان کے ہاتھ پر فتح ہوا لیکن لڑائی میں ان کو ایسے کاری زخم لگے کہ جانبر نہ ہوسکے اور خلعتِ شہادت پہن کر خُلدِ بریں کو سدھارے۔

حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اسی روایت کو ترجیح دی ہے اور ہمارے نزدیک بھی یہی صحیح ہے
رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

حضرت کعب بن زُہیر مزنی رضی اللہ عنہ

(۱)

غزوۂ طائف (۸ ہجری) کے چند دن بعد کا ذکر ہے کہ ایک دن رحمت عالم ﷺ مسجدِ نبوی میں اپنے چند جاں نثاروں کے حلقے میں رونق افروز تھے اور اپنے ارشاداتِ عالیہ سے اُنہیں مستفیض فرما رہے تھے کہ اچانک مسجد کے دروازے پر ایک سانڈنی آ کر رُکی۔ گٹھے ہوئے جسم کے ایک صاحب، جنھوں نے سر سے لے کر منہ تک ڈھاٹا باندھ رکھا تھا، سانڈنی سے نیچے اترے اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے حضور ﷺ کی خدمت میں آ کر بیٹھ گئے۔ حضور ﷺ اُن کی طرف متوجہ ہوئے، تو اُن صاحب نے بڑی لجاجت سے عرض کیا:

''اے اللہ کے سچے رسول، میں صدقِ دل سے اسلام قبول کرتا ہوں۔ اپنا دستِ مبارک لائیے تا کہ بیعت کا شرف حاصل کروں۔''

حضور ﷺ نے اپنا دستِ مبارک بڑھا دیا۔ جب وہ صاحب بیعت کر چکے، تو حضور ﷺ نے اُن سے دریافت فرمایا: ''تم کون ہو؟''

نووارد نے اپنا نام بتایا اور ساتھ ہی ڈھاٹا کھولتے ہوئے عرض کیا: ''یارسول اللہ، کیا مجھے امان ہے؟''

اُن کا چہرہ دیکھتے ہی ایک شمشیر بدست انصاری کہتے ہوئے آگے بڑھے:
''یارسول اللہ، مجھے اجازت دیجیے کہ اس دشمنِ خدا کا سر قلم کر دوں۔''

رحمتِ عالم ﷺ نے فرمایا: ''نہیں، ایسا نہ کرو۔ یہ شخص تائب ہو کر آیا ہے۔ اب اس کی سب خطائیں معاف ہیں۔''

رسولِ رحمت ﷺ کا ارشادِ مبارک سُن کر اُن صاحب کا چہرہ فرطِ مسرّت سے گلنار ہو گیا اور انہوں نے بارگاہِ رسالت ﷺ میں بڑے جوش و خروش سے ایک طویل قصیدہ پڑھنا شروع کر دیا۔ جب اس شعر پر پہنچے:

ان الرسول لنور یستضاء بہ

مھند من سیوف اللہ مسلول

تو سیّد المرسلین ﷺ نے اپنی بُردہ (چادر) مبارک اُتار کر اُنہیں بطور انعام مرحمت فرمائی ع

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جا ہے

یہ صاحب جن کے اشعار نے محبوب ﷺ ربّ العالمین کو مسرور کیا اور جن کو سیّد الانام ﷺ نے اپنی اور چادر مبارک سے نوازا، حضرت کعب بن زُہیر مزنی رضی اللہ عنہ تھے۔

(۲)

حضرت ابو عقبہ کعب بن زُہَیر رضی اللہ عنہ کا تعلق قبیلہ مُضَر کی شاخی مزینہ سے تھا۔ ماں کا نام کبشہ بنتِ بشامہ تھا۔ وہ بنو غطفان سے تھے۔

حضرت کعب رضی اللہ عنہ کے والد زُہَیر بن ابی سُلمیٰ کا شمار زمانہ جاہلیت کے نامور شعراء میں ہوتا ہے۔ وہ اُن سات بڑے شعراء میں سے ایک ہیں جن کے قصائد آبِ زر سے لکھ کر کعبہ کے اندر آویزاں کیے گئے تھے۔ سیّدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تو انہیں "اشعر شعراء العرب" یعنی سب سے بڑا عربی شاعر کہا کرتے تھے۔

حضرت کعب رضی اللہ عنہ کا خاندان نجد میں آباد تھا اور شعر و شاعری میں سارے عرب میں امتیازی حیثیت رکھتا تھا۔ باپ زُہَیر کے علاوہ اُن کا دادا ابو سُلمیٰ ربیعہ، نانا، بھائی اور پھوپھیاں سب کے سب شعر و سخن کے سمندر کے شناور تھے۔ خاندانی ماحول کا یہ اثر ہوا کہ کعب بچپن ہی سے شعر گوئی کی جانب مائل ہو گئے۔ باپ کو معلوم ہوا، تو اس نے اُنہیں شعر گوئی سے منع کیا، کیونکہ اُس کے خیال میں ناپختہ عمر میں کہے گئے اشعار میں فنی خرابیاں

شعراء کے اس نامور خاندان کی شہرت کو داغدار کر سکتی تھیں۔ لیکن شعر گوئی کعب رضی اللہ عنہ کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اُنہوں نے مشقِ سخن جاری رکھی۔ اتفاقاً ایک دن اُن کے کچھ اشعار باپ کی نظر سے گزرے، تو وہ ان کی جدّتِ ادا اور پختگی دیکھ کر اپنے فرزند کی صلاحیتوں کا قائل ہو گیا، چنانچہ انہیں شعر گوئی کی اجازت دے دی۔

ایک اور روایت میں ہے کہ باپ نے اُن کا کڑا امتحان لیا جس میں وہ سُرخرو ہوئے۔ اس پر خوش ہو کر اُنہیں مشقِ سخن کی اجازت دے دی۔ یہاں تک کہ ایک دن سارے عرب نے اُنہیں ایک قادر الکلام شاعر تسلیم کیا۔

کعب رضی اللہ عنہ کے ابتدائی حالاتِ زندگی کے بارے میں اہلِ سِیَر بالعموم خاموش ہیں۔ زیادہ سے زیادہ اتنا پتہ چلتا ہے کہ اُن کا بچپن سے جوانی تک کا زمانہ بنی غطفان کے علاقے میں گزرا۔ اس دوران میں وہ اپنے والد اور دوسرے بزرگوں کی نگرانی میں شعر و شاعری کی مشق کرتے رہے۔ حافظ ابنِ حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے ''الاصابہ'' میں لکھا ہے کہ مشہور مخضرمی (ہجو گو) شاعر حطیہ (ابو ملیکہ جردل بن اوس عبسی) بھی کعب رضی اللہ عنہ کا ہم سبق تھا اور دونوں زُہیر بن ابی سلمٰی سے استفادہ کیا کرتے تھے۔

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ کعب رضی اللہ عنہ نے سپاہیانہ فنون میں بھی تربیت حاصل کی تھی اور ایامِ جاہلیت میں اپنے قبیلے کی لڑائیوں میں حصہ لیا کرتے تھے۔ بنو مزینہ کی قریش، بنو طے اور خزرج کے خلاف جو لڑائیاں ہوئیں، کعب اُن میں اپنے قبیلے کی طرف سے شریک تھے اور رجزیہ اشعار پڑھ پڑھ کر اپنے جوانوں کو لڑائی پر ابھارتے تھے۔

حضرت کعب رضی اللہ عنہ کے باپ زُہیر نے بعثتِ نبوی ﷺ سے تھوڑے عرصے بعد وفات پائی تو کعب رضی اللہ عنہ نے ایسا دردانگیز مرثیہ کہا کہ جو سُنتا تھا، بے اختیار چشم پُرآب ہو جاتا تھا۔

(۳)

جس زمانے میں کعب رضی اللہ عنہ کی شاعری کی شہرت نجد سے نکل کر عرب کے دور دراز

گوشوں تک جا پہنچی تھی، اسلام کے نورِ ہدایت نے بھی عرب کے گوشے گوشے کو منوّر کرنا شروع کر دیا تھا۔ کعب رضی اللہ عنہ اور اُن کے بھائی بُجیر رضی اللہ عنہ کے کانوں تک بھی دعوتِ حق کی آواز پہنچی، لیکن وہ اُس کی طرف ملتفت نہ ہوئے۔ صلح حدیبیہ ۶ ہجری کے بعد دونوں بھائی اپنے وطن سے نکل کر مقام ابرق العزّاف میں آئے۔ یہاں بُجیر رضی اللہ عنہ نے کعب رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تم یہیں ٹھہرے رہو اور اپنی بھیڑ بکریوں کی حفاظت کرو، میں ذرا یثرب جا کر صاحبِ قریش (رسول اکرم ﷺ) سے معلوم کرتا ہوں کہ وہ کس چیز کی دعوت دیتے ہیں۔

بُجیر رضی اللہ عنہ، رحمتِ عالم ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ کے جمالِ جہاں آرا اور ارشاداتِ مقدسہ سے ایسے متاثر ہوئے کہ بلا تامّل سعادت اندوزِ اسلام ہوگئے اور مدینہ منوّرہ ہی کے ہو رہے۔

کعب رضی اللہ عنہ کو بُجیر رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام اور مدینہ منوّرہ میں مستقل اقامت کی اطلاع ملی، تو وہ سخت غضب ناک ہوئے اور حالتِ غیظ میں رحمتِ عالم ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان میں چند گستاخانہ اشعار کہہ ڈالے اور مدینہ جانے والے ایک شخص کے ذریعے یہ اشعار حضرت بُجیر رضی اللہ عنہ تک پہنچا دیئے۔

حضرت بُجیر رضی اللہ عنہ شمع رسالت کے پروانے بن چکے تھے۔ وہ اپنے آقا و مولا ﷺ کی شان میں گستاخی کیسے برداشت کر سکتے تھے! انہوں نے بھرے دل کے ساتھ حضور ﷺ کو اُن اشعار سے مُطّلع کر دیا۔ آپ کو کعب رضی اللہ عنہ کی اس حرکت سے بڑی تکلیف پہنچی اور آپ ﷺ نے فرمایا:

من لقا کعبا فلیقتله

(جو کوئی کعب کو دیکھے اس کو قتل کرے)

بعض اربابِ سِیَر نے یہ رائے ظاہر کی ہے (اور اپنی رائے کے حق میں دلائل بھی دیئے ہیں) کہ صرف یہ گستاخانہ اشعار ہی کعب کے واجب القتل قرار دیئے جانے کا

سبب نہیں ہوئے تھے بلکہ اس کے کچھ اور اسباب بھی تھے۔ وہ یہ کہ کعب، ابرق العزّاف سے مکہ چلے گئے اور قریشِ مکہ کے ساتھ مل کر اسلام کے خلاف معاندانہ سرگرمیوں میں حِصّہ لینے لگے۔ وہ اپنے اشعار میں مسلمانوں کی ہجو کرتے اور مشرکین کو اہلِ حق کے خلاف مشتعل کرتے تھے۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ انہوں نے ابرق العزّاف میں اپنے بھائی کے ساتھ مل کر حضور ﷺ کو شہید کرنے کا منصوبہ بنایا تھا اور اسی مقصد کے لیے بجیر رضی اللہ عنہ کو مدینہ بھیجا تھا، لیکن جب بجیر رضی اللہ عنہ، مدینہ پہنچ کر حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے اور یہ سازش طشت ازبام ہوگئی، تو حضور ﷺ نے کعب کا خون مباح کر دیا۔

بیشتر روایتوں سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت بجیر رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کے فوراً بعد (اواخر ۶ ھ) میں پیش آیا، لیکن ابنِ ہشام کا بیان ہے کہ یہ واقعہ سرورِ عالم ﷺ کی غزوۂ طائف سے مراجعت کے بعد ۸ ھ میں پیش آیا۔ بہر صورت حقیقتِ حال کچھ بھی ہو، اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ حضرت بجیر رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کے بعد دونوں بھائیوں کی راہیں مختلف ہو گئیں۔

بجیر رضی اللہ عنہ راہِ حق کے جانباز سپاہی بن گئے اور کعب نے اسلام کی مخالفت کو اپنا شعار بنالیا۔

ابنِ ہشام نے لکھا ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد جو غزوات پیش آئے، خیبر، فتح مکّہ، حنین اور طائف، حضرت بجیر رضی اللہ عنہ نے ان سب میں سرورِ عالم ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا اور ہر غزوے میں اپنی سرفروشی کے جوہر دکھائے۔ ان غزوات میں انہوں نے حق کی حمایت میں نہایت پُر زور اشعار بھی کہے جن کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف ایک اچھے شاعر ہی نہیں تھے، بلکہ اسلام کی محبت بھی اُن کے روئیں روئیں میں سرایت کر گئی تھی۔

(۴)

سرورِ عالم ﷺ جب غزوۂ طائف سے فارغ ہو کر واپس مدینہ منوّرہ تشریف

لائے، تو حضرت بجیر رضی اللہ عنہ نے خط لکھ کر کعب کو اطلاع دی کہ رسول اللہ ﷺ نے گنتی کے دو چار دشمنانِ حق کے سوا باقی سب اہلِ مکہ کو بخش دیا ہے۔ قتل ہونے والوں میں ابنِ خطل بھی تھا جو حضور ﷺ کی شان میں ہجو یہ اشعار کہا کرتا تھا۔ دوسرے دو ہجو گو ہبیرہ بن ابی وہب اور ابنِ زبعریٰ مکہ سے بھاگ کر یمن میں پناہ گزین ہوئے، تاہم ابنِ زبعریٰ تائب ہو کر بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا، تو حضور ﷺ نے اُس کو بھی بخش دیا۔ تمہاری جان بھی اسی صورت میں بچ سکتی ہے کہ تم میرا خط ملتے ہی سعادت اندوزِ اسلام ہو جاؤ اور بارگاہِ رسالت ﷺ میں حاضر ہو کر اپنی سابقہ خطاؤں پر ندامت کا اظہار کرو۔ حضور ﷺ کا دامنِ کرم بڑا وسیع ہے وہ خطا کاروں سے درگزر فرماتے ہیں۔

کعب کو حضرت بجیر رضی اللہ عنہ کا خط ملا، تو انہوں نے بھائی کے مشورے پر ابتداء میں عمل نہ کیا اور مختلف قبیلوں میں پناہ لینی چاہی، مگر کوئی قبیلہ انہیں پناہ دینے پر آمادہ نہ ہوا حتیٰ کہ اپنے قبیلے بنو مزینہ نے بھی اُنہیں پناہ دینے سے انکار کر دیا۔ اب ان کی آنکھیں کُھلیں اور انہیں حضور ﷺ کا دامنِ اقدس تھامنے ہی میں عافیت نظر آئی۔

ابن ہشام کا بیان ہے کہ کعب کو اسلام کی طرف راغب کرنے کا سبب وہ اشعار تھے جو حضرت بجیر رضی اللہ عنہ نے اُنہیں لکھ کر بھیجے۔ یہ اشعار جو کعب کے گستاخانہ اشعار کے جواب میں تھے، سیرت ابنِ ہشام میں نقل کیے گئے ہیں۔

مَنْ مُبْلِغٌ كَعْبًا فَهَلْ لَكَ فِي الَّتِيْ ... تَلُوْمُ عَلَيْهَا بَاطِلًا وَّهِيَ اَحْزَمُ

اِلَى اللّٰهِ (لَا الْعُزّٰى اللَّاتِ) وَحْدَهٗ ... فَتَنْجُوْا اِذَا كَانَ النَّجَاءَ وَ تَسْلَمُ

لَدٰى يَوْمٍ لَا يَنْجُوْ وَلَيْسَ بِمَفْلِتٍ ... مِنَ النَّاسِ اِلَّا طَاهِرُ الْقَلْبِ مُسْلِمٌ

فَدِيْنُ زُهَيْرٍ وَلَاءِ شَيْءٍ دِيْنَهٗ ... وَدِيْنَ اَبِيْ سَلْمٰى عَلَيَّ مُحَرَّمٌ

ترجمہ: ”کون شخص کعب کو جا کر میرا پیغام دے گا اور اُس سے پوچھے گا کہ جس دین کی تم مذمت کرتے ہو، اس میں آخر کیا خرابی ہے؟ وہ دین تو سراسر بھلائی ہے۔

۲۔ نجات کی طرف لے جانے والا صرف اللہ کا راستہ ہے، لات اور عُزّیٰ کے راستے نہیں۔ اگر نجات اور سلامتی چاہتے ہو، تو اللہ کے راستے پر چل کر حاصل کرلو۔

۳۔ وہ دن یقیناً آنے والا ہے جب پاکباز اور پاک نفس مسلمان کے سوا کوئی نجات حاصل نہ کر سکے گا۔

۴۔ زُہیر کا دین بے حقیقت تھا اور اسی طرح ابی سُلمیٰ کا دین بھی مجھ پر حرام ہے۔

اسلام کے بارے میں شرحِ صدر ہونے کے بعد کعب رضی اللہ عنہ بارگاہِ رسالت میں کس طرح حاضر ہوئے، اس سلسلے میں پانچ مختلف روایتیں ہیں:

(۱) حافظ ابنِ حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے ''الاصابہ فی تمیز الصحابہ رضی اللہ عنہم'' میں لکھا ہے کہ حضرت کعب رضی اللہ عنہ، مدینہ منوّرہ پہنچے، تو سیدھا مسجدِ نبوی ﷺ کا رُخ کیا جہاں حضور ﷺ کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم کے درمیان تشریف فرما تھے۔ کعب رضی اللہ عنہ نے اپنی اونٹنی کو مسجد کے دروازے پر بٹھایا، پھر اپنے قیاس اور قرینے یا خاص علامتوں سے حضور ﷺ کو پہچانا اور صفوں کو چیرتے ہوئے آپ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں جا کر بیٹھ گئے۔ پہلے کلمہ شہادت پڑھا اور پھر یوں عرض پیرا ہوئے:

''یارسول اللہ، میں کعب بن زُہیر ہوں اور امان کی التجا کرتا ہوں۔''

حضور ﷺ نے فرمایا: ''اچھا، تو تم ہو جس نے وہ اشعار کہے تھے؟'' پھر آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''ذرا وہ اشعار پڑھیے۔'' ارشادِ نبوی ﷺ سن کر حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ نے یہ ارشاد پڑھے:

۱ اَلَا اَبْلِغَا عَنِّیْ بُجَیْرًا رِسَالَةً — عَلٰی اَیِّ شَیْءٍ وَیْبَ غَیْرِكَ دَلَّكَا

۲ عَلٰی خُلُقٍ لَمْ تَلْفَ اُمًّا وَلَا اَبًا — عَلَیْهِ وَلَمْ تُدْرِكْ عَلَیْهِ اَخَالَكَا

۳ سَقَاكَ اَبُوْبَكْرٍ بِكَاْسٍ رَوِیَّةٍ — فَاَنْهَلَكَ الْمَاْمُوْرُ مِنْهَا وَعَلَّكَا

ترجمہ(۱): بُجیر کو میرا یہ پیغام پہنچا دو کہ آخر کس چیز نے تجھے غیر کی تباہی و ہلاکت اپنے سر لینے پر آمادہ کیا۔

۲۔ یہ طریقہ نہ تو تمہارے ماں باپ کا تھا اور نہ تمہارے بھائی نے اختیار کیا۔

۳۔ تم کو ابو بکر رضی اللہ عنہ نے لبریز پیالہ پلایا اور ''مامور'' نے تو تمہیں اس پیالے سے خوب سیراب کیا۔

جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے تیسرے شعر کا دوسرا مصرع پڑھا تو کعب رضی اللہ عنہ نے عرض کی:

''یا رسول اللہ، یہ مصرع یوں ہونا چاہیے ع

فَانْهَلَكَ الْمَأْمُوْنُ مِنْهَا وَ عَلَّكَا

''(مامون نے تجھے اس پیالے سے خوب سیراب کیا ہے)''

رحمتِ عالم ﷺ نے فرمایا: ''مامون واللہ'' (ہاں، خدا کی قسم! مامون ہی درست ہے)

پھر ارشاد ہوا: ''تم کو امان ہے اور تم بھی اب مامون ہو۔''

مشرکین اپنے خبثِ باطن کا اظہار بعض اوقات حضور ﷺ کو ''مامور'' کہہ کر کیا کرتے تھے جس کے معنی کسی جن کے تابع ہونے کے ہیں۔ چونکہ اس لفظ سے ذمّ کا پہلو نکلتا تھا، اس لیے حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے اس کو ''مامون'' (بے خوف، محفوظ) سے بدل دیا۔

ابنِ ہشام کے قول کے مطابق حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے اپنے شعر میں فی الواقع ''مامون'' ہی کا لفظ استعمال کیا تھا۔

(۲) ابنِ قتیبہ نے ''الشعر والشعراء'' میں بیان کیا ہے کہ حضرت کعب رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ پہنچ کر پہلے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ نمازِ فجر کے

بعد حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ نے کعب رضی اللہ عنہ کو سرورِ عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر کیا۔ اُس وقت کعب رضی اللہ عنہ نے چہرے پر ڈھاٹا باندھ رکھا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''یارسول اللہ، یہ شخص اسلام لانا چاہتا ہے اور آپ کی بیعت سے مشرف ہونے کا بھی آرزومند ہے۔''

حضور ﷺ نے اپنا دستِ مبارک آگے بڑھا دیا۔ کعب رضی اللہ عنہ بیعت کر چکے، تو اُنہوں نے اپنا ڈھاٹا کھول دیا اور عرض کیا:

''یارسول اللہ، میں کعب بن زُہیر ہوں اور امان کا طلب گار۔''

حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت میں مشہور تابعی حضرت سعید رحمۃ اللہ علیہ بن مسیّب کے حوالے سے یہ اضافہ کیا ہے کہ کعب رضی اللہ عنہ نے مدینہ پہنچ کر لوگوں سے سیّدالانام ﷺ کے سب سے زیادہ رقیق القلب اور نرم دل صحابی رضی اللہ عنہ کا نام پوچھا۔ انہوں نے حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ کا نام لیا۔ کعب رضی اللہ عنہ اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سفارش چاہی، چنانچہ صِدّیقِ اکبر رضی اللہ عنہ انہیں ساتھ لے کر بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے۔

(۳) سیرت ابنِ ہشام میں ہے کہ کعب رضی اللہ عنہ مدینہ منوّرہ پہنچ کر بنوجہینہ کے ایک صاحب کے پاس شب باش ہوئے جو اُن کے جاننے والے تھے۔ اُن صاحب نے نمازِ فجر کے بعد کعب رضی اللہ عنہ کو سرورِ عالم ﷺ کے سامنے پیش کیا۔ کعب رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا اور حضور ﷺ کی بیعت کی۔

حضور ﷺ اُن سے شناسا نہیں تھے، چنانچہ کعب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''یارسول اللہ، کعب بن زُہیر تائب ہو کر اور ایمان قبول کر کے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہے اور امان کا خواستگار ہے۔ اگر میں اُسے پیش کروں، تو کیا آپ اس کو معاف فرما دیں گے؟''

حضور ﷺ نے فرمایا: ''ہاں، اگر وہ صدقِ دل سے ایمان لے آئے اور گزشتہ خطاؤں سے توبہ کرے، تو اس کو امان ہے۔''

اس پر کعب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول، میں ہی کعب بن زُہیر ہوں۔''

(۴) ابوزید القرشی نے ''جمہرۃ اشعار العرب'' میں لکھا ہے کہ حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے مدینہ منورّہ جا کر سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ سے پناہ طلب کی، لیکن انہوں نے یہ فرماتے ہوئے معذرت کی کہ میں رسول اللہ ﷺ کی مرضی کے خلاف تمہیں پناہ نہیں دے سکتا۔ اس کے بعد کعب رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں گئے اور پناہ کی درخواست کی۔ اُنہوں نے بھی انکار کر دیا۔ پھر وہ حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ کے پاس گئے۔ اُنہوں نے بھی پناہ دینے کی حامی نہ بھری، البتہ مشورہ دیا کہ تم جا کر حضور ﷺ کی اقتداء میں نماز پڑھو۔ جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہو جائیں، تو حضور ﷺ سے عرض کرنا کہ اے اللہ کے رسول، میں نے اسلام قبول کیا ہے اور اب آپ ﷺ کی بیعت کرنا چاہتا ہوں۔ حضور ﷺ اپنا دستِ مبارک بڑھائیں گے، تو تم تھام کر امان طلب کرنا۔ اُمید ہے رُسول ﷺ اللہ تمہیں عفو و کرم سے نوازیں گے۔

حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مشورے کے مطابق عمل کیا اور معافی پائی۔

(۵) ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ نے خود حضرت کعب رضی اللہ عنہ کی زبانی یہ واقعہ اس طرح نقل کیا ہے کہ میں نے مسجد نبوی ﷺ کے دروازے پر اپنی سانڈنی بٹھائی اور مسجد میں داخل ہوا۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ ایک چبوترے پر تشریف فرما تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حلقے باندھے آپ کے اردگرد بیٹھے تھے۔ حضور ﷺ کبھی ایک حلقے سے مخاطب ہوتے، کبھی دوسرے سے۔ میں آپ ﷺ کی خدمت میں جا کر بیٹھ گیا اور کلمہ پڑھ کر اپنے اسلام کا اعلان کیا۔ پھر میں نے امان کی استدعا کی۔ حضور ﷺ نے پوچھا: ''تم کون ہو؟''
میں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول ﷺ، میں کعب بن زُہیر ہوں۔''
حضور ﷺ نے فرمایا: ''اچھا، تو وہ اشعار تم ہی نے کہے تھے؟'' پھر آپ ﷺ نے

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے وہ اشعار پڑھنے کے لیے ارشاد فرمایا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے شعر پڑھتے ہوئے جب "المامور" کہا تو میں نے عرض کیا: "یارسول اللہ، المامور نہیں بلکہ المامون۔ آپ نے فرمایا: "مامون و اللّٰہ" (بخدا! مامون ہی ہے)۔

(الاصابہ ج ۳ صفحہ ۲۷۹)

(۵)

ابنِ ہشام نے علامہ ابنِ اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ جب لوگوں کو علم ہوا کہ امان طلب کرنے والا وہی کعب بن زہیر شاعر ہے جس کا خون حضور ﷺ نے ہدر کر دیا ہے، تو ایک انصاری نے آگے بڑھ کر اُن کو قتل کرنا چاہا اور اس مقصد کے لیے حضور ﷺ سے اجازت طلب کی۔ رحمتِ دو عالم ﷺ نے فرمایا: نہیں، کعب تائب ہو کر آیا ہے۔ اب اس سے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔ اب کعب مسرور اور مطمئن ہو گئے اور بارگاہِ رسالت ﷺ میں عرض کیا:

"یارسول اللہ، میں نے ایک قصیدہ کہا ہے، اگر اجازت ہو، تو پیش کروں؟"

حضور ﷺ نے فرمایا: "ہاں، تم اپنے اشعار سناؤ۔"

اب کعب رضی اللہ عنہ نے بڑے ذوق وشوق اور جوش وخروش سے اپنا وہ معرکہ آرا قصیدہ پڑھنا شروع کیا جس نے تاریخ میں "قصیدہ بانت سعاد" کے نام سے شہرت پائی اور کعب بن زُہیر رضی اللہ عنہ کو "شہرتِ عام اور بقائے دوام" کے دربار میں قابلِ رشک جگہ دلائی۔ یہ قصیدہ ۵۸ اشعار پر مشتمل ہے اور اس کا مطلع یہ ہے۔

بَانَتْ سُعَادُ فَقَلْبِیَ الْیَوْمَ مَتْبُوْلَ مُتَیَمٍ اِثْرَهَا لَمْ یُفْدَ مَکْتُوْب

ترجمہ: سُعاد مجھ سے جُدا ہوگئی، اس لیے میرا دل اب مریض ہے، اور وہ ایسا غلام اور قیدی ہے جسے (قیدِ عشق سے) کوئی فدیہ دے کر بھی رہائی دلانے والا نہیں۔

قصیدہ پڑھتے ہوئے جب وہ ان اشعار پر پہنچے:

اُنْبِئْتُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ اَوْعَدَنِیْ   وَالْعَفْوُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ مَاْمُوْلُ

ترجمہ: مجھے خبر دی گئی ہے کہ رسول اللہ (ﷺ) نے مجھے قتل کی دھمکی دی ہے، حالانکہ مجھے تو رسول اللہ (ﷺ) سے عفو کی اُمید ہے۔

حالانکہ مجھے تو رسول اللہ (ﷺ) سے عفو کی اُمید ہے۔

اِنَّ الرَّسُوْلَ لَنُوْرٌ یُّسْتَضَاءُ بِهٖ   مُهَنَّدٌ مِّنْ سُیُوْفِ اللّٰهِ مَسْلُوْلُ

ترجمہ: بے شک رسول اللہ ﷺ ایک ایسا نور ہیں جس سے روشنی حاصل کی جاتی ہے اور اللہ کی تلواروں میں سے ایک ہندی شمشیرِ بے نیام ہیں۔

(قصیدہ کے بعض نسخوں میں "لنور" کے بجائے لسیف کا لفظ آیا ہے یعنی آپ ﷺ ایک تیغ آبدار ہیں جو نُور بکھیرتی ہے۔)

فِیْ عُصْبَةٍ مِّنْ قُرَیْشٍ قَالَ قَائِلُهُمْ   بِبَطْنِ مَكَّةَ لَمَّا اَسْلَمُوْا زُوْلُوْا

ترجمہ: آپ قریش کی جماعت میں ہیں کہ جب وہ جماعت وادیٔ مکہ میں اسلام لائی، تو اُن میں سے ایک کہنے والے نے کہا کہ یہاں سے ہجرت کر جاؤ۔

تو حضور ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ یہ اشعار غور سے سُنو۔ بعض روایات کے مطابق اسی موقع پر، اور بعض کے مطابق جب قصیدہ ختم ہوا، تو حضور ﷺ نے وہ چادر جو اوڑھی ہوئی تھی اتار کر حضرت کعب رضی اللہ عنہ کے کندھوں پر ڈال دی۔

یہ اتنا بڑا اعزاز تھا کہ کعب رضی اللہ عنہ کے نزدیک دنیا جہان کی ساری نعمتیں اس کے سامنے ہیچ تھیں۔ جب تک وہ حیات رہے اُنہوں نے اس بُردہ شریف کو سینے سے لگا کر رکھا اور تنگدستی کے باوجود کسی قیمت پر بھی اس کو جدا کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔

امام جلال الدّین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے "تاریخ الخلفاء" میں لکھا ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے چادر مبارک کو دس ہزار درہم میں حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے خریدنا چاہا، لیکن اُنہوں نے اس متاعِ عزیز کو فروخت کرنے سے انکار کر دیا۔

اُن کی وفات کے بعد اُن کے بیٹے عقبہ المُضَرّب نے یہ بُردہ شریف حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ باختلافِ روایت بیس، تیس یا چالیس ہزار درہم میں فروخت کر دی۔

بنواُمیہ کے بعد یہ ردائے مبارک خلفاء بنی عباس کو وراثۃً ملی۔ مورّخ ابوالفداء اور امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ سقوطِ بغداد کے بعد جب تاتاریوں نے لُوٹ مار کا بازار گرم کیا تو یہ بردہ شریف گم ہو گئی، لیکن بعض دوسرے مورّخین نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ عبّاسی خاندان کے جو افراد تاتار گردی سے بچ رہے تھے وہ اس ردائے مُبارک کو اپنے ساتھ پہلے شام اور پھر مصر لے گئے۔

مشہور مملوک فرمانروا الملک الظاہر بیبرس نے مصر میں خلافتِ عبّاسیہ کا احیاء کیا، تو عبّاسی خلفاء اس ردائے مبارک کو خاص خاص موقعوں پر اوڑھا کرتے تھے۔

ترکوں نے مصر کی مملوک حکومت کو ختم کیا، تو یہ بردہ شریف قسطنطنیہ منتقل ہو گئی۔ اور آج بھی استنبول میں سلطان محمد فاتح کے تعمیر کردہ محل ''توپ کاپی'' کے کمرہ نمبر ۱۲ میں ایک طلائی صندوق میں محفوظ ہے۔

''عطائے بُردہ'' کے واقعے کے بعد حضرت کعب رضی اللہ عنہ کی زندگی کے لیل ونہار کیسے گزرے، اس کے بارے میں صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے قصیدہ گوئی اور اشعار کو اپنا ذریعہ معاش نہیں بنایا اور تھوڑا بہت جو کچھ میسّر تھا، اسی پر قناعت کی، تاہم ردائے مبارک کی صورت میں اُنہیں جو دولت مل گئی تھی، کثیر سے کثیر زر و مال کی بھی اُس کے سامنے کوئی حقیقت نہ تھی۔

حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے بہ اختلاف روایت سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت کی ابتداء (۲۴ھ) یا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہدِ حکومت کے آغاز (۴۲ھ) میں وفات پائی۔ انہوں نے اپنے پیچھے دو بیٹے عقبہ المُضَرّب اور العوام چھوڑے۔ یہ دونوں بھی شاعر تھے۔

''قصیدہ بانت سُعاد'' کے علاوہ حضرت کعب بن زُہیر رضی اللہ عنہ کی یادگار اُن کا ایک

دیوان ہے جو چند مکمل اور نامکمل قصائد اور متفرق اشعار کا مجموعہ ہے۔ یہ دیوان جرمنی، پولینڈ، مصر اور لبنان سے شائع ہو چکا ہے۔

(۲)

حضرت کعب بن زُہیر رضی اللہ عنہ کا شمار شعرائے مخضرمین میں ہوتا ہے، یعنی انہوں نے جاہلیت اور اسلام دونوں کا زمانہ پایا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام میں دونوں زمانوں کی خصوصیات پائی جاتی ہیں، البتہ اس پر نفسِ جاہلی غالب ہے، کیونکہ وہ اواخرِ عہدِ رسالت میں اسلام لائے۔

قصیدہ بانَت سُعاد، جو ایک اعتذاریہ قصیدہ ہے اور جسے ''قصیدۃ البُردہ'' اور ''قصیدۃ لامیہ'' بھی کہا جاتا ہے، حضرت کعب رضی اللہ عنہ کا شاہکار ہے۔ اس کے بیشتر اشعار بھی زورِ بیان اور اسلوب اور فکر کے اعتبار سے جاہلی دور کے انداز کے عکاس ہیں۔ اس کا سبب یہی ہے کہ وہ تصورات اور عقائد جو نفسِ اسلامی کے محرک اور اساس ہیں، یہ قصیدہ کہتے وقت کعب رضی اللہ عنہ ان سے نا آشنا تھے فی الحقیقت یہ قصیدہ وہ قبولِ اسلام سے پہلے تیار کر کے لائے تھے، اس لیے اس کا جائزہ اسی پس منظر میں لینا چاہیے۔

جہاں تک کعب کی شاعرانہ عظمت کا تعلق ہے، اہلِ سِیَر اور علمائے ادب نے اس کو شاندار الفاظ میں خراجِ ستائش ادا کیا ہے، مثلاً حافظ ابنِ عبد البرّ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ کعب رضی اللہ عنہ بہت پُرگو اور بلند پایہ شاعر تھے۔ (الاستیعاب)

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: ''اس خاندان کے شاعروں میں سب سے بڑا شاعر زُہیر بن ابی سُلمٰی ہے اور پھر کعب رضی اللہ عنہ ہیں''۔

ابنِ قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے کہ کعب رضی اللہ عنہ خوش گو اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ (الشعر والشعراء)

علامہ زرکلی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''کعب نجد کے بلند رتبہ شاعروں میں سے ہیں۔ اُن کا شمار زمانہ جاہلیت کے

مشاہیر شعراء میں ہوتا ہے۔ فی الحقیقت شعر و شاعری میں اُن کی بنیاد سب لوگوں سے بڑھ کر مضبوط تھی اور وہ اعلیٰ حسب و نسب اور شرافت کے مالک تھے۔ (الاعلام)

ابوالفرج اصفہانی کہتے ہیں: ''کعب مخضرمی ہیں اور فحول شعراء میں سے ہیں۔

(کتاب الاغانی)

قصیدہ ''بانت سُعاد'' اپنے گوناگوں ادبی محاسن کے لحاظ سے مخضرمی شعر و ادب کے ایک شہ پارے کی حیثیت رکھتا ہے۔ شاعر نے خود اسے بارگاہِ رسالت میں پڑھا اور سرورِ کونین ﷺ سے ردائے مُبارک کی صُورت میں خوشنودی کی سند پائی۔ اسی لیے اس قصیدے کو ہر دَور میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی یہاں تک کہ دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کی بیسیوں شرحیں لکھی گئیں۔ اس لحاظ سے امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ کے ''قصیدہ بُردہ'' کے سوا کوئی دوسرا قصیدہ اس کے سامنے نہیں لایا جا سکتا۔

''ادب العرب'' کے فاضل مؤلف ڈاکٹر زبید احمد صاحب نے بجا طور پر کہا ہے کہ ''صفائی و شستگی الفاظ اور سلاست اور فصاحت زبان کے لحاظ سے قصیدہ بانت سُعاد بے نظیر ہے۔''

اس قصیدے کے تین اجزء ہیں۔ یہ اجزاء بظاہر ایک دوسرے سے الگ ہیں، لیکن فی الحقیقت ان میں نہایت حسین ربط موجود ہے پہلے جزو میں رفیقہ حیات یا محبوبہ سُعاد کا تذکرہ اور تشبیب ہے۔ دوسرے میں رفیقہ سفر ناقہ کی تعریف ہے۔

تیسرے میں رسولِ کرم ﷺ کی مدح و نعت اور آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کی تعریف و ستائش ہے اور یہی تیسرا جزو اس قصیدے کا حاصل ہے جس نے اسے شہرت اور مقبولیت کی انتہائی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ اس کی مقبولیت کو دیکھ کر کئی دوسرے عرب شاعروں نے بھی ''بانت سعاد'' کے نام سے قصیدے لکھے، لیکن اُن میں سے کوئی حضرت کعب رضی اللہ عنہ کے قصیدے کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکا۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت لبید بن ربیعہ عامری رضی اللہ عنہ

(۱)

ابو عقیل لبید بن ربیعہ عامری رضی اللہ عنہ کا شمار جاہلی عرب کے ان شعراء میں ہوتا ہے۔ جو عزت اور شہرت کے آسمان پر آفتاب بن کر چمکے اور دنیا نے جنھیں امراء القیس، نابغہ ذبیانی، زہیر بن ابی سلمٰی، عمرو بن کلثوم اعشیٰ بن قیس اور طرفہ بن العبد جیسے نامور شعراء کی صف کا شاعر تسلیم کیا۔ لبید رضی اللہ عنہ کی عظمت کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ خود سرورِ دو عالم ﷺ نے ان کے بعض اشعار پر اظہارِ پسندیدگی فرمایا۔ وہ ان سات شعراء (اصحاب المعلقات یا المذہبات) میں سے ایک تھے جن کے قصائد زمانہ جاہلیت میں اہلِ مکہ نے کعبہ میں آویزاں کر رکھے تھے۔ لبید رضی اللہ عنہ کا نسب نامہ یہ ہے:

لبید رضی اللہ عنہ بن ربیعہ بن عامر بن مالک بن جعفر بن کلاب بن ربیعہ بن عامر بن صعصعہ عامری

لبید رضی اللہ عنہ کے والد ربیعہ بن عامر اپنی قبیلہ کے رؤسا میں سے تھے اور جود و سخا میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ بیسیوں غرباء و مساکین ان کے دستر خوان پر پرورش پاتے تھے اور ان کی اسی فیاضی اور سیر چشمی نے انہیں قوم کی طرف سے ''ربیع المقترین'' کا خطاب دلایا تھا۔ لبید رضی اللہ عنہ اسی نامور باپ کے خلف الرشید تھے۔ فیاضی اور غریب پروری انہوں نے باپ سے ورثے میں پائی اور تمام عمر اسے بڑی شان اور وقار سے نباہا۔ اس کے علاوہ وہ شجاعت و شہامت، شہسواری، سلامتی طبع اور راست بازی جیسے اوصاف سے بھی آراستہ تھے۔ ان کو اوائل عمر ہی سے شعر و شاعری سے لگاؤ تھا۔ عہدِ شباب میں ایک دفعہ اپنے چچاؤں کے ساتھ نعمان ابو قابوس کے دربار میں گئے تو وہاں عظیم جاہلی شاعر

نابغہ ذبیانی سے ملاقات ہوگئی۔ اس نے ان کا کلام سن کر بہت داد دی اور کہا کہ تم بنی عامر اور بنو قیس کے تمام شاعروں سے بڑھ گئے۔ اس کے بعد وہ رفتہ رفتہ جاہلی عرب کے شعراء کی صفِ اوّل میں آ گئے اور تمام عالمِ عرب میں ان کی شہرت پھیل گئی۔

(۲)

زمانہ جاہلیت میں لبید رضی اللہ عنہ اکثر مکے آتے جاتے رہتے تھے۔ اپنے شاعرانہ کمالات کی بدولت وقریش کے نزدیک بڑی قدر و منزلت کے حامل تھے۔ ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ ۵ بعدِ بعثت میں ایک دفعہ وہ مکہ آئے تو اہلِ مکہ نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ وہ اس وقت تک شرفِ اسلام سے بہرہ ور نہیں ہوئے تھے اس لیے حسبِ سابق قریش کی محافلِ شعر و سخن کو گرمانے لگے...... ایک دن ایسی ہی ایک محفل میں اپنا قصیدہ سنا رہے تھے۔ جب یہ مصرع پڑھا:

الاکل شيء ما خلا اللہ باطل (خبردار رہو کہ اللہ کے سوا ہر چیز باطل ہے)

تو جلیل القدر صحابی حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ، جو اس مجلس میں موجود تھے۔ بے اختیار پکار اٹھے: ”تم نے سچ کہا۔“

لیکن جب انھوں نے دوسرا مصرع پڑھا

وكل نعيم لا محالة زائل (اور ہر نعمت لامحالہ زائل ہونے والی ہے)

تو حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ بول اٹھے: ”یہ غلط ہے، جنت کی نعمتیں ابدی ہیں اور کبھی زائل نہ ہوں گی۔“

اس پر سارے مجمع میں شور مچ گیا لوگ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کو بُرا بھلا کہنے لگے اور لبید سے یہ شعر دوبارہ پڑھنے کی فرمائش کی۔ انہوں نے اس شعر کی تکرار کی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے الفاظ کا اعادہ کیا۔ اس پر لبید سخت برافروختہ ہوئے اور قریش سے مخاطب ہو کر کہنے لگے:

”اے برادرانِ قریش خدا کی قسم پہلے تمہاری مجلسوں کی یہ کیفیت نہ تھی۔ نہ

ان میں بیٹھنا کسی کے لیے باعثِ ننگ و عار تھا اور نہ کبھی بدتمیزی نے ان میں راہ پائی تھی۔ اگر یہ شخص مجھے اسی طرح ٹوکتا رہا تو میں اپنا کلام سنا چکا۔''

لبید رضی اللہ عنہ کی باتیں سن کر مشرکین بھڑک اٹھے اور انہوں نے حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہنے پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ ان پر ہاتھ اٹھانے سے بھی دریغ نہ کیا۔ اس موقع پر جو ہوا سو ہوا لیکن جب اس واقعہ کے پندرہ سولہ سال بعد اللہ تعالیٰ نے لبید بن ربیعہ رضی اللہ عنہ کو بھی آستانہ اسلام پر جھکا دیا تو ان کے روئیں روئیں نے گواہی دی کہ بے شک عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ نے جو کچھ کہا تھا، وہ سچ تھا۔

حافظ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے ''الاستیعاب'' میں لکھا ہے کہ سرورِ عالم ﷺ کو لبید رضی اللہ عنہ کا یہ مصرع بہت پسند تھا۔

الا کل شیءٍ ما خلا اللہ باطل

حضور ﷺ فرماتے تھے کہ شعراء کے کلام میں لبید رضی اللہ عنہ کا یہ کلام بہت اچھا ہے۔

(۳)

لبید رضی اللہ عنہ کے والد نے اسلام کا زمانہ نہیں پایا، خود لبید رضی اللہ عنہ بعثتِ نبوی کے وقت بوڑھے ہو چکے تھے۔ اگرچہ وہ فطرتاً ایک سلیم الطبع اور شریف النفس آدمی تھے لیکن تعجب ہے کہ وہ عہدِ رسالت کے اخیر میں شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہوئے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ بڑھاپے میں اپنا آبائی مذہب یا عقیدہ تبدیل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ حافظ ابنِ عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ اور بعض دوسرے اہلِ سیَر نے لکھا ہے کہ حضرت لبید بن ربیعہ رضی اللہ عنہ ۹ ہجری میں قبیلہ بنو جعفر بن کلاب کے وفد کے ساتھ بارگاہِ رسالت ﷺ میں حاضر ہوئے اور سعادت اندوزِ اسلام ہو گئے۔ اس وقت ان کی عمر بہ اختلافِ روایت نوے ۹۰ یا ایک سو تیرہ برس کی تھی۔ علامہ ابن اثیر کا بیان ہے کہ حضرت لبید بن ربیعہ رضی اللہ عنہ نے ۴۱ ہجری میں ۱۴۵ سال کی عمر میں بمقام کوفہ وفات پائی۔ اس حساب سے قبولِ اسلام کے وقت (یعنی ۹ ھ میں) ان کی عمر ۱۱۳ برس کے لگ بھگ ٹھہرتی ہے گویا وہ حالتِ اسلام میں ۳۲

برس جئے۔ دوسری طرف ''اصابہ'' اور ''اغانی'' کی روایت کے مطابق وہ حالتِ اسلام میں ۵۵ برس جئے اس حساب سے قبولِ اسلام کے وقت ان کی عمر نوے برس قرار دینی پڑے گی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اکثر اربابِ سیَر نے لکھا ہے کہ ایمان لانے کے بعد حضرت لبید رضی اللہ عنہ نے شاعری ترک کر دی اور تا دمِ مرگ ایک یا دو کے سوا کوئی شعر نہیں کہا، فرمایا کرتے تھے کہ اللہ نے مجھے شعر کے عوض سورۂ بقرہ اور آلِ عمران دی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے عہدِ خلافت میں ایک مرتبہ حضرت لبید رضی اللہ عنہ سے پوچھ بھیجا کہ آپ نے زمانہ اسلام میں کون سے اشعار کہے۔ جب انہوں نے جواب میں کہلا بھیجا کہ شعر کے عوض مجھے اللہ نے بقرہ اور آلِ عمران دی ہیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اتنے خوش ہوئے کہ انہوں نے لبید رضی اللہ عنہ کا وظیفہ بڑھا کر دو ہزار کر دیا۔

ایک روایت میں ہے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانے میں ایک مرتبہ حضرت لبید رضی اللہ عنہ سے کہا، لبید میرا اور تمہارا وظیفہ برابر ہے میں تمہارا وظیفہ گھٹا دوں گا۔

انہوں نے کہا ''کچھ دن توقف کیجئے اس کے بعد میرا وظیفہ بھی آپ ہی لے لیجئے گا۔'' (یہ اپنی کبرسنی کی طرف اشارہ تھا)۔

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے شاید ازراہِ تفنن وظیفہ گھٹانے کی بات کی تھی۔ حضرت لبید رضی اللہ عنہ کا جواب سن کر وہ خاموش ہو گئے اور وظیفہ کی رقم میں کوئی کمی نہیں کی۔

حضرت لبید رضی اللہ عنہ نہایت مخیر اور کشادہ دست تھے اس لیے معقول وظیفہ کے باوجود وہ تنگدست رہتے تھے۔ حافظ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ انہوں نے زمانہ جاہلیت میں عہد کیا تھا کہ جب بادِ صبا چلا کرے گی تو وہ جانور ذبح کر کے لوگوں کو کھلایا کریں گے۔ اس عہد کو وہ زندگی بھر نباہتے رہے کہا جاتا ہے کہ لوگوں کو ان کی تنگدستی کا علم ہو گیا تھا۔ چنانچہ جب بادِ صبا چلتی تو وہ اونٹ جمع کر کے ان کی خدمت میں ہدیۃً پیش کر دیتے تھے اور وہ انہیں ذبح کر کے لوگوں کو کھلا دیتے۔ اس طرح ان کا عہد اور ارمان دونوں

پورے ہو جاتے تھے۔

(۴)

اربابِ سِیَر نے حضرت لبید بن ربیعہ رضی اللہ عنہ کے محاسنِ اخلاق کی بے حد تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ وہ نہایت مخیّر، فیاض، شہسوار، شجاع اور صادق القول تھے۔ جاہلیت میں بھی معزّز اور شریف تھے اور اسلام میں بھی۔

ابنِ قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے سلیم الفطرت ہونے کے ثبوت میں یہ شعر پیش کیا ہے جو انہوں نے زمانہ جاہلیت میں کہا تھا۔

و کل امری یوماً سیعلم سعیہ
اذا کشف عند الالہ المحاصل

(اور ہر انسان کو اپنی کوششوں کا نتیجہ اس وقت معلوم ہوگا جب اس کے نتائج اللہ کے سامنے ظاہر ہونگے)

عرب کے فحول شعراء میں حضرت لبید بن ربیعہ رضی اللہ عنہ کا مرتبہ اتنا بلند تھا کہ ایک دفعہ عرب کا نامور شاعر فرزدق ان کا یہ شعر سن کر بے اختیار سجدے میں گر گیا۔

وجلا السیول عن الطلول کانھا
زبر تجد متونھا اقلامھا

(اور سیلاب نے ٹیلوں کو اس طرح مجلیٰ کر دیا گویا وہ کتاب کے صفحات ہیں جن کے متن کو قلم نے درست کیا)

لوگوں نے فرزدق سے پوچھا: ''یہ کیسا سجدہ ہے؟''

کہنے لگا: ''یہ سجدۂ شعر ہے۔ جس طرح لوگ قرآن کے مقاماتِ سجدہ کو جانتے ہیں، میں شعاری کے مقامِ سجدہ کو پہچانتا ہوں۔''

حضرت لبید بن ربیعہ رضی اللہ عنہ کا دیوان چھپ چکا ہے اور اس کی جرمن زبان میں شرح بھی لکھی جا چکی ہے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

حضرت مہجع بن صالح رضی اللہ عنہ

یمن کے کسی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ایک دفعہ لٹیروں نے ان کے گاؤں پر چھاپہ مارا اورانہیں پکڑ کر مکہ لے آئے۔یہاں حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ نے ان سے خرید کر آزاد کر دیا۔اللہ تعالیٰ نے انہیں فطرتِ سعید سے نوازا تھا۔قیامِ مکہ کے دوران میں ان کے کانوں میں دعوتِ توحید کی آواز پڑی تو انہوں نے اس کے قبول کرنے میں ایک لمحہ بھی توقف نہ کیا اور ہر قسم کے نتائج وعواقب سے بے پروا ہو کر بلا کشانِ اسلام کی صف میں شامل ہو گئے۔ ۱۳ بعدِ بعثت میں سرورِ عالم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ہجرت کا اِذن دیا تو وہ بھی دوسرے صحابہ کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے۔ان کا شمار سابقینِ اسلام اور مہاجرین موالی بنو عدی میں ہوتا ہے۔

۲ ہجری میں غزوۂ بدر الکبریٰ پیش آیا تو حضرت مہجع رضی اللہ عنہ بھی سرورِ عالم ﷺ کے ہمرکاب تھے یوں ان کو اصحابِ بدر میں سے ایک ہونے کا عظیم شرف حاصل ہوا۔علامہ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ میدانِ کارزار میں انہوں نے اپنی صفوں سے آگے بڑھ کر مبارزت طلب کی۔دشمن کی طرف سے قریش کا نامی جنگجو عامر بن حضرمی مقابلے کے لیے نکلا۔حضرت مہجع رضی اللہ عنہ نہایت بہادری سے نبرد آزما ہوئے لیکن بالآخر عامر کی ہاتھ سے جامِ شہادت پی کر روضۂ رضواں کو سدھارے۔

ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ کے برعکس ابنِ جریر طبری اور بعض دوسرے اربابِ سِیَر کا بیان ہے کہ حضرت مہجع رضی اللہ عنہ جس وقت مشرکین کے خلاف مصروفِ پیکار تھے، انہیں اچانک کسی دشمن کا تیر لگا جوان کے لیے تیرِ قضا ثابت ہوا۔بعض روایتوں میں انہیں غزوۂ بدر کا سب سے پہلا شہید بتایا گیا ہے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت سعد بن خولی رضی اللہ عنہ

مشہور صحابی حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کے غلام تھے۔ سلسلہ نسب یہ ہے:
سعد رضی اللہ عنہ بن خولی بن سبرہ بن دریم بن قیس بن مالک بن عمیرہ بن عامر الکلبی لخمی۔

حضرت حاطب رضی اللہ عنہ بنی اسد بن عبدالعزیٰ قرشی کے حلیف تھے۔ چونکہ ہر قبیلے کا غلام اور حلیف اسی قبیلے میں شمار کیا جاتا ہے اس لیے حضرت سعد بن خولی رضی اللہ عنہ کا شمار مہاجرینِ قریش بنی اسد میں کیا جاتا ہے۔ انہوں نے اوائلِ بعثت میں اسلام قبول کیا۔ ہجرت کا اِذن ہوا تو وہ بھی حضرت حاطب رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ منورہ آ گئے۔ سب سے پہلے غزوۂ بدر میں دادِ شجاعت دی پھر غزوۂ اُحد میں بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ شریک ہوئے اور اسی غزوے میں مردانہ وار لڑتے ہوئے شہادت پائی۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا قاتل بنی کنانہ کا ایک زرہ پوش مشرک ''ابن عویمر'' تھا۔ اس نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ پر وار کرتے وقت انا ابن عویمر (میں عویمر کا بیٹا ہوں) کا نعرہ لگایا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ اس کی تلوار سے دو ٹکڑے ہو کر گر پڑے۔ پاس ہی انصار بنی معاویہ کے غلام رشید فارسی رضی اللہ عنہ کھڑے تھے۔ وہ فوراً ابنِ عویمر کی طرف بڑھے اور یہ کہہ کر اس پر اپنی تلوار کی بھرپور ضرب لگائی ''خذھا و انا الغلام الفارسی'' (لے اس کو اور میں ہوں غلام فارسی)۔ ان کی تلوار زرہ کو توڑتی ہوئی ابنِ عویمر کے شانے میں اتر گئی اور وہ مقتول ہو کر گر پڑا۔ سرورِ عالم ﷺ یہ ماجرا دیکھ

رہے تھے آپ ﷺ نے حضرت رشید رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''اے رشید تو نے یہ کیوں نہ کہا، خذھا و انا الغلام الانصاری''

اتنے میں ابنِ عویمر کا بھائی شکاری کتے کی طرح جھپٹ کر آگے آیا اور بکارا ''میں ہوں ابن عویمر'' حضرت رشید رضی اللہ عنہ نے اس پر بھی تلوار کا بھرپور وار کیا جس سے اس کا خود اتر گیا اور سر کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ اس وقت حضرت رشید رضی اللہ عنہ نے نعرہ لگایا:

''خذھا و اذا الغلام الانصاری''

حضور ﷺ یہ دیکھ کر متبسّم ہو گئے اور فرمایا:

احسنت یا ابا عبداللّٰہ

(مرحبا اے ابا عبداللہ)

اسی دن سے حضرت رشید رضی اللہ عنہ کی کنیت ابو عبداللہ مشہور ہو گئی حالانکہ عبداللہ نام کا ان کا کوئی لڑکا نہ تھا۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت خُنَیس بن حُذافہ سہمی رضی اللہ عنہ
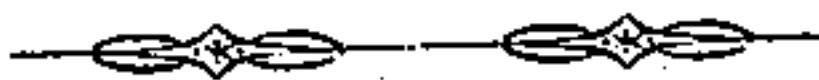
قریش کے خاندان بنوسہم سے تھے۔نسب نامہ یہ ہے:

خنیس رضی اللہ عنہ بن حُذافہ بن قیس بن عدی بن سعد بن سہم بن عمرو بن ھصیص بن کعب بن لُوی۔

اُم المومنین حضرت حفصہ بنتِ عمر فاروق رضی اللہ عنہما کا پہلا نکاح انہی کے ساتھ ہوا تھا۔ حضرت خنیس رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے نہایت صالح فطرت سے نوازا تھا۔ وہ ان اوّلیں مسلمانوں میں سے ایک تھے جو سرورِ عالم ﷺ کے حضرت ارقم بن ابی الارقم رضی اللہ عنہ کے گھر میں پناہ گزین ہونے سے پہلے ہی شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہو گئے تھے۔ جب مشرکینِ قریش نے اہلِ حق پر جینا دو بھر کر دیا تو حضور ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ حضرت خُنیس رضی اللہ عنہ بھی ہجرتِ ثانیہ میں حبشہ چلے گئے اور چند سال وہاں گزار کر حضور ﷺ کی ہجرت الی المدینہ سے کچھ عرصہ پہلے مکہ واپس آئے۔ وہاں سے مدینہ کی طرف ہجرت کی جہاں حضرت رفاعہ بن عبدالمنذر انصاری رضی اللہ عنہ نے انہیں اپنا مہمان بنایا۔ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضور ﷺ نے انہیں حضرت ابی عبس بن جبیر رضی اللہ عنہ کا اسلامی بھائی بنایا۔

غزوات کا سلسلہ شروع ہوا تو حضرت خنیس رضی اللہ عنہ نے پہلے غزوۂ بدر الکبریٰ میں دادِ شجاعت دی۔ پھر ۳ھ میں غزوۂ اُحد میں شریک ہوئے اور والہانہ جوش و خروش سے لڑے۔ لڑائی میں شدید زخم کھایا اور اسی کے صدمہ سے کچھ عرصہ بعد فوت ہو گئے۔ رحمتِ عالم ﷺ نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور ابوالسائب حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کے پہلو میں سپردِ خاک کیا۔ وفات کے وقت کوئی اولاد نہ تھی۔ ان کی بیوہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو چند ماہ بعد سرورِ عالم ﷺ کا شرفِ زوجیت حاصل ہوا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

حضرت ضمادُ الازدی رضی اللہ عنہ

ضماد نام۔ باپ کا نام ثعلبہ تھا۔ اہلِ سِیَر نے ان کا نسب نامہ نہیں لکھا لیکن یہ بات تواتر کے ساتھ بیان کی ہے کہ وہ قبیلہ ازدِ شنوءہ کے چشم و چراغ تھے۔ اور جھاڑ پھونک اور طبابت کا کام کرتے تھے۔ ضماد رضی اللہ عنہ نہ صرف اپنے قبیلہ میں نہایت عزت و احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے بلکہ قریشِ مکہ میں بھی ان کی بڑی قدر و منزلت تھی اور وہ وقتاً فوقتاً مکہ آتے جاتے رہتے تھے۔ وہ تاریخ اسلام کی ان خوش بخت ہستیوں میں سے ہیں جنہیں قبولِ اسلام سے کافی پہلے سرورِ کونین ﷺ کی دوستی کی سعادت حاصل ہوگئی تھی۔ حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ، حافظ ابنِ عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ، حافظ ابنِ حبان رحمۃ اللہ علیہ اور ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ ضماد رضی اللہ عنہ جاہلیت کے زمانے میں سرورِ عالم ﷺ کے دوست تھے۔ مسلم، نسائی، بیہقی اور بعض دوسرے علماء نے لکھا ہے کہ بعثتِ نبوی کے کچھ عرصہ بعد وہ کسی کام سے مکہ آئے یہاں مشرکین نے مشہور کر رکھا تھا کہ (نعوذ باللہ) محمد ﷺ مجنوں ہو گئے ہیں۔ ضماد رضی اللہ عنہ نے یہ بات سنی تو انہیں دھچکا سا لگا کیونکہ حضور ﷺ ان کے دوست تھے۔ انھوں نے دل میں سوچا کہ میں دوسرے لوگوں کا علاج کرتا ہوں اگر میری جھاڑ پھونک اور طبابت میرے پرانے دوست کے کام نہ آئی تو اس کا کیا فائدہ؟ انھوں نے لوگوں سے کہا کہ محمد ﷺ اس وقت کہاں ہیں، مجھے ان کے پاس لے چلو شاید میرے علاج سے وہ صحت یاب ہو جائیں۔ چنانچہ وہ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور کہا، محمد ﷺ میں جھاڑ پھونک کا کام کرتا ہوں اور میرے ہاتھ سے اکثر لوگ شفایاب ہو جاتے ہیں۔ مجھے یہ گوارا نہیں ہے کہ میرے ہوتے ہوئے آپ بیمار رہیں۔ آیئے میں آپ کا علاج کر

دوں۔ حضور ﷺ نے ان کے ہمدردانہ مشورے کے جواب میں پہلے کلمہ شہادت ادا کیا، پھر اللہ کی حمد کی اور اس کے بعد کچھ کلمات ارشاد فرمائے۔ (یا بقولِ بعض قرآنِ حکیم کی کچھ آیات پڑھیں)

ضماد رضی اللہ عنہ کو حضور ﷺ کی باتیں بہت پسند آئیں اور انہوں نے کہا کہ یہ پھر پڑھیے۔ آپ ﷺ نے تین مرتبہ ان کا اعادہ کیا۔ اب ضماد رضی اللہ عنہ بے ساختہ پکار اٹھے، میں نے کاہنوں کا کلام سنا ہے، ساحروں کی سحر بیانی سنی ہے، شعراء کا کلام سنا ہے مگر جو کچھ آج آپ سے سنا ہے اس سے پہلے کبھی کسی سے نہیں سنا۔ یہ تو سمندروں کی تہہ تک پہنچتا ہے۔ میں خدائے واحد پر ایمان لاتا ہوں اور شہادت دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں۔ قبولِ اسلام کے بعد انہوں نے اپنی طرف سے اور اپنی قوم کی طرف سے حضور ﷺ کی بیعت کی اور پھر اپنے وطن چلے گئے۔ قیاس یہ ہے کہ انہوں نے اپنی قوم کو بھی حلقہ بگوشِ اسلام بنایا ہوگا۔

حضرت ضماد رضی اللہ عنہ کے اس سے زیادہ حالات کتبِ سِیَر میں نہیں ملتے۔ البتہ صحیح مسلم کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان حضرت ضماد رضی اللہ عنہ کی وجہ سے ان کے قبیلے کا بہت لحاظ کرتے تھے اگر کسی مہم کے دوران میں اس قبیلے کی کوئی چیز بھول چوک سے کسی مسلمان کے ہاتھ لگ جاتی تو حقیقت معلوم ہونے پر قبیلے کو واپس کر دی جاتی۔

حضرت ضماد الازدی رضی اللہ عنہ کے حالاتِ زندگی اگرچہ تاریخ کے دھندلکوں میں مستور ہیں لیکن ان کا یہ شرف ہی کچھ کم نہیں کہ وہ محبوبِ ﷺ ربّ العالمین کے دوست اور شیدائی تھے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

حضرت مسلم بن حارث تمیمی رضی اللہ عنہ

حضرت مسلم بن حارث رضی اللہ عنہ قبیلہ تمیم کے چشم و چراغ تھے۔ اہلِ سیَر نے ان کے زمانہ اسلام کی تصریح نہیں کی لیکن ان کے اخلاص فی الدّین اور استغنا کی بیحد تعریف کی ہے۔

علامہ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی دشمن قبیلے کی طرف ایک مہم بھیجی۔ مجاہدین میں حضرت مسلم رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ دشمن کو مسلمانوں کی فوج کشی کا علم ہوا تو وہ قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ اثنائے محاصرہ میں ایک دن محصورین نے بہت شور و غل مچایا۔ حضرت مسلم رضی اللہ عنہ ان کے پاس گئے اور نہایت نرمی اور محبت سے ان کو اسلام کی دعوت دی اور یہ بھی بتا دیا کہ تمہارے بچنے کی یہی صورت ہے۔ ان کی تبلیغ سے متاثر ہو کر تمام اہلِ قلعہ حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ اس پر حضرت مسلم رضی اللہ عنہ کے بعض ساتھی جو مالِ غنیمت کے خواہاں تھے ان پر ناراض ہوئے کہ تم نے ان لوگوں کو صاف چھوڑ دیا۔ مدینہ منورہ واپس جا کر انہوں نے رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں تمام واقعہ عرض کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہت خوش ہوئے اور حضرت مسلم رضی اللہ عنہ کی بہت تحسین و تعریف فرمائی اور ساتھ ہی ان کو یہ بشارت دی کہ تمہیں قلعہ کے ہر شخص کے بدلے میں اتنا اتنا اجر ملے گا۔

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کشت و خون کو ناپسند فرماتے تھے اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت مسلم رضی اللہ عنہ کے کام پر اتنے مسرور ہوئے کہ آئندہ آنے والے خلفاء اور ائمہ کے نام ایک سفارشی تحریر رحمت فرمائی اِس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی خوشنودی کا اظہار فرمایا تھا اور اس

تحریر کے پڑھنے والے کو حضرت مسلم رضی اللہ عنہ سے حسنِ سلوک کی ہدایت فرمائی تھی۔

ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ''اُسد الغابہ'' میں لکھا ہے کہ اس موقع پر حضور ﷺ نے حضرت مسلم رضی اللہ عنہ کو ایک دُعا یا وظیفہ بتایا اور فرمایا کہ اس کو فجر اور مغرب کی نمازوں کے بعد سات سات مرتبہ پڑھا کرو، اس سے تم کو فائدہ ہوگا۔

حضرت مسلم رضی اللہ عنہ نے عہدِ رسالت ﷺ کے کن غزوات و سرایا میں شرکت کی، کتبِ سِیَر اس کے بارے میں خاموش ہیں البتہ اوپر کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خالصۃً لوجہ اللہ جہاد میں شریک ہوا کرتے تھے اور افلاس کے باوجود مالِ غنیمت کی مطلق پرواہ نہ کرتے تھے۔

ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضرت مسلم رضی اللہ عنہ نے طویل زندگی پائی اور بنوامیہ کے دورِ حکومت میں کسی وقت فوت ہوئے۔ انہوں نے چاروں خلفائے راشدین رضی اللہ عنہ کے سامنے سرورِ عالم ﷺ کا فرمانِ مبارک پیش کیا اور ان چاروں نے انہیں بہت کچھ دے دلا کر رخصت کیا۔

علامہ یوسف بن الزکی المزی رحمۃ اللہ علیہ نے ''تہذیب الکمال'' میں لکھا ہے کہ حضرت مسلم بن حارث رضی اللہ عنہ کے فرزند حارث بن مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے والد سے کچھ احادیث بھی روایت کی ہیں۔

بقول ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے حارث رحمۃ اللہ علیہ کو بُلا کر ان سے حدیث سنی اور پھر جس طرح خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم ان کے والدِ گرامی سے سلوک کرتے تھے۔ انہیں بھی کچھ دے دلا کر رخصت کیا۔

حضرت مسلم بن حارث رضی اللہ عنہ اس شرف میں منفرد ہیں کہ سیّد المرسلین فخرِ موجودات ﷺ نے انہیں اپنی خوشنودی کی تحریری سند عطا فرمائی۔ ع

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

حضرت زاہر بن حرام اشجعی رضی اللہ عنہ

حضرت زاہر بن حرام رضی اللہ عنہ قبیلہ اشجع کے ایک کم رُو اور حقیر صورت بدوی (دیہاتی) تھے لیکن ان کا بختِ رسا دیکھئے کہ محبوب ربّ العالمین ﷺ کے محبوب صحابہ میں شمار ہوتے تھے۔ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ وہ ہجرت کے ابتدائی زمانے میں نعمتِ اسلام سے بہرہ یاب ہوئے اور پھر غزوۂ بدر میں شریک ہونے کی سعادتِ عظمیٰ حاصل کی۔

حضرت زاہر رضی اللہ عنہ کی سکونت دیہات میں تھی۔ انہیں سرورِ عالم ﷺ سے اس قدر عقیدت اور محبت تھی کہ جب کبھی اپنے گاؤں سے حضور ﷺ کی خدمت میں آتے اپنے ساتھ ضرور دیہات کا کوئی تحفہ لے کر آتے۔ حضور ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ ہر شہری کا کوئی نہ کوئی دیہاتی (بادیہ نشین) دوست ہوتا ہے آلِ محمد ﷺ کا دیہاتی دوست زاہر بن حرام رضی اللہ عنہ ہے۔ ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ''اُسد الغابہ'' میں لکھا ہے کہ جب وہ حضور ﷺ سے رخصت ہوتے تو آپ ﷺ بھی انہیں کوئی نہ کوئی چیز ضرور عطا فرماتے تھے۔

سرکارِ دو عالم ﷺ کو حضرت زاہر رضی اللہ عنہ سے بڑا انس اور لگاؤ تھا اور آپ ﷺ ان سے گاہے گاہے مذاق بھی فرما لیتے تھے۔ ایک دن حضرت زاہر رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ کے بازار میں کچھ بیچ رہے تھے۔ اتفاق سے سرورِ عالم ﷺ ادھر سے گزرے۔ آپ ﷺ نے حضرت زاہر رضی اللہ عنہ کو دیکھا تو ان کی پشت کی طرف جا کر ان کی آنکھوں پر اپنے دستِ مبارک رکھ دیئے اور فرمایا:

''اس غلام کو کون خریدتا ہے۔''

حضرت زاہر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کو پہچان لیا اور کہا،

''یارسول اللہ اس تجارت میں تو آپ مجھے نہایت کم قیمت پائیں گے۔''

رحمتِ عالم ﷺ نے فرمایا، ''نہیں تو بارگاہِ الٰہی میں بہت قیمتی ہے۔''

حضرت زاہر رضی اللہ عنہ کے مزید حالات کتبِ سِیَر میں نہیں ملتے البتہ ایک روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ آخر عمر میں کوفہ جا کر آباد ہو گئے تھے۔ گویا حضور ﷺ کے وصال کے بعد وہ کافی عرصہ زندہ رہے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ
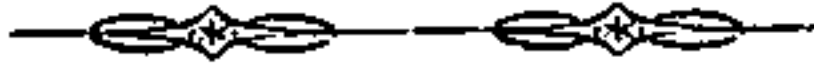
حضرت عمرو بن سراقہ عدوی رضی اللہ عنہ

ان کا تعلق قریش کے خاندان بنو عدی سے تھا۔ سلسلہ نسب یہ ہے:

عمرو رضی اللہ عنہ بن سراقہ بن معتمر بن انس بن اداہ بن زراح بن عدی بن کعب بن لوی

حضرت عمرو بن سراقہ رضی اللہ عنہ ان سعید الفطرت اصحاب میں سے ہیں جن کو دعوتِ توحید کے ابتدائی زمانے میں قبولِ اسلام کا شرف حاصل ہوا۔ وہ ۱۳ بعدِ بعثت تک برابر مکہ میں مقیم رہ کر مشرکینِ قریش کے مظالم سہتے رہے۔ جب ہجرتِ مدینہ کا اِذن ہوا تو ارضِ مکہ کو الوداع کہہ کر مدینہ آ گئے۔ بقول ابنِ سعد حضرت رفاعہ رضی اللہ عنہ بن عبدالمنذر انصاری نے انہیں اپنے ہاں ٹھہرایا۔

سرورِ عالم ﷺ کے مدینہ منورہ میں نزولِ اجلال کے بعد غزوات کا آغاز ہوا تو انہوں نے بدر سے لے کر تبوک تک تمام غزوات میں حضور ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔ غزوات کے علاوہ کئی سرایا میں بھی شریک ہوئے اور والہانہ جوش و خروش سے دادِ شجاعت دی۔ ابنِ سعد کا بیان ہے کہ بعض سرایا میں انہیں بڑی سختیاں جھیلنی پڑیں لیکن ان کے شوقِ جہاد میں مطلق کمی نہ آئی۔ حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک سریّہ میں عمرو بن سراقہ رضی اللہ عنہ ہمارے ساتھ تھے راستے میں خوراک ختم ہو گئی اور ہمیں فاقہ پر فاقہ ہونے لگا۔ عمرو رضی اللہ عنہ دراز قامت دُبلے پتلے آدمی تھے ان کی حالت اتنی نازک ہو گئی کہ پیٹ پر پتھر باندھ کر ہی چلنے کے قابل ہوئے۔ راہِ خدا میں انہوں نے یہ تمام صعوبتیں خندہ پیشانی سے برداشت کیں۔

عہدِ صدیقی و فاروقی میں حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کے حالات کی تفصیل کتابوں میں نہیں ملتی۔ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں وفات پائی۔ اولاد کوئی نہ تھی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

حضرت اسعد بن زُرارہ انصاری رضی اللہ عنہ

(۱)

رحمتِ عالم ﷺ کو پیغامِ حق سناتے ہوئے پورے دس برس گزر چکے تھے، لیکن اہلِ مکہ کی حرماں نصیبی کہ اُن کی اکثریت اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم تھی جو خود اُن کے گھر اتری تھی۔ دعوتِ حق قبول کرنا تو ایک طرف رہا، انہوں نے اُس کی راہ روکنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ سبّ و شتم، استہزا اور تمسخر، مار پیٹ، قید و بند، معاشرتی مقاطعہ، غرض ظلم و جور کا کوئی ایسا حربہ نہ تھا جو انہوں نے ہادیٔ اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھیوں پر نہ آزمایا ہو، لیکن ان تمام ایذا رسانیوں اور ستم رانیوں کے باوجود حضور ﷺ نے مخلوقِ خدا کو راہِ ہدایت دکھانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس طویل عرصے میں حضور ﷺ کا یہ معمول رہا کہ آپ ﷺ عُکاظ، مجنّہ، اور ذی المجاز کے میلوں اور حج کے موقع پر عرب کے مختلف قبائل کی قیام گاہوں پر تشریف لے جاتے، انہیں دعوتِ توحید دیتے اور فرماتے کون میری مدد کرتا ہے اور کون مجھے اپنے پناہ دیتا ہے تاکہ میں بلا روک ٹوک اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچاؤں اور میرا مددگار اس کے بدلے میں جنت کا مستحق ٹھہرے۔ بنو بکر بن وائل، عامر بن صعصعہ، بنو شیبان، بنو سُلیم، بنو عبس، بنو نضر، بنو فزارہ، بنو محارب، بنو مرۃ، بنو کلب اور بنو حنیفہ، غرض قریب قریب عرب کے تمام قبیلوں تک آپ ﷺ نے پیغامِ حق پہنچایا، لیکن کسی قبیلے نے آپ کی تائید و حمایت کی حامی نہ بھری۔

سنہ ۱۱ نبوت کے موسمِ حج کا ذکر ہے کہ آپ ﷺ معمول کے مطابق تبلیغ حق کے لیے منیٰ تشریف لے گئے جہاں عرب کے گوشے گوشے سے حج کے لیے آنے والوں نے خیموں کا شہر آباد کر رکھا تھا، حضور ﷺ سعید رُوحوں کی تلاش میں جمرۂ عقبہ کے قریب

پہنچے، تو دیکھا کہ ایک خیمے میں چھ گورے چٹے خوش وضع آدمی مصروفِ گفتگو ہیں۔ یہ لوگ تین سو میل دُور یثرب سے آئے تھے۔ سرورِ عالم ﷺ نے اُنہیں سلام کیا اور فرمایا: ''کیا آپ لوگ میری بات سنیں گے؟''

اُن سب نے بیک زبان جواب دیا: ''ضرور، ضرور۔''

حضور ﷺ نے اُنہیں نہایت بلیغ پیرائے میں اللہ عزّ وجلّ کا پیغام سنایا، توحید کی دعوت قبول کرنے کی ترغیب دی اور فرمایا میں اللہ کا رسول ہوں اور خلقِ خدا کو راہِ ہدایت دکھانے پر مامور ہوں۔

اُن لوگوں نے آپ ﷺ کے ارشادات بڑے غور سے سُنے اور پھر آپ ﷺ سے درخواست کی:

''اللہ نے جو کلام آپ پر نازل کیا ہے، اس کا کچھ حصّہ ہمیں سنایئے؟''

اس وقت لِسانِ رسالت ﷺ پر سورۂ ابراہیم جاری ہوگئی۔ ابھی آپ ﷺ نے چند آیات ہی پڑھی تھیں کہ قرآنِ حکیم کی بے مثل فصاحت و بلاغت اور ندرتِ بیان سے ان لوگوں کے دل پگھل گئے۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور بولے: ''واللہ! یہ تو وہی نبی ہیں جن کا تذکرہ ہر وقت ہمارے شہر کے یہودیوں کی زبان پر رہتا ہے، دیکھنا یہود کہیں ہم سے قبولِ حق میں سبقت نہ لے جائیں!'' اور پھر حضور ﷺ سے بڑے پُر جوش لہجے میں عرض کیا:

''اے محمد ﷺ! ہم آپ کی دعوت کو دل و جان سے قبول کرتے ہیں اور شہادت دیتے ہیں کہ اللہ ایک ہے اور آپ اس کے سچے رسول ہیں۔ اب فرمایئے کہ آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟''

حضور ﷺ نے فرمایا: ''میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے اپنے ہاں لے جاؤ اور اپنی جانوں کے ساتھ میری تائید و نصرت اور حفاظت کرو تاکہ میں زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پیغامِ حق پہنچا سکوں۔''

اللہ کے اُن سعید فطرت بندوں نے سچے دل سے حضور ﷺ کو سچا رسول تسلیم کر لیا تھا اور اب وہ کوئی بات حضور ﷺ سے چھپا کر نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ نہایت ادب سے عرض کیا: ''اے اللہ کے نبی ﷺ! ہم ہر طرح آپ کی تائید و حمایت کے لیے تیار ہیں۔ ہمارے ہاں تشریف لائیں گے تو ہم آپ ﷺ کی حفاظت کے ذمہ دار ہوں گے، لیکن یا رسول اللہ! ابھی ہمارے درمیان باہمی لڑائیوں کی وجہ سے سخت عداوت پھیلی ہوئی ہے۔ ہم اپنے جھگڑے نبٹا لیں، تو پھر اپنے ہاں تشریف لانے کی دعوت دیں گے۔ کشیدگی اور تفرقے کی اس فضا میں وہاں کامیابی کی بہت کم اُمید ہے۔ انشاء اللہ اگلے سال ہم پھر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔''

''بہت بہتر۔'' حضور ﷺ نے فرمایا۔

پھر ایک شکیل اور وجیہہ نوجوان جو سب سے کم عمر معلوم ہوتے تھے، آگے بڑھے اور عرض کیا: ''یا رسول اللہ! اپنا دستِ مبارک لائیے، میں اس پر بیعتِ اسلام کرتا ہوں۔''

سرورِ عالم ﷺ نے اپنا دستِ مبارک آگے بڑھایا اور سعادت مند نوجوان نے بڑے ذوق و شوق سے آپ ﷺ کی بیعت کی۔ اُن کے پانچوں ساتھیوں نے بھی اُن کی تقلید کی۔ رحمتِ عالم ﷺ اُن لوگوں کی بیعت سے بے حد مسرور ہوئے، انہیں دُعائے خیر سے نوازا اور واپس تشریف لے گئے۔

یثرب کے یہ خوش بخت نوجوان، جنھیں سب سے پہلے خیر الخلائق فخرِ موجودات سیّد المرسلین ﷺ کی بیعت کا عظیم شرف حاصل ہوا، حضرت اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ تھے۔

(۲)

سیّدنا حضرت ابواُمامہ اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ کا شمار آسمانِ ہدایت کے نہایت درخشندہ ستاروں میں ہوتا ہے۔ اُن کا تعلق خزرج کے سب سے معزز خاندان بنو نجار سے تھا۔ سلسلہ نسب یہ ہے:

اسعد رضی اللہ عنہ بن زُرارہ بن عدس بن عبید بن ثعلبہ بن غنم بن مالک بن نجار بن

ثعلبہ بن عمرو بن خزرج۔

حضرت اسعد رضی اللہ عنہ کو مبداءِ فیض نے نہایت صالح فطرت عطا کی تھی۔ وہ زمانہ جاہلیت ہی میں بُت پرستی سے متنفر اور توحید کے قائل ہو گئے تھے۔ یثرب کے یہودیوں سے نبی آخر الزماں ﷺ کا تذکرہ سنتے تو دل میں تمنا پیدا ہوتی۔ کاش! مجھے بھی اس نبی ﷺ کا زمانہ دیکھنے کی سعادت حاصل ہوتی۔ حضور ﷺ کی زیارت سے مشرف ہوئے تو اُن کے کان نبی آخر الزمان ﷺ اور دینِ حق کے ذکر سے کلیتہً نا آشنا نہیں تھے۔ اُن کے مشرف بہ اسلام ہونے کے بارے میں دو روایتیں ہیں۔ علامہ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ وہ اا بعدِ بعثت میں اپنے پانچ نیک فطرت ساتھیوں، حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ، عوف رضی اللہ عنہ بن حارث بن عفرا، رافع بن مالک رضی اللہ عنہ، قطبہ بن عامر رضی اللہ عنہ اور جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کے ساتھ شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہوئے، لیکن علامہ ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ''اُسد الغابہ'' میں لکھا ہے کہ وہ اس سے پہلے ہی حضرت ذکوان رضی اللہ عنہ بن عبدِ قیس کے ساتھ مشرف بہ ایمان ہو چکے تھے۔ اس کی تقریب یہ ہوئی کہ حضور ﷺ کی بعثت کے بعد ایک دفعہ حضرت اسعد رضی اللہ عنہ بن زُرارہ اور ذکوان رضی اللہ عنہ بن عبدِ قیس قومی مفاخرت کا مقابلہ کرنے کے لیے مکہ آئے اور رئیس قریش عتبہ بن ربیعہ کے ہاں قیام کیا۔ اثنائے گفتگو میں عتبہ نے اپنے مہمانوں کو بتایا کہ بنو ہاشم کے ایک نوجوان محمد ﷺ بن عبداللہ نے رسالت کا دعویٰ کیا ہے۔ وہ ہمارے بتوں کی مذمت کرتا ہے، ہمارے آباؤ اجداد کو گمراہ قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ہمیں ایک اللہ کی عبادت کرنی چاہیے۔

ذکوان رضی اللہ عنہ کئی بار حضرت اسعد رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے سُن چکے تھے کہ کاش مرنے سے پہلے اُنہیں دینِ حق نصیب ہو جائے۔ اب اُنہوں نے عتبہ بن ربیعہ سے سرورِ عالم ﷺ کے حالات سُنے تو حضرت اسعد رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر کہا: ''دونك اهذا دينك'' (تم کو جس دین کی تلاش تھی وہ یہی دین ہے) حضرت اسعد رضی اللہ عنہ اُسی وقت اُٹھ کر بارگاہِ

رسالت میں حاضر ہوئے اور اللہ کی واحدانیت اور حضور ﷺ کی رسالت کی تصدیق کی کہتے ہیں کہ حضرت ذکوان رضی اللہ عنہ بن عبدِ قیس بھی اسی موقع پر حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے۔ بہر حال جو روایت بھی درست ہو، یہ بات سب کے نزدیک مُسلّم ہے کہ انصار کے سابقینِ اوّلین میں حضرت اسعد رضی اللہ عنہ کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ یہ حضرت اسعد رضی اللہ عنہ کے جوشِ ایمان اور اخلاص فی الدّین ہی کا نتیجہ تھا کہ یثرب میں چراغ سے چراغ جل اٹھا اور رع بقعۂ نُور شہر کے دیوار و در ہوئے۔

(۳)

حضرت اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ اور اُن کے پانچوں ساتھی دولتِ اسلام سے بہرہ یاب ہو کر یثرب واپس گئے، تو اُن کے دل جوشِ ایمان سے لبریز تھے اور جو شمعِ یقین ان کے سینوں میں فروزاں ہوئی تھی اس کے نور سے وہ دوسرے اہلِ یثرب کے سینوں کو بھی منور کرنے کے لیے بے تاب تھے۔ چنانچہ انہوں نے بڑی تندہی سے اوس و خزرج میں تبلیغِ حق شروع کر دی۔ تھوڑی مدت ہی میں اُن کی تبلیغ سے یثرب کے گھر گھر میں اسلام کا چرچا ہونے لگا اور کچھ سعید الفطرت یثربیوں نے کھلم کھلا حلقہ بگوشِ اسلام ہونے کا اعلان کر دیا۔ اگلے سال (۱۲ بعدِ بعثت) کا موسمِ حج آیا، تو یثرب سے بارہ مسلمان سرورِ کونین ﷺ کی زیارت کے لیے مکہ پہنچے۔ اُن میں سے دس کا تعلق قبیلہ خزرج سے تھا اور دو کا قبیلہ اوس سے۔ خزرجیوں میں حضرت اسعد رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ سرورِ عالم ﷺ کو اُن کی آمد کا پتہ چلا، تو آپ ﷺ رات کو منیٰ تشریف لے گئے اور عقبہ کی گھاٹی میں جہاں گزشتہ سال چھ خزرجیوں سے ملاقات ہوئی تھی۔ ان لوگوں سے ملے۔ رحمتِ عالم ﷺ کو اپنے درمیان پا کر ان اصحاب کی مسرت کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ وہ سب بڑے ذوق و شوق سے حضور ﷺ کی بیعت سے مشرف ہوئے اور حسب ذیل باتوں کا عہد کیا:

۱۔ ہم شرک نہیں کریں گے۔

۲۔ چوری نہیں کریں گے۔

۳۔ زنا نہیں کریں گے۔

۴۔ اپنی لڑکیوں کو قتل نہ کریں گے۔

۵۔ کسی پر تہمت یا جھوٹا الزام نہیں لگائیں گے۔

۶۔ رسول اللہ کی نافرمانی نہ کریں گے اور آپ کا حکم ہر حال میں مانیں گے۔

۷۔ ہر حال میں حق بات کہیں گے اور اس معاملے میں کسی کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔

۸۔ حکومت کے معاملے میں اہلِ حکومت سے جھگڑا نہیں کریں گے، سوائے اس کے کُھلا کفر دیکھیں۔

بیعت لینے کے بعد حضور ﷺ نے اُن اصحاب سے فرمایا: ''اگر تم نے اپنا عہد پورا کیا تو جنت کے حق دار ہو گئے اور اگر عہد شکنی کے مرتکب ہوئے تو اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے کہ وہ تمہیں عذاب دے یا معاف کر دے۔''

یہ بیعت تاریخ میں ''بیعتِ عقبہ اولیٰ'' کے نام سے مشہور ہے۔ بعض نے اسے ''بیعتِ نساء'' سے بھی موسوم کیا ہے، کیونکہ اس بیعت کی شرائط اُن شرائط سے بہت ملتی جُلتی ہیں جن پر چند برس بعد مسلمان عورتوں سے بیعت لی گئی۔

علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ اور ابنِ ہشام کا بیان ہے کہ مکہ سے چلتے وقت اُن اصحاب نے حضور ﷺ سے درخواست کی کہ اُنہیں قرآن پڑھانے اور دین کی باتیں سکھانے کے لیے ایک معلّم عطا کریں۔ اس پر حضور ﷺ نے حضرت مُصعب بن عُمیر رضی اللہ عنہ کو یہ خدمت سونپی اور اُن کو اس مقدّس قافلے کے ساتھ یثرب بھیج دیا۔ بعض دوسری روایتوں میں ہے کہ اُن اصحاب نے یثرب پہنچ کر حضور ﷺ کو خط لکھایا دو آدمی بھیج کر درخواست کی کہ آپ ﷺ کسی ایسے آدمی کو بھیج دیں جو ہمیں دین کی تعلیم دے، اس پر حضور ﷺ نے حضرت مصعب رضی اللہ عنہ کو یثرب جانے کا حکم دیا۔ حضرت مُصعب رضی اللہ عنہ

قافلے کے ساتھ گئے ہوں یا بعد میں، اس بات پر سب اہلِ سِیَر کا اتفاق ہے کہ یثرب میں حضرت اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ ہی نے اُنہیں اپنا مہمان بنایا حضرت مُصعب رضی اللہ عنہ نے اُنہی کے مکان کو مرکز بنا کر تعلیم وہدایت اور دعوت وتبلیغ کا کام شروع کر دیا۔

(۴)

حضرت مُصعب بن عُمیر رضی اللہ عنہ کے پاکیزہ کردار اور حکیمانہ اندازِ تبلیغ نے بیسیوں یثربیوں کے دلوں میں اسلام کی شمع روشن کر دی اور اوس اور خزرج کا کوئی گھر ایسا نہ رہا جس کا کوئی نہ کوئی فرد اسلام کی سعادت سے فیض یاب نہ ہوا ہو، لیکن ابھی تک ان قبیلوں کے سردار اسلام سے نا آشنا تھے، اس لیے اشاعتِ اسلام کے کام میں رکاوٹ پیدا ہو رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس رکاوٹ کو دُور کرنے کی عجیب صورت پیدا کر دی۔ ایک دِن حضرت اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ، حضرت مُصعَب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر بنی ظفر اور بنوعبد الاشہل کے محلّوں کی طرف گئے (یہ دونوں قبیلہ اوس کے گھرانے تھے) وہاں بنی ظفر کے ایک باغ میں کنوئیں (بئر مرق) پر بیٹھ گئے۔ بہت سے اور مسلمان بھی وہاں پہنچ گئے۔ کسی نے بنوعبد الاشہل کے سردار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو یہ اطلاع دی کہ مسلمان تمہارے محلّے میں آ کر لوگوں کو بہکا رہے ہیں۔ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ یہ خبر سُن کر سخت غضب ناک ہوئے اور مسلّح ہو کر وہاں جانے کا ارادہ کیا، لیکن جب پتہ چلا کہ مسلمانوں میں اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ بھی موجود ہیں، تو رُک گئے، کیونکہ اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ اُن کے خالہ زاد بھائی تھے، تاہم انہوں نے اپنے ابنِ عم اُسید بن حُضیر رضی اللہ عنہ سے کہا:

> ''اُسید! تم جاؤ اور اُن لوگوں کو منع کر دو کہ وہ آئندہ ہمارے آدمیوں کو گمراہ کرنے اوس کے محلّوں میں نہ آئیں۔ اسعد بن زُرارہ وہاں نہ ہوتا تو میں خود جاتا۔''

حضرت اُسید رضی اللہ عنہ بھی بنوعبد الاشہل کے سرداروں میں سے تھے اور بڑے

پُر جوش نوجوان تھے۔ اُنھوں نے اپنا نیزہ اٹھایا اور بر مرق کی طرف تیزی سے چل پڑے۔ حضرت اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ نے اُنہیں اس طرح آتے دیکھا تو حضرت مُصعب رضی اللہ عنہ سے کہا: ''یہ قبیلہ اوس کے دو بڑے سرداروں میں سے ایک ہے۔ آج آپ کو اس کے سامنے اللہ کا پیغام پہنچانے کا حق ٹھیک ٹھیک طریقے سے ادا کرنا ہے۔''

حضرت مُصعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اسے ذرا بیٹھنے دو، میں بات کرتا ہوں، آگے جو اللہ کو منظور ہے۔''

اُسید رضی اللہ عنہ نے پہنچتے ہی خشم آلود لہجے میں تیز تیز گفتگو شروع کر دی اور حضرت مُصعب رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر بولے: ''تم یہاں کس مقصد کے لیے آئے ہو؟ کیا ہمارے کمزور لوگوں کو بیوقوف بنانے کے لیے......؟ زندگی پیاری ہے تو فوراً یہاں سے چلے جاؤ اور پھر کبھی ادھر کا رُخ نہ کرنا!''

حضرت مُصعب رضی اللہ عنہ نے اُن کی تند و تیز باتیں بڑے تحمل سے سُنیں اور پھر نہایت نرمی سے فرمایا: ''عزیز بھائی! آپ تھوڑی دیر بیٹھ کر میری بات سُن لیجیے، پسند آئے تو قبول کر لیجیے، ورنہ رَد کر دیجیے گا۔''

مُصعب کی حلم آمیز گفتگو نے اُسید رضی اللہ عنہ کے غیظ و غضب پر پانی کے چھینٹوں کا کام کیا۔ انہوں نے اپنا نیزہ زمین میں گاڑ دیا اور یہ کہتے ہوئے بیٹھ گئے: ''ہاں تم نے انصاف کی بات کی ہے۔ کہو کیا کہتے ہو!''

مُصعب رضی اللہ عنہ نے نہایت دل نشین انداز میں اسلام کے اُصول بیان کیے اور پھر قرآنِ حکیم کی چند آیات پڑھیں۔ اُسید رضی اللہ عنہ بے اختیار پکار اٹھے:

''یہ کیا ہی اچھا دین ہے اور کتنا بلند کلام ہے یہ! تم لوگ اس دین میں داخل ہوتے وقت کیا کرتے ہو؟''

ابنِ ہشام نے حضرت اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ کا یہ بیان نقل کیا ہے:

''میں اور مُصعب رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر اُسید بن حُضیر رضی اللہ عنہ کے چہرے پر عجیب سی

رونق اور بشاشت دیکھی۔ اُن کا اندازِ کلام دیکھ کر ہم سمجھ گئے کہ وہ اسلام سے متاثر ہو گئے ہیں۔ ہم نے اُنہیں غسل کرنے اور پاک کپڑے پہننے کی تلقین کی۔ وہ غسل کر کے اور لباس تبدیل کر کے آئے تو اُنہیں کلمہ شہادت پڑھوایا اور حلقہ اسلام میں داخل کر لیا۔ پھر دو رکعت نماز پڑھوائی۔''

حضرت اُسید رضی اللہ عنہ نے اسلام کی سعادت سے مالا مال ہونے کے بعد حضرت مُصعَب رضی اللہ عنہ سے کہا: ''پیچھے ایک آدمی اور بھی ہے اگر وہ حلقہ بگوشِ اسلام ہو گیا، تو سارا قبیلہ مسلمان ہو جائے گا کیونکہ اُس کی قوم میں سے کوئی شخص بھی ایسا نہیں جو اُس کی بات نہ مانے۔ میں اُس کو ابھی تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ سیدھے سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے۔ اُس وقت وہ اپنے قبیلے کے بہت سے آدمیوں میں گھرے بیٹھے تھے۔ اُسید رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر بولے، ''خدا کی قسم! جب یہ یہاں سے چلا تھا تو اس کا چہرہ جوشِ غضب سے تمتمارہا تھا، لیکن اب اس کا کچھ اور ہی رنگ ہے۔''

اُسید رضی اللہ عنہ اُن کے قریب پہنچے، تو سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''کہو میاں، کیا کر آئے؟''

حضرت اُسید رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''میں نے اُن دونوں آدمیوں سے بات کی۔ بخدا میں نے تو اُن سے کوئی خطرے کی بات محسوس نہیں کی۔ میں نے اُنہیں روکا، تو بولے ہماری بات سُن لو، پھر تمہیں اختیار ہے! جو کام تمہیں ناپسند ہو وہ ہم نہیں کریں گے۔ اُسید رضی اللہ عنہ ذرا دیر رُک کے پھر بولے:

''ابھی ابھی میں نے سنا ہے بنی حارثہ کے لوگ اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کے لیے نکلے ہیں، محض اس لیے کہ وہ آپ کا خالہ زاد بھائی ہے۔ اس کو قتل کر کے وہ آپ کی تذلیل کرنا چاہتے ہیں۔''

یہ سنتے ہی سعد بن مُعاذ رضی اللہ عنہ آگ بگولہ ہو گئے، نیزہ ہاتھ میں لیا اور یہ کہتے ہوئے

بڑ مرق کی طرف لپکے۔ ''اُسید! خدا کی قسم، جس کام کے لیے تمہیں بھیجا، وہ تو ہوا نہیں البتہ تم ایک نئی مصیبت لے آئے۔''

حضرت اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ نے سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو آتے دیکھا، تو حضرت مُصعب رضی اللہ عنہ سے کہا: ''یہ اپنی قوم کا سب سے بااثر سردار ہے۔ کوئی شخص بھی اس کی بات رد نہیں کر سکتا۔ اگر یہ اسلام قبول کر لے تو سارا قبیلہ اس کی پیروی کرے گا۔''

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ اسعد رضی اللہ عنہ اور مُصعب رضی اللہ عنہ اطمینان سے بیٹھے ہیں اور بنو حارثہ کے کسی آدمی کا وہاں نام نشان تک نہیں۔ سمجھ گئے کہ اُسید رضی اللہ عنہ نے چال چلی ہے۔ مجھے یہاں بھیج کر ان لوگوں کی بات سنوانا چاہتے ہیں۔ وہ غضب ناک انداز میں حضرت مُصعب رضی اللہ عنہ اور حضرت اسعد رضی اللہ عنہ کے قریب جا کر کھڑے ہو گئے اور حضرت اسعد رضی اللہ عنہ سے کہا:

> ''ابو اُمامہ، خدا کی قسم! اگر میرے اور تمہارے درمیان رشتہ داری نہ ہوتی، تو تم یہ جرات ہرگز نہ کرتے کہ ہمارے گھروں میں آ کر ہم پر وہ بات ٹھونسنے کی کوشش کرو جسے ہم بُرا سمجھتے ہیں۔''

حضرت اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ کوئی گئے گزرے آدمی نہ تھے۔ وہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی بات کا جواب اسی لہجے میں دے سکتے تھے، لیکن وہ تبلیغِ حق کی خاطر وہاں آئے تھے، اس لیے خالہ زاد بھائی کی تلخ باتیں سُن کر صرف مسکرا دیئے، البتہ حضرت مُصعب رضی اللہ عنہ نے سعد رضی اللہ عنہ سے کہا: ''محترم بھائی! ذرا بیٹھ کر ہماری بات تو سُن لیجئے۔ پسند آئے، تو مان لیجئے، نہ آئے، تو ہم چلے جائیں گے اور وہ بات نہ کہیں گے جو آپ کے خلافِ طبع ہو۔''

ایک اور روایت میں ہے کہ اس موقع پر حضرت اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ ہی نے اُنہیں یہ کہہ کر حضرت مُصعب رضی اللہ عنہ کی باتیں سُننے کی ترغیب دی کہ ''اے بھائی، ذرا ان کی باتیں سُن تو لو، اگر یہ ناگوار معلوم ہوں، تو ان کو نہ ماننا اور اگر کوئی بات بھلی معلوم ہو تو اس کو مان لینا۔''

''یہ بات تم نے قاعدے کی کہی:'' حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے جواب دیا اور اپنا نیزہ گاڑ کر بیٹھ گئے۔ حضرت مُصعب رضی اللہ عنہ نے اُن کے سامنے اسلام کی خوبیاں بیان کیں اور سورۂ زخرف یا حٰم کی چند آیات پڑھ کر سنائیں۔

حضرت اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ اور حضرت مُصعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ قرآن سنتے ہی سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے چہرے کی خشونت نرمی اور بشاشت میں بدل گئی اور انہوں نے بھی وہی بات پوچھی جو حضرت اُسید رضی اللہ عنہ نے پوچھی تھی کہ اس دین میں داخل ہونے کا کیا طریقہ ہے؟ انہوں نے غسل کرنے اور کپڑے پاک کرنے کی تلقین کی۔ سعد رضی اللہ عنہ نہا دھو کر اور پاک کپڑے پہن کر آ گئے، تو اُن حضرات نے پہلے اُنہیں کلمہ شہادت پڑھوایا اور پھر دو رکعت نماز۔ اب سعد رضی اللہ عنہ اپنا نیزہ اٹھا کر واپس اپنے قبیلے میں پہنچے۔ اُنہیں دیکھ کر قبیلے کے بعض لوگ پکار اُٹھے: ''خدا کی قسم! ہم سعد کو بدلا ہوا پاتے ہیں، اب اُن کا چہرہ وہ نہیں جس کو لے کر گئے تھے۔''

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے سارے بنو عبد الاشہل کو جمع کیا اور اُن سے پوچھا:

''اے بنی عبد الاشہل! تمہارے نزدیک میں کیسا ہوں؟''

''آپ ہمارے سردار ہیں، ہم سب سے زیادہ صائب الرائے، عاقل اور معاملہ فہم ہیں۔'' سب نے بیک زبان جواب دیا۔

سعد بولے: ''تو پھر سُن لو، تمہارے مردوں اور تمہاری عورتوں سے بات کرنا مجھ پر حرام ہے جب تک تم اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان نہ لے آؤ!!''

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کا اعلان سن کر بنو عبد الاشہل کے بیشتر افراد اُسی وقت نعمتِ اسلام سے سعادت اندوز ہو گئے۔ جو باقی رہ گئے وہ بھی سوائے ایک آدمی الاصیرم بن ثابت کے شام تک مسلمان ہو گئے اور مدینے کے در و دیوار تکبیر کے نعروں سے گونجنے لگے۔ (الاصیرم رضی اللہ عنہ کو بھی اللہ تعالیٰ نے غزوۂ اُحد کے موقع پر قبولِ حق کی توفیق دی اور وہ اسی غزوہ میں مردانہ وار لڑ کر شہید ہوئے)۔

قبولِ اسلام کے بعد حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے حضرت مُصعَب رضی اللہ عنہ کو اپنا مہمان بنالیا اور پھر حضرت مُصعب رضی اللہ عنہ اور حضرت اسعد رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر تبلیغِ حق میں دن رات ایک کر دیے، یہاں تک کہ تین چار کے سوانصار کے سب گھرانوں میں اسلام پھیل گیا تھا۔ قبیلہ خزرج کے سردار حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ اور اُن کے اہلِ خاندان بھی حلقہ بگوشِ اسلام ہونے والے اصحاب میں شامل تھے۔ اس طرح اوس اور خزرج کے قریب قریب سبھی سربرآوردہ اور سعید الفطرت لوگ اسلام کے دست و بازو بن گئے۔

اُسی زمانے میں حضرت اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ کو ایک اور عظیم شرف یہ حاصل ہوا کہ انہوں نے یثرب میں سب سے پہلے نمازِ جمعہ پڑھائی۔ مشہور صحابی حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کے فرزند حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بڑھاپے میں میرے والد کی بینائی جاتی رہی تھی۔ میں اُنہیں سہارا دے کر نمازِ جمعہ کے لیے لے جاتا۔ جب اذان کی آواز اُن کے کان میں آتی، تو ابواُمامہ اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کے لیے مغفرت کی دعا کیا کرتے۔ میں نے اُن سے پوچھا آپ ہمیشہ کیوں ایسا کرتے ہیں؟ کہنے لگے: ''بیٹے یہ وہ پہلے آدمی ہیں جو ہمیں حرہ بنی بیاضہ (بقیع خضمات) میں رسول اللہ ﷺ کی آمد سے قبل جمعہ پڑھایا کرتے تھے۔'' میں نے پوچھا: ''اس زمانے میں آپ کتنے حضرات تھے؟'' جواب دیا: ''چالیس''۔

ابنِ سیرین رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ابھی نمازِ جمعہ کا حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ مدینے کے مسلمانوں نے آپس میں مشورہ کرنے کے بعد فیصلہ کیا کہ وہ ہفتے میں ایک دن ایک ایک جگہ جمع ہو کر باجماعت نماز پڑھا کریں گے۔ چونکہ یہودیوں کا مقدس دن ہفتہ (سبت) اور عیسائیوں کا اتوار تھا، اس لیے اُن سے امتیاز کے لیے اُنہوں نے جمعہ کا دن اختیار کیا۔ یہ دن اس زمانے میں یومِ عروبہ کہلاتا تھا۔ سب سے پہلا جمعہ حضرت اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ نے بقیع الخضمات میں پڑھایا۔ اس میں چالیس مسلمان شریک تھے۔

اللہ تعالیٰ کو انصار کی یہ ادا ایسی پسند آئی کہ جمعہ کی نماز تمام مسلمانوں پر فرض قرار دی گئی۔ ہجرت نبوی سے پہلے جب نمازِ جمعہ کا حکم نازل ہوا، تو مکہ میں اس کا ادا کرنا ممکن نہ تھا، چنانچہ حضور ﷺ نے حضرت مُصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو مدینے خط لکھا اور امامتِ جمعہ کا حکم دیا۔ گویا جو کام انصار نے اپنی مرضی سے شروع کیا تھا، وہ اب تمام مسلمانوں پر فرض ہو گیا۔

(۵)

۱۳ بعدِ بعثت کے موسمِ حج میں یثرب سے پانچ آدمیوں کا ایک قافلہ حج کے لیے مکہ روانہ ہوا۔ اس قافلے میں حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ سمیت قبائل اوس اور خزرج کے پچھتر ایسے نفوسِ قدسی بھی شامل تھے جو شرفِ ایمان سے بہرہ ور ہو چکے تھے اور سیدِ موجودات ﷺ کو یثرب لانے کے لیے بیتاب تھے۔ اُن میں ۷۳ مرد اور دو خواتین تھیں۔ یثرب میں اسلام کے داعیِ اوّل مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ بھی اس قافلے کے ہمراہ تھے۔

حج سے فارغ ہونے کے بعد سرورِ عالم ﷺ نے انصار سے ملاقات کے لیے وہ رات مقرر کی جس کی صبح یوم النفرِ الآخر کہلاتی ہے۔ آپ ﷺ نے اُن کے نمائندوں کو ہدایت کی کہ وہ عقبہ کے نشیبی حصے میں جمع ہو جائیں اور آنے سے پہلے نہ کسی سوتے کو جگائیں اور نہ کسی غیر حاضر کا انتظار کریں۔

یثربی اہلِ حق نے حضور ﷺ کے ارشاد کی تعمیل کی اور مقررہ رات کو چھپتے چُھپاتے ایک ایک دو دو کر کے عقبہ کی گھاٹی میں پہنچ گئے۔ وہاں انہوں نے سرورِ عالم ﷺ کو آپ کے چچا حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کے ساتھ موجود پایا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اُس وقت تک علانیہ اسلام قبول نہیں کیا تھا، لیکن بعض روایتوں کے مطابق وہ در پردہ مسلمان ہو چکے تھے۔ اُنہیں یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ یثرب سے متعدد نو مسلم، سرورِ عالم ﷺ کو یثرب تشریف لے چلنے کی دعوت دینے آئے ہیں۔

حضرت کعب بن مالک انصاری رضی اللہ عنہ جو اس موقع پر موجود تھے، کہتے ہیں کہ سب سے پہلے حضرت عبّاس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ نے گفتگو شروع کی۔ انہوں نے اہل یثرب سے مخاطب ہو کر کہا:

"اے برادرانِ یثرب! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے خاندان میں معزز و محترم ہیں، مشرکینِ قریش ان کے جانی دشمن ہیں، تاہم بنو ہاشم اور بنو مطلّب نے ہمیشہ دشمنوں سے ان کی حفاظت کی ہے اور آئندہ بھی اپنی استطاعت کے مطابق کرتے رہیں گے، لیکن یہ تمہارے ہاں جانے کے سوا اور کسی بات پر راضی نہیں۔ اب سوچ لو، اگر تم اپنے وعدوں کو ایفا اور مرتے دم تک ان کی حفاظت کر سکتے ہو، تو کوئی بات کرو۔ اگر اپنے ہاں بلا کر اس بات کا ذرا سا اندیشہ بھی ہو کر کسی روز تم ان کا ساتھ نہیں دے سکو گے اور انہیں دشمنوں کے حوالے کرنا پڑے گا، تو انہیں یہیں اپنے حال پر چھوڑ دو!"

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی تقریر سُن کر خزرج کے ایک رئیس حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ جوش میں آ کر کھڑے ہو گئے اور کہا:

"اے عبّاس! ہم نے تمہاری بات سُنی۔ تم بھی یاد رکھو ہم نامرد نہیں ہیں، ہم نے تلواروں کے سایے میں پرورش پائی ہے......"

حضرت ابوالہیثم بن التیہان رضی اللہ عنہ نے اُن کی بات کاٹ کر کہا:

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ہمارے اور یہودیوں کے درمیان حلیفانہ معاہدے ہیں جو بیعت کے بعد فسخ ہو جائیں گے۔ ایسا نہ ہو جب آپ کو غلبہ حاصل ہو جائے، تو آپ ہمیں چھوڑ کر اپنی قوم میں واپس تشریف لے جائیں۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے متبسم ہو کر فرمایا:

"نہیں، ایسا نہ ہو گا۔ میرا خون تمہارا خون ہے، میرا مدفن تمہارے مدفن کے

ساتھ ہے، میں تمہارا ہوں اور تم میرے ہو، میں اُس سے لڑوں گا جس سے تم لڑو گے اور میں اُس سے صلح کروں گا جس سے تم صلح کرو گے۔''

حضور ﷺ کے ارشادات سُن کر انصار کا غنچہ دل کھل گیا، انہوں نے عرض کیا:

''یارسول اللہ ارشاد فرمائیے! ہم کن باتوں پر آپ کی بیعت کریں؟''

حضور ﷺ نے فرمایا: ''میں تم سے ان باتوں پر بیعت لیتا ہوں کہ تم ہر حالت میں حکم سنو گے اور سرِ اطاعت جھکا دو گے، اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے سے دریغ نہیں کرو گے، اللہ کے معاملے میں ہمیشہ حق گوئی سے کام لو گے اور کسی ملامت کرنے والے کی پروا نہیں کرو گے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اپنا شعار بناؤ گے اور جب میں تمہارے ہاں آؤں تو میری حفاظت اس طرح کرو گے جس طرح اپنی جانوں اور اہل و عیال کی کرتے ہو۔ اس کے بدلے میں تمہارے لیے جنت ہے۔''

اس پر سب انصار اٹھ کر حضور ﷺ کی طرف بڑھے، لیکن حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ نے لپک کر آپ ﷺ کا دستِ مبارک اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اپنے ساتھیوں سے کہا: ''ٹھہرو اہلِ یثرب! ہم لوگوں نے اس سفر میں اونٹوں کے کلیجے محض اس یقین کی بناء پر چھلنی کیے ہیں کہ یہ اللہ کے رسول ہیں۔ انہیں اپنے ہاں لے جانا تمام عرب سے عداوت مول لینا ہے۔ عین ممکن ہے اس کے نتیجے میں تمہارے اشراف قتل ہوں اور مخالفین کی تلواریں تمہارے ٹکڑے اڑا دیں۔ اگر یہ سب کچھ برداشت کرنے کی طاقت رکھتے ہو، تو حضور ﷺ کو اپنے ہاں لے چلو اور تمہارا اجر اللہ کے ذِمّے ہے، لیکن اگر کوئی خوف اور خطرہ محسوس کرتے ہو، تو پھر انہیں اپنے حال پر چھوڑ دو اور صاف صاف معذرت کر دو۔ اس وقت کی معذرت اللہ کی ہاں زیادہ قابلِ قبول ہو گی۔''

حضرت اسعد رضی اللہ عنہ کی باتیں سن کر سب لوگوں نے بیک زبان کہا:

''اسعد تم پیچھے ہٹ جاؤ! خدا کی قسم ہم بیعت کر کے رہیں گے اور پھر اُسے ہرگز نہ توڑیں گے۔''

اس پر حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ نے فوراً رحمتِ عالم ﷺ کی بیعت کر لی۔ یہ سعادت انہوں نے تیسری یا چوتھی مرتبہ حاصل کی۔ دوسرے انصار نے بھی اُن کی پیروی کی اور سب بڑے ذوق وشوق سے یکے بعد دیگرے حضور ﷺ کی بیعت سے مشرّف ہو گئے۔ اس بیعت کو تاریخ میں بیعتِ لیلۃ العقبہ، بیعتِ عقبہ ثانیہ، بیعتِ عقبہ کبیرہ وغیرہ ناموں سے پکارا گیا۔ یہ بیعت تاریخ اِسلام میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ فی الحقیقت یہ بیعت عرب وعجم اور جنّ وانس سے اللہ کی خاطر جنگ کرنے کی بیعت تھی۔ ٹھیک اُس وقت جب عرب کا ذرّہ ذرّہ علمبر دارانِ حق کے خون کا پیاسا تھا، ارضِ یثرب کے یہ مقدّس انسان اٹھے اور اپنی جانوں، مالوں اور اولادوں کو مکہ کے دُرِ یتیم ﷺ کے قدموں میں لا ڈالا۔

اللہ کا لاکھ لاکھ سلام ہو اُن مبارک ہستیوں پر جنہوں نے اپنا سب کچھ راہِ حق میں داؤ پر لگا دیا اور کسی خطرے اور ملامت کو خاطر میں نہ لائے۔ اس بیعت نے انصار کو ایک ایسا شرف اور امتیاز عطا کر دیا جس پر وہ ہمیشہ فخر کرتے رہے۔ ابنِ اسحاق رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ انصار میں یہ بحث چھڑ گئی کہ لیلۃ العقبہ میں کس شخص کو سب سے پہلے حضور ﷺ سے بیعت کی سعادت حاصل ہوئی۔ بنو نجار کہتے تھے یہ شرف اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوا۔ بنو سلمہ کہتے تھے کہ سب سے پہلے کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیعت کی۔ بنو عبد الاشہل کا دعویٰ تھا کہ اس معاملے میں ابو الہیثم بن التّیہان رضی اللہ عنہ کو سب پر سبقت حاصل ہے۔ آخر یہ معاملہ حضرت عبّاس بن عبد المُطّلِب رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش ہوا انہوں نے فرمایا: ''سب سے پہلے اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ نے بیعت کی۔ اُن کے بعد براء بن معرور رضی اللہ عنہ نے اور پھر اُسید بن حُضَیر رضی اللہ عنہ نے۔''

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے اس فیصلے کی رُو سے انصار کے سابقین اوّلین صحابہ رضی اللہ عنہم میں حضرت اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ کا مقام سرِ فہرست قرار پاتا ہے۔

بیعت کے بعد سرورِ عالم ﷺ نے اہلِ یثرب سے فرمایا: ''موسیٰ علیہ السلام نے بنی

اسرائیل کے بارہ نقیب منتخب کیے تھے۔ تم بھی دینی امور کی حفاظت کے لیے اپنے میں سے بارہ نقیب منتخب کر لو۔"

یثرب کے مسلمانوں نے بارہ نقیب اتفاقِ رائے سے منتخب کر لیے۔ اُن میں سے نو قبیلہ خزرج کے اور تین اوس کے چشم و چراغ تھے۔ خزرج کے نقیبوں میں سے ایک حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ تھے جنہیں یہ امتیازی مرتبہ بھی حاصل ہوا کہ رحمتِ عالم ﷺ نے اُنہیں "نقیب النُّقباء" مقرر فرمایا۔

اس کے بعد حضور نے انصار کو ہدایت فرمائی کہ اب تم لوگ خاموشی سے رخصت ہو جاؤ، جب اللہ کا حکم ہوگا تو میں ہجرت کر کے تمہارے پاس یثرب آ جاؤں گا۔

(۶)

بیعتِ عقبہ کبیرہ کے بعد حضرت اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ یثرب واپس آ گئے اور دو چند جوش کے ساتھ دعوت و تبلیغ میں مشغول ہو گئے۔ علّامہ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ اُس زمانے میں انصار میں بُت شکنی کی تحریک زوروں پر تھی اور بعض پُر جوش مسلمان اپنے اپنے قبیلوں کے بُت توڑنے میں پیش پیش تھے۔ مشرکینِ یثرب پر مسلمانوں کا ایسا رعب چھا گیا تھا کہ اُنہیں اپنے بُت شکن بھائیوں کا سامنا کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی اور وہ خود ساختہ معبودوں کی بربادی پر خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتے تھے۔

بیعتِ عقبہ کبیرہ ذی الحجہ ۱۳ بعدِ بعثت میں ہوئی تھی۔ ربیع الاوّل ۱۴ بعدِ بعثت میں رحمتِ عالم ﷺ نے ارضِ مکہ کو الوداع کہا اور یثرب کے نواحی محلّے (یا گاؤں) قباء میں نزولِ اجلال فرمایا۔ یہاں حضرت کلثوم بن الہدم رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا۔ وہ اوس کے خاندان بنو عمرو بن عوف کی شاخ بنو عُبید کے ایک معمّر بزرگ تھے اور کبر سنی کے عالم میں دولتِ ایمان سے بہرہ ور ہوئے تھے۔ اُن زمانے میں اگرچہ اسلام کی برکت سے اوس اور خزرج کے باہمی جھگڑے دب گئے تھے، لیکن پھر بھی وہ ایک دوسرے کے محلّوں میں جانے سے ہچکچاتے تھے۔ حضور ﷺ نے قباء میں اوس کے

ایک گھرانے میں قیام فرمایا، تو مدینے سے خزرج کے لوگ وہاں آنے میں قدرے متامل ہوئے، لیکن حضور ﷺ کے شوقِ ملاقات نے انہیں چین سے نہ بیٹھنے دیا اور اُن کے اکابر والہانہ ذوق وشوق کے ساتھ بارگاہِ نبوی میں حاضر ہو گئے۔ اُن میں حضرت اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ نہیں تھے۔ حضور ﷺ نے لوگوں سے پوچھا: ''اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ کہاں ہیں؟'' حضرت رفاعہ بن عبدالمنذر رضی اللہ عنہ، حضرت مبشّر بن عبدالمنذر رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد بن خثیمہ اوسی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''یارسول اللہ! اسعد رضی اللہ عنہ نے جنگِ بعاث میں ہمارے ایک سردار حضیر بن حارث اوسی کو قتل کیا تھا۔ اس لیے شاید وہ یہاں آنے میں خطرہ محسوس کرتے ہیں۔''

اُدھر حضرت اسعد رضی اللہ عنہ اپنے آقا مولا ﷺ کی زیارت کے لیے اس قدر بے تاب ہو گئے کہ رات کو مغرب اور عشاء کے درمیان منہ پر کپڑا لپیٹ کر سیّد الانام ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہو گئے۔ حضور ﷺ اُنہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ حضرت اسعد رضی اللہ عنہ رات بھر حضور ﷺ کے پاس رہے اور علی الصّباح واپس چلے گئے۔ اُن کے جانے کے بعد رحمتِ عالم ﷺ نے سعد بن خثیمہ رضی اللہ عنہ اور عبدالمنذر کے بیٹوں مبشّر رضی اللہ عنہ اور رفاعہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کو پناہ دو۔''

''اُن تینوں جان نثاروں نے عرض کیا۔ ''یارسول اللہ! ہم بسروچشم آپ ﷺ کے ارشاد کی تعمیل کریں گے۔''

حضرت سعد بن خثیمہ رضی اللہ عنہ فوراً حضرت اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ کے مکان پر پہنچے اور اُن کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اُنہیں اپنے قبیلے بنو عمرو بن عوف میں لے آئے۔ قبیلے کے دوسرے عمائد کو حضور ﷺ کی خواہش کا علم ہوا تو وہ سب آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ''یارسول اللہ! ہم سب اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ کو پناہ دیتے ہیں، وہ بلا جھجک یہاں آسکتے ہیں۔''

حضور ﷺ نے اُنہیں دُعائے خیر دی اور حضرت اسعد رضی اللہ عنہ نے بلا خوف و خطر آپ ﷺ کی خدمت میں آنا جانا شروع کر دیا۔

قباء میں چند دن قیام کے بعد رحمتِ عالم ﷺ نے یثرب کو اپنے قدومِ میمنت لزوم سے مشرّف فرمایا تو انصارِ مدینہ نے مسرّت اور ابتہاج کے عالم میں اس شان اور جوش و خروش سے آپ کا استقبال کیا کہ تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ حضور ﷺ کا خیر مقدم کرنے والوں میں حضرت اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ سب سے آگے تھے۔ حضور ﷺ سے اُن کی عقیدت اور محبت عشق کے درجے تک پہنچی ہوئی تھی۔

رحمتِ عالم ﷺ نے جس دن یثرب میں نزولِ اجلال فرمایا اُسی دن سے یہ شہر ''مدینۃ النبی'' کا نام اختیار کر گیا۔ علاّمہ ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے۔ کہ مدینہ منوّرہ میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کو اگر خود حضور ﷺ کا میزبان بننے کا شرف عطا ہوا، تو حضرت اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ کو حضور ﷺ کی اونٹنی قصوا کا میزبان بننے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اتفاق کی بات کی حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ اور حضرت اسعد رضی اللہ عنہ دونوں ہی کا تعلق بنونجار سے تھا۔

حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ کے ہاں رونق افروز ہونے کے چند دن بعد سرورِ کونین ﷺ نے مدینہ منوّرہ میں خانہ خدا بنانے کا ارادہ فرمایا۔ حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ کے گھر کے سامنے ایک قطعہ زمین افتادہ پڑا تھا۔ یہیں آپ ﷺ کی اونٹنی آ کر بیٹھی تھی۔ حضور ﷺ نے اُسی کو مسجد کے لیے منتخب فرمایا۔ اس زمین میں کچھ قبریں اور کھجور کے درخت تھے اور حضور ﷺ کی تشریف آوری سے قبل حضرت اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ یہیں نماز پڑھا کرتے تھے۔ اُس زمین کے مالک بنونجار کے دو یتیم بچے سَہل رضی اللہ عنہ اور سُہیل رضی اللہ عنہ تھے جو حضرت اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ کی سرپرستی میں تھے۔ حضور ﷺ نے اُن لڑکوں سے زمین کی قیمت دریافت کی، تو انہوں نے عرض کیا: ''یارسول اللہ! یہ زمین ہم حق تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے آپ ﷺ کی نذر کرتے

ہیں۔"

حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ تمہیں جزائے خیر دے! میں یہ زمین بلا قیمت نہیں لوں گا۔"

پھر حضور ﷺ نے انصار کے اکابر کے مشورے سے اس زمین کی قیمت دس مثقال سونا متعین فرمائی اور یہ قیمت باختلافِ روایت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ یا حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے دلوائی۔ (فتح الباری ومدارج النبوۃ)، لیکن زرقانی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضرت اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ نے اپنے زیرِ کفالت بچوں سے یہ زمین لے کر مسجد کی تعمیر کے لیے حضور ﷺ کی نذر کر دی اور اُس کے بدلے میں بچوں کو بنو بیاضہ میں ایک باغ دے دیا۔

حضرت اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ کو سرورِ عالم ﷺ سے کمال درجے کی محبت اور عقیدت تھی، جس دن سے حضور ﷺ نے مدینہ منورہ میں قدم رنجہ فرمایا تھا، حضرت اسعد رضی اللہ عنہ کا بیشتر وقت بارگاہِ رسالت ﷺ میں گزرتا تھا۔ حضور ﷺ بھی اُن پر بڑی شفقت فرماتے اور اُن کو اپنے محبوب ترین جان نثاروں میں شمار فرماتے تھے، لیکن افسوس کہ رحمتِ عالم ﷺ کے اس عاشقِ صادق کو عہدِ رسالت ﷺ کے صرف چند ہی ماہ دیکھنے نصیب ہوئے۔ انصارِ مدینہ میں جس طرح انہوں نے حضور ﷺ کا دامنِ اقدس تھامنے میں سبقت کی تھی، اُسی طرح دنیائے فانی کو خیر باد کہنے میں بھی سبقت کی۔

شوال ۱ھ ہجری میں سرورِ عالم ﷺ نے ابھی مسجد کی تعمیر سے فراغت نہیں پائی تھی کہ حضرت اسعد رضی اللہ عنہ کے حلق میں شدید درد اٹھا جو ذبحہ کہلاتا ہے۔ حضور ﷺ نے اُن کی علالت کی خبر سُنی، تو بے تاب ہو گئے۔ فوراً اُن کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ اُنہیں درد سے بے چین دیکھ کر اپنے دستِ مبارک سے سر کو داغا، لیکن افاقہ نہ ہوا اور اسی حالت میں انہوں نے پیکِ اجل کو لبیک کہا۔ وفات سے پہلے سرورِ عالم ﷺ سے عرض کی کہ یا رسول اللہ، میں اپنے پیچھے دو کم سن بچیاں چھوڑ رہا ہوں وہ اللہ کے اور آپ ﷺ

کے حوالے ہیں۔ اُن کے سر پر اپنا دستِ شفقت رکھے گا۔

حضرت اسعد رضی اللہ عنہ انصار میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے خدمت گزار اور اسلام کے سب سے بڑے سرگرم معاون تھے اس لیے یہودیوں نے اُن کی وفات پر زبانِ طعن دراز کی۔ علامہ ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت اسعد رضی اللہ عنہ کی وفات سے شدید صدمہ پہنچا۔ اس موقع پر یہود کی خرافات سُن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہود کہتے ہیں اگر محمدؐ، اللہ کے رسول ہوتے، تو ان کا اتنا سرگرم حامی نہ مرتا، حالانکہ بے نیاز خدا کی قضا کے سامنے کسی کی پیش نہیں چلتی۔''

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حضرت اسعد رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ پڑھائی اور پھر انہیں بقیع میں سپردِ خاک کیا۔ ہجرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے پہلے حضرت کلثوم بن الہدم رضی اللہ عنہ نے قباء میں وفات پائی تھی۔ اُن کی وفات کے چند ہی دن بعد مدینہ منوّرہ میں حضرت اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ نے وفات پائی۔ ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے نمازِ جنازہ حضرت اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ ہی کی پڑھی تھی۔ انصارِ مدینہ کا خیال تھا کہ حضرت اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ سب سے پہلے مسلمان ہیں جن کو خاکِ بقیع نے اپنی آغوش میں لیا، لیکن علامہ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ گورستانِ بقیع میں سب سے پہلے حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ دفن ہوئے جن کی وفات اواخر ۲ھ میں (غزوۂ بدر کے بعد) ہوئی۔ اگر ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ کی روایت درست ہے، تو پھر حضرت اسعد رضی اللہ عنہ کی آخری آرام گاہ کسی اور جگہ بنی ہوگی جس کا اب سراغ نہیں ملتا۔

حضرت اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ بنو نجار کے نقیب تھے۔ اُن کی رحلت کے بعد بنو نجار بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور التماس کی: ''یارسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ہے کہ اسعد رضی اللہ عنہ کی ہم میں کیا منزلت تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اُن کی جگہ ہم میں سے کسی کو نقیب مقرر فرمائیں تاکہ اُن کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے، وہ کسی حد تک پورا ہو سکے۔''

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم لوگ میری ننھیالی قرابت دار ہو اور میں تم میں سے

ہوں۔ اب اسعد رضی اللہ عنہ کی جگہ میں تمہارا نقیب بن جاتا ہوں۔"

بنو نجار کو اپنی عزت افزائی پر بے پناہ مسرت ہوئی۔ وہ ہمیشہ اس بات پر فخر کیا کرتے کہ خود رسولِ اکرم ﷺ ہمارے نقیب بنے۔

رحمت عالم ﷺ حضرت اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ کی یتیم بچیوں کو بے حد عزیز جانتے اور اُن پر نہایت شفقت فرماتے۔ حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ نے "اصابہ" میں لکھا ہے کہ حضور ﷺ نے اُن کو سونے کی بالیاں جن میں موتی پڑے ہوئے تھے، پہنائیں۔

علّامہ ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ نے "اُسدُ الغابہ" میں بیان کیا ہے کہ حضرت اسعد رضی اللہ عنہ کی ایک بچّی کا نام فریعہ تھا۔ وہ سنِ بلوغ کو پہنچیں، تو سرورِ عالم ﷺ نے اُن کا نکاح حضرت نبیط بن جابر رضی اللہ عنہ سے کر دیا۔

سیّدنا حضرت ابی اُمامہ اسعد رضی اللہ عنہ زرارہ نے اگرچہ اسلام کے مدنی دَور کی ابتداء میں وفات پائی، لیکن اپنے جوشِ ایمان اور حُسنِ عمل کے جو نقوش انہوں نے اس مختصر عرصے میں صفحہ تاریخ پر ثبت کیے وہ تا ابد فرزندانِ اسلام کو منزلِ مقصود کی راہ دکھاتے رہیں گے..... خود رحمتِ عالم ﷺ نے اُن کے حُسنِ کردار کا اعتراف یوں فرمایا کہ اُن کو "خیر" کے لقب سے نوازا اور اُن کی جگہ اپنی ذاتِ اقدس کو بنو نجار کا نقیب تجویز فرمایا۔ ع

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا!
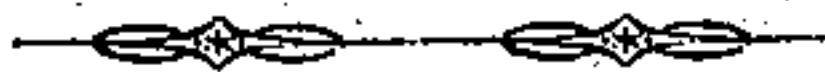
رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

حضرت ذکوان بن عبدِ قیس الزُّرقی انصاری رضی اللہ عنہ

ان کا تعلق خزرج کے خاندان زریق سے تھا۔ سلسلہ نسب یہ ہے:
ذکوان رضی اللہ عنہ بن عبد قیس بن خلدۃ بن مخلد بن عامر بن زُریق

اللہ تعالیٰ نے حضرت ذکوان رضی اللہ عنہ کو فطرتِ سلیم سے نوازا تھا اور وہ بعثتِ نبوی سے قبل ہی توحید کے قائل ہو گئے تھے۔ انہوں نے یہودِ مدینہ سے نبی آخرالزماں ﷺ کا تذکرہ بھی سُنا تھا اور ان کی دلی تمنا تھی کہ اللہ اُن کو نبی آخرالزماں ﷺ کا زمانہ دیکھنا نصیب کرے۔ علامہ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ بیعتِ عقبہ اولیٰ (۱۱ نبوت) سے پہلے وہ ایک مرتبہ اپنے ایک ہم مشرب دوست حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کے ہمراہ قومی مفاخرت کے سلسلے میں مکہ گئے اور مشہور قریشی رئیس عتبہ بن ربیعہ کے ہاں قیام کیا۔ عتبہ نے ان سے سرورِ عالم ﷺ کے حالات بیان کیے۔ (یا بروایتِ دیگر قبل اس کے کہ وہ عتبہ سے ملتے انہوں نے بعض دوسرے لوگوں سے رسولِ اکرم ﷺ کے حالات سُنے) تو وہ بے حد متاثر ہوئے اور حضرت ذکوان رضی اللہ عنہ نے بے ساختہ حضرت اسعد رضی اللہ عنہ سے کہا:

دونك هذا دينك

یعنی تم کو جس چیز کی تلاش تھی وہ موجود ہے۔ اب اس کو اختیار کرو۔

چنانچہ دونوں وہاں سے اٹھ کر بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور توحید و رسالت کا اقرار کر کے شرفِ ایمان سے بہرہ ور ہو گئے۔

سنہ ۱۲ بعدِ بعثت میں وہ مدینہ کے اُن بارہ اہلِ ایمان میں شامل تھے جو مکہ جا کر حضور ﷺ پُرنور کی بیعت سے مشرف ہوئے (بیعتِ عقبہ ثانیہ)۔ اگلے سال

انہوں نے پھر یہی سعادت بیعتِ عقبہ کبیرہ میں مدینہ کے ۷۲ دوسرے اہلِ ایمان کے ساتھ حاصل کی۔ اسی موقعہ پر انصارِ مدینہ نے حضور ﷺ کو مدینہ تشریف لانے کی دعوت دی اور آپ ﷺ کو دل و جان سے اپنی تائید وحمایت کا یقین دلایا۔ اہلِ سیَر کا بیان ہے کہ اس بیعت کے بعد حضرت ذکوان رضی اللہ عنہ مدینہ سے مکہ آ کر مقیم ہو گئے اور کچھ عرصہ بعد دوسرے مہاجرین کے ساتھ مکہ سے ہجرت کی۔ اسی لیے ان کو مہاجری انصاری کہا جاتا ہے۔

رمضان المبارک ۲ھ ہجری میں غزوۂ بدر پیش آیا تو حضرت ذکوان رضی اللہ عنہ کو ''اصحاب بدر'' میں شامل ہونے کا عظیم شرف حاصل ہوا اگلے سال غزوۂ اُحد میں بھی بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ شریک ہوئے اور مشرکین کے خلاف مردانہ وار لڑتے ہوئے اپنی جان راہِ حق میں قربان کر دی۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ
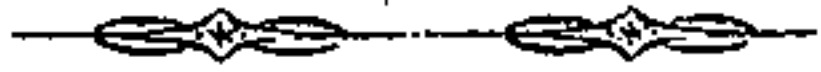
حضرت عُبادہ بن صامت انصاری رضی اللہ عنہ

(۱)

۹ ہجری میں سرورِ عالم ﷺ نے صدقہ وزکوٰۃ وصول کرنے کا ایک جامع نظام وضع فرمایا۔ آپ ﷺ نے عرب کی ہر قبیلے کی طرف الگ الگ مُحصِل روانہ فرمائے جو ان قبائل کا دورہ کر کے لوگوں سے زکوٰۃ اور خراج وصول کر کے آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کرتے تھے۔ اسی سلسلہ میں آپ ﷺ نے اپنے ایک انصاری جان نثار کو بھی بلا بھیجا۔ دراز قامت اور دوہرے بدن کے یہ وجیہہ اور خوش رُو صاحبِ رسول ﷺ بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوئے تو حضور ﷺ نے انہیں ان کے عہدے کا فرمان عطا کرتے ہوئے فرمایا: ''اپنے فرائض انجام دیتے وقت خدا سے ڈرنا، ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن چوپائے تک تمہارے خلاف فریادی ہو کر آئیں۔''

حضور ﷺ کا ارشاد سن کر ان صاحب کی آنکھیں بھر آئیں اور انہوں نے عرض کیا: ''یارسول اللہ ﷺ! میرے ماں باپ آپ پر قربان...... خدا کی قسم مجھے دو آدمیوں پر بھی عامل بننے کی خواہش نہیں۔''

سرورِ عالم ﷺ ان کی بات سن کر نہایت مسرور ہوئے کیونکہ جو شخص خود کسی عہدے کی خواہش کرتا تھا، حضور ﷺ اس کو عامل یا مُحصِل مقرر نہیں فرماتے تھے۔ یہ صاحبِ رسول ﷺ جو دنیاوی عہدوں سے اس قدر بے نیاز تھے اور جن کی اس بے نیازی نے حضور ﷺ کو مسرور کیا، سیّدنا حضرت عُبادہ بن صامت انصاری رضی اللہ عنہ تھے۔

(۲)

حضرت ابوالولید عُبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ تاریخ اسلام کی ایک مہتم بالشان شخصیت

ہیں اور اُن کی جلالتِ قدر پر مسلمانوں کے سبھی مکاتبِ فکر کا اتفاق ہے۔ فی الحقیقت ان کے حالاتِ زندگی اتنے ولولہ انگیز ہیں کہ ان کو پڑھ کر ایمان میں حرارت پیدا ہو جاتی ہے۔

حضرت عُبادہ رضی اللہ عنہ کا تعلق خزرج کی شاخ بنو سالم سے تھا۔ سلسلہ نسب یہ ہے:

عُبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بن قیس بن اصرام بن فِہر بن ثعلبہ بن غنم بن سالم بن عوف بن عمرو بن عوف بن خزرج

والدہ کا نام قُرۃ العین رضی اللہ عنہا بنتِ عبادہ (بن نَضلہ بن مالک بن عجلان) تھا۔ وہ بھی بیٹے کے ہاتھ پر اسلام لائیں اور شرفِ صحابیت سے بہرہ ور ہوئیں۔

حضرت عُبادہ رضی اللہ عنہ کی اٹھتی جوانی تھی کہ اسلام کا خورشیدِ جہاں تاب فاران کی چوٹیوں سے طلوع ہوا۔ ۱۱ بعدِ بعثت میں مدینہ کے چھ سعید الفطرت خزرجی سعادت اندوزِ اسلام ہو کر مکہ سے واپس آئے تو یہاں بھی چراغ سے چراغ جلنے لگا۔ عُبادہ رضی اللہ عنہ ایک جوانِ صالح تھے۔ ان کے کانوں میں جونہی دعوتِ حق کی آواز پڑی، انہوں نے بلا تامل اس پر لبیک کہا۔ اگلے سال حج کے موقع پر حضرت عُبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ قبیلہ خزرج کے نو اور قبیلہ اوس کے دو مسلمانوں کے ساتھ مکہ جا کر عقبہ کے مقام پر رحمتِ عالم ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور آپ کی بیعت سے مشرّف ہوئے۔ تاریخ میں یہ بیعت ''بیعتِ عقبہ اولیٰ'' یا ''بیعتِ نساء'' کے نام سے مشہور ہے۔ خود حضرت عُبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم سے ان باتوں پر بیعت لی:

> ''یہ کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے، چوری نہ کریں گے، زنا نہ کریں گے، اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گے، کسی پر بہتان نہیں لگائیں گے۔ کسی امرِ معروف میں رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی نہ کریں گے اور آپ ﷺ کا حکم سُنیں گے اور مانیں گے خواہ ہم آسودہ حال ہوں یا تنگ دست اور خواہ

وہ حکم ہمیں گوارا ہو یا ناگوارا اور خواہ کسی کو ہم پر فوقیت دی جائے، ہم حکومت کے معاملے میں اہلِ حکومت سے نزاع نہ کریں گے (اگرچہ ہم سمجھتے ہوں کہ حکومت میں ہمارا حق ہے) اِلّا یہ کہ ہم کھُلا کھُلا کفر دیکھیں اور یہ کہ ہم جہاں اور جس حال میں بھی ہوں حق بات کہیں گے اور لومۃ لائم سے نہ ڈریں گے۔"

اس کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا:

"تم میں سے جس کسی نے ان باتوں کو پورا کیا اس کے لیے جنت ہے اور جو کوئی ان میں سے کسی فعلِ قبیح کا مرتکب ہوا اور اسے اس دنیا میں اس فعل کی سزا مل گئی تو یہ سزا اس کے لیے کفارہ گناہ ہو جائے گی اور ستار العیوب نے جس کی پردہ پوشی کر لی تو اس کا انجام رَبّ قدیر کی مشیّت پر موقوف ہے۔ چاہے تو معاف کر دے۔"

اس بیعت کو "بیعتِ نساء" اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کے الفاظ ان الفاظ سے مشابہ ہیں جو چند سال بعد قرآنِ حکیم (سورہ ممتحنہ) میں مسلمان عورتوں سے بیعت لینے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئے۔

۱۳ ؁ بعدِ بعثت میں بیعتِ عقبہ کبیرہ (یا لیلۃ العقبہ) کا عظیم الشان واقعہ پیش آیا جس نے تاریخ کا رُخ موڑ دیا۔ اس میں مدینہ کے ۷۵ پچھتر اہلِ ایمان نے عقبہ کی گھاٹی میں رحمتِ عالم ﷺ کی بیعت اس مقدس پیمانِ وفا کے ساتھ کی کہ آپ ﷺ مدینہ تشریف لائیں تو ہم آپ ﷺ کی اپنی جانوں اور مالوں کے ساتھ اسی طرح حفاظت اور نصرت کریں گے۔ جس طرح اپنی جانوں اور اہل وعیال کی کرتے ہیں۔

اسی موقع پر سرورِ عالم ﷺ نے ان ۷۵ پچھتر اہلِ ایمان سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"(ایسا ہرگز نہیں ہوگا کہ میں دشمنوں پر غالب آ جاؤں تو تمہیں چھوڑ کر اپنی قوم میں واپس آ جاؤں بلکہ) تمہارا خون میرا خون میری آبادی تمہاری

آبادی اور تمہاری بربادی میری بربادی ہوگی۔ تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں جس سے تم صلح کرو گے، اس سے میں صلح کروں گا۔ جس سے تم لڑو گے اس سے میں لڑوں گا۔ غرض میرا مرنا جینا تمہارے ساتھ ہے۔''

ان ۷۵ پچھتر اہلِ ایمان میں حضرت عُبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ یہ وہ عظیم انسان تھے جنہوں نے اس وقت رحمتِ عالم ﷺ کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی اور اپنی جانوں اور مالوں کے ساتھ آپ ﷺ کی حمایت و حفاظت کا عہد کیا جب سارا عرب شمعِ رسالت کو بُجھانے پر تُلا ہوا تھا۔ وہ صاف دیکھ رہے تھے کہ اس نازک موقع پر مکہ کے دُرِ یتیم ﷺ کا ساتھ دینا سارے عرب کے خلاف اعلانِ جنگ کے مترادف تھا اور اس کے نتیجے میں ان کو ہولناک خطرات اور مصائب پیش آ سکتے تھے۔ ان سب باتوں کے علی الرغم انہوں نے مردانہ وار والہانہ عقیدت سے اپنے ہاتھ سیّدالانام ﷺ کے دستِ مبارک میں دے دیئے اور اپنے مستقبل اور قسمت کو حضور ﷺ کی ذاتِ گرامی سے وابستہ کر لیا۔ ان کی یہی بے مثال جرات تھی کہ خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم' ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن اور مہاجرین اوّلین رضی اللہ عنہم کے بعد اہلِ عقبہ رضی اللہ عنہم کو دوسرے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم (بشمول اصحابِ بدر رضی اللہ عنہم) پر ابد تک فضیلت حاصل ہو گئی۔

بیعت کے بعد سرورِ عالم ﷺ نے انصار سے فرمایا کہ اپنے دینی امور کی حفاظت کے لیے اپنے میں سے بارہ آدمی بحیثیت نقیب منتخب کر لو۔ اس ارشاد کے مطابق انصار نے باہمی مشورہ سے بارہ نقیب منتخب کیے۔ ان میں سے نو خزرج سے تعلق رکھتے تھے اور تین اوس سے۔ خزرجی نقباء میں سے ایک حضرت عُبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ تھے، انہیں حضور ﷺ نے بنو قوافل کا نقیب مقررّ فرمایا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے انصار کو مراجعت کی اجازت بخشی۔

(۳)

حضرت عُبادہ بن صامت بیعتِ عقبہ کبیرہ سے مشرّف ہو کر مدینہ واپس آئے تو

اُن کے جوشِ ایمان کا یہ عالم تھا کہ یہ سب سے پہلے اپنی والدہ قُرۃ العین رضی اللہ عنہا کو دائرۂ اسلام میں لائے، اس کے بعد اپنے قبیلے کے بت پرستوں کے گھروں میں جا جا کر ان کے بتوں کو توڑنا شروع کیا۔ خاندانِ بلیٰ بنو نوفل کا حلیف تھے۔ اس کے ایک صاحب کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ، حضرت عُبادہ رضی اللہ عنہ کے دوست تھے۔ انہوں نے اپنے گھر میں ایک بڑا سا بُت بنا رکھا تھا اور بڑے التزام سے اس کی پرستش کیا کرتے تھے۔ حضرت عُبادہ رضی اللہ عنہ ایک دن موقع پا کر کعب کے گھر گئے اور ان کے بُت کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا، پھر کعب کو سمجھایا کہ یہ بت اپنی حفاظت نہیں کر سکتے تو تمہارے کیا کام آئیں گے۔ کعب کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی اور تھوڑے عرصہ بعد وہ بھی سعادت اندوزِ اسلام ہو گئے۔
مُسندِ احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ میں ہے کہ بیعت سے واپس آ کر حضرت عُبادہ رضی اللہ عنہ ہر وقت حضرت سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے جمالِ جہاں آرا سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرنے کے لیے بیتاب رہتے تھے، چنانچہ ہجرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل تھوڑے تھوڑے دنوں کے وقفہ سے دو مرتبہ مکہ جا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی۔

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد مدینہ منورّہ میں نزولِ اجلال فرمایا تو حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کو گویا سارے جہان کی نعمتیں مل گئیں۔ اپنے وقت کا بیشتر حصہ بارگاہِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں گزارتے تھے اور فیضانِ نبوی سے خوب خوب بہرہ یاب ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ علم و فضل کے اعتبار سے اتنے بلند مرتبہ پر پہنچ گئے کہ اسلام کی پہلی درس گاہ جو اصحابِ صُفہ کے لیے قائم ہوئی، وہ اس کے مُعلّم مقرر ہوئے۔

ہجرت کے پانچ ماہ بعد سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے مکان میں مہاجرین و انصار کو جمع کیا۔ اور ان میں مواخاۃ (برادری) قائم کی۔ مستدرکِ حاکم میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عُبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کو جلیل القدر مہاجر صحابی حضرت ابو مرثد غنوی رضی اللہ عنہ کا دینی بھائی بنایا۔

علم کے حصول کے ساتھ ساتھ حضرت عُبادہ رضی اللہ عنہ راہِ حق میں جان و مال کی قربانی

پیش کرنا زندگی کا عظیم تر مقصد سمجھتے تھے۔ وہ ایک سراپا ایثار مجاہد تھے اور موت کا خوف کبھی ان کے عزم و ارادہ میں حائل نہیں ہوتا تھا۔ غزوات کا آغاز ہوا تو انہوں نے بدر سے تبوک تک تمام غزوات میں رحمتِ عالم ﷺ کا ہمرکابی کا شرف حاصل کیا اور ہر معرکے میں والہانہ جوش و خروش کے ساتھ سرفروشی کا حق ادا کیا۔

سرورِ عالم ﷺ مدینہ منورّہ تشریف لائے تھے تو یہودِ مدینہ سے صلح و امن کا ایک تحریری معاہدہ کیا تھا۔ ۲ ہجری کی وسط میں یہودی قبیلے بنوقینقاع نے عہد شکنی اور عملاً یہ معاہدہ توڑ دیا۔ بنوقینقاع مدینہ کے دوسرے یہودی قبائل کی مقابلے میں زیادہ مضبوط اور طاقتور تھے۔ اس قبیلہ کے لوگ عام طور پر صنّاع اور زراعت پیشہ تھے۔ آہنگری اور زرگری ان کا خاص پیشہ تھا۔ (قَین عربی میں لوہار کو کہتے ہیں اور قاع اس ہموار اور نرم زمین کو جس میں کھیتی کی جا سکے) مال و دولت اور ہتھیاروں کی بہتات نے ان لوگوں کو بہت مغرور بنا دیا تھا، چنانچہ جو مسلمان ان کے محلّے یا بازار سے گزرتے ان پر آوازے کسا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ انہوں نے ایک مسلمان خاتون کی بے حرمتی کر دی جس پر مسلمانوں اور یہودیوں میں جھگڑا ہو گیا۔ اس میں ایک مسلمان شہید ہوا اور ایک یہودی مارا گیا۔ حضور ﷺ کو ان لوگوں کی شرارتوں کی اطلاع دی گئی تو آپ ﷺ نے انہیں راہِ راست پر آنے کی تلقین فرمائی۔ اس کے جواب میں انھوں نے بڑ ہانکی کہ محمد (ﷺ) بس قریش پر ہی غالب آ گئے کہ انہیں فنونِ سپہ گری کا علم نہیں تھا۔ اگر محمد (ﷺ) کا مقابلہ ہم سے ہوا تو انہیں فنونِ سپہ گری کا علم نہیں تھا۔ اگر محمد (ﷺ) کا مقابلہ ہم سے ہوا تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ لڑائی کیا ہوتی ہے اور ہم کس طرح لڑتے ہیں۔

بنوقینقاع کا جواب ان کے خبثِ باطن کا غماز تھا اور اب وقت آ گیا تھا کہ انہیں عہد شکنی اور فساد انگیزی کی قرار واقعی سزا دی جائے۔ سرورِ عالم ﷺ نے حکم دیا کہ ان کے محلّے کا محاصرہ کر لیا جائے۔ پندرہ دن کے محاصرے ہی میں ان لوگوں کے کس بَل نکل

گئے اور انہوں نے غیر مشروط اطاعت قبول کر لی۔ لیکن حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اب یہ لوگ مدینہ میں قیام نہیں کر سکتے۔ انہیں اپنے ہتھیار چھوڑ کر تین دن کے اندر مدینہ سے نکلنا ہوگا۔ حضور ﷺ نے ان کے اخراج کی نگرانی کے لیے حضرت عُبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا۔ اس سے پہلے حضرت عُبادہ رضی اللہ عنہ کے ان لوگوں سے حلیفانہ تعلقات تھے لیکن جب قرآنِ کریم کا یہ حکم نازل ہوا کہ ''اے مسلمانو یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست مت بناؤ۔'' تو انھوں نے بنو قینقاع سے اپنا دیرینہ تعلق ایک قلم منقطع کر لیا اور نہایت مستعدی سے ان لوگوں کے اخراج البلد کی نگرانی کی۔

۶ھ میں صلح نامہ حدیبیہ سے پہلے بیعتِ رضوان کا عظیم الشان واقعہ پیش آیا۔ حضرت عُبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بھی ان چودہ سو صحابہ رضی اللہ عنہم میں شامل تھے جنہوں نے اس موقع پر سرورِ عالم ﷺ کے دستِ مبارک پر موت کی بیعت کی اور بارگاہِ خداوندی سے ''اصحاب الشجرہ'' کا لقب اور کھلے لفظوں میں جنت کی بشارت پائی۔

۸ ہجری میں فتح مکہ کے موقع پر حضرت عُبادہ رضی اللہ عنہ رحمتِ عالم ﷺ کے ہمرکاب ان دس ہزار جانبازوں میں شامل تھے جن کے بارے میں سینکڑوں سال پہلے ''کتابِ استثناء'' میں یوں پیشن گوئی کی گئی تھی:

> ''خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا۔ کوہِ فاران سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے ہاتھ میں ایک آتشیں شریعت ان کے لیے تھی۔''

غرض کوئی ایسا غزوہ نہیں تھا جس میں حضرت عُبادہ رضی اللہ عنہ نے ایثار فداکاری کا ثبوت نہ پیش کیا ہو اور عہدِ رسالت کا کوئی شرف ایسا نہیں تھا جو انہیں حاصل نہ ہوا ہو۔ یہ حضرت عُبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کا جذبہ فدویت اور دوسرے اوصاف ومحاسن ہی تھے جنہوں نے ان کو محبوبِ ربِّ دو جہاں ﷺ کو محبوب بنا دیا تھا۔

مُسندِ احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عُبادہ رضی اللہ عنہ صاحبِ فراش ہو

گئے تو خود سیّد الانام ﷺ چند صحابہ کے ہمراہ ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ اس موقع پر حضور ﷺ نے ان سے دریافت فرمایا: ''عُبادہ جانتے ہو شہید کون ہے؟'' انہوں نے اپنی اہلیہ سے کہا کہ ذرا مجھے تکیہ کے سہارے بٹھا دو۔ بیٹھ گئے تو عرض کی۔ ''یا رسول اللہ ﷺ، شہید وہ ہے جو شرفِ ایمان سے بہرہ ور ہو، راہِ خدا میں ہجرت کرے اور جہادِ فی سبیل اللہ میں کام آئے۔'' حضور ﷺ نے فرمایا: ''اس صورت میں تو شہیدوں کی تعداد بہت کم ہو گی۔ قتل ہونا، پانی میں ڈوب کر مرنا، ہیضہ سے مرنا اور عورت کا زچگی میں مرنا، اس قسم کی تمام اموات شہادت میں داخل ہیں اور ان میں مرنے والے شہید ہیں۔''

مسندِ احمد ہی کی روایت ہے کہ ۱۱ھ ہجری میں سرورِ عالم ﷺ سفرِ آخرت سے پہلے علیل ہوئے تو حضرت عُبادہ رضی اللہ عنہ کی بیقراری کا عجیب عالم تھا۔ روزانہ بلا ناغہ صبح شام عیادت کے لیے حضور ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوتے تھے۔ اسی زمانے میں حضور ﷺ نے ایک دن حضرت عُبادہ رضی اللہ عنہ کو ایک دُعا بتائی اور فرمایا کہ یہ دعا مجھ کو جبریلِ امین نے بتائی تھی۔

(۴)

سرورِ عالم ﷺ کی رحلت کے بعد حضرت عُبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ درس و افتاء، وعظ و ہدایت اور بعض اہم حکومتی ذمہ داریوں کی انجام دہی میں گزارا، تاہم ان کے دل میں جذبہ جہاد کی شمع ہمیشہ فروزاں رہی۔ جس وقت بھی موقع ملتا سر بکف میدانِ جہاد میں پہنچ جاتے۔ حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ کی عہدِ خلافت میں شام پر لشکر کشی ہوئی تو حضرت عُبادہ رضی اللہ عنہ بھی مجاہدینِ اسلام میں شامل ہو گئے اور کئی معرکوں میں اپنی سرفروشی کے جوہر دکھائے۔ اپنی غیر معمولی شجاعت اور جاں بازی کی بدولت حضرت عُبادہ رضی اللہ عنہ کو شجاعانِ عرب میں نمایاں مقام حاصل ہو گیا تھا اور ان کو ایک ہزار شہسواروں کے برابر تسلیم کیا جاتا تھا۔ عہدِ فاروقی کے کئی معرکوں میں بھی انہوں نے اپنی شجاعت و بسالت کی دھاک بٹھا دی۔ ۲۱ھ ہجری میں انہوں نے تسخیر اسکندریہ کے سلسلے

میں جس عزم وہمت، بے خوفی اور دلاوری کا مظاہرہ کیا، مورخین نے اس کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مصر کی مہم پر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا تھا۔ انہوں نے تھوڑے ہی عرصے میں باب الیون، عریش، بلبیس، قسطاط وغیرہ کئی مصری شہروں کو فتح کرلیا۔ پھر اسکندریہ کی طرف بڑھے، مصریوں نے قلعہ بند ہو کر زبردست مقابلہ کیا اس سے مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ جب کئی ماہ تک اسکندریہ فتح ہونے میں نہ آیا تو حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے دارالخلافہ سے مدد مانگ بھیجی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے چار ہزار سوار بطور کمک روانہ کیے جو چار افسروں کی ماتحتی تھے۔ یہ چار افسر حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ، حضرت مقداد بن اسود کندی رضی اللہ عنہ، حضرت مسلمہ بن مخلد رضی اللہ عنہ اور حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ تھے جو فنِ سپہ گری میں تمام عرب میں انتخاب تھے۔ یہ کمک روانہ کرتے وقت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے مردم شناس نابغہ عظیم نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ ان افسروں میں ہر شخص ایک ہزار آدمیوں کے برابر ہے۔ اس بناء پر یہ فوج چار ہزار نہیں بلکہ آٹھ ہزار ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو یہ ہدایت بھی کی کہ جس وقت میرا یہ خط تم کو ملے لوگوں کو جمع کر کے ان کے سامنے جہاد کے فضائل بیان کرو اور جن چار افسروں کو میں نے بھیجا ہے ان کو فوج کے آگے کر کے جمعہ کے دن حملہ کرو۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے پاس یہ کمک پہنچی تو انہوں نے فوج کے سامنے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا خط پڑھا، اسے سن کر مجاہدین میں زبردست جوش پیدا ہوگیا۔ جمعہ کے دن حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے فوج مرتب کر کے اسکندریہ پر بھرپور حملے کا ارادہ کیا۔ انہوں نے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے ان کا نیزہ لیا اور اس پر اپنا عمامہ لٹکا کر ان کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ یہ پرچم لیجئے اور اس فوج کی قیادت کیجئے، آج آپ ہی امیرِ عسکر ہیں۔ حضرت عُبادہ رضی اللہ عنہ نے نہایت جوش سے ایسا زبردست حملہ کیا کہ رومیوں کے دفاعی استحکامات درہم برہم ہوگئے اور ان کی ہمتیں پست ہوگئیں۔ بحری د

بری راستے سے جدھر راہ ملی بھاگ نکلے اور مسلمان فاتحانہ شان سے اسکندریہ میں داخل ہو گئے۔ حضرت عُبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے جس زمانے میں یہ کارنامہ سرانجام دیا، وہ تقریباً ساٹھ برس کے پیٹے میں تھے۔ اس عمر میں اس بے جگری سے میدانِ رزم میں اترنا کسی ایسے شخص ہی کا کام ہوسکتا تھا جو غیر معمولی عزم و ہمت کا مالک ہو اور شجاعت و بسالت میں بھی اپنا جواب آپ ہو۔

(۵)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، حضرت عُبادہ رضی اللہ عنہ کی شجاعت اور جاں بازی ہی کے قائل نہیں تھے بلکہ ان کے علم و فضل اور دوسرے اوصافِ حمیدہ کے بھی دل سے معترف اور مداح تھے۔ انہوں نے اپنے زمانہ خلافت میں حضرت عُبادہ رضی اللہ عنہ کو فلسطین کا قاضی مقرر کیا۔ اس زمانے میں اس صوبے کی امارت پر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ فائز تھے۔ ان سے کسی بات پر تکرار ہو گئی۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے کچھ سخت الفاظ کہہ دیئے جو حضرت عُبادہ رضی اللہ عنہ کو ناگوار گزرے اور وہ اس سے یہ فرما کر فلسطین سے مدینہ آ گئے کہ آئندہ جہاں آپ رہیں گے میں نہ رہوں گا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو ان کے مدینہ آنے کی اطلاع ملی تو ان سے یکا یک واپس آنے کا سبب پوچھا۔ انہوں نے واقعہ بیان کیا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''میں آپ کو ہرگز وہاں سے نہ ہٹاؤں گا۔ دنیا آپ ہی جیسے بزرگوں کے دم قدم سے قائم ہے جہاں آپ جیسے لوگ نہ ہوں گے خدا اس زمین کو خراب اور ویران کر دے گا۔ آپ اپنی جگہ پر واپس جایئے۔ میں آپ کو معاویہ رضی اللہ عنہ کی ماتحتی سے علیحدہ کیے لیتا ہوں۔''

ساتھ ہی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو بھی اسی مضمون کا خط لکھ دیا۔

علامہ بلاذری رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ اسی زمانے میں حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ امیرِ شام نے حضرت عُبادہ رضی اللہ عنہ کو حمص کی نیابت پر مامور کیا۔ اپنے زمانہ نیابت میں انہوں نے لاذقیہ فتح کیا۔ اس مہم کے دوران میں انہوں نے بڑے بڑے گڑھے

کھدوائے جن میں ایک شخص اپنے گھوڑے سمیت بخوبی چھپ سکتا تھا۔ یہ تدبیر عسکری نقطہ نظر سے اتنی کارآمد ثابت ہوئی کہ مدتوں یورپی اقوام بھی اس پر عمل کرتی رہیں۔

حمص کی نیابت سے فارغ ہو کر حضرت عُبادہ رضی اللہ عنہ نے فلسطین میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ فلسطین کا علاقہ اس زمانے میں شام ہی میں داخل تھا اسی لیے بعض نے ان کا مستقر شام لکھا ہے۔ شام میں وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ اخیر دم تک بڑے جوش اور ولولے کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ اس معاملے میں وہ حق کی شمشیرِ برہنہ تھے اور مصلحت کیشی ان کو چھو کر بھی نہیں گئی تھی۔ شام میں انھوں نے دیکھا کہ لوگ خرید و فروخت اور لین دین میں شرعی احکام اور حدود کی پابندی نہیں کرتے۔ اس پر برافروختہ ہو گئے اور ایک اجتماعِ عام میں پُر زور خطبہ دیا جس نے لوگوں میں ہیجان برپا کر دیا۔ مسندِ احمد حنبل میں ہے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے فرمایا: ”آپ نے بیع و شریٰ کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کی جو حدیث بیان کی ہے، حضور ﷺ نے یہ تو نہیں فرمایا تھا۔“...... اس پر حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کو غصہ آ گیا کیونکہ وہ ہر لحاظ سے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر فضیلت رکھتے تھے، بڑے جوش سے فرمایا۔ ”مجھے معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہنے کی مطلق پروا نہیں، میں گواہی دیتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہی فرمایا تھا جو میں نے آپ لوگوں کے سامنے بیان کیا۔“

اسی قسم کے کچھ اور واقعات حضرت عُبادہ رضی اللہ عنہ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان اختلاف کا باعث بن گئے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے تو اپنے عہدِ خلافت میں اس اختلاف کو بڑھنے نہ دیا اور دونوں بزرگوں کا دائرہ کار الگ الگ مقرر کر دیا، لیکن حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں جب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پورے شام کے بااقتدار گورنر بنے تو انہوں نے دربارِ خلافت میں شکایت لکھ بھیجی کہ عُبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے خطبات و مواعظ سے لوگوں میں شورش پھیلتی ہے، انہیں شام سے بُلا لیجیے یا میں شام کی حکومت سے دست بردار ہو جاؤں گا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عُبادہ رضی اللہ عنہ کو شام سے بُلا

بھیجا۔ وہ دربارِ خلافت میں پہنچے تو وہاں بہت بڑا مجمع تھا جا کر چپکے سے ایک گوشہ میں بیٹھ گئے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اتفاقاً نظر اوپر اٹھائی تو حضرت عُبادہ رضی اللہ عنہ کو سامنے موجود پایا، ان سے پوچھا، ''فرمایئے تو یہ کیا معاملہ ہے......؟'' امیر المومنین کا ارشاد سُن کر حضرت عُبادہ رضی اللہ عنہ کے جذبہ حق گوئی کو مہمیز لگی، اٹھ کھڑے ہوئے اور مجمع سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''لوگو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میرے بعد امراء معروف کو منکر سے اور منکر کو معروف سے بدل دیں گے۔ ناجائز امور جائز سمجھے جانے لگیں گے۔ لیکن معصیت کے کاموں میں کسی کی اطاعت جائز نہیں تم لوگ ہرگز بدی سے اپنے آپ کو آلودہ نہ کرنا۔''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ وہیں بیٹھے تھے۔ انہوں نے کچھ دخل دیا تو فرمایا کہ:

''تم اس وقت موجود نہیں تھے جب ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان شرائط پر بیعت کی تھی کہ چستی اور کاہلی ہر حالت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کریں گے، آسودہ حال ہوں یا تنگ دست ہر صورت میں اپنے مال سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کریں گے۔ لوگوں کو اچھی باتیں پہنچاتے رہیں گے اور بُری باتوں سے روکتے رہیں گے۔ حق گوئی اور راست مقالی میں کسی سے خم نہیں کھائیں گے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم یثرب تشریف لائیں تو آپ کی نگہبانی اور حفاظت اس طرح کریں گے جس طرح اپنی جان و مال اور اولاد کی کرتے ہیں۔ ان سب شرائط کو پورا کرنے کے صلہ میں جنت ملے گی۔ پس اس بیعت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کیے گئے وعدوں کی پابندی کرنا ہم پر لازم ہے اور جو نہیں کرتا وہ خود اپنا ذمہ دار ہے۔'' (مسندِ احمد حنبل)

(٦)

حضرت عُبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ اپنی ولولہ انگیز زندگی کی ۷۲ منزلیں طے کر چکے تو سخت علیل ہو گئے۔ لوگوں کو علم ہوا تو وہ عیادت کے لیے ٹوٹ پڑے۔ ان میں بڑے

بڑے صحابہ اور تابعین بھی شامل تھے۔ بیماری اگرچہ بہت تکلیف دہ تھی اور جانبری کی کوئی اُمید نہ تھی، لیکن ان کی زبان پر ہر وقت شکرِ خدا جاری رہتا تھا، جلیل القدر صحابی حضرت شداد بن اوس انصاری رضی اللہ عنہ کچھ آدمیوں کے ساتھ بیمار پرسی کے لیے آئے تو ان سے فرمایا، اللہ کے فضل سے اچھا ہوں۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ اور ابنِ عساکر نے عبادہ بن محمد رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ جب حضرت عُبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی وفات کا وقت قریب آیا تو انہوں نے فرمایا کہ میرے غلاموں، خادموں، پڑوسیوں اور ان لوگوں کو جو اکثر میرے پاس آیا کرتے تھے، بلا لاؤ۔ ان سب کو حضرت عُبادہ رضی اللہ عنہ کے پاس لایا گیا تو ان سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ شاید میرا یہ آخری دن ہو اور آج کی رات میری آخرت کی پہلی رات ہو، تم لوگوں کے ساتھ میرے ہاتھوں یا میری زبان سے کبھی کوئی زیادتی ہوئی ہو تو ایک ایک آئے اور مجھ سے بدلہ لے لے قبل اس کے کہ میری جان نکلے اور قیامت کے دن اللہ مجھ سے بدلہ لے۔ لوگوں نے عرض کیا کہ آپ تو ہمارے لیے بمنزلہ والد تھے اور ہم کو ادب سکھانے والے تھے۔ حضرت عُبادہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا، تم لوگوں نے مجھ کو معاف کر دیا، سب نے کہا، ہاں حضرت عُبادہ رضی اللہ عنہ نے کہا، اے میرے اللہ گواہ رہیو۔ پھر فرمایا کہ اگر کوئی بدلہ نہیں لیتا اور سب نے معاف کر دیا تو میری وصیت پر عمل کرنا کہ مجھ پر رونا نہیں بلکہ جب میں مر جاؤں تو تم سب اچھی طرح وضو کر کے مسجد جانا اور نماز پڑھ کر میرے لیے مغفرت کی دعا کرنا۔ مجھ کو میری قبر کی طرف جلدی لے چلنا، میرے پیچھے آگ نہ لے جانا اور نہ میرے نیچے ارغوانی رنگ کا کپڑا رکھنا۔ (اس زمانہ کے جاہلوں میں میت کے پیچھے آگ لے جانے کا دستور تھا۔)

مُسندِ احمد میں ہے کہ وفات سے پہلے بیٹے نے عرض کی کہ مجھ کو کچھ وصیت کیجیے۔ فرمایا، مجھے اٹھا کر بٹھاؤ۔ بیٹھ گئے تو فرمایا: "تقدیر پر یقین رکھنا ورنہ ایمان کی خیر نہیں۔"

اسی حالت میں ان کے شاگردِ رشید، مشہور تابعی حضرت ابو عبداللہ عبدالرحمان بن عسیلہ الصنابحی بھی حاضرِ خدمت ہوئے۔ شفیق استاد کو جان کنی کے عالم میں دیکھا تو فرطِ غم

سے رونے لگے۔ حضرت عُبادہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں راضی برضا ہوں تم روؤ نہیں، انشاء اللہ شفاعت کی ضرورت ہوگی تو شفاعت کروں گا، شہادت کی ضرورت ہوگی تو شہادت دوں گا۔ غرض جہاں تک ہوسکا تمہیں نفع پہنچاؤں گا۔ اس کے بعد فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ سے جو کچھ سنا تھا تم لوگوں تک پہنچا دیا۔ البتہ ایک حدیث باقی تھی اس کو اب بیان کر دیتا ہوں۔ حدیث بیان کر چکے تو آخری ہچکی لی اور یوں یہ آفتابِ رشد و ہدایت ۳۴ھ ہجری میں اللہ تعالیٰ کی شفقِ رحمت میں غروب ہوگیا۔ یہ واقعہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت کا ہے۔

مدفن کے بارے میں اختلاف ہے، بعض نے بیت المقدس اور بعض نے رملہ لکھا ہے۔ حضرت عُبادہ رضی اللہ عنہ نے اپنے پیچھے تین لڑکے چھوڑے، ان کے نام ولید، عبداللہ اور داؤد تھے۔

(۷)

سیّدنا حضرت عُبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سیّد الانام ﷺ کے ایک مخلص ترین شیدائی اور راہِ حق کے ایک سرفروش مجاہد ہی نہ تھے بلکہ علم و فضل کے اعتبار سے بھی ان کا مرتبہ اتنا بلند تھا کہ اساطینِ اُمت میں شمار ہوتے ہیں اور فقہاء صحابہ میں خاص مقام رکھتے ہیں۔ وہ اُن پانچ انصاری صحابہ میں سے ایک ہیں جنھوں نے حضور رسالت مآب ﷺ کے سامنے ہی پورا قرآن مجید حفظ کر لیا تھا اور خود ذاتِ رسالت مآب ﷺ سے ایسے ذوق و شوق سے دینی تعلیم حاصل کی تھی کہ حدیث اور فقہ میں بھی درجہ کمال پر پہنچ گئے تھے۔ اسی بناء پر ان کو یہ شرفِ وحید حاصل ہوا کہ دنیائے اسلام کی سب سے مقدس اور سب سے پہلی درسگاہ، جو حضور ﷺ نے اصحابِ صُفّہ کے لیے قائم فرمائی، اس کے مہتمم اور معلّم مقرر ہوئے۔ اہلِ صُفّہ جو بڑے بلند مرتبہ صحابہ تھے ان سے تعلیم پاتے تھے اور قرات و کتابت سیکھتے تھے۔ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ، امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ اور طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عُبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی مصروفیت زیادہ تھی، اس لیے

جب آپ ﷺ کے پاس کوئی آدمی ہجرت کر کے آتا اور آپ ﷺ اسے ہم میں سے کسی کے سپرد کر دیتے جو اسے قرآن سکھاتا، چنانچہ آپ ﷺ نے ایک آدمی مجھے دیا جو میرے گھر میں ہی رہتا تھا۔ میں اسے قرآن پڑھاتا اور شام کو کھانا بھی کھلاتا، وہ جانے لگا تو اس نے خیال کیا کہ میرا اس پر کچھ حق ہے۔ اس نے ایک کمان بطور ہدیہ دی۔ میں نے اس سے عمدہ کمان لکڑی کے اعتبار سے اور مڑنے میں کبھی نہیں دیکھی تھی۔ میں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور یہ واقعہ عرض کیا: "آپ ﷺ نے فرمایا کہ تیرے دونوں بازوؤں کے درمیان آگ کی چنگاری ہے۔ اگر تو نے اس کو گردن میں ڈالا۔"

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عُبادہ رضی اللہ عنہ لوگوں کو نہ صرف بلامزد تعلیم دیتے تھے بلکہ اپنے پاس سے ان کو کھانا بھی کھلایا کرتے تھے۔

حافظ ابنِ حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے "اِصابہ" میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ "یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ اہلِ شام کو ایسے شخص کی ضرورت ہے جو ان کو قرآن کی تعلیم دے اور فقہی احکام بتلائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عُبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ، مُعاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کو شام کی طرف روانہ کیا۔ عُبادہ رضی اللہ عنہ نے فلسطین میں قیام کیا۔" گویا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے نزدیک قرآن وفقہ میں حضرت عُبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی علمی قابلیت مسلّم تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ ان کی شجاعت اور جوانمردی کے بھی معترف اور مداح تھے، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے مصر سے کمک مانگی تو امدادی فوج پر جن چار آدمیوں کو افسر بنایا، ان میں ایک حضرت عُبادہ رضی اللہ عنہ تھے...... امیر المومنین نے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ یہ ایک ہزار آدمیوں کے برابر ہیں۔

حضرت عُبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے ۱۸۱ احادیث مروی ہیں، ان کے راویوں میں بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ اور تابعین شامل ہیں۔ لوگوں کے سامنے حدیث بیان کرتے تو اس بات پر خاص طور پر زور دیتے کہ یہ کسی دوسرے کے واسطے سے مجھ تک

نہیں پہنچی بلکہ اسے میں نے خود رسول اللہ ﷺ کے دہنِ مبارک سے سنا ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں ہر وقت سرگرم رہتے تھے۔ گھر پر ہوں یا گھر سے باہر، مسجد میں ہوں یا کسی مجلس میں ہر جگہ بڑے لطف وانبساط کے ساتھ حضور ﷺ کے ارشادات لوگوں کو پہنچاتے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ گرجے میں جا کر عیسائیوں کے سامنے بھی ارشادات نبوی کو دہرایا کرتے تھے۔ تفقہ فی الدین میں بھی اپنی نظیر آپ تھے۔ لوگ ان کے پاس بڑے بڑے پیچیدہ مسائل لے کر آتے اور وہ ان کو آنِ واحد میں حل کر دیتے۔ مشہور تابعی حضرت جنادہ رحمۃ اللہ علیہ بن ابی امیہ کا قول ہے کہ حضرت عُبادہ رضی اللہ عنہ دینِ حق میں فقیہ ہیں۔ حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ''اصابہ'' میں ابنِ حزم کا یہ قول نقل کیا ہے کہ حضرت عُبادہ بن صامت کے فتاویٰ سے ایک جزو کا رسالہ مرتب کیا جا سکتا ہے۔ غرض سبقت فی الاسلام، اخلاص فی الدین، جوشِ ایمان، حُبِّ رسول ﷺ، شوقِ جہاد، حق گوئی و بے باکی، وعظ و ہدایت اور علم و فضل جس پہلو سے بھی حضرت عُبادہ رضی اللہ عنہ کی زندگی پر نظر ڈالیں وہ مطلعِ انوار نظر آتی ہے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ
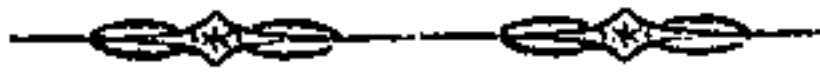
حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہما

(۱)

غزوۂ اُحد (شوال ۳ ہجری) کے چند دن بعد کا ذکر ہے کہ رحمتِ عالم ﷺ نے ایک روز اپنے ایک مدنی جاں نثار سے فرمایا کہ آج میں تمہارے گھر آؤں گا۔ یہ صاحبِ رسول حضور ﷺ کا ارشاد سن کر اس قدر خوش ہوئے کہ قدم زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ دوڑتے دوڑتے گھر گئے اور نہایت اہتمام سے حضور ﷺ کی دعوت کا سامان کیا پھر اپنی اہلیہ سے کہا:

"دیکھو رسول اللہ ﷺ ہمارے غریب خانہ پر تشریف لا رہے ہیں، تم اپنے کام سے کام رکھنا اور بات چیت کر کے حضور ﷺ کو تکلیف نہ دینا۔"

تھوڑی دیر بعد سرورِ عالم ﷺ نے نزولِ اجلال فرمایا تو صاحبِ خانہ اور ان کی اہلیہ خورشیدِ رسالت ﷺ کو اپنے گھر میں جلوہ بار دیکھ کر فرطِ مسرت سے بے خود ہو گئے اور حضور ﷺ کے سامنے دیدہ و دل فرشِ راہ کر دیئے۔ بستر پہلے ہی بچھا رکھا تھا اور اس پر تکیہ بھی لگا دیا تھا۔ حضور ﷺ سے درخواست کی کہ یارسول اللہ کچھ دیر آرام فرمایئے۔ آپ ﷺ مصروفِ خوابِ استراحت ہوئے تو اُن صاحب نے اپنے غلام سے فرمایا کہ جلدی سے بکری کے اس بچے کو ذبح کر کے پکالو۔ ایسا نہ ہو کہ آپ ﷺ جاگتے ہی منہ ہاتھ دھو کر روانہ ہو جائیں۔

حضور ﷺ بیدار ہو کر منہ ہاتھ دھونے سے فارغ ہوئے تو ان صاحب نے فوراً آپ ﷺ کے سامنے دسترخوان بچھا دیا اور والہانہ ذوق و شوق کے ساتھ اپنے آقا و مولا ﷺ کی خدمتِ اقدس میں گوشت، خرما اور پانی پیش کیا۔ حضور ﷺ بہت مسرور

ہوئے اور صاحبِ خانہ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''شاید تم کو علم ہے کہ میں گوشت رغبت سے کھاتا ہوں۔''

انہوں نے عرض کیا: ''ہاں یا رسول اللہ ﷺ''

صاحبِ خانہ کے اہلِ قبیلہ کو معلوم ہوا کہ ان کے محلے کے ایک گھر کو سرورِ کائنات فخرِ موجودات ﷺ نے اپنے قدومِ میمنت لزوم سے مشرف فرمایا ہے تو وہ آپ ﷺ کی زیارت کے لیے اُمڈ پڑے۔ لیکن اس خیال سے کہ قریب جانے سے حضور ﷺ ناگواری محسوس نہ فرمائیں، دُور ہی دُور سے آپ ﷺ کے دیدار سے مشرف ہو کر واپس چلے جاتے تھے۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد حضور ﷺ چلنے لگے تو صاحبِ خانہ کی اہلیہ نے اندر سے پکار کر کہا:

''یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان ہوں، میرے شوہر اور مجھ پر درود پڑھیے۔''

سرورِ عالم ﷺ نے بلا تامّل صاحبِ خانہ اور ان کی اہلیہ پر درود پڑھا، ''اللہ تم پر اور تمہارے شوہر پر رحمت نازل فرمائے۔'' اور پھر خوش خوش تشریف لے گئے۔

مدینہ منورہ کے یہ خوش بخت صاحبِ رسول ﷺ جن پر خود صاحبِ قابَ قوسین رحمتِ دوجہاں ساقی کوثر ﷺ نے درود بھیجا، حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہما تھے اور اس سعادت میں شریک ان کی اہلیہ حضرت سہیلہ بنتِ مسعود رضی اللہ عنہا تھیں۔

(۲)

سیّدنا حضرت ابوعبداللہ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کا شمار نہایت عظیم المرتبت صحابہ رضی اللہ عنہم میں ہوتا ہے۔ ان کا تعلق خزرج کی شاخ بنو سلمہ سے تھا۔ سلسلہ نسب یہ ہے:

جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بن عمرو بن حرام بن کعب بن غنم بن سلمہ۔

بنو سلمہ کی آبادی حرہ اور مسجد قبلتین تک پھیلی ہوئی تھی لیکن خاص حضرت جابر بن

عبداللہ رضی اللہ عنہما کا خاندان قبرستان اور ایک چھوٹی مسجد کے درمیان آباد تھا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے دادا عمرو بن حرام اور والد عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ اپنے قبیلہ کے روساء میں سے تھے۔ ایک چشمہ عین الارزق اور کئی قلعے ان کے تصرّف میں تھے تاہم حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے والد اکثر مقروض رہتے تھے کیونکہ وہ بڑے کثیر العیال اور فیاض تھے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ ہجرتِ نبوی سے تقریباً انیس سال قبل پیدا ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں فطرتِ سلیم سے نوازا تھا۔ اکثر اربابِ سِیَر کا بیان ہے کہ وہ بیعت عقبہ کبیرہ (۱۳ بعدِ بعثت) کے موقع پر اپنے والد کے ساتھ شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہوئے۔ اس وقت ان کا عمر انیس برس کی تھی لیکن ایک روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے والد حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عمرو سے پہلے ہی سعادت اندوزِ اسلام ہو چکے تھے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے خود حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ ''بیعت عقبہ کبیرہ سے پہلے انصار کے محلوں میں کوئی ایسا نہ تھا جس میں مسلمانوں کی ایک جماعت نہ پائی جاتی ہو۔ ایک روز ہم سب جمع ہوئے اور طے کیا کہ ہم رسول اللہ ﷺ کو کب تک مکہ میں بے یار و مددگار چھوڑے رکھیں گے۔ اس کے بعد ہم حج کے موقعہ پر مکہ گئے اور حضور ﷺ سے عقبہ میں ملے۔''

بیعت عقبہ کبیرہ تاریخ اسلام کا ایک مہتم بالشان واقعہ ہے اور اس میں شریک ہونے والے اصحاب کا ایک خاص مقام اور مرتبہ ہے۔ یہ وہ نفوسِ قدسی تھے جنھوں نے سارے عرب کی مخالفت کے علی الرغم اس پیمانِ وفا کے ساتھ مکہ کے دُرِ یتیم ﷺ کو یثرب آنے کی دعوت دی کہ ہم اپنی جانوں اولادوں اور مالوں کے ساتھ آپ ﷺ کی حفاظت اور اعانت کریں گے۔ اسی بیعت کا نتیجہ تھا کہ چند ماہ بعد رحمتِ عالم ﷺ نے اپنا وطن اور گھر بار چھوڑ کر یثرب میں نزولِ اجلال فرمایا اور کفر و شرک کا یہ قدیم گہوارہ ''مدینۃ النبی ﷺ'' بن کر انوارِ رسالت سے جگمگانے لگا۔ گویا بیعت عقبہ کبیرہ کے شرکاء نے تاریخ کے دھارے کا رُخ موڑ ڈالا اور اپنے دامن میں ایسی سعادتیں سمیٹ لیں جن

میں کوئی دوسرا ان کا شریک و سہیم نہیں ہے۔

(۳)

رمضان المبارک ۲ھ ہجری میں حق اور باطل کے درمیان میدانِ بدر میں پہلا معرکہ پیش آیا تو حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے بھی میدانِ جنگ کا عزم کیا لیکن والد حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عمرو نے انھیں یہ کہہ کر روک دیا کہ تم گھر پر رہ کر اپنی خُردسال بہنوں کی خبر گیری کرو۔ چونکہ نو یا دس بہنوں کے اکلوتے بھائی تھے اس لیے والد کے حکم کی تعمیل کی۔ خود حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا اور میدانِ بدر میں دادِ شجاعت دی۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے اگرچہ خاص لڑائی میں شرکت نہیں کی۔ لیکن وہ بدر پہنچ گئے تھے اور مسلمانوں کو پانی پلاتے تھے۔ اگلے سال قریش نے بدر کی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لیے بڑے زور شور سے مدینہ منوّرہ پر چڑھائی کی اور اُحد کا معرکہ پیش آیا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ غزوہ سے ایک شب پہلے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو بُلایا اور کہا:

> ”بیٹے میرا دل کہہ رہا ہے کہ اس لڑائی میں مجھے سب سے پہلے شہادت نصیب ہوگی۔ مجھے اپنی جان مال اور اولاد ہر شے سے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ محبوب ہیں، آپ ﷺ کے بعد تم سب سے بڑھ کر محبوب ہو، تم کو وصیت کرتا ہوں کہ گھر پر رہ کر اپنی بہنوں کی اچھی طرح خبر گیری کرنا اور مجھ پر جو قرض ہے اس کو ادا کر دینا۔“

حضرت جابر رضی اللہ عنہ لڑائی میں شامل ہونے کے لیے بے تاب تھے لیکن والد کے حکم سے مجبور ہو گئے کیونکہ بہنوں میں سے چھ بہت چھوٹی تھیں اور اگر وہ بھی لڑائی میں شامل ہو جاتے تو گھر بالکل خالی ہو جاتا۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے میدان اُحد میں مردانہ وار لڑتے ہوئے شہادت پائی، اور یوں ان کی دلی تمنا پوری ہوگئی۔ شقی القلب مشرکین نے ان کی لاش کا مُثلہ کر ڈالا

(کان، ناک اور ہونٹ کاٹ ڈالے) لڑائی ختم ہوئی تو مسلمانوں نے نعش پر کپڑا ڈال دیا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو والد کی شہادت کی خبر ملی تو وہ میدانِ اُحد میں پہنچ گئے۔ والد کی لاش کے منہ سے کپڑا ہٹایا تو اس کی حالت دیکھ کر بے اختیار رونے لگے، اتنے میں ان کی پھوپھی حضرت ہند رضی اللہ عنہا بنتِ عمرو بن حرام بھی آ پہنچیں، بھائی کی لاش کو اس حالت میں دیکھ کر ان کے منہ سے بھی بے اختیار چیخ نکل گئی۔ اس موقع پر رحمتِ عالم ﷺ نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"تم روؤ یا نہ روؤ فرشتے اپنے پروں سے عبداللہ پر سایہ کیے ہوئے ہیں۔"

مسندِ احمد بن حنبل میں ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی بہنوں نے مدینہ سے ایک اونٹ بھیجا کہ والد کی لاش کو اس پر لاد کر مدینہ لائیں اور بنوسلمہ کے خاندانی قبرستان میں دفن کریں۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے ایسا ہی کرنا چاہا لیکن حضور ﷺ نے اجازت نہ دی اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو ان کے بہنوئی حضرت عمرو بن الجموع رضی اللہ عنہ کے ساتھ اُحد کے گنجِ شہیداں میں ایک ہی قبر میں دفن کیا۔

جامع ترمذی میں ہے کہ غزوۂ اُحد کے بعد حضرت جابر رضی اللہ عنہ سخت غمزدہ اور دلگیر تھے۔ حضور ﷺ نے انھیں اس حالت میں دیکھ کر پوچھا، جابر تم اتنے غمگین کیوں ہو؟ عرض کیا، یارسول اللہ باپ شہید ہو گئے اور بہت سا قرض اور بچے چھوڑ گئے۔ انہی کے فکر میں مبتلا ہوں۔

حضور ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے تیرے باپ کی شہادت کے بعد ان سے بلا واسطہ اور بے حجاب گفتگو فرمائی حالانکہ اللہ تعالیٰ کسی سے بے پرواہ کلام نہیں کرتا۔ اس نے تیرے باپ کو اپنے سامنے بُلا کر فرمایا، اے میرے بندے! جو تمنا ہو، بیان کر۔ انہوں نے عرض کیا، اے پروردگار مجھے پھر دنیا میں بھیج دے تا کہ میں پھر تیرے دشمنوں سے کر لڑوں اور شہادت پاؤں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ میرا قطعی فیصلہ ہے کہ جو دنیا سے آئے گا وہ

واپس نہیں بھیجا جائے گا...... عبداللہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ الٰہی میرے حال کی خبر میرے پسماندوں کو پہنچا دے۔ اس پر یہ ارشادِ خداوندی نازل ہوا کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ان کو مردہ نہ سمجھ بلکہ وہ زندہ ہیں۔''

رحمتِ عالم ﷺ کا ارشاد سن کر حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو یوں محسوس ہوا کہ ان کے زخم پر تسکین بخش مرہم کا پھاہا رکھ دیا گیا ہے۔ اس واقعہ کے چند دن بعد حضور ﷺ صبح کے وقت حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے ایک باغ میں تشریف لے گئے اور ان کے دو باغوں سے جو کھجور حاصل ہوئی تھی اس کے ڈھیر پر بیٹھ گئے۔ اس سے پہلے حضور ﷺ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے یہودی قرض خواہوں کو کچھ رعایت کرنے یا قرض دو قسطوں میں وصول کرنے کی ترغیب دے چکے تھے لیکن انھوں نے صاف انکار کر دیا تھا۔ اب حضور ﷺ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ تم کھجوریں تقسیم کرنی شروع کرو۔ انہوں نے کھجوریں بانٹنی شروع کیں اور حضور ﷺ دعا میں مشغول ہو گئے۔ خدا کی قدرت، کھجوروں میں اتنی برکت ہوئی کہ تمام قرض ادا ہونے کے بعد بھی کثیر مقدار میں بچ گئیں۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ قرض کے بوجھ سے آزاد ہو کر بہت خوش ہوئے۔ حضور ﷺ نے بھی خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے آپ ﷺ کے ایک مخلص جاں نثار کو ہر وقت کی فکر سے نجات دی۔ صحیح بخاری اور مسند احمد حنبل میں اس واقعہ کو حضور ﷺ کے معجزات میں شمار کیا گیا ہے۔

کھجوروں کی تقسیم کے بعد حضرت جابر رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کو اپنے مکان پر لے گئے اور آپ ﷺ کے سامنے گوشت، خرما اور پانی پیش کیا۔ اسی موقع پر حضور ﷺ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ اور ان کی اہلیہ پر درود پڑھا۔ اس واقعہ کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔

(۴)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بدر اور اُحد کے غزووں میں پدرِ گرامی کی ممانعت کی بناء پر شریک نہ ہو سکے تھے ان کے بعد انہوں نے عہدِ رسالت کے تمام غزوات اور کئی سرایا میں والہانہ جوش و خروش کے ساتھ شرکت کی۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے بیان کے

مطابق انہوں نے ۱۹ غزوات میں سرورِ عالم ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔ اربابِ سیر و مغازی نے بعض غزوات کے سلسلے میں ان کا ذکر خصوصیت سے کیا ہے اور کوئی نہ کوئی خاص واقعہ ان سے منسوب کیا ہے کہ ان کی زبانی بیان کیا ہے۔ ان میں سے کچھ منتخب واقعات یہ ہیں۔

۵ ہجری میں غزوۂ احزاب مسلمانوں کے لیے سخت آزمائش کی حیثیت رکھتا تھا۔ عرب کے تمام دشمنانِ حق ایکا کر کے مدینہ منورّہ پر چڑھ آئے تھے اور مسلمانوں کو اپنی حفاظت کے لیے سخت پتھریلی زمین میں خندق کھودنی پڑی تھی۔ پھر خوراک کی اتنی شدید قلت تھی کہ مسلمانوں کو پیٹ پر پتھر باندھنے پڑے تھے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ بھی دوسرے مسلمانوں کے ساتھ خندق کھودنے میں شریک تھے۔ صحیح مسلم اور بعض دوسری کتبِ حدیث میں ان سے روایت ہے کہ ہم لوگ خندق کھود رہے تھے کہ ایک سخت چٹان سامنے آ گئی۔ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ خندق میں ایک بڑا سخت پتھر سامنے آ گیا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا، میں خندق میں اترتا ہوں چنانچہ آپ ﷺ کدال لے کر کھڑے ہوئے اس وقت آپ ﷺ کے شکمِ مبارک پر (بھوک کی شدّت کی وجہ سے) ایک پتھر بندھا ہوا تھا۔ ہم لوگ تین دن سے خندق کھود رہے تھے اور کوئی چیز ہمارے منہ میں نہیں گئی تھی۔ حضور ﷺ نے کدال سے چٹان پر ضرب لگائی تو وہ ریزہ ریزہ ہو گئی، میں نے حضور ﷺ سے گھر جانے کی اجازت چاہی۔ آپ ﷺ نے اجازت دے دی۔ میں نے گھر جا کر اپنی اہلیہ سے کہا کہ آج میں نے حضور ﷺ کو ایسی حالت میں دیکھا ہے کہ مجھ میں تابِ صبر نہیں رہی، کیا گھر میں کچھ کھانے کو ہے؟ اس نے کہا کہ تھوڑے سے جَو اور بکری کا ایک بچہ موجود ہے۔ میں نے بکری کا بچہ ذبح کیا اور اس کا گوشت ہانڈی میں ڈال کر پکنے کے لیے رکھ دیا۔ بیوی نے جَو پیسے اور آٹا گوندھا۔ پھر میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ میرے ہاں تشریف لا کر ماحضر تناول فرمایئے۔ آپ ﷺ نے دعوت قبول فرمالی اور مہاجرین و

انصار کو آواز دی کہ اے اہلِ خندق آج جابر نے تمہیں کا کھانے کی دعوت دی ہے پس تم لوگ جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ساتھ ہی آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ اپنی بیوی سے کہہ دو کہ جب تک میں نہ آ جاؤں ہانڈی چولہے سے نہ اتارے اور نہ روٹی تنور سے نکالے...... میں سخت پریشان ہوا اور اپنے جی میں کہا کہ حضور ﷺ ایک جمِ غفیر کو ایک صاع جَو اور بکری کے ایک بچے پر لا رہے ہیں۔ میں نے گھر جا کر اپنی بیوی سے کہا کہ آج تو نے مجھے رُسوا کر دیا۔ حضور ﷺ سارے اہلِ خندق کو ساتھ لے کر کھانے کے لیے تشریف لا رہے ہیں، بیوی نے پوچھا کیا رسول اللہ ﷺ نے تم سے کچھ پوچھا تھا۔ میں نے کہا، ہاں آپ ﷺ نے دریافت فرمایا تھا کہ تمہارے پاس کتنا کھانا ہے۔ بیوی نے کہا، اللہ اور اللہ کا رسول ﷺ زیادہ جانتے ہیں۔ پھر حضور ﷺ صحابہ سمیت تشریف لائے۔ آپ ﷺ روٹی توڑ کر ثرید بناتے، چمچے سے گوشت ڈالتے اور گوشت سے روٹیوں کو ڈھک دیتے، آپ ﷺ برابر اسی طرح کرتے رہے اور لوگوں کے سامنے پیش کرتے رہے یہاں تک کہ سب سیر ہو گئے اور آپ ﷺ بھی لیکن کھانا پھر بھی بچ رہا اب آپ ﷺ نے میری بیوی سے فرمایا کہ تو بھی کھا اور لوگوں کو بھی بھیج کیونکہ لوگ بھوک میں مبتلا ہیں۔"

صحیح بخاری کی روایت کے مطابق جن لوگوں نے اس موقع پر کھانا کھایا ان کی تعداد ایک ہزار تھی۔ بعض دوسری روایتوں میں یہ تعداد تین سو اور آٹھ سو بھی آئی ہے۔ یہ واقعہ بھی حضور ﷺ کے مشہور معجزات میں شمار کیا جاتا ہے۔

غزوۂ احزاب کے بعد حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو غزوۂ بنو مُصطلق میں حضور ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل ہوا۔ روانگی سے پہلے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کسی کام کے لیے گئے ہوئے تھے جب تک واپس نہ آ گئے حضور ﷺ نے کوچ کا حکم نہیں دیا۔

اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرورِ عالم ﷺ کو حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا کس قدر پاسِ خاطر تھا۔

غزوۂ بن ومُصطلِق کے بعد حضرت جابر رضی اللہ عنہ غزوۂ انمار میں شریک ہوئے۔ صحیح بخاری میں ان سے روایت ہے کہ میں نے جنگِ انمار کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کو سواری پر تشریف رکھے ہوئے قبلہ رو نماز ادا فرماتے دیکھا۔

غزوۂ انمار کے بعد بیعتِ رضوان (۶ ھ) کا عظیم الشان واقعہ پیش آیا۔ اس بیعت کی سعادت حاصل کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے کھلے لفظوں میں اپنی خوشنودی اور جنت کی بشارت دی۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ بھی ان خوش بخت اصحاب میں شامل تھے۔ مُسندِ احمد میں ہے کہ بیعتِ رضوان کے وقت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ رسول اکرم ﷺ کا اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا دستِ مبارک پکڑے ہوئے تھے۔ صحیح بخاری کی ایک روایت کے مطابق اس موقع پر حضور ﷺ نے وہاں پر موجود صحابہ رضی اللہ عنہم سے مخاطب ہو کر فرمایا: ”تم لوگ ساری دنیا سے بہتر ہو۔“

بیعتِ رضوان کی سعادت حاصل کرنے کے بعد حضرت جابر رضی اللہ عنہ غزوۂ خیبر اور پھر غزوۂ ذات الرقاع میں شریک ہوئے۔ غزوۂ ذات الرقاع سے واپسی کے وقت حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا اونٹ یکا یک رک گیا۔ حضور ﷺ نے دیکھا تو فرمایا، اسے کیا ہوا۔ انہوں نے عرض کیا: ”یا رسول اللہ ﷺ معلوم نہیں کیوں اَڑ گیا ہے کسی طرح چلنے کا نام ہی نہیں لیتا۔“

حضور ﷺ نے اونٹ کو ایک کوڑا مارا اور دعا کی۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ تیزی سے دوڑنے لگا۔ حضور ﷺ نے فرمایا اس کو میرے ہاتھ فروخت کر دو۔

انہوں نے عرض کیا: ”میرے ماں باپ آپ پر قربان فروخت نہیں کروں گا بلکہ یہ آپ کی نذر ہے۔“

حضور ﷺ نے فرمایا، نہیں قیمت ضرور دی جائے گی۔

انہوں نے درخواست کی مدینہ تک اسی پر جانے کی اجازت دی جائے۔

حضور ﷺ نے فرمایا، بہتر۔

مدینہ پہنچ کر اونٹ کی مہار پکڑے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کی:

''یارسول اللہ یہ اونٹ قبول فرمایئے۔''

حضور ﷺ اونٹ کے گرداگرد پھرتے تھے اور فرماتے تھے، کیسا اچھا اونٹ ہے، کیسا عمدہ اونٹ ہے۔

پھر حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ جابر رضی اللہ عنہ کو اتنے اوقیہ سونا تول دو۔ انہوں نے سونا تول کر دیا تو حضور ﷺ نے کچھ اور بھی عطا فرمایا پھر ان سے پوچھا: ''تمہیں اونٹ کی قیمت وصول ہو گئی؟'' عرض کیا، ''ہاں، ہاں رسول اللہ'' فرمایا، جاؤ اونٹ بھی لے جاؤ۔ یہ میری طرف سے تمہیں ہدیہ ہے۔''

رجب ۸ ھ میں سرورِ عالم ﷺ نے حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کی قیادت میں ایک مہم ساحلِ بحر کی طرف بھیجی اس کا نام سریہ سیف البحر یا جیش الخبط ہے۔ اس مہم کا مقصد قریش کی نقل و حرکت کا پتہ لینا تھا۔ اس میں تین سو آدمی شامل تھے جن میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ بدقسمتی سے راستے میں رسد ختم ہو گئی اور اہلِ شکر کو چند دنوں تک درختوں کے پتے جھاڑ جھاڑ کر کھانے پڑے۔ اسی اثناء میں سمندر کی موجوں نے ایک بہت بڑی مچھلی کو کنارے پر لا ڈالا۔ اہلِ لشکر نے اس کو انعامِ ربی سمجھا اور پندرہ دن تک اس کا گوشت کھاتے رہے۔ صحیح بخاری میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اس مچھلی کا نام عنبر تھا اور لوگوں نے اس کا گوشت بھی کھایا اور اس کا تیل بھی ملا جس سے جسموں میں فربہی پیدا ہوئی۔ مچھلی اتنی بڑی تھی کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اس کی ایک پسلی کھڑی کی اور لشکر کے سب سے طویل شخص کو اونٹ پر بٹھا کر اس کے نیچے سے گزرنے کے لیے کہا تو وہ گزر گیا۔ مسندِ احمد میں ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ پانچ آدمیوں کے ساتھ اس مچھلی کی آنکھ کی ہڈی کے حلقے میں بیٹھ گئے تو کسی کو پتہ بھی نہ چلا۔

۸ ہجری میں فتح مکہ کے موقع پر حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو اُن دس ہزار قدسیوں میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا جو رحمتِ عالم ﷺ کے ہمرکاب تھے اور جن کے بارے

میں سینکڑوں سال پہلے کتاب استثناء میں یوں پیشگوئی کی گئی تھی۔

''خداوند سینا سے آیا، شعیر سے ان پر آشکار ہوا اور کوہِ فاران سے ان پر جلوہ گر ہوا اور دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا۔ اس کے داہنے ہاتھ میں ان کے لیے آتشیں شریعت تھی۔''

فتح مکہ کے بعد حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے غزوۂ حنین میں دادِ شجاعت دی۔ اگلے سال (۹ ہجری میں) انہوں نے غزوۂ تبوک کے پُر صعوبت سفر میں سرورِ عالم ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔ حجۃ الوداع (۱۰ ہجری) میں بھی وہ حضور ﷺ کے ساتھ تھے۔

(۵)

۱۱ ہجری میں آفتابِ رسالت اللہ تعالیٰ کی شفقِ رحمت میں غروب ہوا تو حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرطِ غم سے نڈھال ہو گئے اور مسجدِ نبوی میں بیٹھ کر ہمہ تن درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ اب ان کے وقت کا بیشتر حصہ لوگوں کو قرآن پڑھانے اور حضور ﷺ کے ارشادات ان تک پہنچانے میں صرف ہوتا تھا۔ دُور دُور سے لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور ان کے دریائے علم سے سیراب ہو کر واپس جاتے تھے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے لسانِ رسالت سے سُن رکھا تھا کہ تعلیم و تعلّم کا درجہ جہاد کے برابر ہے اس لیے ان کو تعلیم و تعلّم اور درس و افتاء میں خاص انہماک تھا۔ سالہا سال تک مسلسل اپنے فیضانِ علم سے مخلوقِ خدا کو بہرہ یاب کرتے رہے۔ حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ کے عہدِ خلافت میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے مخالفانہ طرزِ عمل اختیار کیا تو حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پُر زور حمایت کی۔ ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ انہوں نے حضرتِ علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں شامل ہو کر صفین میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف لڑائی میں بھرپور حصہ لیا اس کے بعد پھر مدینہ منورہ آ کر درس و افتاء میں مشغول ہو گئے۔ سنہ ۳۷ھ کا واقعہ ہے۔ تین سال بعد امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے بسر بن ابی ارطاۃ مدینہ منورہ کا

عامل بن کر آیا تو اس نے اعلان کیا کہ بنو سلمہ کو اس وقت تک امان نہیں مل سکتی جب تک حضرت جابر رضی اللہ عنہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت نہ کرلیں۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے اُمّ المومنین حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا سے مشورہ کیا اور بادلِ ناخواستہ بسر کے پاس جاکر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی حکومت پر بیعت کرلی۔ یزید کے عہدِ حکومت (محرم ۶۱ھ) میں کربلا کا واقعہ ہائلہ پیش آیا تو حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو بے حد صدمہ پہنچا۔ جب انہوں نے سنا کہ یزید نے شہیدانِ کربلا کے پسماندگان کو حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی نگرانی میں دمشق سے مدینہ منوّرہ روانہ کیا ہے تو پیرانہ سالی کے عالم میں بنو ہاشم کے کچھ لوگوں کے ساتھ کربلا پہنچے تاکہ غمزدہ قافلے کو اپنے ساتھ مدینہ منوّرہ لائیں۔ خاندانِ رسالت کا مصیبت زدہ قافلہ جب دمشق سے کربلا پہنچا تو حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے آنسوؤں اور آہوں کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ حضرت زینب بنتِ علی رضی اللہ عنہا نے بنو ہاشم کے لوگوں اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا:۔

> ''اے بنی ہاشم تمہارا چاند غروب ہو گیا،
>
> اے میرے نانا ﷺ کے صحابی تو نے جس بچے (حضرت حسین رضی اللہ عنہ) کو کبھی اپنے آقا ﷺ کے دوشِ مبارک میں سوار کیا تھا، اس کا جسمِ اطہر گھوڑوں کے سُموں سے پامال ہو گیا۔''

حضرت جابر رضی اللہ عنہ اور اس موقع پر موجود دوسرے سب لوگ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی باتیں سن کر بے اختیار رونے لگے۔ اس کے بعد وہ اس مصیبت زدہ قافلے کے ساتھ مدینہ منوّرہ پہنچے اور جہاں تک ممکن ہو سکا خاندانِ رسالت نے مظلوموں کی دلجوئی کرتے رہے۔

۷۴ھ میں حجاج بن یوسف ثقفی مدینہ منوّرہ کا امیر مقرر ہو کر آیا تو اس نے ایسے تمام لوگوں سے باز پرس کی جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پُر جوش حمایت کی تھی ان میں متعدد جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم بھی شامل تھے۔ حجاج نے سرورِ عالم ﷺ کے ان جاں

نثاروں کے احترام کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ان کی گردنوں اور ہاتھوں پر مہریں لگوائیں۔ ابن اثیر رحمۃ اللہ علیہ نے "اُسد الغابہ" میں لکھا ہے کہ حجاج نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر مہر لگوائی۔ اس وقت وہ عمر کی ۹۴ منزلیں طے کر چکے تھے، آنکھیں جواب دے چکی تھیں۔ سخت ضعیف اور ناتواں ہو چکے تھے اور عقبی صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے صرف وہی حیات تھے۔ اس واقعہ کے چند دن بعد پیغامِ اجل آ پہنچا اور عالمِ اسلام کی اس برگزیدہ ہستی نے اس پر لبیک کہا۔ ایک روایت کے مطابق حجاج نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور ایک دوسری روایت کے مطابق حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ابان رضی اللہ عنہ نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور بقیع میں سپردِ خاک کیا۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی میں دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی کا نام سہیلہ بنتِ مسعود رضی اللہ عنہا تھا۔ ان کا تعلق انصار کے قبیلہ ظفر سے تھا۔ حضرت سہیلہ رضی اللہ عنہا کے پہلے خاوند غزوۂ اُحد سے پہلے فوت ہو گئے تھے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے والد حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے غزوۂ اُحد میں شہادت پائی تو اُنہوں نے اپنے پیچھے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے علاوہ نو یا دس خُرد سال بیٹیاں چھوڑیں، غالباً حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی والدہ فوت ہو چکی تھیں اس لیے انہوں نے بہنوں کی نگہداشت اور مناسب غور و پرداخت کے لیے حضرت سہیلہ بنتِ مسعود رضی اللہ عنہا سے نکاح کر لیا۔ حضور ﷺ کو معلوم ہوا تو آپ ﷺ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: "جابر تم نے ایک بیوہ سے نکاح کیا ہے اگر کسی کنواری سے کرتے تو وہ تم سے چُہل کرتی تم اس سے چُہل کرتے۔"

انہوں نے عرض کیا: "یارسول اللہ، بہنیں کم سن تھیں اس لیے کسی ہوشیار عورت کی ضرورت تھی جو ان کے بال سنوارتی، جوئیں نکالتی، کپڑے سی کر پہناتی۔"

حضور ﷺ نے فرمایا: "تم نے ٹھیک کیا۔"

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے دوسرا نکاح اُمِ حارث سے کیا جو جلیل القدر صحابی حضرت محمد بن مسلمہ انصاری رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی تھیں۔

مسندِ احمد حنبل میں ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے نکاح سے پہلے اُمِ حارث کو چھپ کر دیکھ لیا تھا کیونکہ اسلام میں عورت کو دیکھ کر شادی کرنے کی اجازت ہے۔

ان دونوں بیویوں سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے تین لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں۔ عبدالرحمٰن (یا عبداللہ) عقیل، محمد، میمونہ، حمیدہ اور اُمِ حبیب۔

(۶)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا شمار ان فضلائے صحابہ رضی اللہ عنہم میں ہوتا ہے جنہیں علم و فضل کے اعتبار سے اساطینِ اُمت تسلیم کیا جاتا ہے۔ انہوں نے سالہا سال بارگاہِ رسالت میں حاضر رہ کر بڑے ذوق و شوق سے دین کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ، حضرت اُمِ شریک رضی اللہ عنہا، حضرت اُمِ مالک رضی اللہ عنہا اور متعدد دوسرے جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم و صحابیات رضی اللہ عنہن سے استفادہ کیا تھا۔ اس طرح وہ علوم و معارف کا بحرِ زخار بن گئے تھے۔ قرآن حدیث اور فقہ سے خاص شغف تھا۔ اربابِ سِیَر کا بیان ہے کہ صرف اہلِ مدینہ ہی نہیں بلکہ اس آفتابِ علم کے پرتو سے مکہ معظمہ، یمن، عراق اور مصر تک کے لوگ مستفید ہوئے۔ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ایک تھے جو مدینہ منوّرہ میں فتویٰ دیا کرتے تھے اور ان کے فتووں پر پورا اعتماد کیا جاتا تھا۔

روایتِ حدیث کے اعتبار سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ صحابہ رضی اللہ عنہم کرام کے طبقہ اوّل میں شمار ہوتے ہیں۔ ان سے ایک ہزار پانچ سو چالیس احادیث مروی ہیں اور مرویات کی تعداد کے لحاظ سے صرف حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ان سے بڑھ کر ہیں۔ کثیر الروایت ہونے کے باوجود حضرت جابر رضی اللہ عنہ حدیث بیان کرنے میں بڑی احتیاط

سے کام لیتے تھے۔ان کے خوان علم سے تابعین کے بھی طبقے بہرہ یاب ہوئے البتہ جو اصحاب ان کے خاص شاگردوں میں شمار ہوئے ان میں سے کچھ کے اسماء گرامی یہ ہیں:

امام محمد باقر رحمۃ اللہ علیہ، محمد بن عمرو بن حسن رضی اللہ عنہ، عاصم بن عمر بن قتادہ رضی اللہ عنہ، محمد بن منکدر رحمۃ اللہ علیہ، حسن بن محمد حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، سعید بن ابی بلال رحمۃ اللہ علیہ، سعد بن مینا رحمۃ اللہ علیہ۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا فضل وکمال ان کے معاصرین میں مسلّم تھا لیکن اس کے باوجود وہ دوسروں سے علمی استفادہ کرنے میں مطلق عار نہ کرتے تھے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ''تاریخ الصغیر'' میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ مجھے کسی نے بتایا کہ قصاص کے بارے میں حضور ﷺ کی ایک حدیث عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ کے پاس ہے۔وہ اس وقت شام میں مقیم تھے۔میں نے ایک اونٹ خریدا اور اس حدیث کی سماعت کے لیے طویل سفر کر کے شام پہنچا۔وہاں عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ کے دروازے پر پہنچا اور ان کو پیغام بھیجا کہ جابر آپ سے ملنے آیا ہے۔انہوں نے دریافت کیا، کون جابر، عبداللہ رضی اللہ عنہ کے بیٹے؟ میں نے کہا، جی ہاں۔یہ سن کر وہ اس حالت میں نکلے کہ ان کی چادر ان کے پاؤں کے نیچے آ رہی تھی۔انھوں نے مجھ سے معانقہ کیا اس کے بعد میں نے کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کے پاس رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث قصاص کے بارے میں ہے۔میں یہی حدیث سننے آپ کے پاس آیا ہوں۔حضرت عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ نے کہا، میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے آپ فرماتے تھے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بندوں کو جمع کرے گا۔سب برہنہ ہوں گے۔غیر ختنہ شدہ ہوں گے اور بُہم ہوں گے، میں نے پوچھا، بُہم کا کیا مطلب ہے؟ انہوں نے کہا کہ کسی کے پاس کوئی چیز نہ ہوگی۔پھر اللہ تعالیٰ پکارے گا کہ میں بدلہ کا دینے والا ہوں، میں ہی مالک ہوں۔میں جب تک ہر جنتی سے ہر دوزخی کا اور ہر دوزخی سے ہر جنتی کا حق نہ دلالوں نہ کسی کو جنت میں داخل کروں گا اور نہ کسی کو دوزخ میں ڈالوں گا۔حتیٰ کہ ایک معمولی طمانچہ کا قصاص بھی دلاؤں گا...... ہم سب (حاضرین) نے عرض کیا، یارسول

اللہ یہ بدلہ کا دینا کیسے ہوگا جب کہ ہم سب برہنہ اور تہی دست ہوں گے۔ حضور ﷺ نے فرمایا، نیکی اور بدی سے فیصلہ کیا جائے گا...... اس حدیث کی سماعت کے بعد حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے مدینہ منورہ کو مراجعت کی۔

طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے ''الاوسط'' میں بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما ایک حدیث کی سماعت کے لیے حضرت مسلمہ بن مخلد انصاری رضی اللہ عنہ کے پاس مصر بھی تشریف لے گئے تھے۔ جب حضرت مسلمہ رضی اللہ عنہ نے انہیں بتایا کہ ''میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ جس نے کسی مومن کے عیب کی پردہ پوشی کی تو گویا اس نے زندہ درگور کی ہوئی لڑکی کو زندہ کیا'' تو حضرت جابر رضی اللہ عنہ بہت مسرور ہوئے اور مصر میں بغیر قیام کیے مدینہ منورہ کے لیے چل پڑے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ بن حنبل نے اس حدیث کے الفاظ یہ بیان کیے ہیں:

''جس نے اپنے مسلمان بھائی کی دنیا میں پردہ پوشی کی اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی کرے گا''

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو کم وبیش دس برس تک مسلسل سرورِ عالم ﷺ کو معیت اور رفاقت کا شرف حاصل ہوا۔ اس دوران میں انہوں نے جو کچھ لسانِ رسالت سے سنا اسے حرزِ جان بنالیا۔ اسی طرح عہدِ رسالت میں جو واقعات ان کی آنکھوں کے سامنے پیش آئے انہیں اپنے حافظے میں محفوظ کر لیا۔ وہ ایسے واقعات اور حضور ﷺ کے ارشادات بڑے لطف وانبساط کے ساتھ لوگوں کے سامنے بیان کیا کرتے تھے۔ ان سے مروی چند احادیث جن کا تعلق اخلاقیات یا حضور ﷺ کی سیرتِ طیبہ سے ہے ملاحظہ فرمائیں:

○ ...... حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ...... رسول اللہ ﷺ بکری کے ایک مردہ بچے کے پاس سے گزرے جس کے کان اور ناک کٹے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نے لوگوں سے فرمایا، تم میں سے کوئی ہے جو اس کو ایک درہم کے بدلے خریدے......

لوگوں نے عرض کیا کہ ہم تو اس کو مفت بھی نہیں لے سکتے اب تو یہ مردہ ہے۔ جب زندہ تھا تب بھی عیب دار ہونے کی وجہ سے ایک درہم کے عوض بھی مہنگا تھا۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا، خدا کی قسم یہ مردار تمہاری نظروں میں اتنا حقیر نہیں جتنی حقیر یہ دنیا اللہ کی نظروں میں ہے۔ (صحیح مسلم)

○...... رسول اللہ ﷺ نے ایک دفعہ خطبہ میں بیان فرمایا کہ میں مسلمانوں کا خود ان سے بڑھ کر خیر خواہ ہوں۔ اگر کوئی مسلمان فوت ہو جائے اور مال چھوڑ جائے تو اس کے وارث اس کے رشتہ دار ہوں گے مگر جو قرض یا غریب محتاج رشتہ دار چھوڑے تو قرض کی ادائیگی اور غریب رشتہ داروں کی پرورش میرے ذمہ ہے۔ (مسلم)

○...... رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم کرے جو کسی چیز کے بیچتے اور خریدتے وقت نرمی کرتا ہے۔ نیز تقاضا کرتے وقت نرمی کرتا ہے۔ (صحیح بخاری)

○...... رسول اللہ ﷺ سے کبھی کچھ مانگا نہیں گیا کہ آپ ﷺ نے اس کے جواب میں انکار کیا ہو۔ (صحیح بخاری)

○...... رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ہر مرض کے لیے دوا ہے۔ جب کسی بیماری کے لیے دوا پہنچ جاتی ہے۔ تو خدا تعالیٰ کے حکم سے شفا ہو جاتی ہے۔

○...... میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ظہر کی نماز ادا کی پھر آپ ﷺ اپنے گھر کی طرف چلے تو میں بھی آپ ﷺ کے ساتھ ہو لیا۔ سامنے سے کچھ بچے آ نکلے۔ آپ ﷺ نے ازراہِ محبت ان سب کے ایک ایک رخسار پر ہاتھ پھیرا۔ جب میری باری آئی تو آپ ﷺ نے میرے دونوں رخساروں پر ہاتھ پھیرا۔ اس وقت میں نے آپ ﷺ کے دستِ مبارک کی خنکی محسوس کی اور اس کی خوشبو سونگھی ایسا مہک رہا تھا گویا ابھی عطر فروش کے ڈبہ سے نکلا ہے۔ (صحیح مسلم)

○...... رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ آدمی کو مرتے وقت اللہ تعالیٰ سے حسنِ ظن رکھنا چاہیے۔ (یعنی اس کی رحمت پر کامل بھروسا کرنا چاہیے)۔ (صحیح مسلم)

○......رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو مسلمان کی مدد کرنے سے ایسے وقت پیچھے ہٹ جاتا ہے جب اس کی عزت کی دھجیاں اڑائی جا رہی ہوں اور اس کی آبروریزی کی جا رہی ہو تو اللہ تعالیٰ بھی ایسے نازک موقع پر اس کی اعانت اور نصرت ترک کر دیتا ہے جہاں وہ چاہتا ہو کہ کوئی شخص اس کی مدد کے لیے کھڑا ہو اور جو مسلمان کسی مسلمان کی مدد کے لیے ایسی جگہ کھڑا ہو جاتا ہے جہاں اس کی مٹی خراب کی جا رہی ہو اور اس کی آبرو برباد کی جا رہی ہو تو اللہ تعالیٰ بھی ایسے مقام پر اس کی مدد کرتا ہے جہاں وہ چاہتا ہو کہ کوئی اس کی مدد کرے۔ (مسندِ ابوداؤد)

○......ہم ایک غزوہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے (شارحینِ حدیث نے لکھا ہے کہ یہ غزوۂ بنی المصطلق تھا) کہ ایک مہاجر نے ایک انصاری کے لات ماردی۔ اس پر مہاجر نے دوسرے مہاجرین کو اپنی مدد کے لیے پکارا اور انصاری نے دوسرے انصار کو۔ آپ ﷺ نے یہ شور وغل سنا تو فرمایا کہ یہ کیسی زمانہ جاہلیت کی آوازیں آ رہی ہیں۔ لوگوں نے عرض کیا کہ ایک مہاجر نے کسی انصاری کے لات ماردی ہے۔ (اس پر کچھ ہنگامہ برپا ہو گیا ہے) حضور ﷺ نے فرمایا، ان ناشائستہ کلمات کا چھوڑو۔ یہ قصہ کہیں (رئیس المنافقین) عبداللہ بن اُبی نے بھی سن لیا۔ اس نے کہا، اچھا، کیا ایک مہاجر نے یہ حرکت کی ہے؟ ذرا مدینہ پہنچ لیں جو باعزت فریق ہے وہ ذلیل کو نکال باہر کریگا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ابنِ اُبی کے الفاظ کا علم ہوا تو انہوں نے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا، یارسول اللہ آپ اجازت دیں تو میں اس منافق کی گردن اڑادوں، آپ ﷺ نے فرمایا، رہنے دو، لوگ کہیں گے کہ میں اپنے لوگوں کو بھی قتل کر دیتا ہوں۔ ابنِ اُبی کے گستاخانہ فقرے پر اس کے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اپنے باپ سے کہا: خدا کی قسم تو مدینہ میں اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتا جب تک اپنے منہ سے اقرار نہ کرے کہ تو ہی ذلیل ہے اور معزز رسول اللہ ﷺ ہیں۔ آخر اس نے اس کا اقرار کیا۔ (ترمذی)

○......میں ایک غزوہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نجد کی طرف گیا۔ واپسی کے

سفر میں ہم ایک ایسی وادی میں پہنچے جہاں بہت سے کانٹے دار درخت تھے۔ حضور ﷺ خود ایک کیکر کے درخت کے نیچے اترے اور لشکر کے لوگ مختلف درختوں کے سایہ میں پہنچنے کے لیے اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ حضور ﷺ نے اپنی تلوار اسی کیکر کے درخت سے لٹکا دی۔ پھر لشکر کے سب سپاہی سو گئے۔ اچانک ہم نے حضور ﷺ کی آواز سُنی آپ ﷺ ہم کو بُلا رہے تھے۔ ہم گئے تو دیکھا کہ ایک گنوار شخص آپ ﷺ کے پاس موجود ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں سو رہا تھا کہ اس شخص نے مجھ پر تلوار کھینچی اور کہا کہ میرے ہاتھ سے تجھے کون بچا سکتا ہے۔ میں نے کہا، اللہ۔ اس پر اس کے ہاتھ سے تلوار گر پڑی۔ میں نے یہ تلوار اٹھا کر اس سے کہا کہ اب تجھے کون بچا سکتا ہے؟ تو اس نے ندامت کا اظہار کیا اور معافی مانگی۔ حضور ﷺ نے اس شخص کو چھوڑ دیا اور کوئی سزا نہ دی۔ وہ جب اپنی قوم میں واپس گیا تو کہنے لگا کہ میں ایک ایسے شخص کے پاس سے آیا ہوں جو سب سے بہتر انسان ہے۔ (صحیح بخاری)

○...... حضرت مُعاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے ایک دن اپنی قوم کو نماز پڑھاتے ہوئے سورۂ بقرہ پڑھنی شروع کی (ان کی لمبی قرات کی وجہ سے) ایک شخص نے علیحدہ ہو کر ہلکی سی نماز پڑھ لی۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو کہنے لگے یہ شخص منافق ہے۔ اس شخص نے سُنا تو حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچا اور عرض کی، یارسول اللہ ہم مشقت کرنے والے لوگ ہیں، اپنے ہاتھوں سے مزدوری کرتے ہیں اور اونٹوں کے ذریعہ سے پانی بھرتے ہیں۔ آج شب معاذ رضی اللہ عنہ نے ہمیں نماز پڑھائی اور اس میں سورۂ بقرہ شروع کر دی اس لیے میں نے اپنی نماز علیحدہ پڑھ لی۔ اس پر معاذ خیال کرتے ہیں کہ میں منافق ہوں۔ آپ ﷺ نے (حضرت مُعاذ رضی اللہ عنہ کو بُلا کر) فرمایا، معاذ کیا فتنہ برپا کرو گے تین بار یہ الفاظ دہرائے۔ صرف **والشمس وضحٰها** اور **سبح اسم ربك الاعلٰى** جیسی سورتیں پڑھ لیا کرو۔ (صحیح بخاری)

○...... حدیبیہ میں لوگ پیاسے ہو گئے۔ نبی اکرم ﷺ کے سامنے ایک چھوٹا سا

برتن تھا جس سے آپ ﷺ وضو کر رہے تھے۔ لوگ آپ ﷺ کی طرف گھبرائے ہوئے آئے۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا، کیا بات ہے؟ صحابہ نے عرض کیا، ہمارے پاس پینے اور وضو کرنے کے لیے پانی نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے اپنے سامنے کے برتن میں اپنا دستِ مبارک رکھا تو پانی آپ ﷺ کی انگلیوں کے درمیان سے اس طرح اُبلنے لگا جس طرح چشمہ سے جوش مارتا ہے۔ ہم سب نے پیا اور وضو کیا، اس وقت ہم پندرہ سو آدمی تھے۔ (صحیح بخاری)

(۷)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے گلشنِ اخلاق میں سبقت فی الاسلام، حُبِّ رسول، جوشِ ایمان، سادگی، شغفِ علم اور حق گوئی سب سے خوش رنگ پھول ہیں۔ ان کے یہی اوصاف و محاسن تھے جن کی بدولت ان کو بارگاہِ رسالت میں درجہ تقرب حاصل ہو گیا تھا۔ جس طرح وہ سرورِ عالم ﷺ سے والہانہ محبت کرتے تھے اور قدم قدم پر آپ ﷺ کی اطاعت، تعظیم اور خوشی کو ملحوظِ خاطر رکھتے تھے۔ اسی طرح حضور ﷺ بھی ان پر بے انتہا شفقت فرماتے تھے اور نہایت عزیز جانتے تھے۔

مُسندِ احمد حنبل میں ہے کہ حضور ﷺ کو کبھی قرض کی ضرورت ہوتی تو بے تکلف حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے لے لیتے تھے۔ ایک مرتبہ قرض ادا فرمانے لگے تو اظہارِ خوشنودی کے طور پر کچھ زیادہ دیا۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو جب بھی موقع ملتا حضور ﷺ کی دعوت کرتے اور آپ ﷺ بھی خوشی سے اسے قبول فرما لیتے۔ غزوۂ خندق میں انہوں نے جس اخلاص کے ساتھ حضور ﷺ کی دعوت کی اہلِ سیَر نے اس کا حال بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ حضور ﷺ ایک مرتبہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو ان پر اور ان کی اہلیہ پر درود پڑھا۔ ایک اور موقع پر حضور ﷺ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے تو انہوں نے فوراً اٹھ کر ایک فربہ بکری کا بچہ ذبح کرنا چاہا۔

حضور ﷺ نے دیکھا تو فرمایا نسل اور دودھ کیوں قطع کرتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا، یارسول اللہ ابھی بچہ ہے چھوہارے کھا کھا کر اتنی فربہ ہوگئی ہے۔ اس کے بعد اس کو ذبح کر کے گوشت پکایا اور حضور ﷺ کو کھانا کھلا کر رخصت کیا۔

ایک دن حضور ﷺ کی خدمت میں اعلیٰ قسم کی کھجوریں پیش کیں جن میں گٹھلی نہ تھی۔ حضور ﷺ نے فرمایا، میں سمجھا گوشت ہے۔ اسی وقت گھر گئے بکری ذبح کر کے اہلیہ سے گوشت پکوایا اور نہایت عقیدت اور محبت کے ساتھ حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔

ایک مرتبہ تھال میں کھجوریں لیے جا رہے تھے۔ راستے میں حضور ﷺ سے ملاقات ہوگئی۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے کھجوریں حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیں۔ آپ ﷺ نے قبول فرمالیں۔

مُسندِ احمد میں ہے کہ خود سرورِ عالم ﷺ بھی کبھی کبھی ازراہِ شفقت حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی دعوت کیا کرتے تھے اور بعض اوقات کسی اور جگہ دعوت ہوتی تو ان کو اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ ایک دن حضور ﷺ ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے کاشانہ اقدس میں لے آئے اور پردہ گرا کر گھر والوں کو آواز دی۔ اندر سے تین روٹیاں آئیں جن کے ساتھ ایک برتن میں سرکہ تھا۔ حضور ﷺ نے ڈیڑھ ڈیڑھ روٹی تقسیم کی اور فرمایا، سرکہ بھی کیا عمدہ سالن ہے، سرکہ بھی کیا عمدہ سالن ہے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے بڑی رغبت سے کھانا کھایا اور پھر ساری عمر سرکہ کو نہایت محبوب رکھا۔

ایک مرتبہ رسولِ اکرم ﷺ گھوڑے سے گر پڑے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے سنا تو بے تاب ہوگئے۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر حضور ﷺ کی عیادت کے لیے پہنچے۔

غزوہٴ ذات الرقاع میں حضور ﷺ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اونٹ خریدا اور قیمت کے علاوہ کچھ زیادہ رقم بھی عطا فرمائی پھر اونٹ بھی ان کو ہدیۃً واپس دے دیا۔ حضور ﷺ نے ان کو بخشش کے طور پر جو رقم عطا فرمائی اسے انہوں نے تبرک سمجھ کر ایک

تھیلی میں محفوظ کرلیا۔ سالہا سال بعد واقعہ حرہ میں اہلِ شام نے ان کے گھر پر چھاپہ مارا تو دوسرے سامان کے علاوہ یہ تھیلی بھی لوٹ کرلے گئے۔

ایک دفعہ علیل ہو گئے تو حضور ﷺ خود عیادت کے لیے تشریف لائے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ بے ہوش تھے۔ حضور ﷺ نے وضو کر کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تو ہوش میں آ گئے۔ اس وقت تک ان کے کوئی اولاد نہ تھی۔ ماں باپ بھی فوت ہو چکے تھے۔ اسلام میں ایسے شخص کے وارث کو کلالہ کہا جاتا ہے۔ حضور ﷺ کو اپنے سرہانے رونق افروز دیکھا تو عرض کی یارسول اللہ میں مر گیا تو کلالہ وارث ہوگا، کیا اپنی میراث میں سے دو تہائی بہنوں کو دے دوں؟ حضور ﷺ نے فرمایا، ٹھیک ہے دے دو۔ پھر عرض کیا، خواہ نصف؟ فرمایا۔ ہاں۔ یہ فرما کر باہر تشریف لے گئے۔ لیکن جلد ہی واپس آ کر فرمایا، جابر تم اس بیماری میں نہ مرو گے۔ ہاں تمہارے استفسار کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ حکم نازل ہوا ہے:۔

"(اے پیغمبر) تم سے لوگ کلالہ کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہو کہ اس کے متعلق خدا کا یہ حکم ہے، تم بہنوں کو دو تہائی دے سکتے ہو۔"

ایک مرتبہ حضور ﷺ نے ان سے فرمایا کہ اگر بحرین کے علاقے سے مال آیا تو میں تجھے اتنا اتنا اتنا دوں گا۔ لیکن مال کے آنے سے پہلے ہی حضور ﷺ کا وصال ہو گیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت کی ابتداء میں بحرین سے مال آیا تو خلیفۃ الرسول رضی اللہ عنہ نے اعلان کیا کہ جس شخص سے رسول اللہ ﷺ نے کوئی وعدہ کیا ہو یا آپ ﷺ کے ذمہ اس کا قرضہ ہو وہ ہمارے پاس آئے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کو بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے وعدہ فرمایا تھا کہ میں تجھے اتنا اتنا اتنا دوں گا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے دونوں ہاتھ ملا کر درہموں سے بھر کر مجھے دیئے میں نے ان کو گنا تو پانچ سو درہم تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، یہ بھی تیرے ہیں اور ان سے دو گنے اور بھی لے لے۔ (بخاری)

سرورِ عالم ﷺ سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی محبت اور عقیدت اس انتہا کو پہنچی ہوئی تھی کہ آپ ﷺ کے وصال کے بعد بھی اپنے تمام کاموں میں حضور ﷺ کے ارشادات اور عمل کو پیشِ نظر رکھتے تھے بلکہ بعض دفعہ ایسے امور میں بھی آپ ﷺ کا اتباع کرتے تھے۔ جن میں آپ ﷺ کی تقلید واجب نہیں ہے۔ ایک مرتبہ صرف ایک کپڑا اوڑھ کر نماز پڑھی۔ شاگردوں نے عرض کیا، آپ کے پاس چادر بھی تھی اس کو کیوں نہ اوڑھ لیا تاکہ دو کپڑے ہو جاتے۔ فرمایا، میں نے ایک دفعہ خود رسول اللہ ﷺ کو ایک کپڑے کے ساتھ نماز پڑھتے دیکھا۔ اب میں نے حضور ﷺ کی تقلید اس لیے کی کہ تم جیسے بے وقوف حضور ﷺ کی اس رخصت کو دیکھیں اور معترض ہوں۔

سرورِ عالم ﷺ نے ایک موقع پر مسجد فتح میں متواتر تین روز (پیر، منگل اور بدھ) دعا مانگی تھی۔ تیسرے دن بارگاہِ الٰہی سے قبولیتِ دُعا کا مژدہ ملا تو روئے انور فرطِ مسرت سے گلنار ہو گیا۔ یہ واقعہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش آیا تھا۔ چنانچہ جب بھی کوئی مشکل پیش آتی، مسجدِ فتح میں جا کر دعا کرتے، اللہ تعالیٰ یہ مشکل حل کر دیتا۔

نہایت سادہ مزاج اور انکسار پسند تھے۔ مسلمانوں کی خیر خواہی کا جذبہ ہر وقت دل میں موجزن رہتا تھا۔ کسی کی علالت کی خبر سنتے تو بے چین ہو جاتے اور عیادت کے لیے تشریف لے جاتے۔ اڑوس پڑوس میں کوئی سفر سے واپس آتا تو اس سے ملاقات کرنے میں بھی پہل کرتے۔ مہمان آتے تو جو کچھ موجود ہوتا نہایت خوش دلی سے ان کے سامنے پیش کر دیتے اور ان کو تکلف سے بچنے کی تلقین کرتے۔

حق گوئی کا یہ عالم تھا کہ کسی قسم کی مصلحت ان کو حق بات کہنے سے باز نہ رکھ سکتی تھی۔ حجاج بن یوسف ثقفی مدینہ کا امیر ہو کر آیا تو اس نے اوقاتِ نماز میں کچھ تبدیلی کرنی چاہی۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے سنا تو فرمایا، رسول اللہ ﷺ ظہر کی نماز دوپہر کے بعد، عصر کی آفتاب کے صاف اور روشن ہونے تک، مغرب کی غروبِ آفتاب کے بعد اور فجر کی تاریکی میں پڑھتے تھے۔ عشاء کے وقت لوگوں کا انتظار ہوتا تھا اگر لوگ جلد آ گئے تو جلد

پڑھ لیتے تھے ورنہ دیر میں۔ حجاج نے ان کا فتویٰ سنا تو اسی کے مطابق عمل کیا۔

ایک مرتبہ ایک صاحب نے (ایک روایت کے مطابق ان کے اپنے صاحبزادے نے) اپنے باغ کا پھل تین سال کے لیے فروخت کر دیا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو کچھ لوگوں کو لے کر مسجد میں آئے اور سب کے سامنے بیان کیا کہ حضور ﷺ نے اس قسم کے سودے کی ممانعت فرمائی ہے۔ جب تک پھل پک کر کھانے کے قابل نہ ہو جائیں ان کا فروخت کرنا جائز نہیں۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا گھر مسجدِ نبوی سے ایک میل کے فاصلے پر تھا لیکن وہ پانچوں وقت مسجد میں آ کر نماز پڑھا کرتے تھے۔ خواہ کتنی ہی گرمی اور دھوپ ہو ان کو کچھ پروا نہ تھی۔ ایک مرتبہ مسجدِ نبوی کے قریب چند مکان خالی ہوئے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے وہاں اٹھ آنے کا ارادہ کیا لیکن جب حضور ﷺ نے فرمایا کہ نماز کے لیے آنے میں ہر قدم پر ثواب ہوتا ہے، اس لیے دور سے آنے میں زیادہ ثواب ہے تو انہوں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا اور تا دمِ آخر ایک میل دور سے آ کر مسجد میں نمازِ پنجگانہ ادا کرتے رہے یہاں تک کہ جب بینائی جاتی رہی تو بھی کسی کا سہارا لے کر نماز کے لیے برابر مسجد میں پہنچتے تھے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ
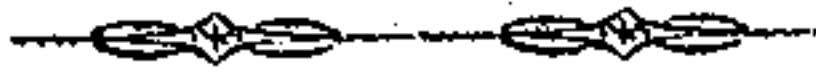
حضرت نعمان الاعرج انصاری رضی اللہ عنہ

نعمان نام۔ اعرج لقب۔ یہ لقب پاؤں میں لنگ ہونے کی وجہ سے تھا۔ سلسلہ نسب یہ ہے:

نعمان بن مالک بن ثعلبہ بن احرام (یا اصرام) بن فہر بن ثعلبہ بن غنم الخزرجی

مورخ محمد بن عمارہ رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ غزوۂ بدر میں سرورِ عالم ﷺ کے ہمرکاب تھے۔ اگلے سال غزوۂ اُحد میں بھی شریک ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ اُحد کے دن اپنی تمنائے شہادت کا اظہار یوں کیا کہ الٰہی تجھے اپنی ذات کی قسم ہے کہ آفتاب غروب ہونے سے قبل اپنے اسی لنگڑے پاؤں سے سبزہ زارِ جنت میں چلتا پھرتا نظر آؤں۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی۔ اور وہ لڑتے ہوئے جامِ شہادت پی کر جنت میں پہنچ گئے۔

سرورِ عالم ﷺ نے حضرت نعمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا حال سن کر فرمایا:

''نعمان الاعرج نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اچھا گمان کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے اس کے گمان کے مطابق سلوک کیا۔ میں نے نعمان کو دیکھا کہ وہ جنت میں چل پھر رہا تھا۔ اور اس کے پاؤں میں لنگڑا پن نہیں تھا۔''

رضی اللہ تعالیٰ عنہ
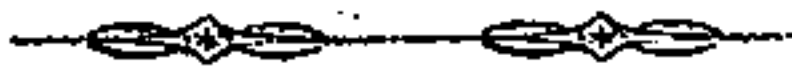
حضرت براء بن معرور انصاری رضی اللہ عنہ

(۱)

رحمتِ عالم ﷺ نے مکہ سے ہجرت فرما کہ مدینہ منورہ میں نزولِ اجلال فرمایا، تو انصارِ مدینہ نے آپ ﷺ کے سامنے اپنے دیدہ و دل فرشِ راہ کر دیے لیکن حضور ﷺ نے ان میں اپنے ایک انصاری جان نثار کو نہ پایا جو بیعتِ عقبہ کبیرہ میں والہانہ جوش و خروش کے ساتھ آپ ﷺ کی بیعت کر چکے تھے اور بآوازِ بلند خدا کی قسم کھا کر یہ عہد کر چکے تھے کہ حضور ﷺ مدینہ تشریف لائیں تو وہ اپنی جان اور آل اولاد کے ساتھ آپ ﷺ کی حفاظت کریں گے۔ حضور ﷺ نے ان کے بارے میں دریافت فرمایا تو آپ ﷺ کو بتایا گیا کہ وہ ایک ماہ قبل اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے ہیں۔ سرورِ عالم ﷺ کو یہ خبر سن کر سخت صدمہ پہنچا۔ آپ ﷺ صحابہ کو ساتھ لے کر ان کی قبر پر تشریف لے گئے اور چار تکبیروں کے ساتھ ان کی نمازِ جنازہ پڑھی...... یہ خوش بخت صاحب رسول جن کی قبر پر سیّد المرسلین، شفیع المذنبین خیر الخلائق ﷺ بہ نفسِ نفیس تشریف لے گئے اور اپنے بیسیوں صحابہ کے ساتھ ان کے لیے دعائے مغفرت کی۔ حضرت براء بن معرور انصاری رضی اللہ عنہ تھے۔

(۲)

سیّدنا ابو بشر بن براء بن معرور رضی اللہ عنہ کا تعلق خزرج کے خاندان "بنو سلمہ" سے تھا۔ نسب نامہ یہ ہے: براء بن معرور بن صخر بن سابق بن سنان بن عبید بن عدی بن غنم بن کعب بن سلمہ بن سعد بن علی بن اسد بن سارده بن یزید بن جشم بن خزرج۔

والدہ کا نام رباب بنتِ نعمان تھا جو سیّد الاوس حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی حقیقی

پھوپھی تھیں...... حضرت براء رضی اللہ عنہ بنوسلمہ کے سردار تھے اور کئی قلعوں کے مالک تھے۔ امارت اور ریاست کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انھیں فطرتِ سعید سے نوازا تھا۔ ۱۲ بعدِ بعثت میں حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ مدینہ منوّرہ آئے اور اپنی تبلیغی مساعی سے جن لوگوں کو حلقہ بگوشِ اسلام بنایا، حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ بھی ان میں شامل تھے۔ ۱۳ نبوّت میں مدینہ کے جو پچھتر اہلِ ایمان مکہ جا کر بیعتِ عقبہ کبیرہ کی سعادت سے بہرہ ور ہوئے۔ حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ ان میں شامل ہی نہیں تھے بلکہ انہوں نے اس موقع پر نہایت اہم کردار ادا کیا۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور ابنِ ہشام نے محمد بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے حضرت کعب بن مالک انصاری رضی اللہ عنہ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ ہم اپنی قوم کے مشرکین کے ساتھ حج کے لیے روانہ ہوئے۔ ہمارے (مسلمانوں) کے ساتھ ہمارے بزرگ اور سردار براء بن معرور رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ اثنائے راہ میں انہوں نے کہا میری ایک رائے ہے، معلوم نہیں تمہیں اس سے اتفاق ہے یا اختلاف۔ ہم نے پوچھا وہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ میں کعبہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھوں اور اس کی طرف پشت نہ کروں۔ ہم نے کہا کہ ہمیں تو یہ معلوم ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ شام (بیت المقدس) کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔ ہم تو آپ ﷺ کے طریقے کے خلاف عمل نہ کریں گے مگر براء بن معرور رضی اللہ عنہ کعبہ کی طرف منہ کر کے ہی نماز پڑھتے رہے اور ہم انہیں ٹوکتے رہے۔ جب ہم لوگ مکہ پہنچے تو براء رضی اللہ عنہ نے مجھ سے کہا:

> "بھتیجے چلو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوں اور آپ ﷺ سے دریافت کریں کہ میرا کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ کیونکہ تم لوگوں کے اختلاف کی وجہ سے میرے دل میں وسوسہ پیدا ہو گیا ہے۔"

چنانچہ ہم دونوں مکہ کے ایک شخص سے آپ ﷺ کا پتہ پوچھ کر حرم گئے، جہاں آپ ﷺ (اپنے چچا) عباس رضی اللہ عنہ کے ساتھ تشریف فرما تھے، ہم نے آپ ﷺ کو

سلام کیا۔ آپ ﷺ نے عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھا، آپ ان دونوں کو جانتے ہیں؟ عباس رضی اللہ عنہ تجارت کے سلسلہ میں ہمارے ہاں آتے رہتے تھے۔ اور ہمیں جانتے تھے، انہوں نے کہا، ہاں، یہ براء بن معرور رضی اللہ عنہ ہیں اور یہ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ۔ براء رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے پوچھا، اے اللہ کے نبی! خدا نے مجھ کو اسلام کی ہدایت کی اور میں سفر کر کے یہاں آیا ہوں، میرا خیال یہ ہے کہ میں کعبہ کی طرف پیٹھ کرنے کے بجائے اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھوں اور میں ایسا کرتا ہوں لیکن میرے ساتھی اس کے خلاف ہیں۔ اس بارے میں آپ کا کیا حکم ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، تم ایک قبلہ پر ضرور ہو لیکن ابھی صبر کرنا چاہیے۔ چنانچہ براء رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی تقلید میں بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے لگے۔''

(۳)

ایامِ تشریق کے بیچ والے دن سرورِ عالم ﷺ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ہمراہ عقبہ تشریف لائے۔ یہاں مدینہ کے تمام اہلِ حق (مشرکین سے الگ ہوکر) جمع تھے۔ کچھ دیر حضور ﷺ اور انصار کے درمیان گفتگو ہوتی رہی۔ اس دوران میں جب انصار نے کہا کہ آپ ﷺ اپنے لیے جو عہد ہم سے لینا چاہیں، لے لیں تو حضور ﷺ نے فرمایا:

''میں تم سے اس بات پر بیعت لیتا ہوں کہ تم میری اسی طرح حمایت و حفاظت کرتے رہو جس طرح خود اپنے اہلِ وعیال کی کرتے ہو۔''

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضور ﷺ کا ارشاد سن کر حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کا دستِ مبارک اپنے ہاتھ میں لے کر عرض کیا:

''جی ہاں۔ اللہ کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا، ہم اپنی جانوں اور آل اولاد کی طرح آپ کی حفاظت کریں گے، یارسول اللہ، ہم سے بیعت لیجئے ہم جنگ آزما لوگ ہیں اور ہم نے اسے اپنے باپ دادا سے ورثے میں پایا ہے۔''

واقدی نے ایک روایت میں اس موقع پر حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

''ہم خوب سامانِ جنگ اور لڑنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ ہمارا یہ حال اس وقت تھا جب ہم بُت پرست تھے تو بھلا اب ہمارا حال کیا ہوگا جب کہ اللہ نے ہمیں ہدایت دی ہے جس سے دوسرے لوگ محروم ہیں اور محمد ﷺ کے ذریعہ سے ہماری تائید فرمائی ہے۔''

ابنِ سعد نے ایک روایت میں بیعتِ عقبہ کے موقع پر حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ سے یہ الفاظ منسوب کیے ہیں:

''اے عبّاس ہم نے آپ کی بات سن لی ہے (یعنی یہ کہ تم خوب سوچ سمجھ لو کہ تم میں سے تمام عرب کی مخالفت مول لینے کی طاقت ہے یا نہیں) خدا کی قسم ہمارے دلوں میں کچھ اور ہوتا تو ہم صاف صاف کہہ دیتے لیکن ہم تو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سچّی وفاداری کرنا اور آپ ﷺ کے لیے جانیں لڑا دینا چاہتے ہیں۔''

ان روایات سے حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ کے اخلاص اور جوشِ ایمان کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس گفتگو کے بعد مدینہ کے سبھی اہلِ حق حضور ﷺ کی بیعت سے مشرّف ہوگئے۔ یہ بیعت تاریخ میں عقبہ کبیرہ یا لیلۃ العقبہ کے نام سے مشہور ہے۔

بیعت کے بعد حضور ﷺ نے انصار سے فرمایا کہ اپنے اندر سے بارہ نقیب منتخب کر کے دو جو اپنے قبیلے کے ذمہ دار ہوں۔ چنانچہ انصار نے بارہ نقباء منتخب کیے۔ ۹ خزرج میں سے اور تین اوس میں سے۔ خزرج کے ۹ نقیبوں میں ایک حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ تھے جنھیں بنوسلمہ کا نقیب منتخب کیا گیا۔

(۴)

بیعتِ عقبہ کبیرہ سے سعادت اندوز ہو کر حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ مدینہ واپس

آئے اور ایک ایک دن حضور ﷺ کے انتظار میں بے تابی سے کاٹنے لگے لیکن افسوس کہ اس دُنیا میں حضور ﷺ کے جمالِ جہاں آرا کی دوبارہ زیارت ان کی قسمت میں نہ تھی۔ ہجرتِ نبوی ﷺ سے ایک ماہ قبل ماہ صفر میں سخت بیمار ہو گئے۔ جب جانبری کی اُمید نہ رہی تو وصیّت کی کہ قبر میں مجھ کو قبلہ رُخ رکھنا اور جب رسول اللہ ﷺ مدینہ منوّرہ تشریف لائیں تو میری تمام جائیداد کا ایک تہائی آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کر دینا۔ اس کے بعد اپنا منہ قبلے کی طرف کر لیا اور اسی حالت میں اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کر دی۔

سرورِ عالم ﷺ مدینہ منوّرہ تشریف لائے تو آپ ﷺ ان کی قبر پر تشریف لے گئے اور ان کے لیے دُعائے مغفرت کی۔ حضرت براء رضی اللہ عنہ کی وصیّت کے مطابق ان کا ثلث مال حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا، آپ نے اسے قبول فرما کر ان کے وارثوں کو واپس کر دیا۔

حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ نے اپنے پیچھے ایک صاحبزادہ بشر رضی اللہ عنہ اور ایک صاحبزادی سلافہ رضی اللہ عنہا چھوڑے۔ ان دونوں کو شرفِ صحابیت حاصل ہے۔

حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ اگرچہ سرورِ عالم ﷺ کی ہجرت الی المدینہ سے پہلے ہی فوت ہو گئے۔ تاہم ان کا شمار نہایت عظیم المرتبت صحابہ میں ہوتا ہے کیونکہ انہوں نے لیلۃ العقبہ میں جس جوشِ ایمان کا مظاہرہ کیا وہ اپنی مثال آپ تھا، اہلِ سِیَر نے انھیں متقی، فاضل اور فقیہ کے القاب سے یاد کیا ہے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت بشر بن براء انصاری رضی اللہ عنہ

سیّدنا حضرت بشر جلیل القدر صحابی، حضرت براء رضی اللہ عنہ بن معرور الانصاری الخزرجی السلمی العقبی النقیب کے صاحبزادے تھے۔ نسب نامہ حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ کے حالات میں دیا جا چکا ہے۔ حضرت بشر رضی اللہ عنہ نے ہجرتِ نبوی ﷺ سے ایک سال قبل اپنے والدِ گرامی کے ساتھ اسلام قبول کیا اور پھر ۱۳ بعدِ بعثت کے زمانہ حج میں اُن کی معیت میں مکہ جا کر بیعتِ عقبہ کبیرہ کی عظیم سعادت حاصل کی۔ حضرت براء رضی اللہ عنہ نے رحمتِ عالم ﷺ کے مدینہ میں نزولِ اجلال سے ایک ماہ پہلے وفات پائی۔ وہ اپنی ایک تہائی مال کی حضور ﷺ کے حق میں وصیّت کر گئے تھے۔ حضور ﷺ مدینہ منوّرہ تشریف لائے تو حضرت بشر رضی اللہ عنہ نے یہ مال آپ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں پیش کیا۔ حضور ﷺ نے قبول فرما کر اسے پھر حضرت بشر رضی اللہ عنہ کو واپس دے دیا۔

حضرت بشر رضی اللہ عنہ نہایت ماہر قدر انداز تھے اور انصار کے بہادر نوجوانوں میں شمار ہوتے تھے۔ انہیں سرورِ عالم ﷺ سے نہایت محبت اور عقیدت تھی اور حضور ﷺ بھی انہیں بہت عزیز جانتے تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد بنوسلمہ کا ایک مالدار شخص جد بن قیس ان کا سردار بن گیا۔ حضور ﷺ مدینہ منوّرہ تشریف لائے تو آپ ﷺ نے بنوسلمہ کے لوگوں سے پوچھا کہ اب تمہارا سردار کون ہے۔ انہوں نے عرض کیا جد بن قیس۔ حضور ﷺ نے فرمایا، اسے تم نے سردار کیوں بنایا؟ عرض کیا کہ محض اس کے مالدار ہونے کی وجہ سے، ورنہ وہ پرلے درجے کا بخیل ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا، ''بھلا بخل سے بھی بڑھ کر کوئی بیماری ہے؟ وہ تمہارا

سردار نہیں ہو سکتا۔"

انصارِ بنو سلمہ نے عرض کیا، تو پھر آپ ہی ارشاد فرمائیں۔ آپ نے فرمایا، تمہارا سردار بشر بن براء بن معرور رضی اللہ عنہ ہے۔ چنانچہ اس دن سے حضرت بشر رضی اللہ عنہ بنو سلمہ کے سردار قرار پائے۔

حضرت بشر رضی اللہ عنہ کو بیعتِ عقبہ کے شرف کے بعد اصحابِ بدر میں شامل ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے اُحد اور احزاب میں شجاعانہ خدمات انجام دیں۔ غزوۂ خیبر میں بھی سرورِ عالم ﷺ کے ہمرکاب تھے۔ فتح خیبر کے بعد ایک یہودی عورت زینب بنت حارث نے آپ ﷺ کی خدمت میں بکری کا زہر آلود گوشت پیش کیا۔ اس وقت جتنے صحابہ بارگاہِ نبوی میں موجود تھے۔ حضور ﷺ نے سب کو شریک کر لیا اور سب سے پہلے خود کھانا شروع کیا لیکن ایک لقمہ کھا کر ہاتھ کھینچ لیا اور فرمایا، اس کھانے میں زہر ہے۔ یہ سنتے ہی سب صحابہ رضی اللہ عنہم دست کش ہو گئے۔ اس اثناء میں حضرت بشر رضی اللہ عنہ نے کئی لقمے کھا لیے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ لقمے کا مزا مجھے بھی خراب معلوم ہوا تھا لیکن رسولِ اکرم ﷺ کے سامنے لقمہ اگلنا ادب کے خلاف سمجھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس زہر کے اثر سے بیمار ہو گئے اور ایک روایت کے مطابق وہیں جاں بحق ہو گئے۔ لیکن بعض نے لکھا ہے کہ ایک سال بیمار رہنے کے بعد وفات پائی۔

زینب بنتِ حارث کے انجام کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں، ایک روایت یہ ہے کہ حضور ﷺ نے اس کو بُلا کر باز پرس کی تو اس نے اپنے جرم کا اقبال کیا اور کہا کہ میں نے اس لیے زہر دیا ہے کہ اگر آپ پیغمبر ہیں تو زہر آپ پر اثر نہ کرے گا اور اگر آپ پیغمبر نہیں ہیں تو ہم کو آپ سے نجات مل جائے گی۔ اب میں گواہی دیتی ہوں کہ آپ سچے پیغمبر ہیں۔ پھر اس نے کلمہ شہادت پڑھا تو حضور ﷺ نے اس سے درگزر فرمایا۔

دوسری روایت یہ ہے کہ حضور ﷺ نے اس کو حضرت بشر رضی اللہ عنہ کے قصاص میں قتل کرا دیا۔

تیسری روایت یہ ہے کہ حضور ﷺ نے زینب کو حضرت بشر رضی اللہ عنہ کی وارثوں کے سپرد کر دیا واللہ اعلم بالصواب۔ حضرت بشر رضی اللہ عنہ کا شمار جلیل القدر صحابہ میں ہوتا ہے۔ ان کی کتاب سیرت میں سبقت فی الاسلام، شجاعت و شہامت، جذبہ فدویت اور حضور ﷺ سے والہانہ محبت وعقیدت سب سے نمایاں ابواب ہیں۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ
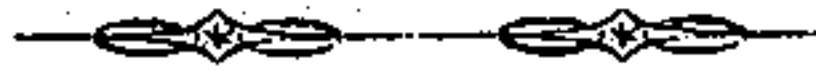
حضرت اوس بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ

خزرج کے خاندان "بنو نجار" سے تھے۔ سلسلہ نسب یہ ہے:

اوس رضی اللہ عنہ بن ثابت بن منذر بن حرام بن عمرو بن زید بن مناۃ بن عدی بن عمرو بن عمرو بن مالک بن نجار بن ثعلبہ بن عمرو بن خزرج۔

حضرت اوس رضی اللہ عنہ، شاعرِ رسول اللہ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے علاتی (پدری) بھائی تھے۔ ان کے اجداد اپنے قبیلہ کے رؤسا میں شمار ہوتے تھے۔ حضرت اوس رضی اللہ عنہ ہجرت نبوی سے پہلے سعادت اندوزِ ایمان ہوئے۔ اور ۱۳ بعدِ بعثت کے موسمِ حج میں مکہ جا کر بیعتِ عقبہ کبیرہ میں شریک ہونے کا عظیم شرف حاصل کیا۔ اس معاملہ میں ان کو اپنے برادرِ بزرگ حضرت حسان رضی اللہ عنہ پر تقدم حاصل ہے۔

رحمتِ دو عالم ﷺ نے مدینہ منورہ کو اپنے قدومِ میمنت لزوم سے مشرف فرمایا اور چند ماہ بعد مہاجرین اور انصار کے مابین عقدِ مواخاۃ قائم کرایا تو اوس رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کا دینی بھائی بنایا۔ اس سے پہلے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئے تھے تو حضرت اوس رضی اللہ عنہ ہی نے ان کو اپنا مہمان بنایا تھا۔

حضرت اوس رضی اللہ عنہ ایک مردِ جانباز تھے اور انہوں نے اپنی جان اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی خوشنودی کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ اب سے پہلے انہوں نے غزوۂ بدر میں اپنی سرفروشی کے جوہر دکھائے اس کے بعد غزوۂ اُحد میں بڑے جوش و خروش سے شریک ہوئے اور کفار کے خلاف مردانہ وار لڑتے ہوئے رتبہ شہادت پر فائز ہوئے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت اَنس بن مالک انصاری رضی اللہ عنہ

(خادمِ رسول اللہ ﷺ)

(۱)

رحمتِ عالم ﷺ نے مکہ سے ہجرت کے بعد یثرب میں نزولِ اجلال فرمایا تو کھجور کے باغات سے گھرے ہوئے اس قدیم شہر پر بہارِ تازہ آ گئی۔ وہ یثرب سے ''مدینۃ النبی ﷺ'' بن گیا۔ اس کی گلی گلی انوارِ نبوّت سے جگمگانے لگی اور اس کا گوشہ گوشہ شمیمِ رسالت کی عطر بیزیوں سے مہکنے لگا۔ اسی زمانے کا ذکر ہے کہ ایک دن مدینہ منورّہ کی ایک باوقار خاتون بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئیں۔ ان کے ساتھ نو دس برس کا ایک خوش رُو بچہ بھی تھا جس کی پیشانی نورِ سعادت سے درخشاں تھی۔ خاتون نے بڑے ادب سے حضور ﷺ کو سلام کیا اور پھر اس بچے کا ہاتھ پکڑ کر یوں عرض پیرا ہوئیں:

''یارسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان یہ میرا لختِ جگر ہے۔ اس کو آپ کی نذر کرتی ہوں، اسے اپنی غلام میں لے لیجئے یہ آپ کی خدمت کیا کرے گا۔''

رحمتِ عالم ﷺ نے خاتون کے جذبۂ اخلاص کی تحسین فرمائی، بچے کے سر پر دستِ شفقت رکھا، اس کے لیے دعائے خیر و برکت مانگی اور پھر ان خاتون کی خواہش کے مطابق اس بچے کو اپنے دامنِ رحمت سے وابستہ کرلیا۔

ارضِ مدینہ کے یہ خوش بخت نونہال جن کو نو دس برس کی عمر میں سرورِ کائنات، فخرِ موجودات سیّد المرسلین صاحب قابَ قوسَین ﷺ کا خادم بننے کا عظیم شرف ہوا اور جو حضور پُرنور ﷺ کے وصال تک دل و جان سے آپ ﷺ کی خدمت کا حق ادا کرتے

رہے، سیّدنا حضرت اَنس بن مالک انصاری رضی اللہ عنہ تھے۔

(۲)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ ان صحابہ کبار میں سے ہیں جن کو اساطینِ اُمّت تسلیم کیا جاتا ہے۔ان کی کنیت ابوحمزہ بھی تھی اور ابوثمامہ بھی۔لقب ''خادمِ رسول اللہ ﷺ'' تھا۔وہ خزرج کے معزز ترین خاندان ''بنونجار'' سے تھے۔نسب نامہ یہ ہے:

انس بن مالک رضی اللہ عنہ بن نضر بن ضمضم بن زید بن حرام بن جندب بن عامر بن غنم بن عدی بن النجّار۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی والدہ کا نام اُمِ سُلیم رضی اللہ عنہا تھا۔ان کا شمار نہایت عظیم المرتبت صحابیات میں ہوتا ہے۔ہجرتِ نبوی سے دو تین سال قبل جب حضرت انس رضی اللہ عنہ کی عمر تقریباً سات آٹھ برس کی تھی، مدینہ منوّرہ میں اسلام کا چرچا پھیلنے لگا۔اُن کی سعید الفطرت والدہ بلا تامّل سعادت اندوزِ اسلام ہوگئیں۔ان کے ساتھ ہی حضرت انس رضی اللہ عنہ کے چچا حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ، خالہ حضرت اُمِ حرام رضی اللہ عنہا اور ماموں حضرت حضرت حرام بن ملحان رضی اللہ عنہ بھی شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہو گئے۔حضرت اُمِ سُلیم رضی اللہ عنہا نے اپنے کمسن فرزند انس رضی اللہ عنہ کو بھی اپنے رنگ میں رنگنا چاہا وہ انہیں کلمہ پڑھاتی تھیں اور شعائرِ اسلامی سکھاتی تھیں۔بدقسمتی سے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے والد مالک بن نضر نہ صرف اپنے آبائی مذہب پر رہے بلکہ حضرت اُمِ سُلیم رضی اللہ عنہا کے قبولِ اسلام پر بھی سخت ناراض ہوئے اور انہیں اپنے فرزند انس رضی اللہ عنہ کو کلمہ پڑھانے سے منع کیا۔لیکن اسلام کا نشہ ایسا نہیں تھا جو کسی ترغیب وتخویف سے اتر جاتا۔حضرت اُمِ سُلیم رضی اللہ عنہا نہایت ثابت قدمی سے اسلام پر قائم رہیں اور ننھے انس رضی اللہ عنہ کو بھی اسی راستے پر چلاتی رہیں۔نتیجہ یہ ہوا کہ میاں بیوی میں سخت کشیدگی پیدا ہوگئی۔مالک بن نضر ناراض ہو کر مدینہ سے شام چلے گئے اور وہیں فوت ہو گئے۔(ایک روایت کے مطابق کسی دشمن نے انہیں قتل کر ڈالا) یہ بیعت عقبہ اولیٰ (۱۲ھ) سے پہلے کا واقعہ ہے۔حضرت اُمِ سُلیم رضی اللہ عنہا اب بیوہ تھیں اور ان کا لاڈلا بچہ

یتیم۔ کچھ مدت بعد ہر طرف سے نکاح کے پیغام آنے لگے لیکن انہوں نے ہر ایک کے جواب میں یہی کہا کہ جب تک انس رضی اللہ عنہ مجلسوں میں اٹھنے بیٹھنے اور گفتگو کرنے کے قابل نہ ہو جائے میں کسی سے نکاح نہیں کر سکتی۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی عمر تقریباً نو برس کی تھی کہ ان کے قبیلہ کے ایک شخص ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے حضرت اُمِ سُلیم رضی اللہ عنہا کو نکاح کا پیغام بھیجا۔ ابو طلحہ رضی اللہ عنہ اس وقت مشرک تھے اور لکڑی کے ایک بت کی پرستش کیا کرتے تھے۔ حضرت اُمِ سُلیم رضی اللہ عنہا نے جواب میں کہلا بھیجا کہ میں خدائے واحد اور اس کے سچے رسول پر ایمان لائی ہوں اور تم ایک خود ساختہ لکڑی کے بُت کے پجاری ہو جو کسی کو نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتا بھلا زندگی کے سفر میں تم میرے ساتھ کیسے بن سکتے ہو؟

ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے حضرت اُمِ سُلیم رضی اللہ عنہا کی باتوں پر غور کیا تو ان میں وزن محسوس ہوا۔ چند دن بعد حضرت اُمِ سُلیم رضی اللہ عنہا کے پاس آئے اور ان سے کہا، مجھ پر حق واضح ہو گیا ہے اور میں تمہارا دین قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔

حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کی بات سن کر حضرت اُمِ سُلیم رضی اللہ عنہا کو بہت خوشی ہوئی اور انہوں نے بے ساختہ کہا:

"پھر مجھے تمہارے ساتھ نکاح کرنے میں کوئی عذر نہیں۔ میرا مہر یہی ہے کہ تم اسلام قبول کر لو۔"

حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ بلا تامل سعادت اندوزِ اسلام ہو گئے اور بقول ابنِ سعد و حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے اپنی والدہ کا نکاح حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ سے پڑھا دیا۔ جلیل القدر صحابی حضرت ثابت بن قیس انصاری رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے کہ میں نے کسی عورت کا مہر اُمِ سُلیم رضی اللہ عنہا کے مہر سے افضل نہیں سُنا۔ ابو طلحہ رضی اللہ عنہ سے نکاح کے بعد حضرت اُمِ سُلیم رضی اللہ عنہا حضرت انس رضی اللہ عنہ کو انہی کے گھر لے گئیں۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ وہیں پرورش پانے لگے۔

(۴)

سرورِ عالم ﷺ نے مدینہ منورّہ کو اپنے قدومِ میمنت لزوم سے مشرف فرمایا تو آپ ﷺ کا پُر جوش استقبال کرنے والوں میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کے والدین بھی تھے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ بھی دوسرے لڑکوں کے ساتھ مل کر فورِ مسرت میں جاء رسول اللہ جاء رسول اللہ (رسول اللہ ﷺ تشریف لائے، رسول اللہ ﷺ تشریف لائے) کے ترانے گا رہے تھے اور سارے شہر میں اچھلتے کودتے ہوئے گشت لگا رہے تھے۔ یہ پُر مسرت دن انہیں عمر بھر یاد رہا۔ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اس دن سے زیادہ مبارک اور پُر مسرت دن کوئی نہیں دیکھا جس میں رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورّہ میں قدم رنجہ فرمایا۔ اس دن مدینہ منورّہ کے درودیوار طلعتِ اقدس سے جگمگا اٹھے۔

ہجرتِ نبوی کی چند دن بعد حضرت اُمِ سُلیم رضی اللہ عنہا نے اپنے لختِ جگر کو حضور ﷺ کا خادم بنا دیا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو اپنے شوہر حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے ہمراہ حضور ﷺ کی خدمت میں بھیجا۔ انہوں نے بارگاہِ رسالت ﷺ میں حاضر ہو کر عرض کیا، یارسول اللہ آپ کے پاس کوئی خادم نہیں ہے، انس رضی اللہ عنہ ایک زیرک اور ہوشیار لڑکا ہے۔ اس کو آپ کی خدمت گاری کے لیے لایا ہوں۔ حضور ﷺ نے حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے جذبہ اخلاص کو دیکھتے ہوئے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو اپنی خدمت گاری کے لیے قبول فرمالیا۔ یہ دن...... حضرت انس رضی اللہ عنہ کی زندگی کا سب سے بڑا "یومِ سعادت" تھا۔ اس دن ان کی زندگی کے اس دورِ مبارک کا آغاز ہوا جس نے انہیں باوجود نو عمر ہونے کے کبار صحابہ رضی اللہ عنہم کی صف میں شامل کر دیا۔ وہ مسلسل دس برس تک سفر و حضر اور خلوت و جلوت میں رحمتِ دو عالم فخرِ موجودات سیّد المرسلین ﷺ کی دل و جان سے خدمت بجالاتے رہے اور اس طویل عرصہ میں حضورِ پُر نور ﷺ کا سحابِ لطف و کرم ان پر جھوم جھوم کر برستا رہا۔ ع

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

(۴)

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے اپنے آقا و مولا ﷺ کی مرضی مبارک کے مطابق اپنے اوقات کو اس طرح ترتیب دیا کہ فجر سے پہلے (منہ اندھیرے) بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں حاضر ہو جاتے تھے اور دوپہر کو تھوڑی دیر کے لیے اپنے گھر واپس آتے تھے۔ پچھلے پہر دوبارہ کاشانہ نبوی ﷺ میں حاضر ہو جاتے اور عصر تک وہیں رہتے۔ نمازِ عصر ادا کر کے گھر واپس آتے۔ بعض اوقات رات گئے تک حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر رہتے۔

رحمتِ عالم ﷺ کے خادمِ خاص ہونے کی وجہ سے حضرت انس رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کو بہت قریب سے دیکھا اور اپنی مستعدی اور فرمانبرداری سے آپ ﷺ کو خوش رکھنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ صحیح بخاری میں ان سے روایت ہے کہ میں نے دس برس اپنے آقا و مولا ﷺ کی خدمت میں گزارے لیکن حضور ﷺ نہ تو کبھی مجھ پر ناراض ہوئے اور نہ کبھی مجھے ڈانٹ ڈپٹ کی یہاں تک کہ کبھی یہ بھی نہ فرمایا کہ فلاں کام کیوں کیا ہے یا فلاں کام کیوں نہیں کیا۔

بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ''شعب الایمان'' میں ان کے یہ الفاظ بھی نقل کیے ہیں کہ اگر کبھی میرے ہاتھ سے کوئی نقصان بھی ہو گیا تو مجھے آپ ﷺ نے اس پر کبھی ملامت نہیں فرمائی۔ اگر گھر والوں میں سے کبھی کسی نے کچھ کہا تو آپ ﷺ نے فرما دیا، رہنے دو کچھ نہ کہو اگر مقدر میں نقصان نہ ہونا ہوتا تو نہ ہوتا۔

مُسندِ احمد بن حنبل میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کاشانہ نبوی ﷺ کے کاموں سے فارغ ہو کر اپنے گھر روانہ ہوئے۔ راستے میں ایک جگہ لڑکے کھیل رہے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ ان کے پاس کھڑے ہو گئے اور تماشا دیکھنے لگے۔ اتنے میں سرورِ عالم ﷺ ادھر تشریف لائے (ایک اور روایت کے مطابق حضور ﷺ نے انہیں کسی کام کے لیے بھیجا تھا لیکن وہ بچوں کے ساتھ کھیل کود میں مشغول ہو گئے۔ جب کافی دیر ہو گئی تو

حضور ﷺ ان کی تلاش میں باہر تشریف لائے۔) لڑکوں نے دور سے حضور ﷺ کو دیکھا تو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے کہا کہ رسول اللہ (ﷺ) تشریف لا رہے ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ گھبرا کر بھاگنے کے بجائے مودبانہ انداز میں وہیں کھڑے رہے۔ حضور ﷺ نے قریب تشریف لا کر ان کا ہاتھ پکڑا اور کسی کام کے لیے جانے کا حکم دیا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ جب تک یہ کام کر کے واپس نہ آئے حضور ﷺ ایک دیوار کے سایہ تلے بیٹھ کر ان کا انتظار فرماتے رہے۔ اس خدمت کی بجا آوری میں انہیں کافی دیر ہو گئی تھی۔ گھر پہنچے تو والدہ حضرت اُمِ سُلیم رضی اللہ عنہا نے تاخیر کا سبب پوچھا۔ انہوں نے کہا، رسول اللہ ﷺ کے ایک کام میں مصروفیت کی وجہ سے دیر ہو گئی۔ حضرت اُمِ سُلیم رضی اللہ عنہا نے پوچھا، کیا کام تھا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے جواب دیا، حضور ﷺ نے کسی کو بتلانے سے منع فرمایا تھا۔ حضرت اُمِ سُلیم رضی اللہ عنہا نے فرمایا، بیٹے یہ بات کبھی کسی کو نہ بتانا۔ چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے یہ بات تمام عمر اپنے نہاں خانہ دل میں محفوظ رکھی اور کبھی کسی کو نہ بتایا کہ حضور ﷺ نے انہیں کس کام کے لیے بھیجا تھا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کو اکثر یہ سعادت نصیب ہوتی تھی کہ نمازِ فجر سے پہلے حضور ﷺ کے لیے سامانِ وضو مہیا کرتے تھے۔ اگر حضرت اُمِ سُلیم رضی اللہ عنہا کو حضور ﷺ کی خدمت میں کوئی چیز پیش کرنی ہوتی تو وہ بسا اوقات حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی کے ہاتھ بھیجا کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ گھر آئے اور حضرت اُمِ سُلیم رضی اللہ عنہا سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ فاقہ سے ہیں کچھ کھانا آپ ﷺ کی خدمت میں بھیج دو۔ انہوں نے چند روٹیاں حضرت انس رضی اللہ عنہ کو دیں اور کہا اسی وقت جا کر حضور ﷺ کو کھانا کھلاؤ۔ جب حضرت انس رضی اللہ عنہ مسجدِ نبوی ﷺ میں پہنچے تو وہاں حضور ﷺ کے گرد بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم کا مجمع تھا۔ حضور ﷺ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا، ابوطلحہ نے تمہیں بھیجا ہے؟ انہوں نے عرض کی ''ہاں یارسول اللہ'' پھر پوچھا ''کھانے کے لیے؟'' انہوں نے کہا ''جی ہاں''۔

حضور ﷺ سب صحابہ رضی اللہ عنہم کو لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے۔ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کو فکر ہوئی کہ اتنے آدمیوں کے لیے کھانا کافی نہ ہوگا۔ حضرت اُمِ سُلیم رضی اللہ عنہا سے کہا، ان سب اصحاب کے لیے کھانے کا کیسے انتظام ہوگا۔ انہوں نے اطمینان سے کہا، یہ بات اللہ اور اللہ کا رسول ﷺ بہتر سمجھتے ہیں۔ پھر جو تھوڑا بہت کھانا موجود تھا انہوں نے رسولِ اکرم ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے سامنے رکھ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں اتنی برکت دی کہ سب نے سیر ہو کر کھایا۔

ایک دن حضرت انس رضی اللہ عنہ معمول کے مطابق نمازِ فجر سے قبل بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے تو حضور ﷺ نے ان سے فرمایا، آج میں روزہ رکھنا چاہتا ہوں، کچھ کھلا دو۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فوراً اٹھے اور کچھ کھجوریں اور پانی لے کر حاضر ہوئے۔ حضور ﷺ نے سحری کھائی اور پھر فجر کی نماز کے لیے تیار ہوئے۔

جہاں حضرت انس رضی اللہ عنہ کو اپنے آقا ﷺ سے بے حد محبت تھی وہاں حضور ﷺ کو بھی ان سے بہت پیار تھا۔ جس زمانے میں وہ حضور ﷺ کی خدمت میں آئے ان کی کوئی کنیت نہ تھی۔ آپ ﷺ کو معلوم ہوا کہ انس رضی اللہ عنہ ''حمزہ'' نام کی ایک سبزی کو بہت پسند کرتے ہیں تو آپ ﷺ نے ان کی کنیت ہی ''ابوحمزہ'' رکھ دی۔ حضور ﷺ حضرت انس رضی اللہ عنہ کو پیار سے ''بیٹا'' یا ''انیس'' کہہ کر بلایا کرتے تھے اور اکثر فرطِ محبت سے ان کے سر پر اپنا دستِ شفقت پھیرا کرتے تھے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ ان کی تعلیم و تربیت پر بھی خاص توجہ فرماتے تھے اور نہایت محبت و شفقت کے ساتھ ان کے کانوں میں نیکی کی باتیں ڈالتے رہتے تھے۔ ترمذی شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا، اے میرے چھوٹے بچے جہاں تک ہو سکے اپنے لیل و نہار اس طرح گزار کہ تیرے دل میں کسی کی جانب سے کھوٹ کپٹ نہ ہو، یہ بات میری سنت ہے اور جس نے میری سنت کو دوست رکھا اس نے مجھ کو دوست رکھا اور جس نے مجھ کو دوست رکھا وہ میرے ساتھ جنت میں ہوگا۔

حضور ﷺ کبھی کبھی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ہنسی مذاق کی باتیں بھی کر لیتے تھے۔ ایک مرتبہ مزاح میں ارشاد فرمایا یا ذالاذنین یعنی اے دو کانوں والے۔

علامہ بلاذری نے "انساب الاشراف" میں لکھا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے والد مالک بن النضر کا شیریں پانی کا کنواں تھا۔ حضور ﷺ اس کا پانی پیا کرتے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کو اکثر اپنے اس کنوئیں کا پانی حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت نصیب ہوتی۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کے سوتیلے والد حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے نہایت مخلص اور جاں نثار صحابی تھے۔ اسی طرح ان کی والدہ حضرت اُمِ سُلیم رضی اللہ عنہا کو بھی حضور ﷺ سے کمال درجے کی عقیدت اور محبت تھی۔ وہ حضور ﷺ کی پردادی سلمیٰ کے بھائی کی پوتی تھیں۔ اسی نسبت سے وہ اور ان کی بہن حضرت اُمِ حرام رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کی خالہ مشہور ہو گئی تھیں۔ اگرچہ یہ رشتہ دور کا تھا لیکن سرورِ عالم ﷺ کے نزدیک اس کی بڑی قدر و قیمت تھی اور آپ ازراہِ شفقت حضرت اُمِ سُلیم رضی اللہ عنہا اور حضرت اُمِ حرام رضی اللہ عنہا دونوں کے گھروں کو اپنے قدومِ میمنت لزوم سے مشرف فرمایا کرتے تھے۔ ہجرت کے چند ماہ بعد حضور ﷺ نے حضرت اُمِ سُلیم رضی اللہ عنہا ہی کے گھر میں مہاجرین اور انصار کو بُلا کر ان کے درمیان عقدِ مواخاۃ قائم فرمایا تھا۔ اہلِ سِیَر کا بیان ہے کہ حضور ﷺ اکثر حضرت اُمِ سُلیم رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لے جاتے، کھجوریں یا کھانا جو کچھ موجود ہوتا، تناول فرماتے۔ دوپہر کا وقت ہوتا تو آرام فرماتے۔ نماز کا وقت آ جاتا تو وہیں چٹائی پر نماز ادا کر لیتے۔ حضور ﷺ سے حضرت اُمِ سُلیم رضی اللہ عنہا کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ آپ ﷺ جب ان کے گھر میں استراحت فرماتے تو وہ آپ ﷺ کا پسینہ مبارک اور گرے ہوئے موئے مبارک ایک شیشی میں تبرک کے طور پر جمع کر لیتی تھیں۔ مسندِ ابوداؤد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میرے سر پر زُلفیں تھیں، میری والدہ ماجدہ نے فرمایا کہ میں ان کو (کبھی) نہ تراشوں گی (یا تراشنے دوں گی) کیونکہ رسول اللہ ﷺ (ازراہِ محبت)

ان کو کھینچا کرتے اور ان پر ہاتھ پھیرا کرتے تھے۔

ایک دفعہ حضور ﷺ حضرت اُمِ سُلیم رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لے گئے تو انہوں نے درخواست کی، یارسول اللہ ﷺ میرے بچے انس رضی اللہ عنہ کے لیے دُعا فرمائیں۔ حضور ﷺ دیر تک دعا فرماتے رہے اور آخر میں فرمایا:

اَللّٰهُمَّ اَكْثِرْ مَالَهٗ وَوَلَدَهٗ وَ اَدْخِلْهُ الْجَنَّةَ

(اے اللہ تو اس کے مال اور اولاد میں کثرت بخش اور اسے جنت میں داخل کر)

اس دعا کا یہ اثر ہوا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ مال و دولت میں تمام انصار سے بڑھ گئے اور اولاد کی کثرت کی یہ کیفیت تھی کہ وفات کے وقت ان کے بیٹے بیٹیوں اور پوتے پوتیوں کی تعداد سو سے اوپر تھی۔

(۵)

۲ھ ہجری میں حق و باطل کا معرکہ اوّل بدر کے میدان میں پیش آیا تو حضرت انس رضی اللہ عنہ کی عمر بارہ برس کی تھی اور وہ لڑائی میں شریک ہونے کے مُکلّف نہیں تھے کیونکہ حضور ﷺ نے لڑائی میں شریک ہونے کے لیے کم از کم پندرہ برس کی عمر مقرر فرمائی تھی۔ تاہم وہ کم عمری کے باوجود میدانِ بدر میں پہنچ گئے اور حضور ﷺ کی خدمت گزاری کا فرض انجام دیا۔ بعض لوگوں کو ان کی شرکتِ بدر میں اس بناء پر شک تھا کہ ان کی عمر اس وقت پندرہ برس سے کم تھی لیکن ایک مرتبہ جب خود ان سے اس بارے میں استفسار کیا گیا تو انہوں نے فرمایا، میں بدر میں کیسے غیر حاضر رہ سکتا تھا؟ چنانچہ غزوۂ بدر کے بعض واقعات ان سے مروی ہیں۔

۳ھ میں غزوۂ اُحد پیش آیا تو اس وقت بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ کی عمر لڑائی کے قابل نہیں تھی لیکن انہوں نے اس موقع پر بھی بڑے ذوق وشوق سے حضور ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔ بعد میں وہ اس غزوے کے چشم دید واقعات لوگوں کو سنایا کرتے تھے۔ صحیح بخاری میں ان سے روایت ہے کہ میرے چچا جن کا نام بھی میری طرح

انس (یعنی انس بن نضر رضی اللہ عنہ) تھا۔ وہ غزوۂ بدر میں شریک نہ تھے۔ اس پر انہوں نے ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کی، یارسول اللہ سب سے پہلے لڑائی جو آپ مشرکوں سے لڑے، میں اس میں موجود نہ تھا لیکن اگر اب کوئی لڑائی آپ ﷺ کی مشرکوں سے ہوئی تو اللہ تعالیٰ جان لے گا کہ میں کیا کرتا ہوں، پھر جب اُحد کی جنگ کا موقع آیا اور مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے تو میری چچا انس رضی اللہ عنہ نے یوں دعا کی کہ اے اللہ میں ان میدان سے ہٹنے والے مسلمانوں کے لیے تجھ سے معافی طلب کرتا ہوں اور ان مخالف مشرکوں کے ظلم و تعدّی سے بیزاری ظاہر کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر مشرکوں کی طرف بڑھے، سامنے ایک صحابی حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ملے تو میرے چچا نے ان سے کہا، اے سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ! اب تو جنت حاصل کرنے کا موقع ہے۔ خدا کی قسم مجھے تو اُحد کی طرف سے جنت کی خوشبو آ رہی ہے (یہ کہہ کر تلوار چلاتے ہوئے لشکرِ کفار میں گھس گئے یہاں تک کہ شہید ہو گئے) ہم نے ان کے بدن پر کچھ اوپر اسی زخم پائے کچھ تلوار کے، کچھ نیزہ کے اور کچھ تیروں کے۔ دشمنوں نے ان کے کان ناک وغیرہ کاٹ لیے تھے ہم تو اُن کو پہچان نہ سکے ہاں ان کی ہمشیرہ (حضرت رُبَیّع بنتِ نضر رضی اللہ عنہا) نے ان کی انگلی کی ایک پور سے ان کو پہچانا۔

ایک اور روایت میں کہتے ہیں کہ اُحد کے دن جب مسلمان اِدھر اُدھر منتشر ہونے لگے تو صرف حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ اپنی ڈھال سے حضور ﷺ کو محفوظ کیے ہوئے تھے۔ وہ بہت اچھے تیر اندازوں میں تھے۔ ان کی کمان کی تانت بہت سخت تھی اور اس روز دو یا تین کمانیں توڑ چکے تھے۔ جب حضور ﷺ سر مبارک اٹھا کر دشمنوں کی طرف دیکھتے تو ابوطلحہ رضی اللہ عنہ عرض کرتے یا نبی اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں سر اوپر نہ اٹھائیں مبادا کوئی تیر آ کر لگ جائے۔ میرا سینہ آپ کے آگے رہے۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور اُمِ سُلیم رضی اللہ عنہا مشکوں میں پانی بھر بھر کر لا رہی تھیں۔ ان کے پیروں کے زیور نظر آ رہے تھے۔ وہ زخمیوں کے منہ میں پانی ٹپکاتیں۔ پانی ختم ہو جاتا تو

اور لاتیں اور ان زخمیوں کے منہ میں ڈالتیں۔

اُحد کے بعد حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ۵ ہجری میں غزوۂ احزاب اور اس سے متصل غزوۂ بنو قریظہ میں سرورِ عالم ﷺ کی ہم رکابی کا شرف حاصل کیا۔

۶ ہجری میں حدیبیہ کے مقام پر بیعتِ رضوان کا مہتم بالشان واقعہ پیش آیا اس میں جن اصحاب رضی اللہ عنہم نے سرورِ عالم ﷺ کے دستِ مبارک پر مرنے مارنے کی بیعت کی۔ اللہ تعالیٰ نے کھلے لفظوں میں ان کو اپنی خوشنودی کی بشارت دی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ بھی ان خوش بخت اصحاب میں شامل تھے۔

بیعتِ رضوان کے بعد حضرت انس رضی اللہ عنہ غزوۂ خیبر میں والہانہ ذوق وشوق سے شریک ہوئے۔ مسندِ ابوداؤد میں ان سے روایت ہے کہ میں نے جنگِ خیبر میں رسول اللہ ﷺ کو ایک گدھے پر سوار دیکھا جس کی باگ کھجور کی چھال کی بنی ہوئی تھی۔ اسی روایت میں وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ گدھے پر بھی سوار ہو جاتے، صوف کا بُنا ہوا کپڑا بھی پہن لیتے اور غلام کی دعوت بھی قبول فرما لیتے۔

مسندِ احمد رحمۃ اللہ علیہ میں ہے کہ فتح کے بعد (داخلہ خیبر کے وقت) حضرت انس رضی اللہ عنہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ اونٹ پر سوار تھے اور حضور ﷺ کی سواری کے اس قدر قریب تھے کہ ان کے قدم حضور ﷺ کے قدم مبارک کو چھو گئے۔ جلدی سے اپنا قدم پیچھے ہٹایا تو وہ حضور ﷺ کی ازار مبارک سے الجھ گیا جس سے اِزار مبارک اس طرح کھسک گئی کہ آپ ﷺ کے زانوں سے اقدس کی سفیدی لوگوں کو نظر آ گئی۔ عام حالات میں حضور ﷺ اپنے زانوئے مبارک کا عریاں ہونا کبھی گوارا نہ فرماتے لیکن اس موقع پر آپ ﷺ نے عفو درگزر سے کام لیا اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مطلق باز پرس نہ فرمائی۔

ذیقعدہ ۷ ہجری میں رحمتِ عالم ﷺ عمرۃ القضا کے لیے مکہ تشریف لے گئے۔ اس موقع پر جن جاں نثاروں کو آپ ﷺ کی معیت کا شرف حاصل ہوا۔ حضرت

انس رضی اللہ عنہ بھی ان میں شامل تھے ۸ ہجری میں فتح مکہ کے موقع پر بھی وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب تھے اس کے بعد انہوں نے حنین اور طائف کے معرکوں میں دادِ شجاعت دی۔ ۹ھ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جھلسا دینے والی گرمی میں تبوک کے طویل سفر کی صعوبتیں جھیلیں۔ اس کے بعد ۱۰ ہجری میں حجۃ الوداع میں شریک ہونے کی سعادت حاصل کی۔ ۱۱ ہجری میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے وصال فرمایا تو حضرت انس رضی اللہ عنہ پر کوہِ غم ٹوٹ پڑا۔ ترمذی شریف میں ان سے روایت ہے کہ جس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں داخل ہوئے تو تمام مدینہ جگمگا اٹھا اور جس دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو تمام مدینہ تاریک تھا، اور ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مٹی دے کر ابھی اپنے ہاتھ جھاڑنے بھی نہ پائے تھے کہ اپنے قلوب کی حالت دیکھی تو دگرگوں تھی۔

اپنے شفیق آقا و مولا صلی اللہ علیہ وسلم کی مفارقت کے صدمہ جانکاہ کو حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بڑے صبر اور حوصلے کے ساتھ برداشت کیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سریر آرائے خلافت ہوئے تو حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بلا تامل خلیفۃ الرسول رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی۔ اس وقت ان کی عمر صرف بیس برس کی تھی لیکن دانائے کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے مسلسل دس ۱۰ سال کے فیضِ صحبت نے انہیں گوناگوں صلاحیتوں کا مالک بنا دیا تھا چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مشورہ سے انہیں بحرین کا عامل مقرر فرمایا۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے عہدِ صدیقی میں مرتدین کے خلاف بعض معرکوں میں بھی حصہ لیا۔ اس سلسلہ کی سب سے سخت لڑائی مسیلمہ کذاب کے خلاف یمامہ کے میدان میں لڑی گئی۔ اس لڑائی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کے بھائی حضرت براء بن مالک رضی اللہ عنہ نے محیر العقول شجاعت دکھائی۔ قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ بھی اس معرکے میں موجود تھے۔ حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ''الاصابہ'' میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ حضرت براء رضی اللہ عنہ نے مسیلمہ کی جنگ کے دن باغ والوں پر (یعنی مرتدین پر جنہوں نے باغ کی چاردیواری کے اندر مورچہ بنا رکھا

تھا) تنِ تنہا تیر اندازی کی اور ان سے لڑتے رہے یہاں تک کہ باغ کا دروازہ کھول دیا۔ اس وقت ان کے جسم پر تیروں اور تلواروں کے اسی ۸۰ سے زیادہ زخم تھے۔ انہیں وہاں سے علاج کے لیے اپنے خیمے میں پہنچایا گیا اور ان کی تیمارداری کے لیے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو وہاں ایک ماہ ٹھہرنا پڑا۔

(۶)

۱۳ھ ہجری میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ مسند نشینِ خلافت ہوئے تو حضرت انس رضی اللہ عنہ کو جذبہ جہاد نے بے تاب کر دیا۔ وہ امیر المومنین سے اجازت لے کر ایران کے میدانِ رزم میں پہنچ گئے اور عہدِ فاروقی کے بہت سے معرکوں میں اپنی فروشی کے جوہر دکھائے۔ ان کے جانباز بھائی حضرت براء بن مالک رضی اللہ عنہ بھی ان معرکوں میں ان کے ساتھ تھے۔ علامہ بلاذری رحمۃ اللہ علیہ نے ''انساب الاشراف'' میں لکھا ہے کہ اسی زمانے میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ اور حضرت براء رضی اللہ عنہ کو بصرے میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے خلاف حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کے الزامات کی تحقیق کے لیے مقرر کیا تھا۔

اکثر مورخین نے معرکہ حریق اور فتح شوستر (تستر) کے سلسلے میں حضرت انس رضی اللہ عنہ اور حضرت براء رضی اللہ عنہ کا ذکر خصوصیت سے کیا ہے۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ اور حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ اور ان کے بھائی براء بن مالک رضی اللہ عنہ عراق کے ایک مقام حریق میں دشمن کے ایک قلعے کے محاصرے میں شریک تھے۔ دشمن گرم زنجیروں میں لوہے کے آنکڑے لگا کر مسلمانوں کی طرف پھینکتے اور جو مسلمان قلعے کی دیوار کے قریب ہوتا اس کو اوپر کھینچ لیتے تھے۔ ایک موقع پر حضرت انس رضی اللہ عنہ دیوار کے قریب گئے یا اس پر چڑھنے کی کوشش کی تو وہ بھی دشمن کے آنکڑے میں پھنس گئے۔ وہ انہیں اوپر کھینچ ہی رہے تھے کہ حضرت براء رضی اللہ عنہ کی نظر پڑ گئی۔ وہ لپک کر ادھر گئے اور زنجیر کو اس زور سے جھٹکا دیا کہ اوپر کی رسی ٹوٹ گئی اور حضرت انس رضی اللہ عنہ زمین پر آ گرے۔

گرم زنجیر کھینچنے سے حضرت براء رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کا تمام گوشت جل گیا اور ہڈیاں نکل آئیں۔ چونکہ حضرت انس رضی اللہ عنہ زیادہ اوپر سے نہیں گرے تھے، اس لیے معمولی چوٹ آئی جو جان بچ جانے کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی۔

معرکہ شوستر میں حضرت انس رضی اللہ عنہ پیدل فوج کے افسر تھے اور حضرت براء رضی اللہ عنہ میمنہ کے۔ شوستر کا محاصرہ بہت دن تک جاری رہا اس دوران میں ایرانیوں کی مسلمانوں سے کئی جھڑپیں ہوئیں جن میں حضرت انس رضی اللہ عنہ اور حضرت براء رضی اللہ عنہ نے کمال شجاعت دکھائی اور ایرانیوں کو ہر بار قلعے میں دھکیل دیا۔ اثنائے محاصرہ میں ایک دن حضرت انس رضی اللہ عنہ، حضرت براء رضی اللہ عنہ کے خیمے میں گئے۔ وہ بڑے لَے کے ساتھ کچھ اشعار پڑھ رہے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا، بھائی اللہ نے آپ کو قرآن عطا فرمایا ہے جو ان اشعار سے بہتر ہے۔ اس کو لحن سے پڑھیے۔ انہوں نے کہا، انس رضی اللہ عنہ شاید تمہیں یہ ڈر ہے کہ کہیں میں بستر پر نہ مر جاؤں لیکن خدا کی قسم ایسا نہ ہوگا، میں جب مروں گا میدان میں مروں گا۔

اللہ نے حضرت براء رضی اللہ عنہ کی قسم یوں پوری کی کہ وہ اسی معرکے میں نہایت بہادری سے لڑتے ہوئے ایرانیوں کے سپہ سالار ہرمزان کے ہاتھ سے شہید ہو گئے۔ بہر حال حضرت براء رضی اللہ عنہ اور دوسرے مجاہدین کی سرفروشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایرانیوں کو ذلت انگیز شکست ہوئی اور ہرمزان اپنے اہل و عیال سمیت مسلمانوں کے ہاتھ اسیر ہو گیا۔ اسے اسلامی لشکر کے سپہ سالار حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے اسے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے ساتھ بارگاہِ خلافت میں روانہ کر دیا۔ اس سفر میں ہرمزان کی حفاظت کے لیے تین سو سوار حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ماتحتی میں تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ہرمزان کو بحفاظت مدینہ منورہ پہنچا دیا جہاں اس نے اسلام قبول کر لیا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ میدانِ جہاد ہی کے شیر نہیں تھے بلکہ آسمانِ علم و فضل کے ماہتاب بھی تھے۔ بصرہ آباد ہونے کے کچھ عرصہ بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے محسوس کیا کہ

وہاں کے لوگوں کو فقہ کی تعلیم کے لیے کچھ معلمین کی ضرورت ہے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے فضلاء صحابہ میں سے ایک جماعت منتخب کی جس میں حضرت انس رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ امیر المومنین نے نو یا دس اصحاب پر مشتمل اس جماعت کو ضروری ہدایات دے کر بصرہ روانہ کیا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بصرہ پہنچ کر وہیں مستقل اقامت اختیار کر لی اور باقی زندگی اسی شہر میں گزاری۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت عثمان ذُوالنّورَین رضی اللہ عنہ مسند آرائے خلافت ہوئے تو حضرت انس رضی اللہ عنہ شروع سے اخیر تک ان کے وفادار اور بہی خواہ رہے۔ ان کی خلافت کے آخری دور میں باغیوں نے فتنہ انگیزی کی انتہا کر دی۔ یہاں تک کہ انہوں نے مدینہ منوّرہ پہنچ کر کاشانہ خلافت کا محاصرہ کر لیا۔ بصرہ میں ان واقعات کی اطلاع پہنچی تو حضرت انس رضی اللہ عنہ، حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ اور وہاں پر موجود دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بے تاب ہو گئے اور انہوں نے اہلِ بصرہ کو امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی امداد کے لیے آمادہ کیا۔ لیکن یہ امداد بھی مدینہ منوّرہ پہنچنے بھی نہ پائی تھی کہ امیر المومنین کی شہادت کا واقعہ پیش آیا، اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان لڑائیوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس پُر آشوب زمانے میں حضرت انس رضی اللہ عنہ نے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور کسی لڑائی یا جھگڑے میں حصہ نہیں لیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد بھی وہ عرصہ تک حیات رہے لیکن بالعموم گوشہ نشین ہی رہے۔ امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے عہد میں وہ کچھ عرصہ اہلِ بصرہ کی امامت کرتے رہے۔ عبدالملک بن مروان کے عہدِ خلافت میں حجاج بن یوسف ثقفی بصرہ کا امیر مقرر ہوا تو اس نے حضرت انس رضی اللہ عنہ پر بڑی سختی کی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ حجاج نے حضرت انس رضی اللہ عنہ پر مخالفین بنوامیّہ کی حمایت کرنے کا الزام لگایا اور لوگوں کی نظروں میں گرانے کے لیے ان کی گردن پر مہر لگوا دی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے نہایت صبر وتحمل سے یہ سزا برداشت کی لیکن گھر آ کر خلیفہ عبدالملک کو ایک خط لکھا جس میں حجاج کے

ظلم اور دھمکیوں کی روئداد بیان کی۔ عبدالملک ''خادمِ رسول اللہ ﷺ'' کا خط پڑھ کر تھرّا اٹھا اور اس نے حجاج کو ایک سخت عتاب آمیز خط لکھا جس میں اس کو حکم دیا کہ فوراً حضرت انس رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے معافی مانگو۔ خلیفہ کا خط ملتے ہی حجاج اپنی درباریوں سمیت حضرت انس رضی اللہ عنہ کی خدمت میں گیا اور بڑی لجاجت سے معافی مانگی حضرت انس رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے بڑا وسیع ظرف عطا فرمایا تھا انہوں نے نہ صرف اس کو معاف کر دیا بلکہ اس کی درخواست پر عبدالملک کو اپنی خوشنودی کا خط بھی لکھ دیا۔

۹۳ھ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ بیمار پڑے۔ اس وقت عمر کی ۱۰۳ منزلیں طے کر چکے تھے۔ اہلِ خانہ، عقیدت مندوں اور شاگردوں نے علاج معالجہ اور خبر گیری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی لیکن ضعف روز بروز بڑھتا گیا۔ جب جانبری کی کوئی امید نہ رہی تو اپنے شاگردِ خاص ثابت بنانی رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا کہ میری زبان کے نیچے رسول اللہ ﷺ کا موئے مبارک رکھ دو۔ انہوں نے تعمیلِ ارشاد کی۔ اسی حالت میں روحِ مطہر عالمِ بالا کو پرواز کر گی اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ اس وقت سوائے ایک صحابی حضرت ابوالطفیل رضی اللہ عنہ کے کرۂ ارض پر کوئی اور صاحب رسول رضی اللہ عنہ موجود نہ تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی وفات کی خبر پھیلی تو لوگوں کا ایک جم غفیر جنازے میں شریک ہونے کے لیے امڈ آیا۔ قطن رحمۃ اللہ علیہ بن مدرک کلاب نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور پھر ہزاروں لوگوں نے بادیدۂ گریاں اسلام کے اس بطلِ جلیل کو بصرہ کے قریب موضع طف میں سپردِ خاک کر دیا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ نہایت کثیر الاولاد تھے۔ اہلِ سیَر کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اسی لڑکے اور تین لڑکیاں عطا کی تھیں ان کے علاوہ بیس سے زیادہ پوتے بھی وفات کے وقت موجود تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے کئی صاحبزادے فنِ حدیث میں شیخ اور امام کا درجہ رکھتے تھے۔ مشہور بصری محدث ابو عُمَیر عبدالکبیر بن محمد بن عبداللہ بن حفص بن ہشام (متوفی ۲۹۱ھ) بھی انہیں کی اولاد میں سے ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کو اپنی اولاد سے

بہت محبت تھی اور وہ اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کو خود تعلیم دیا کرتے تھے۔

(۷)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا شمار آسمانِ ہدایت کے ان درخشندہ ستاروں میں ہوتا ہے جن کے علم وفضل کی ضوفشانی نے سارے عالمِ اسلام کو جگمگا دیا۔ روایتِ حدیث کے اعتبار سے وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طبقہ اول میں ہیں اور ان سے ۱۲۸۶ احادیث مروی ہیں۔ ان میں سے ۸۰ صحیح بخاری میں اور ۷۰ صحیح مسلم میں منفرد ہیں۔ ۱۸۰ احادیث متفق علیہ ہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے سرچشمہ وحی سے اکتساب کے علاوہ مندرجہ ذیل کبار صحابہ رضی اللہ عنہم وصحابیات رضی اللہ عنہن سے بھی استفادہ کیا:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ، حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا بنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ، حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ، حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ، حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ، حضرت اُمِ سُلیم رضی اللہ عنہا (والدہ) حضرت اُمِ حرام رضی اللہ عنہا (خالہ) حضرت اُمّ الفضل رضی اللہ عنہا (اہلیہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ عمِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم)۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کے دریائے علم سے سیراب ہونے والوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ چند ممتاز تلامذہ کے اسماء گرامی یہ ہیں:

حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ، سلیمان تیمی رحمۃ اللہ علیہ، ثابت بنانی رحمۃ اللہ علیہ، قتادہ رحمۃ اللہ علیہ، ابوقلابہ رحمۃ اللہ علیہ، حمید الطویل رحمۃ اللہ علیہ، ثمامہ بن عبداللہ بن انس رضی اللہ عنہ، اسحٰق بن ابی طلحہ رحمۃ اللہ علیہ، ابوعثمان رحمۃ اللہ علیہ، جعد رحمۃ اللہ علیہ، ابوبکر بن عبداللہ مزنی رحمۃ اللہ علیہ، یحیٰی بن سعید رحمۃ اللہ علیہ، محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ، انس بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ، ربیعۃ الرائے رحمۃ اللہ علیہ، سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ، سلمہ بن وردان رحمۃ اللہ علیہ

مسندِ احمد رحمۃ اللہ علیہ میں ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ روایتِ حدیث میں بہت محتاط تھے۔

جب حدیث روایت کر چکتے تو غایت احتیاط کی بناء پر کہا کرتے تھے:

او کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

(یا جیسے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا)

جن حدیثوں کو سمجھنے میں لوگوں کو غلط فہمی ہو سکتی تھی، حضرت انس رضی اللہ عنہ انہیں بیان ہی نہیں کرتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ حدیث روایت کرتے وقت وضاحت کر دیتے تھے کہ میں نے یہ براہِ راست رسول اللہ ﷺ سے سنی ہے یا فلاں صاحبِ رسول ﷺ ہے۔

علمِ حدیث کے علاوہ حضرت انس رضی اللہ عنہ علم فقہ میں بھی درجہ تبحر رکھتے تھے۔ مختلف دینی مسائل کے بارے میں ان کے بے شمار فتاویٰ اور اجتہادات کتابوں میں موجود ہیں جو ان کے تفقہ فی الدین کا بیّن ثبوت ہیں۔ وہ ان چند فقہائے صحابہ میں سے تھے جنہیں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اہلِ بصرہ کو فقہ کی تعلیم دینے کے لیے منتخب فرمایا تھا۔ بصرہ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کے حلقہ درس کو اس قدر مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی کہ تمام عالمِ اسلام کے شائقینِ علم کھنچ کھنچ کر وہاں پہنچنے لگے یہاں تک کہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ سے بھی طلبہ بصرہ آ کر ان کے حلقہ درس میں شریک ہوتے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نہایت باقاعدگی اور تسلسل کے ساتھ سالہا سال تک لوگوں کو تعلیم دیتے رہے۔ وہ بڑے بلیغ انداز میں درس دیا کرتے تھے۔ اگر مجلس درس میں کوئی شخص سوال کرتا تو نہایت خندہ پیشانی سے اس کا جواب دیتے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ذاتِ گرامی ساٹھ ستّر برس تک علم کی جوئے رواں بنی رہی جس سے علم کا ہر جویا بقدرِ ظرف سیراب ہوتا رہا۔

(۸)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کے صحیفہ اخلاق میں حُبّ رسول ﷺ، اتباعِ سُنّت، شغفِ علم، شجاعت، شوقِ جہاد، امر بالمعروف اور حق گوئی سب سے نمایاں ابواب ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ہوش کی آنکھیں کھولیں تو اپنے گھرانے پر شروع دن ہی سے اسلام کو پرتو فگن دیکھا۔ ان کی والدہ حضرت اُمِ سُلیم رضی اللہ عنہا، سوتیلے والد حضرت

ابوطلحہ رضی اللہ عنہ، چچا حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ، بھائی حضرت براء بن مالک رضی اللہ عنہ، خالہ حضرت اُمِ حرام رضی اللہ عنہا اور ماموں حضرت حرام رضی اللہ عنہ ملحان سبھی حضور سرورِ عالم ﷺ کے نہایت مخلص شیدائی تھے۔ خاندان میں ہر وقت ذاتِ رسالت مآب ﷺ اور آپ ﷺ کی دعوت کا چرچا ہوتا رہتا تھا۔ اسی پاکیزہ ماحول نے کمسن انس رضی اللہ عنہ کے دل میں حضور پُرنور ﷺ کی محبت کا بیج بو دیا۔ اس کے بعد ان کو مسلسل دس برس تک رحمتِ دو عالم ﷺ کی خدمت کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس دوران میں ان کو حضور ﷺ کے بے مثل اخلاقِ عالی نے اتنا متاثر کیا کہ وہ اپنے شفیق آقا و مولا ﷺ کے عاشقِ صادق بن گئے۔ انہوں نے خلوت وجلوت، سفر وحضر، بزم ورزم ہر حالت میں حضور ﷺ کی اس تندہی اور ذوق وشوق سے خدمت کی کہ آپ ﷺ ہمیشہ ان سے خوش رہے۔ حضور ﷺ نے وصال فرمایا، تو حضرت انس رضی اللہ عنہ کی دنیا اندھیر ہو گئی لیکن اپنے آقا ﷺ ہی کے ارشاد کے مطابق انہوں نے جزع فزع کے بجائے صبر سے کام لیا اور اپنے آپ کو حضور ﷺ کی تعلیمات اور ارشادات امت تک پہنچانے کے لیے وقف کر دیا۔ تاہم رحمتِ عالم ﷺ کی یاد ان کو ہر وقت تڑپاتی رہتی تھی ان کی کوئی مجلس ایسی نہ تھی جس میں حضور ﷺ کا ذکرِ خیر نہ ہو۔ عہدِ رسالت کا کوئی واقعہ کسی سے سنتے یا خود بیان کرتے تو آنکھیں نم ہو جاتیں اور شدّتِ تاثر سے آواز بھرّا جاتی۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا کہ اپنے آپ پر بالکل قابو نہ رہتا اور سخت بے چینی کے عالم میں مجلس سے اٹھ کھڑے ہوتے جب تک گھر پہنچ کر تبرکاتِ نبوی کی زیارت نہ کر لیتے کل نہ پڑتی تھی۔ ایک دن سرورِ عالم ﷺ کا حلیہ بیان کر رہے تھے "میں نے کبھی کوئی ریشم رسول اللہ ﷺ کی ہتھیلی سے زیادہ نرم نہیں چھوا اور نہ کوئی خوشبو حضور ﷺ کے بدن مبارک سے زیادہ خوشبودار سونگھی......" اسی طرح بیان کرتے کرتے فرطِ محبت سے اتنے بے قرار ہوئے کہ گریہ طاری ہو گیا اور زبان پر بے اختیار یہ الفاظ آ گئے:

"قیامت کے دن رسول اللہ ﷺ کی زیارت نصیب ہو گی تو عرض کروں گا

یارسول اللہ آپ کا ادنیٰ غلام انس حاضر ہے۔''

حضور ﷺ سے بے پناہ محبت اور عقیدت کا یہ اثر تھا کہ انہیں اکثر خواب میں سید الانام ﷺ کی زیارت نصیب ہو جاتی تھی۔

اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ ان کو دنیا کی ہر شے سے محبوب تر تھے۔ صحیح بخاری میں خود ان سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تین باتیں ایسی ہیں جو کسی شخص میں پائی جائیں تو گویا اس نے ایمان کی حلاوت پالی۔ ایک یہ کہ اللہ اور اس کا رسول اس کو ساری دنیا سے عزیز تر ہو۔ دوسرے یہ کہ جس سے محبت کرے، اللہ کی خاطر کرے۔ تیسرے یہ کہ اسلام لانے کے بعد کفر کی طرف لوٹ جانے کو ایسا ہی ناپسند کرے جیسا کہ آگ میں پڑ جانے کو ناپسند کرتا ہے۔

ایک اور روایت میں فرماتے ہیں کہ کسی نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا، قیامت کب آئے گی۔ آپ ﷺ نے فرمایا، تم نے قیامت کے لیے کیا سامان مہیا کیا ہے۔ عرض کیا، یارسول اللہ، میں تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو محبوب رکھتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا، بس جس سے محبت رکھتے ہو اس کے ساتھ تمہارا حشر ہو گا۔ حضور ﷺ کا یہ ارشاد سن کر ہم لوگوں کو جتنی خوشی ہوئی کبھی کسی دوسری بات سے نہیں ہوئی۔ مجھے امید ہے کہ نبی ﷺ اور حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے محبت کے باعث ان کے ساتھ رہوں گا حالانکہ میرے اعمال ان جیسے نہیں ہیں۔

اپنی اولاد اور عامۃ الناس کی تربیت کے لیے حضور ﷺ کے اخلاقِ عالی کا ذکر بڑے لطف و انبساط سے کیا کرتے تھے اس سلسلے میں ان سے مروی چند احادیث ملاحظہ کیجیے:

- رسول اللہ ﷺ نے کبھی کسی کھانے میں عیب نہیں نکالا۔ اگر آپ ﷺ کو پسند ہوتا تو تناول فرما لیتے اگر ناپسند ہوتا تو چھوڑ دیتے۔ (صحیح بخاری)
- رسول اللہ ﷺ سے جب کبھی کسی شخص نے کوئی چیز مانگی آپ نے اسے وہ

چیز دے دی۔ ایک دفعہ ایک شخص آپ ﷺ کے پاس آیا۔ آپ ﷺ نے ایک وادی میں چرتی ہوئی (اپنی تمام) بکریاں اسے عطا کر دیں۔ وہ شخص اپنی قوم میں واپس جا کر کہنے لگا کہ محمد ﷺ تو ایسے شخص کی طرح دیتے ہیں جس کو افلاس اور محتاجی کا ڈر ہی نہ ہو۔ بعض دفعہ کوئی شخص محض مال حاصل کرنے کے لیے مسلمان ہوتا لیکن تھوڑے ہی دنوں میں اسلام اس کو دنیا و مافیہا سے پیارا ہو جاتا۔ (صحیح مسلم)

○ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ سے اس بات پر راضی ہوتا ہے کہ جب وہ کوئی لقمہ بھی کھائے تو اللہ تعالیٰ کی حمد کرے اور جب پانی کا گھونٹ پیئے تو اللہ تعالیٰ کی حمد کرے۔ (صحیح مسلم)

○ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص چاہتا ہے کہ اس کے رزق میں کشائش ہو اور اس کے مرنے کے بعد اس کا ذکرِ خیر باقی رہے تو چاہیے کہ رشتہ داروں سے حسنِ سلوک کرے۔ (صحیح بخاری)

○ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے وہ کچھ پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ (صحیح بخاری)

○ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ بیٹا جب تو اپنے گھر میں داخل ہو تو گھر والوں کو سلام کیا کر۔ یہ بات تیرے اور تیرے گھر والوں کے لیے برکت کا باعث ہو گی۔ (ترمذی شریف)

○ رسول اللہ ﷺ کچھ بچوں کے پاس سے گزرے۔ آپ ﷺ نے ان کو سلام کیا۔ حضور ﷺ کی یہی عادت مبارک تھی۔ (صحیح بخاری)

○ مدینہ کی لونڈیوں میں سے کوئی لونڈی رسول اللہ ﷺ کا دستِ مبارک پکڑتی اور پھر اپنی ضرورت عرض کرنے کے لیے جہاں مرضی ہوتی حضور ﷺ کو لے جاتی۔ (صحیح بخاری)

○ رسول اللہ ﷺ کی یہ عادت مبارک تھی کہ جب آپ ﷺ اپنے بستر پر

جاتے تو یوں دعا فرماتے کہ سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جس نے ہمیں کھلایا اور پلایا اور ہماری ضرورتیں پوری کیں اور ہم کو آرام کرنے کی جگہ دی۔ کئی لوگ ایسے ہیں کہ جن کی نہ ضرورت پوری ہوئی نہ ان کو آرام کرنے کی جگہ ملی۔ (صحیح مسلم)

سرورِ عالم ﷺ کی حیاتِ طیبہ ہر وقت حضرت انس رضی اللہ عنہ کے پیشِ نظر رہتی تھی اس لیے اپنے ہر کام میں حضور ﷺ کی متابعت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ عبادات ہوں یا معاملات وہ ہر بات میں حضور ﷺ کے اسوۂ حسنہ پر عمل کرتے تھے۔ نماز میں خشوع و خضوع کا یہ عالم ہوتا تھا کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے انہیں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو فرمایا، میں نے ابنِ اُمِ سُلیم رضی اللہ عنہا (انس رضی اللہ عنہ) سے بڑھ کر کسی کو رسول اللہ ﷺ کے مشابہ نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا جذبہ اتباعِ سُنّت اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ کبھی کوئی کام رسولِ اکرم ﷺ کو ایک دفعہ بھی کرتے دیکھا تو اس کی بھی تقلید کی کوشش کرتے تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے دیکھا تھا کہ حضور ﷺ نے بچوں کو سلام کرنے میں سبقت فرمائی۔ اس کے بعد وہ ساری عمر حتیٰ کہ ایامِ پیری میں بھی بچوں کو سلام کرنے میں سبقت کرتے رہے۔

ایک مرتبہ سفر میں نماز کا وقت آ گیا۔ انہوں نے اونٹ کی پیٹھ پر ہی نماز پڑھ لی۔ اونٹ قبلہ رُخ نہ تھا، تلامذہ نے اس پر حیرت کا اظہار کیا تو فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو ایک دفعہ اسی طرح نماز پڑھتے دیکھا تھا۔

ایک دفعہ ایک ہی کپڑے میں نماز پڑھ رہے تھے اسی کو باندھ اور اوڑھ رکھا تھا۔ ابراہیم بن ربیعہ رحمۃ اللہ علیہ نے انھیں اس طرح نماز پڑھتے دیکھا تو بہت حیران ہوئے۔ جب حضرت انس رضی اللہ عنہ نماز پڑھ چکے تو ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا، آپ ایک کپڑے میں نماز پڑھتے ہیں؟ فرمایا ہاں میں نے حضور ﷺ کو بھی ایک کپڑے میں نماز پڑھتے دیکھا تھا (مسندِ احمد بن حنبل میں ہے کہ حضور ﷺ نے سب سے آخری نماز جو حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے پڑھی تھی ایک کپڑے میں ادا فرمائی تھی۔)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کو تحصیلِ علم کا اس قدر شوق تھا کہ نہ صرف فیضان نبوی سے مسلسل دس برس تک براہِ راست بہرہ یاب ہوتے رہے بلکہ کبار صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی مقدور بھر استفاضہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم و فضل کا ''مجمع البحرین'' بن گئے۔ پھر اس علم کو اپنے تک محدود نہ رکھا بلکہ ساری عمر اس کی اشاعت کرتے رہے۔

شجاعت و بسالت میں بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ جوانانِ انصار میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ نہایت ماہر قدر انداز اور اعلیٰ درجے کے شہسوار تھے۔ گھڑ دوڑ کے مقابلوں میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ بچپن میں اس قدر تیز دوڑتے تھے کہ ایک دفعہ جنگلی خرگوش کا تعاقب کر کے اسے پکڑ لیا حالانکہ ان کے سب ہم عمر لڑکے ناکام لوٹے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ اپنے بچوں کو دینی تعلیم کے علاوہ تیر اندازی بھی سکھایا کرتے تھے اگر ان کا نشانہ چوک جاتا تو خود ایسا تاک کر نشانہ لگاتے کہ تیر اپنے ہدف پر جا لگتا۔ جہاد کا اس قدر شوق تھا کہ باوجود نوعمر ہونے کے عہدِ رسالت کے نو غزوات میں شریک ہوئے اور حضور ﷺ کے وصال کے بعد عہدِ فاروقی کے بہت سے معرکوں میں اپنی تلوار کے جوہر دکھائے۔ امر بالمعروف اور حق گوئی کے معاملے میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کو نہ لومۃ لائم کی پروا تھی اور نہ کسی بڑی سے بڑی شخصیت کی۔ نہ ان کو غلط کام سے ٹوکنے میں باک تھا اور نہ حق بات کہنے سے جھجکتے تھے۔ ایک مرتبہ مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنی امارتِ بصرہ کے زمانے میں شہر کے ایک معزز انصاری کو سازش کے شبہ میں گرفتار کر لیا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کو علم ہوا تو وہ فوراً دارالامارت تشریف لے گئے۔ مصعب مسندِ امارت پر بیٹھے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا، رسول اللہ ﷺ نے امراء اور حکام کو وصیت فرمائی ہے کہ انصار سے خاص رعایت کی جائے، ان کے اچھوں سے اچھا سلوک کیا جائے اور جو بُرے ہیں ان کے معاملہ میں چشم پوشی اور درگزر سے کام لیا جائے۔

مصعب نے ''خادمِ رسول اللہ ﷺ'' سے یہ حدیث سنی تو مسند سے اتر کر اپنا

رخسار فرش پر رکھ دیا اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ مبارک سر آنکھوں پر ہیں ان کو رہا کرتا ہوں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ اموی حکومت کے ایک امیر حکم بن ایوب کے مکان پر تشریف لے گئے، وہاں دیکھا کہ لوگ ایک مرغی کے پاؤں باندھ کر اس پر نشانہ لگا رہے ہیں۔ جب تیر لگتا تو وہ پھڑ پھڑانے لگتی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ غصے سے بے تاب ہو گئے اور فرمایا، رسول اللہ ﷺ نے ایسی حرکت سے منع فرمایا ہے۔ بے زبان جانوروں کے معاملے میں خدا سے ڈرو۔

حجاج بن یوسف ثقفی کے بیٹے نے ایک مرتبہ قاضی بصرہ بننے کی خواہش کی۔ حجاج اس کو اس عہدہ پر فائز کرنا چاہتا تھا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کو خبر ہو گئی وہ حجاج کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا جو شخص قضا یا امارت کی خواہش کرے، رسول اللہ ﷺ نے اس عہدہ پر ایسے شخص کے تقرر کی ممانعت فرمائی ہے۔

کربلا کے واقعہ ہائلہ کے بعد حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا سرِ اقدس عراق کے گورنر عبید اللہ بن زیاد کے سامنے لایا گیا تو اس موقع پر حضرت انس رضی اللہ عنہ بھی دربار میں موجود تھے۔ عبید اللہ نے اپنے ہاتھ کی چھڑی سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی چشمِ مبارک پر مارتے ہوئے آپ ﷺ کے خدوخال کے بارے میں رکیک الفاظ استعمال کیے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا چہرہ مبارک غصے سے سرخ ہو گیا اور انہوں نے فرمایا:

"جانتے ہو یہ (سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا) چہرہ رسول اللہ ﷺ کے روئے انور سے مشابہ ہے۔"

ایک مرتبہ خلیفہ عبد الملک اموی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو انصار کی ایک جماعت کے ہمراہ دمشق بلایا۔ وہاں سے واپسی کے سفر میں فج الناقہ کے مقام پر عصر کا وقت آیا تو حضرت انس رضی اللہ عنہ دو رکعت نماز پڑھا کر اپنے خیمے میں تشریف لے گئے۔ ان کے ساتھیوں نے چار رکعتیں پوری کیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو وہ سخت ناراض

ہوئے اور فرمایا، لوگوں کو کیا ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی رعایت سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ وہ زمانہ آنے والا ہے جب لوگ دین میں بال کی کھال نکالیں گے لیکن حقیقت میں وہ دین کی روح سے ناآشنا ہوں گے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایامِ شہزادگی میں اموی حکومت کی طرف سے مدینہ منورہ کے گورنر مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کا قیام بھی مدینہ منورہ میں تھا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے شاہی خاندان میں پرورش پائی تھی اور دینی مسائل سے کچھ زیادہ واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ لوگوں کو نماز پڑھاتے وقت کوئی نہ کوئی غلطی ہو جاتی تھی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ ان کو ہمیشہ ٹوک دیتے تھے۔ ان کی بار بار کی روک ٹوک سے حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کی طبیعت میں تکدر پیدا ہوا۔ ایک دن حضرت انس رضی اللہ عنہ سے کہا کہ یہ آپ میرے پیچھے کیوں پڑے رہتے ہیں اور میری مخالفت پر ہر وقت کمر بستہ ہونے کا کیا سبب ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میں نے رسول اللہ ﷺ کو جس طرح نماز پڑھتے دیکھا ہے اگر آپ بھی اسی طرح نماز پڑھائیں تو مجھ سے زیادہ کوئی خوش نہ ہوگا۔ ورنہ پھر میں آپ کے ساتھ نماز پڑھنا ہی ترک کر دوں گا۔''

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نہایت نیک نہاد اور سعید الفطرت تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے ارشاد سے بہت متاثر ہوئے اور ان سے درخواست کی کہ آپ مجھے رموزِ دین کی تعلیم دیں۔ ان کو کیا عذر ہو سکتا تھا فوراً حامی بھر لی اور تھوڑی ہی مدت میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کو رموزِ شریعت سے واقف کر دیا۔ اب وہ ایسی معتدل نماز پڑھانے لگے کہ خود حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بدیں الفاظ اس کا اعتراف کیا کہ اب اس نوجوان کی نماز حضور نبی کریم ﷺ کی نماز کے عین مشابہ ہے۔

ایک مرتبہ عبیداللہ بن زیاد والی عراق کی مجلس میں حوضِ کوثر کا ذکر آیا تو اس نے اس

کے وجود میں شک کا اظہار کیا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کو اس کی خبر ہوئی تو بے چین ہو گئے۔ اٹھ کر سیدھے عبید اللہ کے دربار میں گئے اور اس کو حوضِ کوثر کے بارے میں رسولِ اکرم ﷺ کے ارشادات سے آگاہ کیا۔ جب تک وہ قائل نہ ہو گیا واپس تشریف نہ لائے۔

ایک مرتبہ عصر کی نماز کے لیے تیار ہو رہے تھے کہ کچھ لوگ ملاقات کے لیے آ گئے۔ انہوں نے پوچھا کس وقت کی نماز کی تیاری ہے؟ فرمایا عصر کی۔ انہوں نے کہا ہم تو ابھی ظہر پڑھ کر آ رہے ہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سخت برہم ہوئے اور فرمایا، لوگ بیکار بیٹھے رہتے ہیں اور نماز کے لیے نہیں اٹھتے۔ جب وقت تنگ ہو جاتا ہے تو جلدی سے اٹھ کر مرغ کی طرح چار چونچیں مار لیتے ہیں۔ یہ منافق کی نماز ہوتی ہے مومن کی نہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کو جس طرح اللہ تعالیٰ نے نہایت پاکیزہ سیرت سے نوازا تھا اسی طرح ان کو نہایت دلکش اور پاکیزہ صورت بھی عطا کی تھی۔ بہت خوبرو اور موزوں اندام تھے چہرے پر نور برستا تھا۔ مزاج میں بڑی نفاست اور پاکیزگی تھی۔ بالوں میں مہندی لگایا کرتے تھے اور خوشبودار چیزوں کو بہت پسند کرتے تھے۔ خلوق نام کی ایک خوشبو جس کی زردی سے چمک پیدا ہوتی تھی۔ اس قدر مرغوب تھی کہ اکثر اپنے ہاتھوں میں ملا کرتے تھے۔ بڑھاپے میں دانت ہلنے لگے تو ان کو سونے کے تاروں سے کسوایا۔ انگوٹھی پہنتے تھے اور صاف ستھرا عمدہ لباس زیب تن فرماتے تھے۔ اس معاملے میں ان کے پیشِ نظر یہ حدیث ہوتی تھی کہ اللہ تمہیں اپنی نعمتوں سے نوازے تو ایسا لباس پہنو جس سے نعمت کا اظہار ہو...... کھلی آب و ہوا بہت پسند تھی۔ اس لیے بصرہ کے نواح میں طف کے دیہاتی مقام پر ایک عالیشان وسیع مکان بنوایا تھا اور اسی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہیں ایک باغ بڑے شوق سے لگایا جس میں پھلدار پودے اور پھول کثرت سے تھے۔ یہ باغ سال میں دو بار پھلتا تھا اور اس میں پھولوں کی ایک ایسی قسم

تھی جو مشک کی طرح مہکتی تھی۔

نہایت خوش خوراک تھے دستر خوان پر اکثر چپاتی اور گوشت ہوتا تھا۔ کبھی کبھی گوشت میں ترکاری بھی ہوتی تھی۔ لوکی کا موسم ہوتا تو اکثر گوشت کے ساتھ یہی پکواتے کیونکہ ان کے آقا و مولا ﷺ کو لوکی بہت مرغوب تھی۔ نہایت فیاض اور کریم النفس تھے۔ کھانے کے وقت جتنے شاگرد موجود ہوتے ان کو باصرار کھانے میں شریک کر لیتے تھے۔

صبح کا ناشتہ ۳ یا ۵ اور بعض اوقات اس سے کچھ زیادہ چھوہاروں پر مشتمل ہوتا۔ پانی پیتے تو اسے تین وقفوں میں ختم کرتے۔

گفتگو بہت صاف اور جچی تلی ہوتی بالعموم ہر جملہ کی تین بار تکرار فرماتے۔ مُسندِ احمد میں ہے کہ کسی کے مکان پر تشریف لے جاتے تو تین بار اندر جانے کی اجازت طلب کرتے۔

بے حد بردبار اور انکسار پسند تھے اگرچہ نہایت بلند مرتبہ صحابی تھے، اونچے درجے کے رئیس اور صاحبِ علم و فضل بھی تھے لیکن عوام الناس سے ہر جگہ اور ہر وقت بڑی بے تکلفی سے ملتے تھے۔ اسی طرح شاگردوں میں بھی گھل مل جاتے تھے اور ان کو اپنی تعظیم کے لیے کھڑا ہونے سے روکتے تھے۔ اکثر فرماتے کہ ہم بیٹھے ہوتے اور رسول اللہ ﷺ تشریف لاتے تو ہم میں سے کوئی تعظیم کے لیے کھڑا نہ ہوتا یہ اس لیے کہ حضور ﷺ ایسے تکلفات کو ناپسند فرماتے تھے اور نہ آپ سے بڑھ کر ہم کو کوئی محبوب نہ تھا...... غرض حضرت انس رضی اللہ عنہ گوناگوں اوصاف و محاسن کا یک پیکرِ جمیل تھے۔ انہوں نے اپنی سیرت اور کردار کے جو نقوش صفحۂ تاریخ پر مرتسم کیے وہ آج بھی ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

حضرت مُبشّر بن عبدالمنذر انصاری رضی اللہ عنہ

قبیلہ اوس کی شاخ بنو عمرو بن عوف میں سے ہیں۔ سلسلہ نسب یہ ہے:

مبشّر رضی اللہ عنہ بن عبدالمنذر بن زنبر بن زید بن اُمیہ بن زید بن مالک بن عوف بن عمرو بن عوف بن مالک بن اوس۔

والدہ کا نام نُسَیبہ تھا۔ وہ بھی بنو عمرو بن عوف سے تھیں۔ ان کا نسب نامہ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح دیا ہے:

نُسَیبہ بنت زید بن ضبیعہ بن زید بن مالک بن عوف بن عمرو بن عوف

ہجرتِ نبوی ﷺ سے پہلے مشرّف بہ اسلام ہوئے۔ ان کے خاندان کی سکونت قباء میں تھی۔ سرورِ عالم ﷺ نے ہجرت کے بعد قباء میں نزولِ اجلال فرمایا تو قبیلہ عمرو بن عوف ہی کو آپ ﷺ کا شرفِ میزبانی حاصل ہوا۔ قیامِ قباء کے دوران میں مدینہ سے سبھی اکابرِ خزرج حضور ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے لیکن ان میں بنو نجار کے نقیب حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ (جو آپ ﷺ کے نہایت مخلص شیدائی تھے) نہیں تھے۔ حضور ﷺ نے اہلِ قباء سے ان کے بارے میں دریافت فرمایا تو حضرت مبشّر بن عبدالمنذر، ان کے بھائی ابولبابہ رفاعہ بن عبدالمنذر رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد بن خثیمہ اوسی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:

''یارسول اللہ! سعد نے جنگِ بعاث میں ہمارے ایک رئیسِ قبیلہ نتبل بن حارث کو قتل کر دیا تھا اس لیے وہ یہاں آنے سے ہچکچاتے ہیں۔''

دوسرے دن حضور ﷺ نے ان تینوں کو بُلا کر فرمایا: ''میری خواہش ہے کہ تم لوگ

اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کو پناہ دو۔

انہوں نے عرض کیا، اگر آپ کی یہی مرضی مبارک ہے تو ہمیں بسر و چشم منظور ہے۔ چنانچہ حضرت سعد بن خثیمہ رضی اللہ عنہ فوراً حضرت اسعد رضی اللہ عنہ کے مکان پر پہنچے اور ان کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اپنے قبیلہ میں لے آئے۔ بنو عمرو بن عوف کے دوسرے اصحاب کو حضور ﷺ کی خواہش کا علم ہوا تو ان سب نے بھی حضرت اسعد رضی اللہ عنہ کو پناہ دے دی۔ چند ماہ بعد حضور ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخاۃ قائم فرمائی تو حضرت مُبَشّر رضی اللہ عنہ کو حضرت عاقل بن ابی بکیر رضی اللہ عنہ کا دینی بھائی بنایا۔

رمضان المبارک ۲ھ میں غزوۂ بدر الکبریٰ پیش آیا۔ حضرت مُبَشّر رضی اللہ عنہ اس میں بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ شریک ہوئے اور جانبازانہ لڑتے ہوئے ایک مشرک ابو ثور کے ہاتھ سے جامِ شہادت پیا۔

بعض نے لکھا ہے کہ وہ اُحُد میں لاولد شہید ہوئے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ انہوں نے خیبر میں شہادت پائی لیکن جمہور اہلِ سِیَر کے نزدیک وہ غزوۂ بدر ہی میں شہید ہوئے۔

نامور صحابی حضرت ابولبابہ رفاعہ رضی اللہ عنہ، حضرت مبشّر رضی اللہ عنہ کے بھائی تھے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ
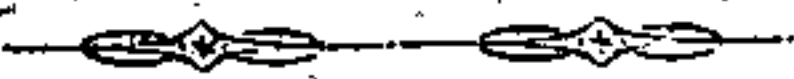
حضرت نعمان بن مالک انصاری رضی اللہ عنہ

ان کا تعلق خزرج کے خاندان ''بنو قوقل'' سے تھا۔

سلسلہ نسب یہ ہے:

نعمان بن مالک بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ بن رعد بن فہر بن ثعلبہ بن غنم بن عوف بن خزرج۔

نہایت مخلص اور پُر جوش مسلمان تھے۔ سب سے پہلے غزوۂ بدر میں اپنی تلوار کے جوہر دکھائے۔ ۳ ہجری میں سرورِ عالم ﷺ غزوۂ اُحد کے لیے روانہ ہوئے تو حضرت نعمان رضی اللہ عنہ بھی حضور ﷺ کے ہمرکاب تھے۔ چلنے سے پہلے انہوں نے بارگاہِ رسالت میں عرض کیا:

''یارسول اللہ، خدا کی قسم میں جنت میں ضرور داخل ہوں گا۔

حضور ﷺ نے فرمایا ''وہ کیسے؟''

عرض کیا: ''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور یہ کہ میں لڑائی سے ہرگز نہ بھاگوں گا''

حضور ﷺ نے فرمایا: ''تم سچ کہتے ہو۔''

لڑائی شروع ہوئی تو حضرت نعمان رضی اللہ عنہ نے سرفروشی کا حق ادا کر دیا اور بالآخر جامِ شہادت پی کر جنت میں پہنچ گئے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کی قسم کی لاج رکھ لی۔ ایک روایت میں ہے کہ انہیں صفوان بن امیہ نے شہید کیا۔

بعض علماءِ سِیَر نے حضرت نعمان بن مالک رضی اللہ عنہ اور حضرت نعمان الاعرج رضی اللہ عنہ کو ایک ہی شخصیت خیال کیا ہے لیکن فی الحقیقت وہ دو الگ شخصیتیں ہیں اگرچہ دونوں ہم جد

تھے۔ نعمان الاعرج رضی اللہ عنہ کے پردادا کا نام احرم (اصرم) بن فہر تھا اور نعمان بن مالک رضی اللہ عنہ کے پردادا کا نام رعد بن فہر تھا۔ اس کے علاوہ نعمان الاعرج رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ کو اپنے جنت میں داخل ہونے کے لیے قسم دلائی تھی اور نعمان بن مالک رضی اللہ عنہ نے خود قسم کھائی تھی کہ میں جنت میں داخل ہوں گا۔ (والعلم عند اللہ)

رضی اللہ تعالیٰ عنہ
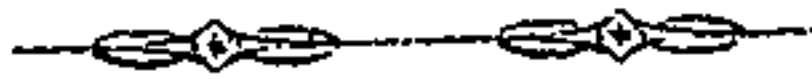
حضرت سعد بن عُبادہ ساعدی انصاری رضی اللہ عنہ

(۱)

رحمتِ عالم ﷺ ایک دن مسجدِ نبوی ﷺ میں رونق افروز تھے۔ کئی جان نثار بھی بارگاہِ رسالت میں حاضر تھے اور حضور ﷺ کے ارشاداتِ عالیہ سے مستفیض ہو رہے تھے۔ اتنے میں کسی نے آ کر خبر دی کہ آپ ﷺ کے ایک مدنی جاں نثار سخت بیمار ہیں۔ حضور ﷺ یہ خبر سن کر بے چین ہو گئے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کرام کو ساتھ لے کر عیادت کے لیے ان کے گھر تشریف لے گئے۔ اس سے پہلے حضور ﷺ کبھی ان کے گھر تشریف لے جاتے تھے تو وہ فرطِ مسرت سے بے خود ہو جاتے تھے اور آپ ﷺ کے استقبال کے لیے دیدہ و دل فرشِ راہ کو دیا کرتے تھے، لیکن آج حضور ﷺ نے ان کے گھر کو اپنے قُدومِ میمنت لزوم سے مشرّف فرمایا اور انھیں خبر تک نہ ہوئی۔ درد کی شِدّت نے انہیں دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا تھا۔ ایسے بے ہوش تھے کہ دیکھنے والوں کو ان کے مردہ ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ کسی نے کہا، فوت ہو گئے ہیں۔ کچھ بولے، ابھی دم باقی ہے۔ حضور ﷺ کو ان کی حالت دیکھ کر اس قدر صدمہ ہوا کہ آپ ﷺ پر رقت طاری ہو گئی اور آنکھوں سے سیلِ اشک رواں ہو گیا۔ آپ ﷺ کو دیکھ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی رونے لگے، تاہم حضور ﷺ نے سب کو دلاسا دیا، بیمار کے لیے صحت کی دعا فرمائی اور با دیدۂ نم تشریف لے گئے۔ یہ علیل صاحبِ رسول، جن کے ساتھ سیّد الانام ﷺ کو ایسا قلبی لگاؤ تھا، سیدّنا حضرت سعد بن عبادہ ساعدی انصاری رضی اللہ عنہ تھے۔

سیّدنا حضرت سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ کا شمار نہایت عظیم المرتبت صحابہ میں ہوتا ہے۔ وہ خزرج کی شاخ ''بنو ساعدہ'' کے چشم و چراغ تھے اور امارت و ریاست ان کے گھر کی کنیز

تھی، اسی لیے سیّد الخزرج کے لقب سے مشہور تھے۔کنیت ابوقیس بھی تھی اور ابوثابت بھی۔نسب نامہ یہ ہے:

سعد رضی اللہ عنہ بن عُبادہ بن دُلَیم بن حارثہ بن ابی خزیمہ بن ثعلبہ بن طریف بن خزرج بن ساعدہ بن کعب بن خزرج اکبر

والدہ کا نام عمرہ بنتِ مسعود رضی اللہ عنہا تھا۔ان کو بھی قبولِ اسلام اور صحابیت کا شرف حاصل ہوا۔حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے دادا دُلَیم اور والد عبادہ اپنے خاندان ساعدہ کے سردار اور قبیلہ خزرج کے مقتدر رؤسا میں سے تھے۔وہ صرف نام ہی کے رئیس نہ تھے بلکہ دل کے بھی رئیس تھے۔اور ان کے دسترخوان سے ہزاروں لوگ پرورش پاتے تھے۔دُلَیم کے زمانے سے ان کے خاندان میں یہ دستور تھا کہ ہر روز قلعہ پر سے ایک شخص اعلان کرتا تھا کہ جس شخص کو عمدہ اور لذیذ کھانا، گوشت اور روغن مطلوب ہو وہ آئے اور ہمارے ہاں قیام کرے۔دُلَیم کی اس دعوتِ عام سے مسافر اور مقامی سبھی لوگ مستفید ہوتے تھے۔ اس طرح دُور دُور تک ان کی سخاوت اور فیاضی کا شہرہ ہو گیا تھا۔ان کا خاندانی بُت مناۃ تھا۔ہر سال مکہ جا کر دس اونٹ اس کی نذر کے طور پر ذبح کیا کرتے۔دُلَیم کے بعد عُبادہ اور عبادہ کے بعد سعد رضی اللہ عنہ نے بھی اپنی خاندانی روایات کو برقرار رکھا اور اپنی جود و سخا کی دھاک بٹھا دی۔اسلام سے پہلے عرب میں لوگ بالعموم جاہل تھے اور بہت کم آدمی ایسے تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔حافظ ابنِ حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ مدینہ کے ان چند آدمیوں میں سے تھے جو زمانہ جاہلیت میں نہایت عمدہ عربی لکھ لیتے تھے۔انہیں صرف نوشت و خواند ہی کا ملکہ نہیں تھا بلکہ وہ ایک ماہر قدر انداز اور تیراک بھی تھے۔اسی لیے لوگوں میں ''کامل'' کے لقب سے مشہور تھے۔

(۲)

سنہ ۱۱ بعدِ بعثت میں مدینہ کے چھ سعادت مند خزرجی مکہ سے مسلمان ہو کر واپس آئے تو خزرج کے گھر گھر اسلام کا چرچا ہونے لگا۔حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو اللہ

تعالیٰ نے فطرتِ سعید عطا کی تھی، وہ بھی اسی زمانے میں شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہو گئے۔ اگرچہ بعض روایات میں ہے کہ وہ بیعتِ عقبہ کبیرہ (۱۳ نبوت) میں سعادت اندوزِ اسلام ہوئے لیکن صحیح یہی ہے کہ وہ اس سے پہلے حلقہ بگوشِ اسلام ہو چکے تھے۔ ۱۳ بعدِ بعثت میں اہلِ مدینہ کا ایک بڑا قافلہ حج کے لیے مدینہ سے مکہ روانہ ہونے لگا، تو حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سمیت ۷۵ اہلِ ایمان بھی اس قافلے میں شامل ہو گئے۔ یہی وہ بلند ہمت اور جری نفوس تھے جو ایک مقررہ رات کی تاریکی میں اپنے مشرک ساتھیوں سے الگ ہو کر عقبہ کی گھاٹی میں سرورِ عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ ﷺ کی بیعت کی اور اس عہد کے ساتھ حضور ﷺ کو مدینہ تشریف لانے کی دعوت دی کہ اپنی جانوں مالوں اور اولادوں کے ساتھ آپ ﷺ کی حفاظت اور حمایت کریں گے۔ بیعت کے بعد اہلِ مدینہ نے حضور ﷺ کے ارشاد کے مطابق اپنے میں سے بارہ نقیب منتخب کیے۔ ان میں نو خزرجی تھے اور تین اوسی۔ خزرجی نقباء میں ایک حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ تھے۔ تاریخ میں یہ مہتم بالشان واقعہ بیعتِ عقبہ ثانیہ بیعتِ عقبہ کبیرہ یا بیعت لیلۃ العقبہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہی واقعہ سرورِ عالم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ہجرت الی المدینہ کی تمہید بنا۔ اگرچہ بیعتِ عقبہ کبیرہ کا انعقاد بالکل خفیہ ہوا پھر بھی مشرکین مکہ کے کانوں میں کسی نہ کسی طرح اس کی بھنک پڑ گئی۔ وہ علی الصباح اہلِ قافلہ کے پاس گئے اور ان سے کہا:

> ''اے گروہِ خزرج ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تم لوگوں نے ہمارے خلاف جنگ آزما ہونے کے لیے محمد (ﷺ) سے بیعت کی ہے۔''

یثرب (مدینہ) کے مشرکین کو اس بیعت کا کوئی علم نہ تھا، وہ قسمیں کھانے لگے کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ ان کے سردار عبداللہ بن اُبی نے کہا اگر ایسا کوئی واقعہ ہوتا تو مجھ سے کبھی پوشیدہ نہ رہ سکتا تھا۔

عمائدِ قریش اس جواب پر مطمئن ہو کر واپس چلے گئے، لیکن جلد ہی انہیں اصل واقع

کا علم ہو گیا۔ اب وہ اہلِ قافلہ کے تعاقب میں نکلے۔ قافلہ تو نکل چکا تھا، لیکن بدقسمتی سے حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ اور حضرت مُنذِر بن عمرو رضی اللہ عنہ اس سے بچھڑ گئے تھے۔ مشرکین نے انہیں اَذاخِر (یا حاجز) کے مقام پر جا لیا۔ مُنذِر رضی اللہ عنہ تو کسی طرح ان کی گرفت سے نکل گئے، مگر حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ ان کے پنجہ ستم میں گرفتار ہو گئے۔ ظالموں نے کجاوے کے تسموں سے ان کے ہاتھ گردن سے باندھ دیئے اور ان کو مارتے پیٹتے اور سر کے بال پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے مکہ لائے۔ اب جو کوئی آتا ان کو زدوکوب کرتا اور ان کے سر کے بال پکڑ کر کھینچنا شروع کر دیتا۔ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ''میں جب مکے میں قریش کا ہدفِ ستم بنا ہوا تھا، ایک گورا چٹا، روشن چہرے والا وجیہہ شخص مجھے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ (یہ شخص سہیل بن عمرو تھے جو فتح مکہ کے بعد اسلام لائے) میں نے دل میں خیال کیا کہ اگر مجھے کسی شخص سے شریفانہ سلوک کی اُمید ہو سکتی ہے تو وہ یہی شخص ہو گا، لیکن جب وہ میرے قریب آیا تو اس نے اس زور سے میرے منہ پر تھپڑ (گھونسا) مارا کہ میرا منہ پھر گیا۔ اب میں نے سمجھ لیا کہ یہ سب کے سب ظالم اور سیاہ باطن ہیں۔ اتنے میں ایک اور شخص آیا (یہ ابوالبختری بن ہشام تھا) اس نے مجھ سے کہا، ''ارے بھائی اس طرح کب تک مار کھاتے رہو گے، کیا مکہ میں تمہاری کسی سے شناسائی نہیں ہے؟'' میں نے کہا، ''ہاں میں حارث بن امیہ (بن عبد شمس بن عبد مناف) اور جُبَیر بن مطعِم بن عدی کو جانتا ہوں۔ یہ دونوں تجارت کے سلسلے میں ہمارے شہر یثرب آتے جاتے رہتے ہیں، میں نے بارہا ان کے تجارتی قافلوں کی حفاظت کی ہے......اس نے کہا تو پھر ان دونوں کا نام لے کر دہائی دو اور لوگوں کو بتاؤ کہ تمہارے اور ان کے درمیان کیا تعلق ہے۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ اُدھر وہ شخص شہر گیا اور ان دونوں کو حرم کعبہ میں موجود پا کر کہا، خزرج کا ایک آدمی اَبطح میں اہلِ مکہ کے ہاتھوں بُری طرح پٹ رہا ہے اور وہ تم دونوں کے نام کی دُہائی دے رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ اس کے اور تمہارے درمیان جوار (پناہ) کا تعلق ہے۔ انہوں نے پوچھا، وہ اپنا نام کیا بتاتا ہے؟ اس نے کہا، سعد بن

عبادہ۔ اُنہوں نے کہا، غضب ہو گیا۔ یہ سعد تو قبیلہ خزرج کا رئیس اعظم ہے اور خدا کی قسم جو کچھ وہ کہہ رہا ہے بالکل سچ ہے۔ وہ ہمیشہ ہمیں پناہ دیتا رہا ہے اور اس نے یثرب میں کبھی کسی کو ہم پر ظلم کرنے کے اجازت نہیں دی۔ پھر وہ دوڑتے ہوئے آئے اور مجھے ان ظالموں کے پنجے سے نجات دلائی۔''

حضرت سعد رضی اللہ عنہ رہائی پا کر مدینہ کی طرف روانہ ہوئے تو راستے میں انہیں اپنے انصاری بھائی واپس مکہ کی جانب آتے ملے وہ انہی کی تلاش میں آ رہے تھے اب انہیں ساتھ لے کر مدینہ کی جانب روانہ ہو گئے۔

ہجرت کے بعد رحمتِ عالم ﷺ نے مدینہ میں نزولِ اجلال فرمایا تو انصار نے والہانہ جوش و خروش سے آپ ﷺ کا استقبال کیا، حضرت سعد رضی اللہ عنہ بھی ان میں شامل تھے۔ حضور ﷺ بنو ساعدہ کے محلے سے گزرے تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر عرض کیا،'' یارسول اللہ میرا غریب خانہ حاضر ہے اس کو شرف اقامت بخشیے۔'' حضور ﷺ نے ان کو دعائے خیر و برکت دی اور فرمایا۔''میری اونٹنی کو چلنے دو، جہاں حکم ہے وہیں جا ٹھہرے گی۔''

سیّد الانام ﷺ کا شرف میزبانی اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مقدر میں لکھ رکھا تھا، چنانچہ آپ ﷺ کی اونٹنی انہیں کے دروازے کے سامنے جا کر بیٹھ گئی اور خانہ ابوایوب انوارِ رسالت ﷺ سے جگمگانے لگا۔ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضور ﷺ کے دارِ ابوایوب رضی اللہ عنہ میں رونق افروز ہوتے ہی انصار کے گھروں سے انواع و اقسام کے کھانے آپ ﷺ کی خدمت میں پہنچنے شروع ہو گئے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ بن عبادہ کے گھر سے عراق اور ثرید سے بھرا ہوا ایک بڑا برتن آپ ﷺ کی خدمت میں پہنچا۔ حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ''الاصابہ'' میں لکھا ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ اکثر حضور ﷺ کی خدمت میں کھانا بھیجا کرتے تھے۔ ہجرت کے پہلے سال کے اخیر (یا دوسرے سال کے آغاز میں) حضور ﷺ غزوۂ ابوآء کے لیے تشریف لے گئے تو

حضرت سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ کو مدینہ منورہ میں اپنا جانشین بنا کر چھوڑ گئے۔

رمضان ۲ھ میں غزوۂ بدرالکبریٰ سے پہلے حضور ﷺ کو مکہ سے لشکرِ قریش کی روانگی کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ نے دشمن سے نبرد آزما ہونے کے بارے میں اپنے جان نثاروں سے مشورہ فرمایا۔ مہاجرین میں سے بعض اصحاب نے نہایت ولولہ انگیز تقریریں کیں اور حضور ﷺ کو یقین دلایا کہ وہ راہِ حق میں جان کی بازی لگا دیں گے۔ ان کے جذبہ فدویت نے حضور ﷺ کو بہت مسرور کیا تاہم آپ ﷺ نے فرمایا کہ اب دوسرے اصحاب بھی رائے دیں۔ اس ارشاد کا مقصد انصار کی مرضی معلوم کرنا تھا کیونکہ انصار نے بیعت لیلۃ العقبہ میں صرف یہ اقرار کیا تھا کہ وہ مدینہ منورہ میں آپ ﷺ کی حفاظت اور مدد کریں گے۔ یہ نہیں کہا تھا کہ وہ مدینہ منورہ سے باہر نکل کر بھی آپ ﷺ کی حمایت میں لڑیں گے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کا منشاء سمجھ گئے، انہوں نے اٹھ کر عرض کیا:

''یارسول اللہ شاید آپ ہماری مرضی معلوم کرنا چاہتے ہیں۔''

حضور ﷺ نے فرمایا: ''ہاں'' حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:

''اے اللہ کے رسول ﷺ، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر آپ ﷺ ہمیں سمندر میں کودنے کا حکم دیں تو ہم بلا تامل کود جائیں گے۔ اور خشکی کا حکم ہو تو ہم برک الغماد (یمن کا ایک دور دراز مقام) تک اونٹوں کے کلیجے پگھلا دیں گے۔''

ایک روایت کے مطابق یہ الفاظ سیّد الاوس حضرت سعد بن معاذ اشہلی انصاری رضی اللہ عنہ کی زبان سے ادا ہوئے۔ حضرت سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ دونوں اپنے اپنے قبیلے کے سر برآوردہ رئیس تھے اس لیے مستبعد نہیں کہ دونوں نے اپنے جذبہ فدویت کا اظہار ایک دوسرے سے ملتے جلتے الفاظ میں کیا ہو۔ بہر صورت سرورِ عالم ﷺ ان کے پُر جوش اظہارِ فدویت پر اس قدر خوش ہوئے کہ چہرۂ

مبارک چمک اٹھا اور آپ ﷺ نے تیاری کا حکم دے دیا۔

ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ غزوۂ بدر پر جانے کے لیے بالکل تیار تھے کہ کُتّے نے کاٹ کھایا اور وہ حضور ﷺ کی ہمرکابی سے محروم رہ گئے۔ آپ ﷺ نے سنا تو فرمایا کہ افسوس ان کو لڑائی میں شریک ہونے کی بڑی تمنّا تھی۔ تاہم آپ ﷺ نے ان کو اصحابِ بدر میں شامل فرمایا اور مالِ غنیمت میں سے ان کو حصّہ دیا۔ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ کے برعکس امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حضرت سعد رضی اللہ عنہ غزوۂ بدر میں عملاً شریک تھے۔

اگلے سال ۳ھ میں غزوۂ اُحد پیش آیا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ اس میں بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ شریک ہوئے۔ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ کفّارِ مکہ کی پُرخروش یلغار کی خبر مشہور ہوئی تو اہلِ مدینہ نے شہر کے اردگرد مسلّح پہرے بٹھا دیئے۔ اس موقع پر کاشانہ نبوی ﷺ کی حفاظت کا ذمہ حضرت سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ نے لیا۔ وہ کچھ آدمیوں کے ساتھ مسلّح ہو کر مسجدِ نبوی ﷺ میں پہنچ گئے اور رات بھر کاشانہ نبوی کا پہرہ دیتے رہے۔ اگلے دن سرورِ عالم ﷺ میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہوئے تو خزرج کا علم حضرت سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ کو مرحمت فرمایا۔ وہ اور سیّد الاوس حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ علَم اٹھائے لشکر کے آگے آگے چل رہے تھے۔ لڑائی کا آغاز ہوا تو حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ شروع سے اخیر تک میدانِ جنگ میں دادِ شجاعت دیتے رہے۔ جب انہیں رسولِ اکرم ﷺ کے مجروح ہونے کی خبر ملی تو بے تاب ہو کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ، حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ اور کچھ دوسرے صحابہ بھی حضور ﷺ کے پاس پہنچ چکے تھے۔ ان سب نے مل کر حضور ﷺ کی تیمارداری اور حفاظت کا فریضہ انجام دیا۔

غزوۂ اُحد کے چند ماہ بعد یہود بنونضیر نے غدّاری پر کمر باندھی تو حضور ﷺ نے ان کا محاصرہ کر لیا۔ چند ہی دنوں میں ان کے کَس بل نکل گئے اور انہوں نے شکست تسلیم

کر لی۔ (حضور ﷺ نے انہیں مدینہ سے جلاوطن کرنے پر ہی اکتفا کیا۔) بنونضیر کے محاصرے کے دوران میں حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ اپنے خرچ پر مجاہدین میں کھجوریں تقسیم کرتے رہے۔

شعبان ۵ ہجری میں حضور ﷺ بنومصطلق کی سرکوبی کے لیے مریسیع تشریف لے گئے تو حضرت سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ بھی آپ ﷺ کے ہم رکاب تھے۔ اس موقع پر تمام انصار (اوس وخزرج دونوں) کا عَلَم ان کے پاس تھا۔

اسی سال غزوۂ احزاب پیش آیا جس میں عرب کے تمام مشرکین اور یہود متحد ہو کر مدینہ منورّہ پر چڑھ آئے۔ مسلمانوں کے لیے یہ سخت امتحان کا وقت تھا لیکن وہ اپنی قوتِ ایمانی کی بدولت اس امتحان میں سُرخرو نکلے۔ جنگ کے دوران میں ایک موقع پر حضور ﷺ نے بنوغطفان کے طالع آزماؤں کو کفار سے توڑنے کے لیے غطفانی سرداروں سے گفتگو کی طرح ڈالی۔ ان لوگوں نے مطالبہ کیا کہ مدینہ کی پیداوار کا ایک ثلث ہمیں دے دیا جائے تو ہم واپس چلے جائیں گے۔ حضور ﷺ نے مشورہ کے لیے حضرت سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ، حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اور حضرت اُسید بن حُضیر رضی اللہ عنہ کو بلا بھیجا اور انہیں غطفانیوں کے مطالبے سے آگاہ فرمایا۔ ان تینوں نے عرض کیا، ''یارسول اللہ اس معاملے میں اللہ کی طرف سے تو کوئی حکم نازل نہیں ہوا؟'' حضور ﷺ نے فرمایا نہیں۔ اس پر تینوں نے بیک زبان کہا:

> ''یارسول اللہ ان غطفانیوں کو تو ہم نے زمانہ جاہلیت میں بھی کبھی گھاس نہیں ڈالی اب جب کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے ذریعے ہمیں راہِ ہدایت دکھائی اور اسلام نے ہمیں سر بلند کیا تو ہم ان کو کیا خراج دیں گے؟ ہمارے لیے تو ان کے لیے تلوار ہے اور بس۔''

سرورِ عالم ﷺ ان کی غیرتِ دینی سے بہت خوش ہوئے اور ان کے لیے دُعائے خیر فرمائی۔

ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ غزوۂ احزاب میں بھی انصار کا عَلَم حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے پاس تھا۔

غزوۂ احزاب (خندق) کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودِ بنو قریظہ کا محاصرہ کیا تو اثنائے محاصرہ میں حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے محاصرہ کرنے والے مجاہدین کو سامانِ رسد اپنے پاس سے بہم پہنچایا۔

ربیع الآخر ۶ھ میں بنو غطفان اور بنو فزارہ کے لٹیروں نے مدینہ سے چند میل دُور غابہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اونٹوں پر لُوٹ ڈالی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی سرکوبی کے لیے ذی قرد تشریف لے گئے۔ اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو مدینہ منوّرہ میں اپنا جانشین مقرر فرمایا اور تین سو مجاہدین شہر کی حفاظت کے لیے ان کی تحویل میں دیئے۔ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اثنائے سفر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سامانِ رسد کی ضرورت محسوس ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو اطلاع بھیجی۔ انہوں نے مدینہ سے دس اونٹ اور کھجوروں کے بہت سے گٹھے بھیجے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ذی قرد کے مقام پر مل گئے۔

ذیقعد ۶ھ میں حدیبیہ کے مقام پر ''بیعتِ رضوان'' کا عظیم الشان واقعہ پیش آیا۔ اس موقعہ پر حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ ان چودہ سو سرفروش صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں شامل تھے جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر ''موت'' کی بیعت کی اور جن کو کھلے لفظوں میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی بشارت ملی۔

صلح حدیبیہ کے بعد سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ خیبر کے لیے روانہ ہوئے تو اسلامی لشکر کے تین جھنڈے بنائے، ان میں سے ایک جھنڈا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو عطا فرمایا۔

رمضان المبارک ۸ ہجری میں رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کا عزم فرمایا تو خاص اپنا جھنڈا حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے سپرد فرمایا۔ مسلمان شہر میں داخل ہوئے تو

حضرت سعد رضی اللہ عنہ پرچم اڑاتے بڑی شان سے انصار کے آگے آگے چل رہے تھے۔ اس وقت ان کے جوش وخروش کا عجیب عالم تھا۔ سپہ سالارِ قریش ابوسفیان پر نظر پڑی تو ان کے بے پناہ جوش نے رجز کی صورت اختیار کر لی۔

اليوم يوم الملحمه اليوم تستحل الحرمه

(آج کا دن سخت خونریزی کا دن ہے آج کعبہ حلال ہو جائے گا)۔

حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ یہ رجز سن کر لرز گئے۔ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے بعد حضور ﷺ کا دستہ خاص ان کے سامنے سے گزرا تو ابوسفیان نے پکار کر کہا:

''اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا آپ ﷺ نے اپنی قوم کے قتل کا حکم دیا ہے۔ لِلّٰہ اس پر رحم کیجئے۔ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ ابھی یہ دھمکی دے کر گزرے ہیں کہ آج سخت خونریزی کا دن ہے، آج کے دن حُرمتیں اتاری جائیں گی اور قریش کو برباد کر دیا جائے گا۔ میں آپ ﷺ کی اپنی قوم کے بارے میں اللہ کا واسطہ دیتا ہوں۔ آپ ﷺ تو تمام لوگوں میں بھلے اور صلح رحمی کرنے والے ہیں۔''

اس موقع پر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے بھی حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ ہمیں ڈر ہے کہیں سعد رضی اللہ عنہ واقعی قریش پر تلوار نہ چلا دیں۔ عین اسی وقت ایک شخص نے ضرار بن خطاب کے پُر درد اشعار حضور ﷺ کے سامنے پڑھنے شروع کر دیئے جن میں آپ ﷺ سے فریاد کی گئی تھی کہ سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ اہلِ مکہ کی کمر توڑنا چاہتے ہیں۔ اس وقت آپ ﷺ کے سوا قریش کو کوئی اور پناہ دینے والا نہیں، زمین ان کے لیے تنگ ہے اور آسمان ان کا دشمن ہے۔

حضور ﷺ نے یہ سب کچھ سُنا تو آپ ﷺ کا دریائے رحمت جوش میں آ گیا۔ فرمایا: سعد رضی اللہ عنہ نے غلط کہا۔ آج کعبہ کی عظمت دوبالا ہو گی۔ آج رحم کرنے کا دن ہے۔ آج قریش کو عزت دی جائے گی۔ آج کعبہ کو غلاف پہنایا جائے گا۔''

اس کے بعد آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا کہ جھنڈا ان سے لے کر ان کے بیٹے قیس رضی اللہ عنہ کو دے دیا جائے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ جھنڈا دینے میں متذبذب ہوئے اور کہا کہ مجھے جب تک یہ ثبوت نہ مل جائے کہ واقعی حضور ﷺ نے مجھ سے جھنڈا لینے کا حکم دیا ہے میں جھنڈا کسی کے حوالے نہیں کروں گا۔ حضور ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے اپنا عمامہ مبارک حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا۔ اب انہوں نے جھنڈا اپنے بیٹے قیس رضی اللہ عنہ کے حوالے کر دیا۔ پھر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی، ''یارسول اللہ ﷺ مجھے ڈر ہے کہیں قیس رضی اللہ عنہ بھی قریش کے انتقام لینے پر نہ تُل جائے۔'' اس پر حضور ﷺ نے حضرت قیس رضی اللہ عنہ سے بھی جھنڈا لے لیا اور اسے حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا۔

فتح مکہ کے بعد حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حُنین کی خونریز لڑائی میں حضور ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ غزوۂ حنین میں خزرج کے علمبردار حضرت سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ ہی تھے۔

غزوۂ حنین کے بعد حضور ﷺ نے مالِ غنیمت تقسیم فرمایا تو بعض نومسلموں کو تالیفِ قلب کے طور پر بطورِ خاص بڑے بڑے حصے عنایت فرمائے اس پر انصار کے نوجوان آزردہ ہوئے اور ان میں کچھ اس قسم کی چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ مشرکوں کا خون ابھی تک ہماری تلواروں سے ٹپک رہا ہے لیکن مالِ غنیمت قریش اور ان کے حلیفوں ہی کو دیا جا رہا ہے۔ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے یہ باتیں سنیں تو سب جا کر حضور ﷺ کے گوش گزار کر دیں۔ آپ ﷺ نے انہیں حکم دیا کہ تمام انصار کو فلاں خیمے میں جمع کرو۔ جب تمام لوگ جمع ہو گئے تو حضور ﷺ نے ان سے فرمایا کہ میں نے ایسی ایسی باتیں سنیں ہیں ان میں سے بعض نے عرض کیا، ''یارسول اللہ بڑی عمر کے لوگوں اور ہمارے اکابر نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی البتہ نوجوانوں نے بمقتضائے عمر ایسی باتیں ضرور کہی ہیں۔''

حضور ﷺ نے فرمایا:

''یا معشرِ انصار کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم پہلے گمراہ تھے۔ میں تمہیں کفر و شرک کے اندھیروں سے نکال کر طریق حق پر لایا اور جنت کا مستحق بنایا، تم ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے میں نے تم میں اتفاق پیدا کیا۔ تم قبائلِ عرب میں حقارت کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے میں نے تمہیں عزت کے مقام پر فائز کیا۔''

رسولِ اکرم ﷺ کے ہر ارشاد پر انصار بے ساختہ کہے جاتے تھے ''بیشک اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا احسان بہت بڑا ہے'' حضور ﷺ نے فرمایا۔ ''تم بھی اپنے احسانات بیان کرو۔''

انصار نے عرض کیا۔ ''یارسول ﷺ اللہ ہم کیا عرض کریں۔''

حضور ﷺ نے فرمایا:

''تم کہو تجھے اپنے گھر سے نکالا گیا، ہم نے اپنے گھر میں پناہ دی۔ تیرا کوئی مددگار نہیں تھا۔ ہم نے تیری مدد کی، تو بے سروسامان تھا ہم نے تجھے غنی کیا۔ سارے دُنیا نے تجھے جھٹلایا ہم نے تیری تصدیق کی۔ تم یہ جواب دیتے جاؤ گے اور میں کہتا جاؤں گا کہ تم سچ کہتے ہو لیکن اے گروہِ انصار کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ دوسرے لوگ اونٹ بکریاں اور مال و دولت اپنے گھروں کو لے جائیں اور تم محمد ﷺ کو اپنے گھر لے جاؤ۔''

حضور ﷺ کے ارشادات سُن کر انصار کے قلب و جگر کے ٹکڑے اڑ گئے۔ روتے روتے ان کی ہچکیاں بندھ گئیں اور وہ بے اختیار پکار اٹھے ''ہم کو صرف محمد رسول اللہ ﷺ مطلوب ہیں۔''

پھر حضور ﷺ نے فرمایا:

''انصار میرے ہیں اور میں انصار کا ہوں...... اے اللہ انصار اور انصار کے

لڑکوں پر رحم فرما۔ اے گروہِ انصار قریش کو اس لیے زیادہ مال دیا گیا ہے کہ ان کی تالیفِ قلب ہو جائے کیونکہ ابھی وہ جدید الاسلام ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کا حق زیادہ ہے۔''

انصار رحمتِ عالم ﷺ کی معیت میں اپنے گھروں کو لوٹے تو فرطِ مسرت سے ان کے قدم زمین پر نہ ٹکتے تھے۔

۹ھ ہجری میں حضور ﷺ نے مسلمانوں کو غزوۂ تبوک کی تیاری کا حکم دیا اور اس سلسلے میں انہیں انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب دی۔ اس موقع پر ایثار و قربانی کے تحیّر خیز مناظر دیکھنے میں آئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے گھر کی سوئی سلائی تک لاکر بارگاہِ رسالت میں پیش کر دی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ گھر کا آدھا مال واسباب لے آئے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ایک ہزار اونٹ مع پالان اور ایک خطیر رقم پیش کی۔ اسی طرح دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس موقع پر حضرت سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ نے بہت بڑی رقم پیش کی۔ اس کے بعد انہوں نے تبوک کے پُر صعوبت سفر میں حضور ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔

(۳)

۱۱ھ ہجری میں سرورِ عالم ﷺ نے رحلت فرمائی تو مسلمانوں پر کوہِ غم ٹوٹ پڑا، لیکن ساتھ ہی ان کو یہ فکر دامن گیر ہو گئی کہ اُمّتِ مسلمہ کا تھوڑی مدت کے لیے بھی سربراہ کے بغیر رہنا خطرے سے خالی نہیں، چنانچہ جونہی حضور ﷺ کے وصال کی خبر مشہور ہوئی، خلافت کا سوال اُٹھ کھڑا ہوا۔ انصار سقیفہ بنو ساعدہ میں، جو حضرت سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ کی ملکیت تھا جمع ہوئے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ قدرے علیل تھے تاہم لوگ انہیں سہارا دے کر اجتماع میں لے آئے۔ جہاں وہ کپڑا اوڑھے ہوئے تکیہ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد انہوں نے ایک پُر زور خطبہ دیا جس میں انصار کی قربانیاں اور فضائل بیان کیے اور اس بات پر فخر کا اظہار کیا کہ رسولِ اکرم ﷺ ہمیشہ انصار سے خوش رہے۔ خطبہ کے

آخر میں انہوں نے اس یقین کا اظہار کیا کہ انصار ہی خلافت کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔ اس لیے انہیں اپنے میں سے کسی شخص کو خلیفۃ الرسول منتخب کر لینا چاہیے۔

کچھ دوسرے انصاری بزرگوں نے بھی حضرت سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ کے موقف کے حق میں تقریریں کیں اور کثرت رائے سے یہی طے پایا کہ منصبِ خلافت کے لیے سب سے بڑھ کر انصار میں موزوں حضرت سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ ہی ہیں۔ اسی اثناء میں مہاجرین کو بھی اس اجتماع کی خبر ہو گئی۔ حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر فوراً سقیفہ بنو ساعدہ میں پہنچ گئے۔ خاصی بحث و تمحیص اور مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعتِ خلافت کر لی۔ اس موقع پر حضرت سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ نے کیا طرزِ عمل اختیار کیا؟ بہت سے اربابِ سِیَر اور مورخین جن میں ابنِ اثیر، حافظ ابنِ حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ، حافظ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ اور ابنِ قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ جیسے بلند پایہ علماء شامل ہیں، اس طرف گئے ہیں کہ حضرت سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ کی بیعت نہیں کی اور دل برداشتہ ہو کر حوران (شام) چلے گئے۔ جہاں ۱۵ھ میں کسی نے اُنہیں شہید کر ڈالا۔ ابنِ عبدربہ کی ''عقد الفرید'' میں تو کلبی سے یہاں تک مروی ہے کہ ایک شخص نے سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو قتل ہی اس لیے کیا کہ وہ حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ (اور ان کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ) کی بیعت کا انکار کرتے تھے، لیکن ان کے ساتھ ہی کچھ ایسی روایات بھی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ عُبادہ نے حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ کے دلائل سے مطمئن ہو کر مہاجرین کے استحقاقِ خلافت کو تسلیم کر لیا تھا اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ ابنِ جریر طبری نے اپنی تاریخ میں حضرت سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ کے بیعت کرنے کا ذکر نہایت واضح اور دو ٹوک الفاظ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"تتابع القوم علی البیعۃ و بایع سعد"

(قوم نے بیعت میں ایک دوسرے کی پیروی کی اور سعد رضی اللہ عنہ نے بھی بیعت کی)

طبری ہی کی ایک اور روایت میں خود حضرت سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ کی زبانی ان کی بیعت کا اعتراف موجود ہے اور یہ بیان بھی کہ اگر انہوں نے بیعت نہ کی ہوتی تو لوگ اُنہیں شام جانے کے لیے زندہ نہ چھوڑتے۔

مسندِ احمد بن حنبل کی ایک مرسل روایت سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ نے خوشدلی سے حضرت ابوبکر صِدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی تھی۔ اس روایت کے الفاظ یہ ہیں:

''حمید بن عبدالرحمان حمیری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے وفات پائی تو حضرت ابوبکر صِدیق رضی اللہ عنہ مدینہ کے کسی حِصّہ میں تھے۔ اس سانحہ کی خبر سن کر وہ حضور ﷺ کے جسدِ اقدس کے پاس آئے اور آپ ﷺ کے چہرۂ مبارک سے چادر اٹھا کر کہا، میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان ہوں، آپ ﷺ زندگی میں بھی اور وفات کے بعد بھی کس قدر حسین وجمیل ہیں۔ اس کے بعد کہا رَبّ کعبہ کی قسم محمد ﷺ اس دُنیا سے تشریف لے گئے۔ پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ تیزی کے ساتھ انصار کے پاس گئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا اور اس میں انصار کی ہر اس فضیلت کا تذکرہ کیا جو قرآن میں بیان ہوئی ہے یا جو رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمائی ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ بے شک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اگر تمام لوگ کسی وادی کی طرف جائیں اور انصار کسی اور وادی کی طرف تو میں انصار کی وادی اختیار کروں گا۔ اور اے سعد (بن عُبادہ) تم بھی اس وقت وہاں موجود تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ قریش خلافت کی ذمہ داری سنبھالیں گے، لوگوں کے بھلے قریش کے بھلے کے تابع ہیں اور لوگوں کے بُرے قریش کے بُرے کے تابع

ہیں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ (بن عبادہ) نے فرمایا، بیشک آپ سچ فرماتے ہیں ہم انصار وزیر ہیں اور آپ حضرات امیر۔"

محدث ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔ مشہور شافعی فقیہ ابنِ حجر ہیتمی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "الصواعق المحرقہ" میں حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے بیعت نہ کرنے کے تخیل کو غلط قرار دیا ہے۔ صاحبِ کنز العمال نے بھی حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے بیعت کرنے کی روایت کو قبول کیا ہے اور اسے اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔

صحابیت کی جلالتِ شان اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں قرآن و حدیث کی متفق علیہ توضیحات کے پیشِ نظر کسی اختلافی مسئلہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں نیک گمان کرنا ہی احسن طریقہ ہے۔ اس لیے ہم انہی روایات کو ترجیح دیتے ہیں جن کی رو سے حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی تھی۔

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کا سالِ وفات مختلف روایتوں میں ۱۱ھ، ۱۴ھ اور ۱۵ھ بیان کیا گیا ہے لیکن جمہور علماء نے ۱۵ھ والی روایت کو ترجیح دی ہے۔ ان کی وفات کیسے ہوئی؟ اس کے بارے میں تفصیل نہیں ملتی۔ ایک روایت میں ہے کہ کسی نے تیر مار کر شہید کر ڈالا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ کسی نے شہید کر کے گھر کے غسل خانے میں ڈال دیا تھا۔ گھر کے لوگوں نے دیکھا تو تمام جسم نیلا پڑ گیا تھا۔ انہیں کس شخص نے شہید کیا اور اس شقاوت سے اس کا کیا مقصد تھا؟ اس کے بارے میں بھی کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

(۴)

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی اہلیہ کا نام فکیہہ بنتِ عبید انصاریہ رضی اللہ عنہا تھا۔ وہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی بنتِ عم تھیں اور نہایت مخلص صحابیہ تھیں۔ ایک روایت میں ہے کہ ۸ھ میں انہوں نے حضور ﷺ کے ایماء پر اپنے غلام کو حکم دیا کہ وہ مسجدِ نبوی ﷺ کے لیے منبر تیار کرے۔ چنانچہ ان کے غلام نے غابہ کے جھاؤ کی لکڑی سے منبر بنایا۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اپنے پیچھے تین لڑکے چھوڑے۔ قیس رضی اللہ عنہ، سعید اور اسحاق۔

ان میں سے حضرت قیس رضی اللہ عنہ کا شمار نہایت عظیم المرتبت صحابہ میں ہوتا ہے۔ بڑے قد آور اور وجیہہ جوان تھے۔ وہ اکثر سرورِ عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر رہتے تھے اور خاص مدینہ منورہ (شہر) میں ''پولیس'' کے فرائض انجام دیا کرتے تھے۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے چند حدیثیں بھی مروی ہیں۔ ان کے راویوں میں حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہما، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ کے اسماءِ گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کے بعض ارشادات لکھ کر محفوظ کر لیے تھے۔

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے گلشنِ اخلاق میں سبقت فی الاسلام، حُبِّ رسول، جوشِ ایمان، شوقِ جہاد، انفاق فی سبیل اللہ اور جود و سخا سب سے جوش رنگ پھول ہیں۔ اپنے جذبہ فدویت اور دوسرے اوصاف و محاسن کی بدولت انہیں بارگاہِ رسالت ﷺ میں درجہ تقرب حاصل ہو گیا تھا۔ حضور ﷺ کو ان سے اس قدر محبت تھی کہ وقتاً فوقتاً ان کے مکان پر تشریف لے جاتے تھے۔ کبھی بیمار ہو جاتے اور حضور ﷺ کو ان کی علالت کی خبر ملتی تو آپ بے چین ہو جاتے اور فوراً عیادت کے لیے ان کے گھر تشریف لے جاتے۔ حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ نے ان کے لیے یہ دُعا فرمائی:

''اے اللہ اپنی برکتیں اور رحمتیں سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی آل پر نازل فرما۔''

ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے یوں دعا کی:

''اللہ انصار کو جزائے خیر دے۔ خصوصاً عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عمرو بن حرام اور سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ کو۔''

سرورِ عالم ﷺ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ تشریف لائے تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ اکثر آپ ﷺ کی خدمت میں کھانا بھیجا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی بطورِ خاص بھی آپ ﷺ کی دعوت کیا کرتے تھے۔ ابنِ عساکر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ

سے روایت کی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے رسولِ اکرم ﷺ کی دعوت کی اور آپ ﷺ کی خدمت میں روٹی اور کھجوریں پیش کیں۔ حضور ﷺ یہ تناول فرما چکے تو آپ ﷺ کی خدمت میں دودھ کا ایک پیالہ پیش کیا۔ حضور ﷺ نے اسے پیا اور فرمایا:

(تمہارے کھانے کو بھلے لوگ کھائیں اور تمہارے پاس روزہ دار روزہ افطار کریں اور تمہیں فرشتے دعائیں دیں۔)

ایک اور روایت میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کی خدمت میں کھانا پیش کیا جس میں تل اور کھجوریں تھیں۔

ابنِ عساکر نے خود حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ "میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اونٹ کی نلی کے گودے کا ایک بڑا پیالہ بھر کر لایا۔ آپ ﷺ نے پوچھا، اے ابوثابت یہ کیا ہے؟ میں نے عرض کیا، یارسول اللہ میں نے آج چالیس جگر والے اونٹ ذبح کیے، میرے دل میں تمنا پیدا ہوئی کہ آپ ﷺ کو ان کی نلی کا گودا کھلاؤں۔ اس پیالے میں یہی گودا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے اسے تناول فرمایا اور میرے لیے دُعائے خیر کی۔"

اربابِ سِیَر نے حضرت سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ کی دریا دلی، سیر چشمی اور جود و سخا کے بہت سے واقعات بیان کیے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے وقت کے بہت بڑے سخی اور جواد تھے اور اسی بناء پر لوگوں میں بے حد ہر دلعزیز تھے۔ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ:

"میں نے سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ کو دیکھا، وہ اپنی حویلی کے دروازے پر کھڑے ہو کر پکار رہے تھے کہ جسے چربی یا گوشت پسند ہو وہ سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ کے پاس آئے۔"

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے یہ دریا دلی اپنے باپ دادا سے ورثے میں پائی تھی ان کے

بعد ان کے بیٹے حضرت قیس رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے اس خاندانی دستور کو قائم رکھا۔ ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما' حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی حویلی کے پاس سے گزرے تو ان کی آنکھوں میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی دعوتِ عام کا منظر گھوم گیا اور انہوں نے فرمایا یہ ہے سعد رضی اللہ عنہ کی حویلی جہاں وہ لوگوں کو آواز دے کر بلایا کرتے تھے۔

اصحابِ صُفّہ کا اپنا کوئی گھر اور ذریعہ معاش نہیں تھا اس لیے وہ اللہ کے مہمان سمجھے جاتے تھے۔ صاحب حیثیت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اصحابِ صُفّہ میں سے ایک ایک دو آدمیوں کو اپنے ساتھ لے جاتے تھے اور ان کو کھانا کھلاتے تھے لیکن حضرت سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ روزانہ شام کو اسی ۸۰ آدمیوں کا کھانا بھجواتے تھے۔

مُسندِ احمد میں ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی والدہ حضرت عمرہ بنتِ مسعود رضی اللہ عنہا نے ۵ ہجری میں انتقال کیا تو انہوں نے ماں کے ایصالِ ثواب کے لیے پانی کی ایک سبیل جاری کی۔ مدینہ منورّہ میں آج بھی یہ سبیل ''سقایہ آلِ سعد'' کے نام سے موجود ہے۔

۸ھ میں سریہ سیف البحر یا جیش الخبط پیش آیا۔ اس مہم کے قائد حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ تھے اور تین سو آدمیوں کے لشکر میں حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے علاوہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت قیس رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ مہم کے دوران میں سامانِ رسد ختم ہو گیا اور مجاہدین سخت مصیبت میں مبتلا ہو گئے۔ اس موقع پر حضرت قیس رضی اللہ عنہ نے اونٹ قرض لے لے کر ذبح کراتے شروع کر دیئے۔ جب نو اونٹ ذبح ہو چکے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ قیس رضی اللہ عنہ کو روکا جائے ورنہ وہ اپنے باپ کا مال یونہی صرف کر دیں گے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے انہیں مزید اونٹ ذبح کرانے سے روک دیا۔ حضرت قیس رضی اللہ عنہ نے مدینہ واپس آ کر حضرت سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ کو مسلمانوں کی مصیبت کا حال سنایا تو انہوں نے فرمایا کہ اونٹ ذبح کراتے۔ انہوں نے کہا میں نے تین بار ایسا کیا لیکن پھر مجھے روک دیا گیا۔ جب حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو یہ معلوم ہوا کہ

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فلاں جملے کہے تھے تو انہیں سخت جوش آیا۔ ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ وہ حضور ﷺ کے پیچھے آ کر کھڑے ہو گئے اور کہا:

''ابن ابوقحافہ اور ابنِ خطاب کی طرف سے کوئی جواب دے کہ وہ میرے بیٹے کو بخیل کیوں بنانا چاہتے ہیں؟''

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو سرورِ عالم ﷺ سے نہایت عقیدت اور محبت تھی۔ حضور ﷺ ان کے مکان پر قدم رنجہ فرماتے تو وہ فرطِ احترام سے بچھ بچھ جاتے تھے۔ جب حضور ﷺ واپسی کا ارادہ فرماتے تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ اپنے گدھے پر چادر بچھواتے اور اس کو سواری کے لیے پیش کرتے پھر اپنے فرزند حضرت قیس رضی اللہ عنہ کو حضور ﷺ کی ہم رکابی کا حکم دیتے۔ حضور ﷺ بھی حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا بہت پاسِ خاطر فرماتے تھے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ غزوۂ بدر سے پہلے ایک مرتبہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ بیمار ہو گئے۔ حضور ﷺ کو اطلاع ملی تو آپ ﷺ ان کی عیادت کے لیے سواری پر تشریف لے گئے۔ راستے میں ایک جگہ کچھ مسلمان اور منافقین ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں راس المنافقین عبداللہ بن اُبی بھی تھا۔ یہ وہ شخص تھا جس کو ہجرتِ نبوی ﷺ سے پہلے تمام اہلِ مدینہ (اوس اور خزرج) اپنا بادشاہ بنانے پر متفق ہو گئے تھے اور اس کے لیے تاج بھی تیار کر لیا تھا لیکن حضور ﷺ کی تشریف آوری کے بعد یہ ساری کاروائی کالعدم قرار پائی تھی۔ یہ بات عبداللہ بن اُبی پر سخت شاق گزری تھی اور وہ حضور ﷺ سے خار کھانے لگا تھا۔ حضور ﷺ کی سواری کی گرد اُڑی تو وہ ترشروئی سے بولا، ''محمد ﷺ اپنا گدھا پرے کر و اس کی بدبو نے میرا دماغ پریشان کر دیا۔'' اس کے جواب میں حضور ﷺ نے سب حاضرینِ مجلس کو سلام کیا اور سواری سے اتر کر خدا کی واحدانیت پر ایک مختصر خطبہ دیا۔ ابنِ اُبی نے تنگ کر کہا، ''اگر تمہاری باتیں سچ ہیں تو یہ ان لوگوں کو بتاؤ جو خود تمہارے پاس آتے ہیں۔'' اس موقع پر بات اس قدر بڑھی کہ مسلمانوں اور منافقوں کے درمیان تلوار چل جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا لیکن حضور ﷺ نے فریقین کو سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کر دیا۔

اس کے بعد آپ ﷺ حضرت سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے اور دورانِ گفتگو میں ان سے فرمایا: ''سعد تم نے سنا آج عبداللہ بن اُبی (ابوحباب) نے مجھ سے یہ باتیں کہیں۔''

انہوں نے عرض کیا۔''یارسول اللہ ﷺ آپ ﷺ اس کی باتوں کا خیال نہ فرمائیں، اس شخص کو ہم لوگ اپنا بادشاہ بنایا چاہتے تھے۔ اللہ نے آپ ﷺ کو حق وصداقت کے ساتھ مبعوث کیا تو ہم نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔ ابنِ اُبی کی باتین بادشاہت سے محرومی کا نتیجہ ہیں آپ ﷺ اس سے درگزر فرمائیں۔'' حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی اس گزارش پر حضور ﷺ نے ابنِ اُبی کو معاف فرما دیا۔

ایک مرتبہ حضور ﷺ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو تحصیلِ صدقہ کے لیے افسر منتخب فرمایا لیکن جب اُنہوں نے یہ ذمہ داری قبول کرنے سے معذرت کی تو حضور ﷺ نے ان کا عذر قبول فرما لیا۔

حضرت سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ کے مقام ومرتبہ کا اندازہ کرنے کے لیے یہی کافی ہے کہ سیّد الانام فخرِ موجودات ﷺ نے ان کو بارہا دعائے خیر وبرکت سے نوازا اور بارہا ان کے گھر کو اپنے قدُومِ میمنت لزوم سے مشرّف فرمایا۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ
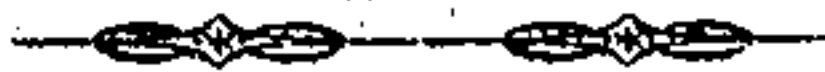
حضرت حارث بن صمّہ انصاری رضی اللہ عنہ

سیّدنا حضرت ابو سعید حارث بن صمہ، خزرج کے معزز ترین خاندان نجار سے تھے۔ نسب نامہ یہ ہے:

حارث رضی اللہ عنہ بن صمہ بن عمرو بن عتیک بن عمرو بن عامر (مبذول) بن مالک بن نجار۔

ہجرتِ نبوی سے قبل ہی ان کی فطرت سعید نے انہیں توحید کی طرف مائل کر دیا اور وہ ۱۱ نبوّت سے ۱۳ نبوّت کے درمیان کسی وقت حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔

سرورِ عالم ﷺ مدینہ منورّہ تشریف لائے اور چند ماہ بعد مہاجرین اور انصار کے مابین مواخاۃ قائم کرائی تو حضرت حارث رضی اللہ عنہ کو حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ کا اسلامی بھائی بنایا۔

رمضان المبارک ۲ ہجری میں رحمتِ عالم ﷺ غزوۂ بدر کے لیے مدینہ سے روانہ ہوئے تو حضرت حارث رضی اللہ عنہ بھی حضور ﷺ کے ہمرکاب تھے۔ راستے میں روحا نام ایک مقام پر ان کو چوٹ لگ گئی اور وہ لڑنے کے قابل نہ رہے۔ چنانچہ حضور ﷺ نے انہیں واپس مدینہ بھیج دیا، تاہم انہیں بدر کے مالِ غنیمت سے حصہ مرحمت فرمایا اس لیے ان کا شمار اصحابِ بدر میں ہوتا ہے۔

اگلے سال غزوۂ اُحد میں جانبازانہ حصّہ لیا اور شروع سے لے کر اخیر تک نہایت ثابت قدمی سے میدان میں ڈٹے رہے۔ اہلِ سِیَر نے انصارِ ثابت قدم میں ان کا نام صراحت سے لیا ہے۔ اس لڑائی میں انہوں نے قریش کے ایک بہادر عثمان بن عبداللہ

بن مغیرہ کو قتل کیا۔ حضور ﷺ نے مقتول کا سامان ان کو مرحمت فرمایا، ان کے علاوہ حضور ﷺ نے کسی مسلمان کو کسی کافر کا سامان نہیں دیا۔

ایک روایت میں ہے کہ جس وقت لڑائی پورے زور پر تھی۔ حضرت حارث رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے، آپ ﷺ نے ان سے دریافت فرمایا، ''تم نے عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو دیکھا؟'' انہوں نے عرض کیا، ''یارسول اللہ وہ پہاڑ کی طرف کفار کے نرغہ میں تھے، میں نے ان کی مدد کو جانا چاہا لیکن آپ ﷺ پر نظر پڑی تو ادھر آ گیا۔'' حضور ﷺ نے فرمایا، ''عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو فرشتے بچا رہے ہیں۔'' اس کے بعد حضرت حارث رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے پاس گئے تو دیکھا کہ مشرکین کی سات لاشیں ان کے سامنے پڑی ہیں، انہوں نے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ سے پوچھا، کیا ان سب کو آپ نے قتل کیا ہے؟'' انہوں نے جواب دیا، ''ارطاط اور فلاں فلاں کو تو میں نے ہلاک کیا، باقی مشرکوں کے قاتل مجھ کو نظر نہیں آئے۔'' یہ سن کر حضرت حارث رضی اللہ عنہ پکار اٹھے:

''رسول اللہ ﷺ نے بالکل صحیح فرمایا تھا!''

سنہ ۴ ہجری میں بئر معونہ کا المناک سانحہ پیش آیا۔ اس کا پس منظر یہ تھا کہ حضور ﷺ نے ابو براء عامر بن مالک کی درخواست پر ستر مبلغین کی ایک جماعت نجد کی طرف روانہ فرمائی۔ حضرت حارث بن صمہ رضی اللہ عنہ بھی اس پاکباز جماعت میں شامل تھے۔ بئر معونہ کے مقام پر وہ حضرت عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مویشی چرانے کے لیے گئے ہوئے تھے کہ بنو عامر کے سردار عامر بن طفیل نجدی نے بعض مشرک قبائل کو ساتھ لے کر مسلمانوں پر حملہ کر دیا اور سب کو ایک ایک کر کے شہید کر ڈالا۔ جب حضرت حارث رضی اللہ عنہ اور عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ واپس آئے تو اپنے ساتھیوں کی لاشیں خاک و خون میں غلطاں دیکھیں۔

حضرت حارث رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرو رضی اللہ عنہ سے کہا، ''اب کیا رائے ہے؟''

عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ''رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر تمام واقعہ

بیان کرنا چاہئے۔"

حارث رضی اللہ عنہ بولے: "جہاں منذر رضی اللہ عنہ مارے جائیں میں وہاں سے کس طرح ہٹ سکتا ہوں۔" یہ کہہ کر تلوار سونت لی اور عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر مشرکین پر ٹوٹ پڑے، انہوں نے تیروں کی بوچھاڑ کر دی۔ حضرت حارث رضی اللہ عنہ کا جسم چھلنی ہو گیا اور وہ جامِ شہادت پی کر خُلدِ بریں میں پہنچ گئے۔ حضرت عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ کو مشرکین نے اسیر کر لیا۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت حارث رضی اللہ عنہ مشرکین پر حملہ آور ہوئے اور ان میں سے دو کو خاک و خون میں لوٹا دیا۔ اس پر انہوں نے نرغہ کر کے حارث رضی اللہ عنہ اور عمرو رضی اللہ عنہ، دونوں کو گرفتار کر لیا۔ پھر انہوں نے حضرت حارث رضی اللہ عنہ سے کہا، "ہم تمہیں قتل نہیں کرنا چاہتے۔ جو تمہاری خواہش ہو گی ویسا ہی کریں گے۔" حضرت حارث رضی اللہ عنہ نے کہا، "تم مجھ کو منذر رضی اللہ عنہ اور حرام بن ملحان رضی اللہ عنہ کی جائے قتل پر پہنچا دو۔" مشرکین نے انھیں وہاں پہنچا کر چھوڑ دیا۔ حضرت حارث رضی اللہ عنہ شوقِ شہادت سے سرشار تھے، انہوں نے پھر کفار پر حملہ کر دیا۔ جب ان میں سے ایک دو مارے گئے تو انہوں نے حضرت حارث رضی اللہ عنہ کو چاروں طرف سے بھالوں پر رکھ لیا اور یوں وہ اپنے خالقِ حقیقی کے حضور پہنچ گئے۔

حضرت حارث رضی اللہ عنہ نے اپنے پیچھے دو لڑکے چھوڑے، ابوجہم رضی اللہ عنہ اور سعد رضی اللہ عنہ۔ ان دونوں کو شرفِ صحابیت حاصل ہے۔

سانحہ بئر معونہ میں جو اصحاب شہید ہوئے وہ نہایت پاکباز، عبادت گزار اور فاضل لوگ تھے اور اپنے شغفِ قرآن کی نسبت سے "قُرّاء" مشہور تھے۔ حضرت حارث رضی اللہ عنہ کے مرتبہ کا اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے۔

بعض روایتوں میں ہے کہ وہ شعر و شاعری میں بھی درک رکھتے تھے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت براء بن عازب انصاری رضی اللہ عنہ

(۱)

رحمتِ عالم ﷺ کو وصال فرمائے سالہا سال گزر چکے تھے لیکن مدینہ منورّہ کے ایک صاحبِ رسول حضور ﷺ کی یادوں کو اپنے سینے میں اس طرح بسائے ہوئے تھے کہ ان کو کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی اپنی زندگی کے وہ لیل ونہار نہیں بھولتے تھے جو انہوں نے سیّد الانام ﷺ کی خدمتِ اقدس میں گزارے تھے۔ وہ اپنے ہر قول اور فعل میں ہمیشہ سرورِ عالم ﷺ کا اسوۂ حسنہ پیشِ نظر رکھتے تھے یہاں تک کہ وہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی اپنے آقا و مولا ﷺ کی پیروی کو اپنے لیے باعث سعادت سمجھتے تھے جن میں حضور ﷺ نے اپنی اتباع کا حکم نہیں دیا۔ ایک مرتبہ ان کے ایک شاگرد ملاقات کے لیے حاضر ہوئے تو باہمہ جلالتِ قدر انہوں نے خود آگے بڑھ کر شاگردِ رشید کو سلام کیا اور ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر خوب ہنسے۔ پھر ان سے فرمایا:

"جانتے ہو میں نے ایسا کیوں کیا؟"

انہوں نے عرض کیا "آپ ہی فرمائیے۔"

فرمایا: "میں نے ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کو ایسا ہی کرتے دیکھا تھا۔ اس موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا کہ جب دو مسلمان اس طرح ملیں اور ان کی کوئی ذاتی غرض ایک دوسرے سے وابستہ نہ ہو تو اللہ تعالیٰ دونوں کو بخش دیتا ہے۔"

یہ صاحبِ رسول ﷺ جن کو جذبہ اتباعِ رسول ﷺ اس انتہا تک پہنچا ہوا تھا کہ کبھی کوئی کام ذاتِ رسالت مآب ﷺ کو ایک مرتبہ بھی کرتے دیکھا تو اس کی تقلید کو بھی اپنے آپ پر واجب کر لیا تھا سیّدنا حضرت براء بن عازب انصاری رضی اللہ عنہ تھے۔

(۲)

حضرت ابوعمارہ براء بن عازب انصاری رضی اللہ عنہ کا شمار بڑے جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم میں ہوتا ہے۔ ان کا تعلق اوس کی شاخ بنو حارثہ سے تھا۔ سلسلہ نسب یہ ہے:

براء بن عازب رضی اللہ عنہ بن حارث بن عدی بن جشم بن مجدعہ بن حارثہ بن حارث بن خزرج بن عمرو بن مالک بن اوس۔

حضرت براء رضی اللہ عنہ کے خاندان میں اسلام کا چرچا حضرت ابو بردہ رضی اللہ عنہ بن نیاز کے ذریعے پھیلا جوان کے ماموں تھے اور بیعت لیلۃ العقبہ (۱۳ بعدِ بعثت) میں سعادت اندوزِ اسلام ہو چکے تھے۔ وہ قبیلہ بَلی سے تھے اور مدینہ منوّرہ میں بنو حارثہ کے حلیف تھے۔ انھوں نے بدر، اُحد، احزاب اور دوسرے غزواتِ نبوی میں جانبازانہ شرکت کی اور عظیم المرتبت صحابہ میں شمار ہوئے۔ انہی کے اثر اور تبلیغ کی بدولت حضرت براء رضی اللہ عنہ کے والد عازب بن حارث رضی اللہ عنہ بھی شرف اسلام اور صحابیت سے بہرہ ور ہوئے۔ صحیح بخاری کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عازب رضی اللہ عنہ کو ذاتِ رسالت مآب ﷺ سے والہانہ عقیدت و محبت تھی۔ اس روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عازب رضی اللہ عنہ سے اونٹ کا پالان خریدا اور ان سے فرمایا کہ یہ پالان اپنے بیٹے سے اٹھوا کر میرے گھر بھیج دیجئے۔ حضرت عازب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، اے رسول اللہ ﷺ کے رفیقِ غار، مہربانی فرما کر پہلے ہجرت کا قصہ سنایئے اس کے بعد ہی میں آپ کو جانے دوں گا۔"

حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ ان کا اشتیاق دیکھ کر متبسّم ہو گئے اور بڑے لطف و انبساط کے ساتھ ہجرت کا واقعہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔ حضرت عازب رضی اللہ عنہ یہ قصہ سُن کر خوش ہو گئے اور حضرت براء رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ بیٹے یہ پالان اٹھا کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر چھوڑ آؤ۔ نوجوان براء رضی اللہ عنہ نے اسی وقت پالان اٹھایا اور ہنسی خوشی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اقامت گاہ پر پہنچا دیا۔

حضرت ابو بردہ بن نیار رضی اللہ عنہ اور حضرت عازب رضی اللہ عنہ ہجرتِ نبوی سے پہلے ہی اسلام کا دامنِ رحمت تھام چکے تھے۔ حضرت براء رضی اللہ عنہ نے بھی ماموں اور باپ کی تقلید کی اور حضور ﷺ کے مدینہ منورہ میں نزولِ اجلال فرمانے سے پہلے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابنِ اُمِ مکتوم رضی اللہ عنہ سے نہایت ذوق وشوق کے ساتھ درسِ قرآن لینا شروع کر دیا۔

صحیح بخاری میں ہے کہ جس وقت رسولِ اکرم ﷺ نے سرزمینِ مدینہ کو اپنے قدومِ میمنت لزوم سے مشرف فرمایا، حضرت براء رضی اللہ عنہ سورہ سبح اسم ربك الا علٰی کا درس لے رہے تھے۔ حصولِ علم کا یہی شوق تھا جس نے حضرت براء رضی اللہ عنہ کو معدنِ فضل و کمال بنا دیا اور ایک دن وہ آسمانِ فضائل پر آفتاب بن کر چمکے۔

(۳)

رمضان المبارک ۲ھ میں حق وباطل کا معرکہ اوّل بدر کے میدان میں پیش آیا تو حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ بڑے ذوق وشوق سے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور لڑائی میں شریک ہونے کی اجازت چاہی۔

سرورِ عالم ﷺ نے ان کے جوش اور جذبے کی تحسین فرمائی لیکن لڑائی میں شریک ہونے کی اجازت نہ دی کیونکہ ان کی عمر پندرہ برس سے کم تھی۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضور ﷺ بالعموم ان نوجوانوں کو لڑائی میں شریک ہونے کی اجازت دیتے تھے جو کم از کم پندرہ برس کی عمر تک پہنچ چکے ہوں۔ چنانچہ حضرت براء رضی اللہ عنہ کم عمری کی بناء میں غزوہ بدر میں شریک نہ ہو سکے۔ ۳ھ میں غزوہ احد پیش آیا۔ اس وقت حضرت براء رضی اللہ عنہ پندرہ برس کے ہو چکے تھے، بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ لڑائی میں شریک ہوئے اور خوب دادِ شجاعت دی۔

۵ھ ہجری میں سارے عرب کے دشمنانِ حق نے متحد ہو کر مدینہ منورہ پر دھاوا بول دیا تاہم اہلِ حق نے خندق کھود کر بڑی ثابت قدمی سے اپنا دفاع کیا۔ اسی پُر آشوب

زمانے میں خاص مدینہ منوّرہ کے اندر یہودِ بنی قریظہ نے مسلمانوں کی پشت میں خنجر گھونپنے کا منصوبہ بنایا۔ اہلِ حق کے لیے یہ نہایت سخت آزمائش تھی۔ لیکن ان کے دلوں میں تو شوقِ شہادت کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ کیا مجال کہ کسی کے پائے استقامت میں ذرّہ بھر لغزش بھی آئی ہو۔ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت سے وہ اس آزمائش میں پورے اترے۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ بھی ان سرفروشوں میں شامل تھے۔ وہ شروع سے اخیر تک بڑی سرگرمی سے لڑائی میں شریک رہے اور دوسرے مسلمانوں کی طرح محصوری کے تمام مصائب خندہ پیشانی سے برداشت کیے۔

ذیقعدہ ۶ ہجری میں رحمتِ عالم ﷺ نے عمرہ کے لیے مکہ کا عزم فرمایا۔ اس سفر میں چودہ سو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور ﷺ کے ہمرکاب تھے۔ ان میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ اثنائے راہ میں حضور ﷺ کو اطلاع ملی کہ قریشِ مکہ اس بات پر راضی نہیں کہ مسلمان مکہ میں داخل ہوں۔ اس لیے قریش کی شدید مزاحمت سے دو چار ہوئے بغیر عمرہ کرنا ممکن نہیں۔ حضور ﷺ نہیں چاہتے تھے کہ اس سلسلہ میں کشت و خون تک نوبت پہنچے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے مکہ معظمہ سے چند میل دور حدیبیہ کے مقام پر پڑاؤ ڈال دیا اور قریشِ مکہ سے سفیروں کے ذریعے گفتگو کی طرح ڈالی۔ اس گفت و شنید کے دوران میں حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کا پیغام لے کر مکہ گئے تو قریشِ مکہ نے انہیں وہیں روک لیا۔ جب ان کی واپسی میں تاخیر ہوئی تو مسلمانوں میں ان کی شہادت کی خبر مشہور ہوگئی۔ اس خبر سے مسلمانوں میں بڑا جوش پیدا ہوا۔ حضور ﷺ نے فرمایا، عثمان کے خون کا بدلہ لینا فرض ہے۔ اس کے بعد آپ ﷺ ببول کے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے اور وہاں پر موجود تمام صحابہ رضی اللہ عنہم سے جاں نثاری کی بیعت لی۔ اللہ تعالیٰ کو ان صحابہ رضی اللہ عنہم کی یہ ادا اتنی پسند آئی کہ اس نے کھلے لفظوں میں ان کو اپنی خوشنودی کی بشارت دی۔ اسی لیے تاریخ میں یہ مہتم بالشان واقعہ "بیعتِ رضوان" کے نام

سے مشہور ہے۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ بھی ان خوش بخت صحابہ رضی اللہ عنہم میں شامل تھے جن کو بیعتِ رضوان میں شریک ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اس بیعت کے بعد معلوم ہوا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر صحیح نہ تھی لیکن مسلمانوں کے جوش و خروش اور صداقت کا یہ اثر ہوا کہ قریشِ مکہ کے حوصلے پست ہو گئے اور وہ مسلمانوں سے صلح پر آمادہ ہو گئے چنانچہ مسلمانوں اور قریشِ مکہ کے مابین معاہدہ صلح طے پا گیا۔

صلح حدیبیہ کے بعد غزوۂ خیبر پیش آیا۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ اس غزوے میں میں بھی جانبازانہ شریک ہوئے۔ ۸ھ ہجری میں انہیں فتح مکہ کے موقع پر سرورِ عالم ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل ہوا۔ اسی سال حنین کا خونیں معرکہ پیش آیا، اس کی ابتداء میں بنو ہوازن نے اپنی کمین گاہوں سے مسلمانوں پر اس شدت سے تیر برسائے کہ ان کی صفیں درہم برہم ہو گئیں۔ اسلامی لشکر میں مکہ کے دو ہزار نو مسلم بھی شامل تھے وہ اس بدحواسی سے پیچھے ہٹے کہ بیشتر دوسرے مسلمان بھی پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے۔

اس نازک موقع پر سرورِ عالم ﷺ کوہِ استقامت بن کر میدانِ جنگ میں کھڑے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک مختصر سی جماعت آپ ﷺ کے گرد جاں نثاری کے جوہر دکھا رہی تھی۔ صحیح بخاری کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان ثابت قدم سرفروشوں میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ اس روایت میں ہے کہ کسی شخص نے حضرت براء رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا، کیا غزوۂ حنین میں آپ بھی بھاگنے والے لوگوں میں شامل تھے؟ انہوں نے جواب دیا، میں شہادت دیتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے پشت نہیں پھیری البتہ جلد باز لوگ دور تک پھیل گئے تھے۔

شارحینِ حدیث نے ان کے اس ارشاد سے یہ مطلب اخذ کیا ہے کہ وہ شروع سے اخیر تک میدانِ جنگ میں موجود رہے، اگر میدان سے ہٹ جاتے تو لڑائی میں پیش آنے والے واقعات بیان نہ کر سکتے۔

مسلمانوں کا انتشار جلد ہی ختم ہو گیا، جب حضور ﷺ کے حکم سے حضرت

عباس رضی اللہ عنہ نے مہاجرین وانصار کو بآوازِ بلند آواز دی:

یا معشر الانصار...... یا اصحاب الشجرة

اے جماعتِ انصار...... اے اصحابِ شجرہ (یعنی اے بیعتِ رضوان کرنے والو) تو تمام مسلمان دفعتاً پلٹ پڑے اور کفار کو اپنی تلواروں پر رکھ لیا۔

غزوۂ حنین کے بعد حضرت براء رضی اللہ عنہ سرورِ عالم ﷺ کے ساتھ طائف کے محاصرے میں شریک ہوئے۔

غزوۂ طائف کے کچھ عرصہ بعد حضور ﷺ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو ایک جماعت کے ساتھ یمن روانہ کیا۔ اس جماعت میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ ان کے پیچھے حضور ﷺ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو یہ ہدایت دے کر یمن بھیجا کہ خالد کے ساتھیوں میں سے جو واپس مدینہ آنا چاہیں وہ واپس آ جائیں اور جو تمہارے ساتھ یمن میں قیام کرنا چاہیں، یمن میں قیام کریں۔ حضرت براء رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ یمن میں ٹھہرنا پسند کیا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ قیامِ یمن کے زمانے میں ان کے حصے میں بہت سا مالِ غنیمت آیا۔

مُسندِ احمد بن حنبل کے مطابق حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے عہدِ رسالت کے غزوات میں سے پندرہ میں شرکت کی۔ ان غزوات کے علاوہ انہوں نے تین اور موقعوں پر بھی حضور ﷺ کے ساتھ سفر کرنے کا شرف حاصل کیا۔

۱۱ھ ہجری میں سرورِ عالم ﷺ نے رحلت فرمائی اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سریر آرائے خلافت ہوئے تو حضرت براء رضی اللہ عنہ نے بلا تامل صدیق اکبر کی بیعت کر لی اور خلافتِ صدیقی کے ابتدائی پُر آشوب دور میں فتنوں کے استیصال کرنے میں اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ خلیفۃ الرسول رضی اللہ عنہ کی اعانت کی۔ فتنہ ارتداد کے خاتمہ کے بعد شام اور ایران سے معرکہ آرائیوں کا آغاز ہوا تو حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ بھی میدانِ جہاد میں پہنچ گئے۔ اس وقت ان کی عمر پچیس برس کے لگ بھگ تھی اور سینے میں شوقِ

شہادت کے شعلے بھڑک رہے تھے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کے کئی معرکوں میں انہوں نے سرفروشانہ حصہ لیا۔ اس سلسلہ میں مورخین نے ''رے'' اور ''تستر (شوستر)'' کے معرکوں کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے جن میں انہوں نے حضرت نعیم بن مقرن رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر ایرانیوں کے خلاف اپنی تلوار کے جوہر دکھائے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دورِ خلافت میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف جو معرکے پیش آئے ان سب میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بھرپور ساتھ دیا۔ اسی زمانے میں انہوں نے کوفہ میں مکان بنایا اور وہیں مستقل اقامت اختیار کر لی۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد وہ سیاسی ہنگاموں سے کنارہ کش ہو گئے اور باقی زندگی تعلیم و تعلّم اور درس و تدریس میں گزاری۔ ۷۲ھ میں عمر کی پچاسی ۸۵ منزلیں طے کر چکے تو پیغامِ اجل آ پہنچا اور اپنے وقت کے اس رجلِ عظیم نے کوفہ ہی میں اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔ انہوں نے اپنے پیچھے پانچ بیٹے چھوڑے، عبید، لوط، ربیع، سوید، اور یزید۔ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ سوید عمان کے امیر مقرر ہوئے اور انہوں نے اپنے فرائضِ منصبی اس حسن و خوبی سے انجام دیئے کہ لوگوں کے دل موہ لیے۔ مسندِ احمد حنبل کے مطابق عمان کی امارت پر یزید بن براء رضی اللہ عنہ کا تقرر ہوا۔ مورخین نے ان دونوں روایتوں کی تطبیق اس طرح کی ہے کہ شاید دونوں بھائی یکے بعد دیگرے عمان کے امیر مقرر ہوئے۔ واللہ اعلم۔

(۴)

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کا شمار فضلاء صحابہ میں ہوتا ہے۔ ان سے تین سو پانچ حدیثیں مروی ہیں۔ ان میں سے بائیس صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں موجود ہیں۔ حضرت براء رضی اللہ عنہ نے رسولِ اکرم ﷺ سے براہِ راست بھی احادیث روایت کی ہیں اور

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، حضرت علی کرم اللہ وجہہ، حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ اور حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ جیسے کبار صحابہ سے بھی۔ ان کی مجلس حدیث میں بعض اوقات ان کے ہم عصر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی شریک ہو جاتے تھے۔

حضرت براء رضی اللہ عنہ روایت حدیث میں غایت درجہ احتیاط سے کام لیتے تھے۔ علامہ ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ نے ''طبقات'' میں لکھا ہے کہ حضرت براء رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

''میں جو احادیث بیان کروں ضرور نہیں کہ وہ سب میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنی ہوں، ہمیں اپنے اونٹ بھی چرانے ہوتے تھے اس لیے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ہمہ وقت حاضر نہ رہ سکتے تھے۔ چنانچہ میں بہت سی حدیثیں صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایت کرتا ہوں۔''

حضرت براء رضی اللہ عنہ کے شاگردوں میں ابن ابی لیلیٰ رحمۃ اللہ علیہ، ابواسحاق رحمۃ اللہ علیہ، معاویہ بن سوید رحمۃ اللہ علیہ اور ابو بردہ رحمۃ اللہ علیہ جیسے اکابر تابعین شامل ہیں۔

حضرت براء رضی اللہ عنہ علوم قرآن اور مسائل فقہ میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کے سامنے کوئی اشکال پیش کیا جاتا تو اس کو آن واحد میں حل کر دیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی شخص نے پوچھا، کیا آیت

لا تلقوا بایدیکم الی التهلکة ؕ
(اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو)

کا اطلاق مشرکین کے خلاف لڑائی پر بھی ہوتا ہے۔ حضرت براء رضی اللہ عنہ نے فرمایا، ہرگز نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاد میں نقصان اور ہلاکت نہیں بلکہ جہاد سے کنارہ کشی کرنے میں ہلاکت ہے۔ اگر تم یہ سمجھ کر جہاد میں حصہ نہیں لیتے کہ اس سے کاروبار یا تجارت میں نقصان ہوگا یا مال صَرف کرنا پڑے گا تو گویا تم نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا۔ اس آیت میں یہی فرمایا گیا ہے کہ دنیوی فوائد کو پیش نظر رکھ کر جہاد سے کنارہ کشی نہ کرو۔

حضرت براء رضی اللہ عنہ رسولِ اکرم ﷺ سے کوئی حدیث روایت کرتے تو انتہائی حزم و احتیاط سے کام لیتے تھے۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مُسند میں بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کو ایک دعا بتائی تھی اس میں ایک جگہ لفظ "بنبیك" کی جگہ "برسولك" پڑھا۔ حضور ﷺ نے فوراً ٹوک دیا اور فرمایا میں نے جو الفاظ تمہیں بتائے ہیں بعینہٖ وہی پڑھو۔

اس ہدایت کا یہ نتیجہ تھا کہ وہ حدیث بیان کرتے وقت حضور ﷺ کے فرمائے ہوئے الفاظ میں مطلق کوئی کمی بیشی یا تبدیلی نہیں کرتے تھے، خواہ کمی بیشی یا مترادف الفاظ لانے سے مفہوم و مطلب میں کوئی فرق نہ پڑتا ہو۔ باہمہ جلالتِ قدر طبیعت میں بہت انکسار تھا اور اپنے معاصر صحابہ سے مسائل پوچھنے میں کوئی عار محسوس نہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ عبدالرحمٰن بن مطعم رحمۃ اللہ علیہ نے دریافت کیا کہ کیا درہموں کو ایک مقررہ مدت کے لیے فروخت کیا جاسکتا ہے۔ حضرت براء رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ منوّرہ تشریف لائے تو ہم اہلِ مدینہ اسی طرح خرید و فروخت کیا کرتے تھے لیکن حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہاتھوں ہاتھ درہم و دینار کا فروخت کرنا جائز ہے لیکن ادھار ناجائز ہے۔ میں نے جو کچھ کہا ہے تم اس کی تصدیق زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے بھی کرلو کیونکہ ان کا بڑا وسیع تجارتی کاروبار تھا۔

عبدالرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کے پاس گئے تو انہوں نے حضرت براء رضی اللہ عنہ کی تصدیق کی۔

(۵)

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی کتابِ سیرت میں سبقت فی الاسلام، شوقِ جہاد اور شغفِ علم کے علاوہ حُبِّ رسول اور اتباعِ سنت سب سے درخشاں ابواب ہیں۔ حضور ﷺ کا ذکر اس محبت عقیدت اور ذوق وشوق سے کرتے تھے کہ گویا منہ سے موتی

جھڑ رہے ہیں۔ صحیح مسلم میں ان سے روایت ہے کہ میں نے سرخ لباس میں کسی گیسو والے شخص کو رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر خوب صورت نہیں دیکھا۔ آپ ﷺ کے گیسوئے مبارک کبھی شانوں تک بھی آ جاتے تھے۔ آپ ﷺ نے دونوں شانوں کے درمیان کچھ فاصلہ تھا۔ آپ ﷺ نہ بہت دراز قامت نہ زیادہ پست قد تھے۔

اسی سے ملتی جلتی ایک حدیث صحیح بخاری میں بھی ہے۔

"ایک مرتبہ کسی شخص نے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ کا رُوئے اقدس (درخشانی میں) تلوار کی مانند تھا۔ فرمایا، نہیں حضور ﷺ کا رُوئے انور تو چاند کی مانند تھا۔" (بخاری)

حضرت براء رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ ہم میں سب سے بڑا بہادر وہ سمجھا جاتا تھا جو لڑائی میں رسول اللہ ﷺ کے پاس کھڑا ہوتا تھا۔ (مسلم)

صحیحین میں حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو عشاء کی نماز میں سورہ "والتین و الزیتون" پڑھتے سنا ہے۔ میں نے آپ ﷺ سے زیادہ خوش آواز کسی کو نہیں پایا۔

ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضرت براء رضی اللہ عنہ کی انگلی میں سونے کی انگوٹھی ہوا کرتی تھی۔ لوگوں نے اس پر اعتراض کیا تو فرمایا کہ یہ انگوٹھی میں صرف اس لیے پہنتا ہوں کہ یہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے پہنائی تھی۔ اس کا واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے مالِ غنیمت تقسیم فرمایا۔ صرف یہ انگوٹھی تقسیم ہونے سے رہ گئی۔ آپ ﷺ نے ادھر ادھر نظر دوڑائی پھر مجھے بُلا کر فرمایا، لو، اس کو پہنو، یہ اللہ اور اللہ کے رسول نے تمہیں پہنائی ہے۔ اب تم سوچو کہ جو چیز اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے مجھے پہنائی ہو، میں اس کو کیسے اتار سکتا ہوں۔

صحیح مسلم میں حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب ہم رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھتے تو اس بات کو پسند کرتے کہ ہم حضور ﷺ کی داہنی جانب کھڑے ہوں۔

حضور ﷺ کے وصال کے بعد بھی انہوں نے یہ طرزِ عمل زندگی بھر اختیار کیے رکھا۔

حضرت براء رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ نبی اکرم ﷺ کا رکوع اور سجدہ اور دو سجدوں کے درمیان بیٹھنا اور رکوع سے اٹھنا یہ چاروں چیزیں مقدار میں برابر ہوتی تھیں بجز قیام اور قعود کے۔ ایک مرتبہ انہوں نے گھر کے تمام لوگوں کو جمع کیا اور ان سے فرمایا، زندگی کا کچھ بھروسا نہیں کہ کب تک ہے میں چاہتا ہوں کہ آج تم کو دکھادوں کہ رسول اللہ ﷺ کس طرح وضو فرماتے اور نماز پڑھتے تھے۔ پھر اہلِ خانہ کے سامنے وضو کیا اور ظہر سے عشاء تک کی سب نمازیں اہلِ خانہ کے ساتھ پڑھیں۔

ایک مرتبہ اہلِ خانہ کو سجدہ کا طریقہ بتایا کہ رسول اللہ ﷺ اس طرح سجدہ کیا کرتے تھے پھر خود سجدہ کیا تاکہ وہ اچھی طرح سمجھ جائیں۔

حضرت براء رضی اللہ عنہ کی طبیعت نہایت حساس تھی رسولِ کریم ﷺ کے وصال کے بعد انہوں نے مسلمانوں کو بعض فتنوں میں بتلا ہوتے دیکھا تھا اور اس پر سخت مضطرب ہوئے تھے۔ ایک مرتبہ کسی نے کہا، آپ کتنے خوش قسمت ہیں کہ حضور ﷺ کے جمالِ جہاں آراء سے اپنی آنکھیں روشن کیں اور بیعتِ رضوان کی سعادت بھی حاصل کی۔ انہوں نے فرمایا، بھتیجے تم نہیں جانتے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد ہم لوگوں نے کیا کیا۔

بعض فقہی اور دوسرے دینی مسائل کے بارے میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی احادیث بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ انہوں نے نماز، حج، قربانی، احوالِ قبر وغیرہ کے بارے میں حضور پُر نُور ﷺ کے جو ارشادات امت تک پہنچائے وہ تا ابد مسلمانوں کی رہنمائی کرتے رہیں گے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ
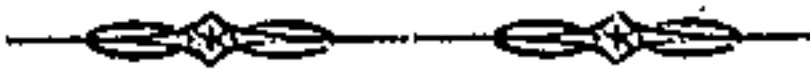
حضرت اَنس بن نضر انصاری رضی اللہ عنہ

(۱)

غزوۂ اُحد سے کچھ عرصہ پہلے کا ذکر ہے کہ ایک دن بارگاہِ رسالت میں ایک مقدمہ پیش ہوا۔ ایک انصاری خاتون رُبیع رضی اللہ عنہا کے ہاتھ سے انصار ہی کی ایک لڑکی کا دانت ٹوٹ گیا تھا، اس لڑکی کے وُرثاء قصاص کا مطالبہ لے کر بارگاہِ نبوی ﷺ میں پیش ہوئے تھے۔ حضور ﷺ نے سارے حالات سن کر فیصلہ صادر فرمایا کہ ''دانت کے بدلے دانت۔ رُبیع کا دانت توڑا جائے گا۔''

اس خاتون کے بھائی بھی وہاں موجود تھے ان کو اپنی بہن سے بے پناہ محبت تھی۔ اگرچہ وہ ایک سچے مسلمان اور سرورِ عالم ﷺ کے عاشقِ صادق تھے لیکن بہن کی محبت کے جذبہ سے مغلوب ہو کر بے اختیار ان کی زبان سے نکل گیا:

''یارسول اللہ، خدا کی قسم، رُبیع کا دانت نہ توڑا جائے گا۔''

حضور ﷺ نے فرمایا: ''بھائی اللہ کا یہی حکم ہے۔ ہاں لڑکی کے وُرثاء دِیت لے کر اپنے مطالبے سے دست بردار ہو جائیں تو دوسری بات ہے۔''

اس وقت رحمتِ خداوندی جوش میں آئی اور لڑکی کے ورثاء دِیت لینے پر راضی ہو گئے۔ اس طرح ان صاحبِ رسول رضی اللہ عنہ کی پیاری بہن کا دانت بچ گیا۔ رحمتِ دوعالم ﷺ نے فرمایا،

''اللہ کے بعض بندے ایسے ہیں کہ جب قسم کھا بیٹھتے ہیں تو اللہ ان کی قسم پوری کر دیتا ہے۔''

یہ صاحبِ رسول رضی اللہ عنہ جن کی قسم کی لاج ربِّ ذوالجلال والاکرام نے رکھی اور

محبوبِ ربّ العالمین ﷺ نے جن کے خاصانِ خدا میں سے ہونے کی تصدیق فرمائی، سیّدنا حضرت انس بن نضر انصاری رضی اللہ عنہ تھے۔

(۲)

حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ خزرج کے خاندان نجّار سے تھے۔ سلسلہ نسب یہ ہے:

انس رضی اللہ عنہ بن نضر بن ضمضم بن زید بن حرام بن جندب بن عامر بن غنم بن عدی بن نجّار۔

سرورِ عالم ﷺ کی پردادی سلمیٰ بنتِ عمرو (حضرت عبدالمطلب کی والدہ) بھی اسی خاندان سے تھیں اور رشتہ میں حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ کی پھوپھی ہوتی تھیں۔ اس نسبت سے حضرت انس رضی اللہ عنہ کا خاندانِ رسالت ﷺ سے بھی تعلق تھا۔ جلیل القدر صحابیہ حضرت امِ سُلیم رضی اللہ عنہا، حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ کی بھاوج اور خادمِ رسول اللہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ ان کے حقیقی بھتیجے تھے۔ حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ کا شمار بنو نجّار کے رؤساء میں ہوتا تھا۔ دولتِ دنیوی کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے انہیں فطرتِ سلیم سے بھی نوازا تھا، سرورِ عالم ﷺ کے مدینہ منوّرہ میں نزول اجلال فرمانے سے پہلے ہی دولتِ ایمان سے بہرہ ورہ ہو گئے۔ غزوۂ بدر (۲ ھ) میں کسی وجہ سے شریک نہ ہو سکے۔ کفر و حق کے اس معرکہ اوّل میں اپنی شرکت سے محرومی کا انہیں بے حد قلق تھا، رحمتِ عالم ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر عرض کی: ''یا رسول اللہ مجھے بہت دکھ اور افسوس ہے کہ میں آپ کے پہلے غزوہ میں آپ کی ہمرکابی کا شرف حاصل نہ کر سکا لیکن زندہ رہا تو دنیا دیکھے گی کہ آئندہ میں کیا کرتا ہوں۔

(۳)

شوال ۳ ھ ہجری میں غزوۂ اُحد پیش آیا تو حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ اس میں بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ شریک ہوئے۔ جب ایک اتفاقی غلطی سے لڑائی کا پانسہ پلٹ گیا اور صرف چند آدمی سرورِ عالم ﷺ کے ساتھ میدان میں باقی رہ گئے تو حضرت انس

بن نضر رضی اللہ عنہ سخت بیتاب ہو کر کفار کی طرف بڑھے۔ راستے میں حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ملے، ان سے مخاطب ہو کر فرمایا، سعد کہاں جاتے ہو، جنت وہ ہے، خدا کی قسم مجھے اُحد کی طرف سے جنت کی خوشبو آ رہی ہے۔

ایک اور روایت میں ہے، کہ رسول اکرم ﷺ کی شہادت کی خبر سن کر چند صحابہ بیدلی کے عالم میں لڑائی چھوڑ کر الگ جا بیٹھے تھے، حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ ان کے پاس سے گزرے تو پوچھا کہ تم لوگ لڑائی چھوڑ کر یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ انہوں نے کہا، افسوس کہ رسول اللہ ﷺ شہید ہو گئے، حضرت انس رضی اللہ عنہ بولے، تو پھر تم لوگ زندہ رہ کر کیا کرو گے؟ اٹھو اور کافروں سے لڑ کر مر جاؤ جس طرح حق کی خاطر رسول اللہ ﷺ نے جان دی۔ یہ کہہ کر بڑے جوش سے تلوار چلاتے ہوئے کفار کے ہجوم میں گھس گئے اور دیر تک دادِ شجاعت دیتے رہے۔ بالآخر مشرکین نے نرغہ کر کے ان پر تیروں، تلواروں اور برچھیوں کا مینہ برسا دیا یہاں تک کہ وہ خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اگرچہ ان کا جسم زخموں سے چھلنی ہو گیا تھا لیکن کفار کی آتشِ غضب اس سے بھی نہ بجھی اور انہوں نے لاش کا مُثلہ کیا۔ لڑائی ختم ہونے پر شہداء اور زخمیوں کی تلاش شروع ہوئی تو حضرت انس رضی اللہ عنہ کی لاش پہچانی نہ جاتی تھی۔ بڑی مشکل سے ان کی بہن رُبیّع بنتِ نضر نے ان کی ایک انگلی سے لاش شناخت کی، کہا جاتا ہے کہ حضرت انس کی اُنگلی پر ایک تل تھا جسے دیکھ کر حضرت رُبیّع نے پہچانا۔ بعض روایتوں میں یہ بھی آیا ہے کہ انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے خوبصورت دانتوں یا انگلیوں کی پوروں سے لاش شناخت کی۔ بہر صورت اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ نے راہِ حق میں اس شان سے جان دی کہ جسم کا کوئی حصہ زخموں سے خالی نہ تھا۔ خالق کون و مکان کو ان کی یہ ادا ایسی بھائی کہ بروایت حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ خادمِ رسول اللہ ﷺ یہ آیت ان کے بارے میں نازل ہوئی:

مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ ۖ فَمِنْهُم مَّنْ

قَضٰی نَحْبَهٗ

(ایمان والوں میں بہت سے ایسی لوگ ہیں جنہوں نے اللہ سے کیے ہوئے وعدے کو سچا کر دکھایا ہے ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا ہے اور کوئی وقت آنے کا منتظر ہے)

بنا کر وند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را
رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ
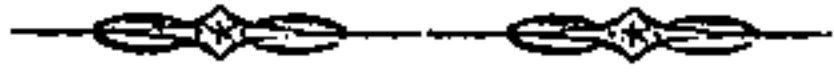
حضرت عبادؓ بن بشر انصاری رضی اللہ عنہ

(۱)

رحمتِ عالم ﷺ ایک مرتبہ اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ میں استراحت فرماتے تھے۔ پچھلی شب کو آپ ﷺ تہجد پڑھنے کے لیے اٹھے تو آپ ﷺ کے سمعِ مبارک میں اپنے ایک جاں نثار کے ذکرِ الٰہی کی آواز پڑی۔ آپ ﷺ ان کی شب بیداری اور شغفِ عبادت سے بہت مسرور ہوئے اور فرمایا: ''اللہ تعالیٰ ان کو بخشش سے نوازے۔''

یہ صاحب رسول جن کی شب بیداری نے سیّد المرسلین ﷺ کو مسرور کیا اور لسانِ رسالت ﷺ سے جن کی مغفرت چاہی گئی۔ حضرت عباد بن بشر انصاری رضی اللہ عنہ تھے۔

(۲)

سیّدنا حضرت عباد بن بشر رضی اللہ عنہ کا شمار اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم میں ہوتا ہے۔ ان کی کنیت ابورافع بھی تھی اور ابو بشر بھی۔ وہ قبیلہ اوس کے خاندان عبدالاشہل کے چشم و چراغ تھے۔ نسب نامہ یہ ہے:

عباد بن بشر بن وقش بن زغبہ بن زعوراء بن عبدالاشہل

۱۲ سنہ بعثت میں حضرت مُصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ اسلام کے مبلغِ اوّل کی حیثیت سے مدینہ آئے تو ان کی تبلیغی مساعی کے نتیجہ میں اوس و خزرج کے بہت سے گھرانوں میں اسلام کا چرچا پھیل گیا۔ ان میں بنو عبدالاشہل کے گھرانے بھی تھے۔ جس دن اس قبیلے کے سردار حضرت سعد بن مُعاذ رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا اسی دن سارے اہلِ قبیلہ ان کی پیروی میں شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہو گئے۔ حضرت عباد بن بشر رضی اللہ عنہ بھی ان میں شامل

تھے۔

رحمتِ عالم ﷺ نے مدینہ منوّرہ میں نزولِ اجلال فرمایا تو حضرت عباد بن بشر رضی اللہ عنہ کو گویا دونوں جہانوں کی نعمتیں مل گئیں۔ اپنے وقت کا بیشتر حصہ بارگاہِ رسالت میں گزارتے تھے اور مقدور بھر فیضانِ نبوی سے بہرہ یاب ہونے کی کوشش کرتے تھے۔ حضور ﷺ سے اپنی عقیدت، محبت اور تحصیلِ علم کے شوق کی بدولت بہت جلد ان کو بارگاہِ نبوّت میں درجہ تقرّب حاصل ہو گیا۔ ہجرت کے چند ماہ بعد حضور ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے مابین مواخاۃ قائم کرائی تو حضرت عباد رضی اللہ عنہ بدر سے لے کر تبوک تک تمام غزوات و مشاہد میں بڑے ذوق و شوق سے شریک ہوئے اور ہر معرکے میں اپنی شجاعت اور سرفروشی کے جوہر دکھائے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ، ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ اور کئی دوسرے اہلِ سِیَر نے لکھا ہے کہ غزوۂ بدر کے بعد مدینہ کے ایک بااثر یہودی کعب بن اشرف نے مسلمانوں کے خلاف دریدہ دہنی کو اپنا وتیرہ بنالیا۔ وہ ایک چرب زبان شاعر تھا اپنے اشعار میں نہ صرف سیّد الانام ﷺ کی ہجو کرتا تھا بلکہ کفّار کو اہلِ حق کے خلاف ابھارتا بھی تھا۔ اسی جوش میں مکہ پہنچا اور اپنے اشتعال انگیز اشعار سے قریش میں انتقام کی آگ کو اور بھی بھڑکا دیا۔ پھر مدینہ واپس آکر اپنی سرگرمیاں پہلے سے بھی تیز کر دیں۔ حضور ﷺ کو اس کی فتنہ انگیزیوں کا علم ہوا تو آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کو حکم دیا کہ اس فتنے کو ختم کرنے کی کوشش کریں۔ حضرت محمد بن مسلمہ انصاری رضی اللہ عنہ نے حضرت عباد بن بشر رضی اللہ عنہ اور کچھ دوسرے جانبازوں کو اپنے ساتھ لیا اور کعب بن اشرف کے گھر جا کر اس کو کیفرِ کردار تک پہنچا دیا۔ حافظ ابنِ عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ اس پر حضرت عباد رضی اللہ عنہ نے چند اشعار کہے جس میں اس بات پر مسرّت کا اظہار کیا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اسلام کے ایک بڑے دشمن کو ختم کرنے کی توفیق دی۔ اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عباد بن بشر رضی اللہ عنہ شعر و شاعری میں بھی درک رکھتے تھے۔

(۳)

غزوۂ احزاب (۵ ہجری) میں سارے عرب کے دشمنانِ اسلام اکٹھے کر کے مدینہ منوّرہ پر حملہ آور ہوئے تھے اور خود شہر کے اندر یہودِ بنی قریظہ نے غداری پر کمر باندھی تھی۔ یہ بڑا پُر آشوب زمانہ تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ہر وقت یہ فکر دامن گیر رہتی تھی کہ کہیں کسی دشمنِ اسلام کے ہاتھ سے سرورِ عالم ﷺ کو چشمِ زخم نہ پہنچ جائے۔ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ اس زمانے میں حضرت عباد بن بشر رضی اللہ عنہ چند دوسرے انصاری صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ ہر رات حضور ﷺ کی قیام گاہ پر پہرہ دیتے تھے۔

ذیقعدہ ۶ ہجری میں رحمتِ عالم ﷺ چودہ سو جاں نثاروں کے ہمراہ بیت اللہ کی زیارت وطواف کے لیے مدینہ منوّرہ سے روانہ ہوئے۔ قریش کو اطلاع ملی تو انھوں نے اہلِ حق کی مزاحمت کا ارادہ کر لیا اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو دو سو سوار دے کر مسلمانوں کا راستہ روکنے کے لیے آگے بھیجا۔ حضرت عباد بن بشر رضی اللہ عنہ نے بیس جانبازوں کے ساتھ اس دستے کا سامنا کیا اور اس کی پیش قدمی میں حائل ہو گئے۔ اس اثناء میں سرورِ عالم ﷺ راستہ بدل کر حدیبیہ کے مقام پر اتر پڑے اور قریش کو پیغام بھیجا کہ ہم صرف عمرہ کرنے آئے ہیں لڑنا مقصود نہیں اس لیے مناسب یہ ہوگا کہ اہلِ مکہ اور مسلمان تھوڑی مدّت کے لیے آپس میں صلح کا معاہدہ کر لیں۔ لیکن قریش مزاحمت پر تلے رہے یہاں تک کہ حضور ﷺ نے حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کو صلح کی ترغیب دینے کے لیے قریش کے پاس بھیجا۔ قریش نے انھیں مکہ میں روک لیا اس سے مسلمانوں میں سخت تشویش پیدا ہوئی اور جب کسی نے یہ خبر مشہور کر دی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قریش نے شہید کر ڈالا تو مسلمان جوشِ غضب سے بے قرار ہو گئے۔ اسی موقع پر بیعتِ رضوان کا عظیم واقعہ پیش آیا جس میں چودہ سو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور ﷺ کے دستِ مبارک پر لڑنے مرنے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا انتقام لینے کی بیعت کی۔ اللہ تعالیٰ نے راہِ حق کے ان جانبازوں کو کھلے لفظوں میں اپنی خوشنودی اور جنت کی بشارت دی۔ ان خوش نصیب

جوانمردوں میں حضرت عباد بن بشر رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔

۸ ہجری میں حضرت عباد رضی اللہ عنہ کو ان دس ہزار نفوسِ قدسی میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا جو فتحِ مکہ کے موقع پر رحمت عالم ﷺ کے ہمرکاب تھے۔ اس کے بعد انہوں نے حنین اور طائف کے معرکوں میں دادِ شجاعت دی۔ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ غزوۂ طائف کے بعد حضور ﷺ نے حضرت عباد بن بشر رضی اللہ عنہ کو بنو سُلیم اور بنو مزینہ سے صدقات وصول کرنے پر مامور فرمایا۔ یہ خدمت انجام دے کر واپس آئے تو حضور ﷺ نے اسی کام کے لیے انہیں بنو مصطلق میں بھیجا۔ وہاں انھوں نے دس روز قیام کیا اس دوران میں صدقات بھی وصول کیے اور لوگوں کو قرآنِ حکیم اور احکامِ شریعت کی تعلیم بھی دی۔

صحیح بخاری میں روایت ہے کہ ایک دفعہ حضرت عباد بن بشر رضی اللہ عنہ، حضرت اُسید بن حُضیر رضی اللہ عنہ کے ہمراہ بارگاہِ رسالت ﷺ میں حاضر ہوئے اور حضور ﷺ کی اقتداء میں عشاء کی نماز پڑھی، کافی دیر کے بعد اپنے گھروں کی طرف لوٹے۔ رات بہت تاریک تھی۔ دونوں کے ہاتھ میں عصا تھا۔ جب حضور ﷺ سے رخصت ہُوئے تو ایک کا عصا روشن ہو گیا، اس کی روشنی میں چلتے رہے۔ جب دونوں کا راستہ جُدا ہوا تو دونوں کے عصا روشن ہو گئے۔ اہلِ سِیَر کا بیان ہے کہ یہ آنحضرت ﷺ کا معجزہ تھا اور ان دونوں بزرگوں کی کرامت۔

غزوۂ ذات الرقاع (۷ ہجری) کے ایام کا واقعہ ہے کہ حضرت عباد بن بشر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ رات کو حضور کی قیام گاہ کے پہرے پر مامور تھے۔ دونوں نے آپس میں طے کیا کہ ایک رات کے نصفِ اوّل میں بیدار رہے اور دوسرا نصفِ آخر میں۔ نصفِ اوّل کی باری حضرت عباد رضی اللہ عنہ کے حصّے میں آئی۔ انہوں نے نماز کی نیت باندھ کر سورۂ کہف کی تلاوت شروع کی اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ سو گئے۔ اتنے میں کسی کافر نے حضرت عباد بن بشر رضی اللہ عنہ کو تیر مارا، جس سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا۔

پھر یکے بعد دیگرے دو تیر اور لگے۔ لیکن انھوں نے نماز نہیں چھوڑی۔ مگر جب خون زیادہ ہی بہنے لگا تو انہوں نے سلام پھیر کر حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو جگایا۔ حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے کہا خدا کے بندے! تم نے مجھے پہلے تیر پر ہی جگا دیا ہوتا۔ حضرت عباد رضی اللہ عنہ بولے، میں نے سورۂ کہف شروع کر رکھی تھی جی نہ چاہا کہ اُسے موقوف کر دوں۔

سنہ ۹ ہجری میں غزوۂ تبوک پیش آیا۔ اس زمانے میں سخت خشک سالی اور شدت کی گرمی تھی اس کے باوجود تیس ہزار جاں بازوں نے حضور ﷺ کی ہمرکابی کی سعادت حاصل کی اور نہایت خندہ پیشانی سے بھوک، پیاس، گرمی اور طویل دشوار گزار سفر کی صعوبتیں برداشت کیں۔ اللہ کے ان پاکباز بندوں میں حضرت عباد بن بشر رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ حضور ﷺ کو ان پر اس قدر اعتماد تھا کہ انھیں تمام پہرہ داروں کا افسر مقرر فرما دیا تھا۔ چنانچہ وہ رات کو تمام لشکر کے گرد گشت لگا کر اس کی حفاظت کرتے تھے۔

(۴)

سنہ ۱۱ ہجری میں رحمتِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سریر آرائے خلافت ہوئے تو فتنۂ ارتداد اور جھوٹے مدعیانِ نبوت کی وجہ سے نوزائیدہ مملکتِ اسلامیہ سخت مشکلات میں پھنس گئی لیکن اس موقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بے مثال عزم و ہمت سے کام لیا اور مرتدین کے سامنے جھکنے یا انھیں کسی قسم کی رعایت دینے سے صاف انکار کر دیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ انہوں نے مرتدین کا قلع قمع کرنے کے لیے گیارہ لشکر مرتب کیے اور مختلف اطراف میں مناسب ہدایات دے کر روانہ کیے۔ مجاہدینِ اسلام نے تھوڑے ہی عرصہ میں مرتدین کے کس بل نکال دیے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ خونریز لڑائی مسیلمہ کذاب کے خلاف یمامہ کے مقام پر لڑی گئی۔ لشکرِ اسلام میں حضرت عباد بن بشر رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ وہ مرتدین کے خلاف سر ہتھیلی پر رکھ کر لڑے اور کشتوں کے پشتے لگا دیے۔ آخر بہت سے مرتدین نے انھیں گھیر لیا اور ان پر تیروں، تلواروں اور برچھیوں کا مینہ برسا دیا، حضرت عباد رضی اللہ عنہ نے آخر دم تک تلوار ہاتھ سے نہ چھوڑی اور

مردانہ وار لڑتے ہوئے جامِ شہادت پی کر خُلدِ بریں میں پہنچ گئے۔ اس وقت ان کی عمر ۴۵ برس کی تھی۔ کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔ حضرت عباد رضی اللہ عنہ کو روایتِ حدیث کا موقع نہیں ملا اس لیے ان سے صرف دو حدیثیں مروی ہیں۔ ان کی جلالتِ قدر کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا انھیں انصار کے تین بہترین آدمیوں میں سے ایک قرار دیتی تھیں، دوسرے دو حضرت سعد بن مُعاذ رضی اللہ عنہ اور حضرت اُسَید بن حُضَیر رضی اللہ عنہ تھے۔

حضرت عباد بن بِشر رضی اللہ عنہ کے صحیفہ حیات میں سبقت فی الاسلام، اخلاص فی الدّین، جذبہ فدویت، حُبِّ رسول ﷺ، دیانت وامانت، شوقِ جہاد اور شغفِ عبادت سب سے نمایاں ابواب ہیں۔ فرائض کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ لوگوں کو قرآن اور شریعت کی تعلیم دینا، رات رات بھر جاگ کر سرورِ عالم ﷺ اور دوسرے مسلمانوں کی حفاظت کرنا یا عبادتِ الٰہی میں مشغول رہنا اور پھر دن کو شریکِ جہاد ہونا ان کے ایسی اوصاف ہیں جن میں بہت کم لوگ ان کے شریک وسہیم ہیں۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ
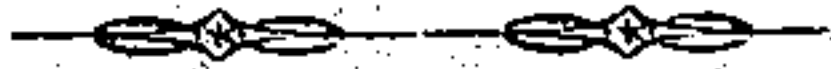
حضرت جبار بن صخر انصاری رضی اللہ عنہ

حضرت ابوعبداللہ جبار بن صخر رضی اللہ عنہ کا تعلق خزرج کے خاندان سلمہ سے تھا۔ سلسلہ نسب یہ ہے:

جبار رضی اللہ عنہ بن صخر بن اُمیہ بن خنیس بن سنان بن عبید بن عدی بن غنم بن کعب بن سلمہ۔

والدہ کا نام سعاد بنتِ سلمہ تھا جو خزرج کی شاخ جشم بن خزرج سے تھیں۔

حافظ ابنِ کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ''البدایہ والنہایہ'' میں لکھا ہے کہ حضرت جبار رضی اللہ عنہ کے والد صخر بن اُمیہ کو بھی شرفِ صحابیت حاصل تھا اور وہ اصحابِ بدر میں سے ایک تھے لیکن دوسرے اربابِ سِیَر نے اصحابِ بدر کی جو فہرست دی ہے اس میں صخر بن اُمیہ کا نام نہیں ہے۔ بعض نے تو ان کے صحابی ہونے میں بھی کلام کیا ہے۔

حضرت جبار رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے فطرتِ سعید سے نوازا تھا۔ ہجرتِ نبوی ﷺ سے پہلے دعوتِ حق پر لبیک کہا اور ۱۳ بعدِ بعثت میں مکہ جا کر بیعتِ عقبہ کبیرہ کی سعادت حاصل کی۔

ہجرت کے بعد سرورِ عالم ﷺ نے مہاجرین اور انصار میں برادری قائم کی تو حضرت جبار رضی اللہ عنہ کو حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ کا بھائی بنایا۔ غزوات کا آغاز ہوا تو حضرت جبار رضی اللہ عنہ نے بدر سے تبوک تک تمام غزوات میں رحمتِ عالم ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔

فتح خیبر کے بعد سرورِ عالم ﷺ نے حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کو وہاں کے

پھلوں کا تخمینہ کرنے کے لیے روانہ فرمایا تھا۔ ۸ھ میں وہ غزوۂ موتہ میں شہید ہو گئے تو حضور ﷺ نے یہ خدمت حضرت جبار بن صخر رضی اللہ عنہ کو تفویض فرمائی اور اسے وہ سالہا سال تک نہایت حسن و خوبی سے انجام دیتے رہے۔

مُسندِ احمد حنبل رحمۃ اللہ علیہ میں ہے کہ سرورِ عالم ﷺ مکہ معظمہ کے لیے روانہ ہوئے تو اثنائے راہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ تم میں سے کوئی اثنا بہ جا کر پانی کا انتظام کرے۔ حضرت جبار رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، یارسول اللہ میں جاتا ہوں۔ چنانچہ وہاں پہنچ کر اِدھر اُدھر سے پتھر اکٹھے کر کے حوض بنایا اور اس میں قریبی چشمے یا کنوئیں سے پانی بھرا۔ کام ختم ہو گیا تو وہیں سو گئے۔ حضور ﷺ وہاں پہنچے تو فرمایا، اے حوض کے مالک، اونٹ کو تمہارے حوض سے پانی پلانے کی اجازت ہے؟ حضرت جبار رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کی آواز پہچان کر عرض کیا، بسر و چشم۔ حضور ﷺ نے اونٹ کو پانی پلایا اور پھر اسے بٹھا کر وضو کرنا چاہا۔ حضرت جبار رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کو وضو کرایا اور حضور ﷺ کی بائیں جانب کھڑے ہو گئے۔ آپ ﷺ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر دائیں جانب کھڑا کر دیا اور پھر نماز ادا فرمائی۔

سرورِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے عہد میں بھی خیبر کے پھلوں کا تخمینہ کرنے کی خدمت بدستور ان کے سپرد رہی اس کے علاوہ حساب کتاب کا عہدہ بھی ان کے پاس تھا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں یہودِ خیبر نے پھر فتنہ انگیزی شروع کر دی اور نت نئی شرارتیں کرنے لگے۔ ایک دفعہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو جو خیبر میں مقیم تھے بالا خانے سے دھکا دے کر نیچے گرا دیا جس سے وہ زخمی ہو گئے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ان لوگوں کی کارستانیوں سے آگاہ ہوئے تو آپ رضی اللہ عنہ نے عام مجمع میں کھڑے ہو کر ان شرارتیں بیان کیں اور یہودیوں کو خیبر سے جلاوطن کرنے کے فیصلہ کا اعلان کیا۔ پھر کچھ مہاجرین اور انصار کو ساتھ لے کر اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے

کے لیے خیبر تشریف لے گئے۔ حضرت جبار بن صخر رضی اللہ عنہ بھی اس سفر میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ہمراہ تھے۔

حضرت جبار رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ۳۰ سنہ ہجری میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ساٹھ برس کے لگ بھگ تھی۔ مُسندِ احمد میں چند احادیث بھی ان سے مروی ہیں۔

بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت جبار بن صخر رضی اللہ عنہ حساب کتاب میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔

ازواج واولاد کی تفصیل کسی کتاب میں نہیں ملتی۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ
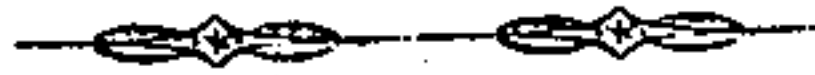
حضرت حارثہ بن سُراقہ انصاری رضی اللہ عنہ

(۱)

غزوۂ بدر سے کچھ عرصہ پہلے کا ذکر ہے کہ ایک دن علی الصباح مدینہ منوّرہ کے ایک نوجوان اپنے خیال میں مگن کہیں جا رہے تھے۔ اثنائے راہ میں اتفاق سے انہیں رحمتِ عالم ﷺ مِل گئے۔ سعادت مند نوجوان نے حضور ﷺ کو بڑے ادب سے سلام کیا اور وہیں کھڑے ہو گئے۔ حضور ﷺ نے نہایت خندہ پیشانی سے ان کے سلام کا جواب دیا اور پھر شفقت آمیز پیرائے میں ان سے پوچھا:

"کہو بھائی تمہارے شب روز کیسے گزر رہے ہیں۔"

نوجوان نے عرض کیا:

"یارسول اللہ میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان، دنیا کی طرف چنداں رغبت نہیں رہی۔ رات یادِ الٰہی میں گزارتا ہوں اور دن بھر روزے سے رہتا ہوں۔ عین اس وقت یہ حالت ہے کہ خود کو عرش کی طرف پرواز کرتے محسوس کر رہا ہوں۔ جنت اور دوزخ مجھے اپنے سامنے نظر آ رہے ہیں اور میں لوگوں کو گروہ در گروہ ان میں داخل ہوتے دیکھ رہا ہوں۔"

حضور ﷺ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ جل شانہ، جس بندے کے دل کو روشن کر دیتا ہے۔ وہ پھر اللہ سے جُدا نہیں ہوتا۔"

نوجوان کا چہرہ جو پہلے ہی نورِ سعادت سے درخشاں تھا، رحمتِ عالم ﷺ کا ارشاد سُن کر اور بھی چمک اٹھا۔ انہوں نے بے ساختہ عرض کیا:

''یارسول اللہ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے شہادت نصیب فرمائے۔''

حضور ﷺ نے اسی وقت دستِ مبارک اٹھائے اور بارگاہِ خداوندی میں دُعا کی کہ الٰہی اس نوجوان کی آرزو کو پورا کردے۔

یہ قائم اللیل اور دائم الصوم جوانِ صالح جو اپنی جان راہِ حق میں قربان کرنے کے لیے اس قدر آرزومند اور بیتاب تھے کہ خود سیّد المرسلین محبوب ربّ ذوالمنن ﷺ سے اپنی شہادت کے لیے دعا کروائی، غزوۂ بدر الکبریٰ میں انصار کے سب سے پہلے شہید حضرت حارثہ بن سُراقہ انصاری رضی اللہ عنہ تھے۔

(۲)

حضرت حارثہ بن سُراقہ رضی اللہ عنہ کا تعلق خزرج کی معزز ترین شاخ بنو نجار سے تھا۔ نسب نامہ یہ ہے:

حارثہ بن سراقہ رضی اللہ عنہ بن حارث بن عدی بن مالک بن عدی بن عامر بن غنم بن نجار۔

والدہ کا نام رُبَیع بنتِ نضر رضی اللہ عنہا تھا۔ وہ خادمِ رسول اللہ ﷺ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی حقیقی پھوپھی، شہیدِ اُحد حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ کی بہن اور خود بھی جلیل القدر صحابیہ تھیں۔ بہن بھائی میں انتہا درجے کی محبت تھی۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت رُبَیع رضی اللہ عنہا کے ہاتھ سے ایک انصاری لڑکی کا دانت ٹوٹ گیا۔ اس کے اہلِ خاندان نے قصاص کا مطالبہ کیا۔ سرورِ عالم ﷺ نے ان کے حق میں فیصلہ صادر فرمایا کیونکہ دانت کے بدلے دانت، کان کے بدلے کان اور جان کے بدلے جان، ہی خُدائی قانون ہے۔ ہاں اگر مضروب یا مقتول کے وُرثاء خون بہا (دِیت) لینے پر رضامند ہو جائیں تو پھر قصاص ٹل جاتا ہے۔

حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ بھی اس موقع پر حاضر تھے۔ یہ جان کر کہ اب ان کی پیاری بہن کا دانت بھی توڑا جائے گا۔ جوشِ محبت سے بے قرار ہو گئے اور بے اختیار بار

گاہِ نبوی میں عرض پیرا ہوئے۔ "یارسول اللہ، خدا کی قسم رُبَیع رضی اللہ عنہا کا دانت نہ توڑا جائے گا۔"

حضور ﷺ نے فرمایا: "بھائی خدا کا حکم یہی ہے۔"

خدا کی قدرت، مضروب لڑکی کے متعلقین حضرت انس رضی اللہ عنہ کا جوشِ محبت دیکھ کر بہت متاثر ہوئے اور دِیَت لینے پر رضامند ہو گئے۔ اسی طرح حضرت رُبَیع رضی اللہ عنہا قصاص سے بچ گئیں۔ اس موقع پر حضور ﷺ نے فرمایا، بعض بندگانِ خدا ایسے بھی ہیں کہ جب کسی بات پر قسم کھا بیٹھتے ہیں تو اللہ ان کی قسم پوری کر دیتا ہے۔

حضرت رُبَیع رضی اللہ عنہا کی شادی سراقہ بن حارث سے ہوئی تھی۔ انہی کے صلب سے حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے۔ سراقہ ہجرتِ نبوی سے پہلے وفات پا گئے اور شرف اسلام سے بہرہ ور نہ ہو سکے البتہ حضرت رُبَیع رضی اللہ عنہا اور حارثہ رضی اللہ عنہ دونوں نے اپنے خاندان (بنو نجار) کے بہت سے دوسرے لوگوں کے ساتھ ہجرتِ نبوی سے کچھ عرصہ قبل یا ہجرت کے فوراً بعد قبولِ اسلام کی سعادت حاصل کی۔ ماں نے نہایت دلسوزی کے ساتھ حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ کی پرورش کی اور ان کو باپ کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ کو اس بات کا بخوبی احساس تھا چنانچہ وہ اپنی والدہ کے نہایت فرماں بردار اور خدمت گزار تھے اور ان کی خوشی کو اپنی خوشی پر ہمیشہ ترجیح دیتے تھے یہی سبب تھا کہ والدہ بھی ان سے والہانہ محبت کرتی تھیں اور ہر وقت فرزندِ سعید کو اپنی دعاؤں سے نوازتی رہتی تھیں۔ یہ ان کی دعاؤں ہی کا ثمرہ تھا کہ حارثہ رضی اللہ عنہ نے عین عالمِ شباب میں لذّاتِ دینوی سے کنارہ کش ہو کر خدا سے ایسی لَو لگائی تھی کہ مقبولِ بارگاہ الٰہی ہو گئے تھے۔ اللہ نے ان کی آنکھوں کے سامنے سے کتنے ہی حجابات اٹھا دیئے تھے یہاں تک کہ وہ دوزخ اور جنت کے مناظر دیکھا کرتے تھے۔

(۳)

رمضان المبارک ۲ھ ہجری میں رحمتِ عالم ﷺ تین سو تیرہ جاں نثاروں کے ہمراہ

غزوۂ بدر الکبریٰ کے لیے تشریف لے گئے۔ اللہ کے ان پاک باز بندوں میں حضرت حارثہ بن سُراقہ رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ یہ مٹھی بھر جماعت محض اللہ کے بھروسے پر کفر کی مہیب طاغوتی طاقت سے ٹکرانے نکلی تھی۔ اس کے بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ سارے لشکر کے پاس لے دے کے صرف دو گھوڑے اور ستر اونٹ تھے۔ ان دو گھوڑوں میں سے ایک گھوڑے کے سوار حضرت حارثہ بن سراقہ رضی اللہ عنہ تھے۔ حضور ﷺ نے ان کو لشکر کی نگہبانی کا فرض سونپا تھا۔ وہ میدانِ کارزار میں لبِ حوض پانی پینے کے لیے کھڑے تھے کہ ایک مشرک حِبان بن العرقہ نے تاک کر ایک تیر ان کی طرف چلایا جو ان کے گلے میں پیوست ہو گیا اور اسی کے صدمہ سے ان کی روحِ مطہر جنت الفردوس کو پرواز کر گئی۔ ع

خوش درخشید و لے شعلہ مستعجل بود

اس طرح حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ کی دلی تمنا پوری ہو گئی اور کیوں نہ ہوتی اس کے لیے تو سیّد الانام امام الانبیاء شافعِ محشر ﷺ نے دُعا کی تھی۔

حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر مدینہ پہنچی تو حضرت رُبَیع رضی اللہ عنہا کو اپنے سعادت مند فرزند کی دائمی جدائی کا شدید صدمہ ہوا لیکن انہوں نے کمال درجے کے صبر و استقلال سے کام لیا اور فرمایا، خدا کی قسم جب تک رسول اللہ ﷺ تشریف نہ لائیں گے اور میں آپ ﷺ سے حارثہ کا حال نہ پوچھ لوں گی، ہرگز آہ و بکا اور گریہ وزاری نہ کروں گی۔

جب سرورِ عالم ﷺ نے غزوۂ بدر سے مراجعت فرمائی تو حضرت رُبَیع رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور یوں عرض پیرا ہوئیں:

''یارسول اللہ حارثہ میری نہایت اطاعت گزار اور محبوب فرزند تھا۔ اس کی جدائی کا جس قدر صدمہ میرے دل پر ہے اس کو آپ خوب جانتے ہیں۔ میں نے چاہا تھا کہ اس کے غم میں گریہ وزاری کروں پھر میں نے اپنے دل میں کہا کہ میں ایسا نہ کروں گی جب تک رسول اللہ ﷺ سے یہ بات پوچھ نہ

لوں کہ حارثہ اب کس حال میں ہے۔ اگر وہ جنت میں ہے تو ہرگز گریہ و زاری نہ کروں گی اور صبر کروں گی اور اگر وہ جہنم میں ہے تو اللہ دیکھے گا کہ میں بین و بکا سے کس طرح اپنی جان کو ہلکان کرتی ہوں۔"

رحمتِ عالم ﷺ نے فرمایا: "یہ تم کیا کہہ رہی ہو، جنت ایک نہیں بلکہ بکثرت ہیں۔ ان میں سے ایک جنت الفردوس ہے اور بیشک حارثہ رضی اللہ عنہ اسی جنت میں ہے۔"

حضور ﷺ کا ارشاد مبارک سن کر حضرت رُبَیع رضی اللہ عنہا شاداں و فرحاں ہو گئیں اور بے اختیار ان کی زبان سے نکلا:

"بخٍ بخٍ یا حارثہ" (واہ واہ اے حارثہ) اس کے بعد انہوں نے عرض کی: "یارسول اللہ ﷺ اب میں کبھی حارثہ کے لیے نہیں روؤں گی۔"

اکثر اہلِ سِیَر نے لکھا ہے کہ حضرت حارثہ بن سراقہ رضی اللہ عنہ غزوۂ بدر میں انصار کے سب سے پہلے شہید ہیں۔ بعض روایتوں میں ہے کہ غزوۂ بدر کے وقت حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ کی عمر تیرہ چودہ برس تھی اور ان پر جہاد فرض نہ تھا وہ صرف جنگ کا تماشا دیکھنے کے لیے بدر گئے تھے، اتفاق سے شہید ہو گئے۔ ہمیں ایسی تمام روایات کی صحت میں کلام ہے۔ کیونکہ جمہور اہلِ سِیَر نے انہیں صراحت کے ساتھ شہدائے بدر میں شمار کیا ہے۔

فی الحقیقت تیرہ چودہ برس کے ایک لڑکے سے ہرگز توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ محض جنگ کا تماشا دیکھنے گھر سے اسی ۸۰ میل دُور جائے۔ صحیح یہی ہے کہ غزوۂ بدر سے قبل حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ نہ صرف سنِ بلوغت کو پہنچ چکے تھے بلکہ فیضانِ نبوی ﷺ سے بھی بہت کچھ بہرہ یاب ہو چکے تھے اور عبادت سے غیر معمولی شغف و انہماک کی بدولت مقربانِ الٰہی میں داخل ہو چکے تھے۔ وہ برضاء و رغبت حضور ﷺ کی رضامندی اور اجازت کے ساتھ میدانِ بدر میں تشریف لے گئے اور وہیں جامِ شہادت پی کر جنت الفردوس کو سدھارے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

حضرت ابوالیسر کعب بن عمرو انصاری رضی اللہ عنہ

(۱)

اواخر ۶ ہجری (یا اوائل ۷ ہجری) میں رحمتِ عالم ﷺ غزوۂ خیبر کے لیے تشریف لے گئے تو یہودِ خیبر اپنے قلعوں میں محصور ہو کر بیٹھ گئے اثنائے محاصرہ میں ایک دن حضور ﷺ نے دیکھا کہ یہودیوں کی بہت سی بکریاں ایک قلعے کے اندر جا رہی ہیں۔ آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''آج کون مجھے ان بکریوں کا گوشت کھلائے گا۔''

چھوٹے سے قد کے ایک صاحب رضی اللہ عنہ رسول ﷺ نے اٹھ کر عرض کیا:

''یارسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان یہ کام میں کروں گا۔''

یہ کہہ کر تیر کی طرح بکریوں کی طرف لپکے اور اس بات کی پرواہ کیے بغیر کہ محصور دشمن کا کوئی تیر یا پتھر ان کی جان نہ لے لے، دو بکریوں کو پکڑ لیا اور انھیں بغل میں دبا کر حضور رسالت مآب ﷺ کی خدمت میں لے آئے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے فوراً ان بکریوں کو ذبح کیا اور ان کو گوشت پکا کر حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔ سرورِ عالم ﷺ ان صاحب رسول رضی اللہ عنہ کی کارگزاری پر بے حد مسرور ہوئے اور ان کو دعائے خیر سے نوازا۔ یہ صاحب رسول رضی اللہ عنہ جنھوں نے سرورِ کونین ﷺ کی خوشنودی کی خاطر اپنی جان خطرے میں ڈال کر یہ کارنامہ انجام دیا۔ حضرت ابوالیسر کعب بن عمرو انصاری رضی اللہ عنہ تھے۔

(۲)

سیّدنا ابوالیَسر کعب بن عمرو رضی اللہ عنہ کا شمار نہایت عظیم المرتبت صحابہ میں ہوتا ہے وہ

خزرج کے خاندان بنو سلمہ سے تعلق رکھتے تھے اور انصار کے السابقون الاوّلون میں سے تھے۔ نسب نامہ یہ ہے:

کعب رضی اللہ عنہ بن عمرو بن عباد بن عمرو بن سواد بن غنم بن کعب بن سلمہ بن سعد بن علی بن اسد بن سارده بن یزید بن جشم بن خزرج۔

والدہ کا نام نسیبہ بنتِ ازہر تھا اور وہ بھی بنو سلمہ سے تھیں۔

حضرت کعب رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے فطرتِ سلیم سے نوازا تھا۔

۱۲ بعدِ بعثت میں حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ اسلام کے مبلغ اوّل کی حیثیت سے مدینہ منورہ تشریف لائے اور اہلِ مدینہ کو حق کی طرف بلانا شروع کیا تو حضرت کعب بن عمرو رضی اللہ عنہ نے بنو سلمہ کے کچھ دوسرے سعید الفطرت نوجوانوں کے ساتھ بلا تامّل دعوتِ اسلام پر لبیک کہا۔ اس وقت ان کی عمر اٹھارہ برس کے لگ بھگ تھی۔ اگلے سال وہ مدینہ کے چوہتر ۷۴، دوسرے اہلِ حق کے ساتھ مکہ گئے اور لیلۃ العقبہ میں رحمتِ عالم ﷺ کی بیعت سے مشرّف ہوئے یہی وہ اصحاب تھے جنہوں نے حضور ﷺ کو مدینہ تشریف لانے کی دعوت دی اور اپنی جانوں مالوں اور اولادوں کے ساتھ آپ ﷺ کی نصرت و حمایت کا عہد کیا۔ جب یہ عہد کر کے وہ مدینہ واپس گئے تو جوشِ ایمان نے انہیں خاموش نہ بیٹھنے دیا اور وہ بڑی سرگرمی اور تندہی سے باطل کی بیخ کنی اور حق کی اشاعت میں مشغول ہو گئے تا آنکہ اوس و خزرج کے گھر گھر میں اسلام پھیل گیا۔

بیعت لیلۃ العقبہ کے تقریباً چار ماہ بعد رحمتِ عالم ﷺ بھی ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لے آئے اور اسلام کے مدنی دور کا آغاز ہو گیا۔

(۳)

رمضان ۲ ہجری میں بدر کے میدان میں حق و باطل کے درمیان پہلا معرکہ ہوا تو حضرت کعب بن عمرو رضی اللہ عنہ نے اس میں بڑے جوش و خروش سے حصہ لیا۔ وہ جان ہتھیلی پر رکھ کر لڑے اور قریشِ مکہ کے علمبردار عزیز بن عمیر سے علَم چھین لیا۔ ایک روایت میں ہے

کہ انہوں نے مشرکین کے ایک رئیس منبہ بن حجاج کو بھی موت کے گھاٹ اتارا اور پھر عمِ رسول حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کو اسیر کر لیا (وہ بھی قریشِ مکہ کے ساتھ بادلِ نخواستہ آئے تھے) جب وہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ کو حیرت ہوئی کہ اس چھوٹے سے قد کے آدمی نے عباس جیسے ڈیل ڈول والے شخص کو کیسے گرفتار کر لیا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''عباس کو اسیر کرنے میں کسی فرشتہ نے ابوالیسر کی مدد کی ہوگی۔''

غزوۂ بدر کے بعد حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے دوسرے تمام غزوات میں بھی رحمتِ علم ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا اور ہر معرکے میں سربکف ہو کر دادِ شجاعت دی۔ غزوۂ خیبر کے موقع پر انہوں نے جس طرح حضور ﷺ کی خوشنودی حاصل کی اس کی تفصیل اوپر آ چکی ہے۔ سرورِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد ان کی عسکری سرگرمیوں کا سراغ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عہدِ خلافت میں ملتا ہے۔ اہلِ سیَر کا بیان ہے کہ انہوں نے جنگِ صفّین اور دوسرے لڑائیوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں شامل ہو کر اپنی تلوار کے خوب جوہر دکھائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد انہوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ مسند احمد رحمۃ اللہ علیہ بن حنبل میں ہے کہ بڑھاپے میں خیبر والا واقعہ بیان کر کے رویا کرتے تھے اور لوگوں سے فرماتے تھے کہ مدینہ میں اب میں ہی باقی رہ گیا ہوں جس نے رسول اللہ ﷺ کا فیضانِ صحبت اٹھایا ہے۔ اس سے پہلے کہ میری زندگی کا چراغ بجھ جائے مجھ سے جو فائدہ اٹھا سکتے ہو اٹھا لو۔

حضرت ابوالیَسر کعب بن عمرو رضی اللہ عنہ جب عمر کی ستر سے کچھ اوپر منزلیں طے کر چکے تو پیغامِ اجل آ پہنچا اور وہ خالقِ حقیقی کے حضور پہنچ گئے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ وہ اصحابِ بدر میں سب سے آخر میں فوت ہوئے۔ اپنے پیچھے عمار نامی ایک لڑکا چھوڑا۔ حدیث بیان کرنے میں بہت محتاط تھے تاہم ان سے مروی چند احادیث کتبِ حدیث میں مل جاتی ہیں۔ صحیح مسلم میں مشہور تابعی حضرت عبادہ بن ولید رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ

ایک مرتبہ حضرت کعب بن عمرو رضی اللہ عنہ نے مجھ سے دو حدیثیں اس طرح بیان کیں کہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر کہتے تھے کہ ان آنکھوں نے یہ واقعہ دیکھا اور پھر کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہتے تھے کہ ان کانوں نے رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے یہ سُنا۔

(۴)

حضرت کعب بن عمرو رضی اللہ عنہ کے لیے سرورِ عالم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا ہر نقش چراغِ ہدایت تھا اور وہ اسی کی روشنی میں جادۂ عمل پر قدم رکھتے تھے۔

صحیح مسلم میں روایت ہے کہ ایک مرتبہ عبادہ بن ولید رحمۃ اللہ علیہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے دیکھا کہ ان کے غلام کے پاس کتابوں کا پستارہ ہے اور اس نے بھی ہو بہو حضرت کعب رضی اللہ عنہ جیسا لباس پہن رکھا ہے۔ یہ لباس دو مختلف قسم کے کپڑوں پر مشتمل تھا۔ عبادہ نے عرض کیا کہ اگر آپ دونوں ایک ایک کپڑا ایک دوسرے سے بدل لیتے تو ہمرنگ ہو کر پورا حلہ یعنی جوڑا ہو جاتا۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر ان کے سر پر ہاتھ پھیرا، دُعا دی اور فرمایا ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ غلاموں کو وہی کھلاؤ جو خود کھاتے ہو اور وہی پہناؤ جو خود پہنتے ہو'' یعنی اس طریقہ سے دونوں سے کپڑے ہمرنگ تو ہو جاتے لیکن اس سے کپڑوں میں اختلاف ہو جاتا اور مساوات زائل ہو جاتی۔ یہ بات حضرت کعب رضی اللہ عنہ کو گوارا نہ تھی۔

ایک دفعہ حضرت کعب رضی اللہ عنہ تنگ دست ہو گئے۔ اور ایک دوسرے صحابی حضرت سمرہ بن ربیعہ رضی اللہ عنہ سے کچھ قرض لیا وہ تقاضے کو آئے تو ان کے پاس ابھی قرض ادا کرنے کی مقدرت نہ تھی۔ ندامت سے بچنے کے لیے اِدھر اُدھر ہو گئے۔ حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ واپس جانے لگے تو حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے سامنا ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ قرض کا مطالبہ کریں حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ ''سمرہ رضی اللہ عنہ کیا تم نے رسول اللہ ﷺ سے نہیں سنا ہے کہ جو شخص تنگ دست کو مہلت دے گا اللہ تعالیٰ اس کو اپنے سایہ میں لے لے گا؟'' انہوں نے فرمایا:

''بے شک میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ سُنا ہے''
اس کے بعد بغیر تقاضے کے واپس چلے گئے۔

(الاصابہ۔ ابن حجر)

علامہ ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ''اُسد الغابہ'' میں لکھا ہے کہ ایک شخص پر حضرت ابوالیسر کا قرض آتا تھا وہ تقاضے کے لیے اس کے گھر گئے تو اس نے لونڈی سے کہا کہ کہہ دو گھر میں نہیں ہیں۔ حضرت ابوالیسر رضی اللہ عنہ نے اُس کی آواز سن لی، پکار کر کہا، باہر نکلو میں نے تمہاری آواز سُن لی ہے۔ وہ باہر آیا تو پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کہا۔ اس نے کہا کہ تنگدستی سے مجبور ہو کر۔ فرمایا، جاؤ میں قرض معاف کرتا ہوں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ جس نے تنگ دست کو مہلت دی یا قرض معاف کر دیا وہ قیامت کے دن اللہ کے سائے میں ہوگا۔

صحیح مسلم میں اسی قسم کا واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ بنو حرام کا ایک شخص حضرت ابوالیَسر کا مقروض تھا۔ وہ قرض وصول کرنے اس کے مکان پر گئے۔ معلوم ہوا کہ صاحبِ خانہ گھر میں نہیں ہے۔ اسی اثناء میں اس کا چھوٹا لڑکا باہر آیا اس سے پوچھا تمہارے والد کہاں ہیں۔ اس نے طفلانہ صاف گوئی سے کہا کہ ماں کی چارپائی کے نیچے چھپ کر بیٹھے ہیں۔ حضرت ابوالیَسر رضی اللہ عنہ نے آواز دی، باہر آ جاؤ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ تم کہاں ہو۔ وہ باہر آیا اور اپنی تنگ دستی کا حال سنایا۔ حضرت ابوالیسر رضی اللہ عنہ نے اسی وقت قرض کا رسید نامہ منگا کر تمام الفاظ مٹا دیئے اور فرمایا:

''اگر استطاعت ہو تو ادا کر دینا ورنہ میں معاف کرتا ہوں۔''

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

حضرت محمود بن مسلمہ انصاری رضی اللہ عنہ

قبیلہ اوس کی شاخ بنو حارثہ سے تھے۔ مشہور صحابی حضرت محمد بن مَسلمہ رضی اللہ عنہ ان کے بھائی تھے۔ نسب نامہ یہ ہے:

محمود رضی اللہ عنہ بن مسلمہ بن سلمہ بن خالد بن عدی بن مجدعہ بن حارثہ بن خزرج بن عمرو بن مالک بن اوس

اہلِ سِیَر نے ان کے قبولِ اسلام کا زمانہ نہیں لکھا لیکن قیاسِ غالب یہی ہے کہ وہ ہجرتِ نبوی ﷺ سے تقریباً ایک سال پہلے دولتِ ایمان سے بہرہ ور ہو گئے تھے کیونکہ ان کے بھائی حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ اسی زمانے میں حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی تبلیغ سے مسلمان ہوئے تھے۔

حضرت محمود رضی اللہ عنہ سب سے پہلے غزوۂ اُحد میں شریک ہوئے۔ اسکے بعد غزوۂ خندق میں دادِ شجاعت دی۔ ۶ھ میں انہیں حدیبیہ میں بیعتِ رضوان کا عظیم شرف حاصل ہوا۔ اس کے بعد سرورِ عالم ﷺ کی ہمرکابی میں غزوۂ خیبر کے لیے تشریف لے گئے اور اس میں نہایت ثابت قدمی سے دادِ شجاعت دی۔ اثنائے جنگ میں ایک دن لڑائی کی شدت اور ہتھیاروں کے بوجھ سے تھک گئے اور قلعہ ناعم کی دیوار کے سائے میں سستانے کے لیے بیٹھ گئے۔ کسی یہودی (بعض روایتوں کے مطابق کنانہ بن ابی الحُقیق یا مرحب) نے ایک بھاری پتھر (غالباً چکّی کا پاٹ) ان کے سر پر دے مارا۔ اس سے شدید زخمی ہو گئے اور پیشانی کی کھال منہ پر اتر آئی۔ لوگ اٹھا کر حضور ﷺ کی خدمت میں لے گئے۔ آپ ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے کھال کو اس کی جگہ لا کر

کپڑے کی پٹی باندھ دی۔ حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ ان کی حالت دیکھ کر سخت مغموم تھے۔ حضور ﷺ نے ان کو تسلی دی اور فرمایا انشاء اللہ تیرے بھائی پر پتھر گرانے والا کل اپنے کیفرِ کردار کو پہنچ جائے گا۔ لسانِ رسالت سے نکلے ہوئے الفاظ دوسرے دن یوں پورے ہوئے کہ حضرت محمود رضی اللہ عنہ پر پتھر گرانے والا یہودی دوسرے دن مارا گیا۔ حضرت محمود رضی اللہ عنہ بھی زخمی ہونے کے تین دن بعد عازم فردوسِ بریں ہو گئے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ'
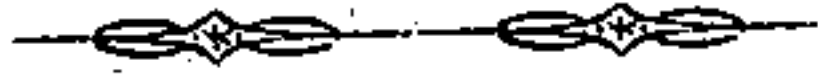
حضرت عاصم بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ

(۱)

غزوۂ بدر کے دن جب علمبردارانِ حق اور پرستارانِ طاغوت ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوئے تو ہنگامہ کارزار گرم ہونے سے پہلے سرورِ عالم ﷺ نے اپنے ایک انصاری جاں نثار کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا: ''تم دشمن سے کس طرح لڑو گے؟''

انہوں نے عرض کیا: ''یارسول اللہ ﷺ جب دشمن دو سو گز کے فاصلے پر ہوگا تو ہم اس پر تیر برسائیں گے۔ جب وہ آگے بڑھ کر نیزے کی زد میں آئے گا تو ہم نیزوں سے لڑیں گے اور جب اس سے بھی آگے آئے گا تو ہم تلواروں سے اس کا مقابلہ کریں گے۔''

ان کا جواب سُن کر حضور ﷺ کے روئے انور پر بشاشت پھیل گئی اور آپ ﷺ نے فرمایا:

''ہاں لڑنے کا یہی صحیح طریقہ ہے۔ تم لوگ اسی طرح لڑنا۔''

یہ صاحب رسول جن کے بتائے ہوئے طریق جنگ کی خود سید المرسلین ﷺ نے تصویب فرمائی، سیّدنا حضرت عاصم بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ تھے۔

(۲)

سیّدنا حضرت ابو سلمان عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ کا شمار نہایت عظیم المرتبت صحابہ میں ہوتا ہے۔ ان کا تعلق انصار کے قبیلہ اوس سے تھا۔ نسب نامہ یہ ہے:

عاصم رضی اللہ عنہ بن ثابت بن ابی افلح قیس بن عصمۃ بن نعمان بن مالک بن امتہ بن ضبیعہ بن زید بن مالک بن عوف بن عمرو بن عوف بن مالک بن

اوس

حضرت عاصم رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے فطرتِ سعید عطا کی تھی۔ جب حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی تبلیغی مساعی کے نتیجہ میں یثرب کے گھر گھر میں اسلام کا چرچا پھیلا تو حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نے بھی کسی تامّل کے بغیر دعوتِ حق پر لبیک کہا۔ اس طرح ان کو ہجرتِ نبوی سے پہلے ہی نعمتِ اسلام نصیب ہوگئی۔ جس دن رحمتِ عالم ﷺ نے مدینہ منوّرہ میں نزولِ اجلال فرمایا وہ حضرت عاصم رضی اللہ عنہ کی زندگی کا سب سے بڑا یومِ مسرّت تھا۔ انہوں نے اپنے جذبہ فدویت، جوشِ ایمان اور پاکیزگی کردار کی بدولت بہت جلد بارگاہِ رسالت میں درجہ تقرب حاصل کرلیا۔ وہ قدر اندازی، نیزہ بازی اور شمشیر زنی میں کمال درجے کی مہارت رکھتے تھے اور شجاعانِ انصار میں شمار ہوتے تھے چنانچہ غزوۂ بدر کے دن جب انہوں نے حضور ﷺ کے استفسار پر لڑائی کا طریقہ بتایا تو ایک روایت کے مطابق حضور ﷺ نے دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مخاطب ہوکر فرمایا:

''جو لڑنا چاہے عاصم کی طرح لڑے''

لڑائی شروع ہوئی تو حضرت عاصم رضی اللہ عنہ اس جوش اور جذبہ کے ساتھ لڑے کہ جانبازی کا حق ادا کردیا۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح مبین عطا کی۔ قریشِ مکہ کے ستر ۷۰ آدمی ہلاک اور ستر ۷۰ ہی مسلمانوں کے ہاتھ اسیر ہوگئے۔ ان قیدیوں میں مشہور دشمنِ دین عقبہ بن ابی معیط بھی تھا۔ اس شخص نے مکہ میں رحمتِ عالم ﷺ کو ستانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ یہی وہ نانہجار تھا جس نے ایک دن حضورِ پُرنور ﷺ کے دوشِ مبارک پر اس وقت اونٹ کی نجس اوجھ رکھی تھی جب آپ ﷺ مسجدِ حرام میں سربسجود تھے۔ لڑائی کے بعد حضور ﷺ بدر سے کوچ فرما کر صفراء کے مقام پر پہنچے تو آپ ﷺ نے حضرت عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ عقبہ بن ابی معیط کو شہرِ خموشاں میں پہنچا دیں۔ ابنِ جریر طبری کا بیان ہے کہ جب حضرت عاصم رضی اللہ عنہ اس کے قتل کے لیے بڑھے تو اس نے چلّا کر کہا: ''محمد ﷺ میرے بچوں کا کون کفیل ہوگا؟''

آپ ﷺ نے فرمایا: "جہنم"۔ جہنم سے آپ ﷺ کی مراد یہ تھی کہ تم خود تو جہنم میں جاؤ پیچھے تمہارے اولاد کا جو حشر مقدر ہے وہ ہو کر رہے گا۔

حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نے تلوار کے ایک ہی وار میں عقبہ کو کیفرِ کردار تک پہنچا دیا۔

(۳)

۳ھ ہجری میں غزوۂ اُحد پیش آیا تو اس میں بھی حضرت عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ جان ہتھیلی پر رکھ کر لڑے۔ وہ اس غزوہ کے اُن ابطالِ خاص میں سے تھے جو شروع سے لے کر اخیر تک ثابت قدم رہے۔ لڑائی کے دوران میں قریش کا ایک نامی جنگجو مسافع بن طلحہ بن ابی طلحہ نشان اٹھائے ہنکارتا ہوا میدان میں آیا۔ حضرت عاصم رضی اللہ عنہ کی نظر اس پر پڑی تو انہوں نے یہ کہہ کر اس کو تیر مارا "یہ لے میں ہوں ابنِ ابی الاقلح" تیر اس پر چنداں کارگر نہ ہوا تو انہوں نے آگے بڑھ کر اپنی تلوار کے وار سے اس کو خاک وخون میں لوٹا دیا۔ مسافع کے بعد اس کا بھائی حارث بن طلحہ بن ابی طلحہ للکارتا ہوا آگے بڑھا۔ حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نے اس کو بھی جہنم واصل کر دیا۔ ایک روایت میں ہے کہ ان دونوں کی ماں سلافہ بھی مکہ سے مشرکین کے ساتھ آئی تھی اور میدانِ جنگ میں موجود تھی۔ مسافع میں ابھی کچھ جان باقی تھی کہ اس کو اٹھا کر سلافہ کے پاس لے گئے۔ اس نے بیٹے سے پوچھا: "تجھ کو کس نے مارا ہے؟" اس نے کہا "مجھے مارنے والے نے تیر چلاتے وقت کہا تھا، میں ہوں ابنِ ابی الاقلح۔" اس پر سلافہ نے نذر مانی کو میں ابنِ ابی الاقلح کے کاسۂ سر میں شراب پیوں گی اور جو شخص اس کا سر کاٹ کر لائے گا اس کو سو اونٹ انعام دوں گی۔ گویا غزوۂ اُحد کے بعد حضرت عاصم رضی اللہ عنہ مشرکینِ مکہ کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکنے لگے تھے۔ اس لڑائی میں اگرچہ مسلمانوں کو شدید جانی نقصان پہنچا لیکن ان کے حوصلے نہایت بلند تھے۔ اس لیے مشرکین کو مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کا حوصلہ نہ پڑا اور وہ مسلمانوں کے جانی نقصان ہی کو غنیمت سمجھ کر میدانِ اُحد سے عازمِ مکہ ہو گئے۔ دوسرے دن سرورِ عالم ﷺ نے اپنے جان نثاروں کے ساتھ "حمراء الاسد" کے مقام تک لشکرِ قریش کا

تعاقب کیا لیکن وہ بچ کر نکل گیا۔ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ کفارِ مکہ کا نامی شاعر ابو عزہ عمرو بن عبداللہ اتفاق سے پیچھے رہ گیا تھا مسلمانوں نے اسے گرفتار کر لیا۔ یہ شخص بنو جمح سے تعلق رکھتا تھا۔ اور اپنے اشعار میں اسلام کے خلاف سخت بدزبانی کیا کرتا تھا۔ غزوۂ بدر میں بھی وہ مشرکین کے ساتھ آیا تھا اور مسلمانوں کے ہاتھ اسیر ہو گیا تھا۔ جب اس کو فدیہ دینے کے لیے کہا گیا تھا تو اس نے اپنی مفلسی اور تہی دستی کا عذر پیش کیا تھا اور کہا تھا کہ میری پانچ لڑکیاں ہیں۔ حضور ﷺ نے اس سے یہ وعدہ لے کر آزاد کر دیا تھا کہ وہ آئندہ کبھی مسلمانوں کے خلاف کسی لڑائی میں شریک نہ ہوگا۔ غزوہ اُحد کے موقع پر اس نے اپنا عہد فراموش کر دیا اور بڑے جوش وخروش کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف لڑا۔ اب گرفتار ہو کر حضور ﷺ کے سامنے پیش ہوا تو بہت رویا گڑگڑایا اور جان بخشی کی درخواست کی لیکن سرورِ عالم ﷺ نے فرمایا: ''مومن ایک سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جاتا۔ تیری یہ مرضی ہے کہ مکہ جا کر مقامِ حجر میں بیٹھے اور ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر اور مونچھوں پر تاؤ دے کر کہے کہ میں نے محمد ﷺ کو دوبارہ دھوکا دیا ہے۔ یہ نہیں ہوگا۔'' اس کے بعد آپ ﷺ نے حضرت عاصم رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ اس کی گردن مار دو۔ انہوں نے اُٹھ کر اسی وقت اس کا سر قلم کر دیا۔

(۴)

صفر ۴ھ ہجری میں ''رجیع'' کا دردناک سانحہ پیش آیا۔ اس سانحہ کا پس منظر کیا تھا؟ اس کے بارے میں تین مختلف روایتیں ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ غزوۂ اُحد کے بعد بنو ہذیل کے سردار سفیان بن خالد نے ایک ذلیل سازش تیار کی۔ ان نے چند آدمی حضور ﷺ کی خدمت میں مدینہ منورہ بھیجے جنھوں نے سفیان کی ہدایت کے مطابق حضور ﷺ سے درخواست کی کہ ہمارے ساتھ چند مسلمانوں کو بھیجئے جو ہمارے قبیلہ میں اسلام کی تبلیغ کریں۔ حضور ﷺ نے ان کی درخواست قبول فرمائی اور چند مبلغین اسلام ان کے ساتھ کر دیئے۔ دوسری روایت ہے کہ طلحہ بن ابی طلحہ مقتولِ اُحد کی بیوی اور مسافع

اور حارث مقتولانِ اُحد کی ماں سلافہ بنتِ سعد نے سفیان بن خالد ہذلی کو ترغیب دی کہ وہ کسی حیلہ سے مدینہ منورّہ جا کر چند مسلمانوں کو اپنے ساتھ لائے۔ انمیں عاصم بن ثابت بن ابی الافلح بھی ہوتا کہ وہ اس کو قتل کر کے اپنے شوہر اور بیٹوں کا انتقام لے سکے۔ اس کے عوض وہ سفیان کو سو اونٹ انعام دے گی۔ ساتھ ہی اس نے قسم کھائی کہ جب تک اس کے انتقام کی آگ ٹھنڈی نہ ہوگی وہ سر میں تیل نہ ڈالے گی اور نہ بستر پر سوئے گی۔ سفیان بن خالد نے اس کو تسلی دی کہ جو کچھ وہ چاہتی ہے وہ ضرور کیا جائے گا۔ چنانچہ اس نے چند آدمیوں کو مدینہ منورّہ بھیجا۔ انہوں نے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کیا اور چند دن مسلمانوں کے مہمان بن کر اسلام کی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد انہوں نے رحمتِ عالم ﷺ سے درخواست کی کہ ہمارے ساتھ اپنے چند صحابہ کو روانہ فرمائیں تاکہ وہ ہمیں اور ہمارے دوسرے اہلِ قبیلہ کو اسلام کے احکام اور عقائد سکھائیں۔ حضور ﷺ نے ان کی درخواست منظور فرمالی اور دس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر مشتمل ایک جماعت ان کے ساتھ کر دی (یہ صحیح بخاری کی روایت ہے۔ دوسرے اہلِ سِیَر نے اس جماعت میں شامل صحابہ کی تعداد چھ بتائی ہے)۔ اس جماعت کا سردار حضور ﷺ نے باختلافِ روایت حضرت مرثد بن ابی مرثد غنوی رضی اللہ عنہ یا حضرت عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا۔ جب یہ جماعت (مکہ اور عسفان کے درمیان ہدّہ سے سات کوس کے فاصلے پر) رجیع کے مقام پر پہنچی تو غدّاروں نے بدعہدی کی اور اپنے قبیلوں (بنولحیان، عضل وقارہ) میں سے ایک سو (اور ایک دوسرے رویت کے مطابق دو سو) مسلح آدمیوں کو بُلا لائے۔ حضرت عاصم رضی اللہ عنہ اپنی فراستِ باطنی سے سمجھ گئے کہ ان لوگوں کی نیت نیک نہیں ہے اور یہ ہمیں قتل یا گرفتار کرنا چاہتے ہیں تاہم انہوں نے عزم و استقلال کو ہاتھ سے نہ جانے دیا اور اپنے ساتھیوں کو لے کر ایک پہاڑی پر چڑھ گئے۔ مشرکین نے پہاڑی کے گرد گھیرا ڈال لیا اور مسلمانوں سے کہا کہ نیچے اتر آؤ ہم تم کو پناہ دیتے ہیں۔

حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہا: ''مسلمانو! میں کسی

مشرک کی پناہ نہ لوں گا۔'' یہی بات انہوں نے مشرکین سے بھی بآوازِ بلند کہی اور ساتھ ہی دُعا کی، الٰہی ہمارے حال کی خبر رسول اللہ ﷺ کو دے۔ اس پر دشمنوں نے ان پر تیروں کو مینہ برسا دیا۔ مجاہدین نے بھی ثابت قدمی سے مقابلہ کیا اور بہت سے کافروں کو جہنم واصل کیا لیکن دشمنوں کی تعداد بہت زیادہ تھی ان کے تیروں کی بوچھاڑ سے حضرت عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ اور ان کے سات رفقاء نے جامِ شہادت پیا اور دو (حضرت خُبیب بن عدی رضی اللہ عنہ اور حضرت زید بن دثنہ رضی اللہ عنہ) کافروں کے ہاتھ اسیر ہو گئے۔[1]

علامہ ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اُسد الغابہ'' میں لکھا ہے کہ شہادت سے پہلے حضرت عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ نے بڑے خشوع و خضوع سے بارگاہِ ربّ العزت میں دُعا کی تھی کہ ''الٰہی میری اس طرح حفاظت کیجیو کہ نہ میں کسی مشرک کو مَس کروں اور نہ کوئی مشرک مجھے چھو سکے۔''

اللہ نے ان کی اس تمنا کو اس طرح پورا کیا کہ جب وہ شہید ہو گئے تو شہد کی مکھیوں (یا بھڑوں) کا ایک بہت بڑا غول ان کی لاش پر بھیج دیا جو کسی مشرک کو قریب نہ پھٹکنے دیتا۔ بالآخر انہوں نے تھک ہار کر یہ طے کیا کہ رات کو جب مکھیاں (یا بھڑیں) چلی جائیں گی اس وقت عاصم رضی اللہ عنہ کا سر کاٹ لیں گے۔ خدا کی قدرت رات کو اس قدر بارش ہوئی کہ اس کے پانی نے سیلاب کی صورت اختیار کر لی اور حضرت عاصم رضی اللہ عنہ کا جسدِ اطہر اسی سیلاب میں بہہ گیا۔ مشرکین نے اس کو ہر چند تلاش کیا لیکن ان کو کامیابی نہ ہوئی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک پاکباز بندے کی بات کی لاج رکھ لی۔

ایک روایت میں حضرت عاصم رضی اللہ عنہ کا یہ قول منقول ہے کہ جس روز میں نے اسلام قبول کیا اسی دن سے عہد کر لیا کہ آج سے نہ کسی کافر اور مشرک سے ہاتھ ملاؤں گا نہ اس کو

[1] لحیانی غداروں نے حضرت خبیب رضی اللہ عنہ اور حضرت زید رضی اللہ عنہ کو مشرکینِ مکہ کے پاس فروخت کر دیا۔ انہوں نے ان دونوں کو قید کر دیا اور اشہرِ حُرم گزرنے کے بعد نہایت بے دردی کے ساتھ دونوں مظلوموں کو سولی پر چڑھا کر شہید کر ڈالا۔

چھوؤں گا، نہ اپنا جسم اس کو چھونے دوں گا نہ کسی مشرک کی امان قبول کروں گا اور نہ اس کا ذمی ہوں گا۔ چنانچہ اپنے اس عہد کو وہ زندگی بھر نباہتے رہے اور ان کی شہادت کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کے جسم کی حفاظت کی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ جس دن حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نے شہادت پائی بادل کا ایک ٹکڑا بھی آسمان پر نہ تھا، لیکن رات کو مطلع ابر آلود ہو گیا اور اس کثرت سے بارش ہوئی کہ ہر طرف جل تھل ہو گیا۔ سیّدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ نے عاصم رضی اللہ عنہ کو مرنے کے بعد کافروں سے اسی طرح محفوظ رکھا جس طرح وہ زندگی میں کافروں کے چھونے سے پرہیز کرتے تھے۔

حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نے اپنے پیچھے ایک لڑکا اور ایک لڑکی چھوڑے۔ ان کی صاحبزادی کا نام جمیلہ تھا اور وہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے منسوب تھیں۔ ان کے بطن سے اللہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو فرزند عطا کیا تو انہوں نے اس کا نام اپنے جلیل القدر خسر (اور بچّے کے نانا) کے نام پر عاصم رکھا۔ حضرت عاصم رضی اللہ عنہ کے بیٹے کا نام محمد رحمۃ اللہ علیہ تھا۔ عرب کا نامور شاعر احوص، محمد رحمۃ اللہ علیہ بن عاصم رضی اللہ عنہ ہی کا فرزند تھا۔

سیّدنا حضرت عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اپنے جوشِ ایمان، اخلاصِ عمل، حُبِّ رسول، جانبازی اور پاکبازی کے جو نقوش صفحہ تاریخ پر ثبت کیے وہ مسلمانوں کے لیے تا ابد مشعلِ راہ بنے رہیں گے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

حضرت عبداللہ بن جُبَیر انصاری رضی اللہ عنہ

قبیلہ اوس کے خاندان عمرو بن عوف سے تھے۔ سلسلہ نسب یہ ہے:
عبداللہ رضی اللہ عنہ بن جبیر بن نعمان بن امیہ بن امراء القیس بن ثعلبہ بن عمرو بن عوف بن مالک بن اوس۔

خاندانِ عمرو بن عوف کے اس جوانِ رعنا کی مبداء فیض نے نہایت نیک فطرت و دیعت کی تھی۔ ہجرتِ نبوی سے تقریباً ایک سال پہلے شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہوئے اور پھر ۱۳ بعدِ بعثت میں بیعت لیلۃ العقبہ میں شریک ہونے کی سعادت حاصل کی۔

ابنِ سعد نے واقدی کے حوالہ سے حضرت عُوَیم بن ساعدہ رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ جب ہم (مدینہ کے اہلِ ایمان) مکہ پہنچے تو عبداللہ رضی اللہ عنہ بن جبیر، مَعن بن عدِی رضی اللہ عنہ اور سعد رضی اللہ عنہ بن خثیمہ نے مجھ سے کہا کہ آؤ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں جا کر آپ ﷺ کو سلام کریں کیونکہ ہم آپ ﷺ پر ایمان لا چکے ہیں، لیکن ابھی تک آپ ﷺ کی زیارت نہیں کی۔ چنانچہ ہم عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کے مکان پر گئے جہاں حضور ﷺ تشریف فرما تھے۔ ہم نے آپ ﷺ کو سلام کیا اور آپ ﷺ سے پوچھا کہ ہم (اہلِ مدینہ) کی ملاقات آپ سے کب اور کہاں ہو؟ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا تمہارے ساتھ تمہاری قوم کے وہ لوگ بھی ہیں جو تم سے مخالفت رکھتے ہیں اس لیے اپنا معاملہ پوشیدہ رکھو یہاں تک کہ حج پر آئے ہوئے لوگ منتشر ہو جائیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے ملاقات کے لیے وہ رات تجویز فرمائی جس کی صبح کو یوم النَّفرِ الآخر کہا جاتا ہے۔ اور ملاقات کا مقام عقبہ کا نشیبی حصہ مقرر فرمایا۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن جُبیر رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے تھے جو بیعت سے پہلے ہی حضور ﷺ کی زیارت سے مشرف ہو چکے تھے۔

سرورِ عالم ﷺ نے مدینہ منورہ میں نزولِ اجلال فرمایا تو دوسرے اہلِ ایمان کے ساتھ حضرت عبداللہ بن جُبیر رضی اللہ عنہ نے بھی والہانہ ذوق و شوق کے ساتھ حضور ﷺ کا استقبال کیا۔

رمضان ۲ھ ہجری میں رحمتِ عالم ﷺ غزوۂ بدر کے لیے تشریف لے گئے تو حضرت عبداللہ بن جُبیر رضی اللہ عنہ بھی آپ ﷺ کے ہمرکاب تھے۔ اس غزوہ میں وہ کمال سرفروشی سے لڑے۔ ایک روایت کے مطابق حضور ﷺ کے داماد حضرت ابوالعاص بن ربیع رضی اللہ عنہ کو (جو بادلِ ناخواستہ کفار کے ساتھ آئے تھے) حضرت عبداللہ بن جُبیر رضی اللہ عنہ ہی نے اسیر کیا۔ (بعض روایتوں میں ان کو قیدی بنانے والے کا نام حضرت خراش بن الصمہ رضی اللہ عنہ آیا ہے)۔

۳ھ ہجری میں غزوۂ اُحد پیش آیا تو حضرت عبداللہ بن جُبیر رضی اللہ عنہ اس میں بھی بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ شریک ہوئے۔ لڑائی شروع ہونے سے پہلے سرورِ عالم ﷺ نے انہیں پچاس تیر انداز دے کر جبلِ اُحد کی قریبی پہاڑی جبل عینین (جبل الرُماۃ) پر متعین فرمایا اور ہدایت فرمائی کہ مسلمانوں کو خواہ فتح ہو یا شکست تم لوگ کسی حالت میں اس مقام سے نہ ہٹنا اور اگر دشمن وادیٔ قناۃ کی راہ (یعنی جبلِ اُحد اور جبلِ عینین کے درمیانی درّے) سے مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے کوئی دستہ بھیجے تو اس کو روکنا۔

میدانِ رزم گرم ہوا تو مجاہدینِ اسلام کی جانبازی کے باعث حملہ آوروں کے پاؤں جلدی ہی اکھڑ گئے اور مسلمان مالِ غنیمت سمیٹنے میں مشغول ہو گئے۔ جبلِ عینین پر متعین تیر اندازوں نے کفار کو پسپا ہوتے دیکھا تو ان میں بھی بیشتر اپنا مورچہ چھوڑ کر میدان میں آگئے اور مالِ غنیمت جمع کرنے کے لیے چاروں طرف پھیل گئے۔ حضرت عبداللہ بن جُبیر رضی اللہ عنہ نے انہیں بہت منع کیا کہ اپنی جگہ نہ چھوڑو۔ لیکن انہوں نے جواب

دیا کہ مسلمانوں کو فتح ہو گئی ہے اب یہاں رکنے سے کیا حاصل؟ صرف آٹھ یا دس تیر اندازوں نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا اور سرفروشوں کی یہ قلیل جماعت برابر مورچے میں ڈٹی رہی۔ جب مشرکین کا ایک گھڑ سوار دستہ چکّر کاٹ کر درہ عینین کے راستے مسلمانوں پر حملہ آور ہوا تو حضرت عبداللہ بن جُبیر رضی اللہ عنہ اور ان کے جانباز ساتھیوں نے اس کا زبردست مقابلہ کیا۔ یہاں تک کہ ایک ایک کر کے سب شہید یا شدید زخمی ہو گئے۔

حضرت عبداللہ بن جُبیر رضی اللہ عنہ کو کسی مشرک نے ایسا تیر مارا کہ ان کے پیٹ کے پار ہو گیا اور آنتیں نکل پڑیں۔ مشرکین نے ان کی لاش کا مُثلہ کیا۔ (ناک کان وغیرہ اعضاء کاٹ ڈالے)۔ اس طرح راہِ حق کا یہ جانباز سپاہی اپنے آقا و مولا ﷺ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے روضۂ رضوان کو سدھار گیا۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

حضرت خوات بن جُبیر انصاری رضی اللہ عنہ

ابوعبداللہ اور ابوصالح کنیت تھی۔ حضرت عبداللہ بن جُبیر رضی اللہ عنہ شہیدِ اُحد کے بھائی تھے۔ (ان کا ذکر پیچھے آچکا ہے) بھائی کی طرح وہ بھی نہایت سلیم الفطرت تھے۔ سرورِ عالم ﷺ کے مدینہ منورّہ تشریف لانے سے پہلے ہی سعادت اندوزِ اسلام ہو گئے۔

رمضان ۲ھ میں رحمتِ عالم ﷺ غزوۂ بدر کے لیے روانہ ہوئے تو حضرت خوات رضی اللہ عنہ بھی حضور ﷺ کے فدائیوں میں شامل تھے۔ صفراء پہنچے تو پاؤں میں پتھر لگا جس کی وجہ سے چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے۔ حضور ﷺ نے انہیں علاج اور آرام کے لیے مدینہ واپس بھیج دیا۔ تاہم بدر کے مالِ غنیمت میں ان کا پورا حصہ لگایا۔ اس کے بعد انہوں نے اُحد اور دوسرے غزوات میں جانبازانہ شرکت کی۔ ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ نہایت شجاع تھے اس لیے حضور ﷺ نے ان کو اپنا سوار بنایا تھا۔

شعر و شاعری میں بھی درک رکھتے تھے اور نہایت خوش الحان تھے۔ حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ''اصابہ'' میں بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کے ساتھ حج کے لیے روانہ ہوئے۔ راستے میں لوگوں نے فرمائش کی کہ ضرار کے اشعار سناؤ۔ لیکن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا، نہیں اپنے اشعار سناؤ۔ چنانچہ وہ ساری رات خوش الحانی سے اپنے اشعار سناتے رہے۔ سپیدۂ سحر نمودار ہوا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''خوّات اب بس کرو صبح ہو گئی۔''

حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے باہمی جھگڑوں میں

حضرت خواتؓ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پُر جوش حامیوں میں تھے اور جنگِ صفین میں فوجِ مرتضوی شامل تھے۔

۴۰ھ ہجری میں بعمر ۷۴ سال مدینہ منورہ میں سفرِ آخرت اختیار کیا۔ اپنے پیچھے ایک لڑکا صالح نامی چھوڑا۔ حضرت خوات رضی اللہ عنہ سے چند حدیثیں بھی مروی ہیں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ دن کے ابتدائی حصے میں سونا بے تمیزی، درمیانی حصے میں مناسب اور آخری حصے میں سونا حماقت ہے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ
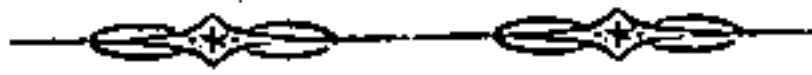
حضرت قطبہ بن عامر انصاری رضی اللہ عنہ

سیّدنا حضرت ابوزید قطبہ بن عامر رضی اللہ عنہ انصار کے سابقین اوّلین سے ہیں۔ ان کا تعلق قبیلہ خزرج کی شاخ بنوسلمہ سے تھا۔ نسب نامہ یہ ہے:

قطبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بن حدیدہ بن عمرو بن سواد بن غنم بن کعب بن سلمہ۔

حضرت قطبہ رضی اللہ عنہ مدینہ کے ان جلیل القدر بزرگوں سے ہیں جو ۱۱، ۱۲ اور ۱۳ نبوت (بعدِ بعثت) میں متواتر تین سال مکہ جا کر عقبہ کے مقام پر سرورِ عالم ﷺ کی بیعت سے مشرّف ہوئے اور پھر حضور ﷺ کو اس عہد کے ساتھ مدینہ تشریف لانے کی دعوت دی کہ ہم اپنی جانوں، مالوں اور اولادوں کے ساتھ آپ کی حفاظت کریں گے۔

(۱۳ بعدِ بعثت، بیعت عقبہ کبیرہ)

رحمتِ عالم ﷺ نے مدینہ منوّرہ میں نزولِ اجلال فرمایا تو حضرت قطبہ رضی اللہ عنہ کو گویا دونوں جہانوں کی نعمتیں مل گئیں۔ حضور ﷺ سے اس قدر عقیدت اور محبت تھی کہ روزانہ جب تک آپ ﷺ کی زیارت نہ کر لیتے چین نہ پڑتا تھا۔

غزوات کا آغاز ہوا تو انہوں نے بدر سے تبوک تک ہر غزوے میں حضور ﷺ کے ہمرکاب ہو کر جاں نثاری کا حق ادا کیا۔ جوشِ ایمان کا یہ عالم تھا کہ غزوۂ بدر میں مشرکین اور مسلمانوں کی صفوں کے درمیان ایک پتھر پھینکا اور باآوازِ بلند کہا:

''خدا کی قسم جب تک یہ پتھر نہ بھاگے گا میں میدانِ جنگ سے منہ نہ موڑوں گا۔''

چنانچہ جب تک مشرکین کو شکست نہ ہو گئی، عرصۂ کارزار میں برابر دادِ شجاعت دیتے رہے۔ اس لڑائی میں انہوں نے ایک مشرک مالک بن عبداللہ تمیمی کو قید بھی کیا...... غزوۂ

اُحد میں انہوں نے نو زخم کھائے۔

وہ ان دس ہزار قدوسیوں میں سے ایک تھے جنہیں فتح مکہ کے موقع پر رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت نصیب ہوئی۔ مکہ میں اس اعزاز کے ساتھ داخل ہوئے کہ بنو سلمہ کا علَم اٹھا رکھا تھا۔ علمبرداری کا یہ اعزاز خود سیّد المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مرحمت فرمایا تھا۔

حضرت قطبہ رضی اللہ عنہ کو سنّتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر چلنے کا خاص التزام تھا۔ عہدِ جاہلیت میں انصار میں ایک عجیب رسم تھی کہ جب انہوں نے احرام باندھا ہوتا تو دروازے سے گھر کے اندر داخل نہ ہوتے تھے بلکہ پیچھے سے (یا چھت پر سے کود کر) گھر میں جاتے تھے۔

قریشِ مکہ میں بھی یہی دستور تھا، لیکن بعض خاندان اس سے مستثنٰی تھے۔ ایک دن سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم احرام کی حالت میں کسی باغ میں تشریف لے گئے۔ حضرت قطبہ رضی اللہ عنہ بھی احرام باندھے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اندر چلے گئے۔ لوگوں نے کہا ''یارسول اللہ یہ شخص گناہ کا مرتکب ہوا ہے کہ احرام کی حالت میں دروازے سے اندر داخل ہوا۔''

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت قطبہ رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''قطبہ رضی اللہ عنہ تم احرام باندھ کر اندر کیوں آئے؟''

انہوں نے عرض کیا: ''یارسول اللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر اندر آ گیا۔''

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں تو احمسی ہوں (یعنی میرا قبیلہ اس دستور کا پابند نہیں ہے) عرض کیا: دینی دینک یعنی جو آپ کا دین ہے وہی میرا دین ہے۔''

اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی:

لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ج وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا (البقرہ۔آیت ۱۸۹)

(یہ کوئی نیکی نہیں کہ تم گھروں میں چھت پر (پیچھے) سے آتے ہو۔ لیکن نیکی پرہیزگاری میں ہے اور گھروں میں دروازوں سے آؤ)

گویا خود ذاتِ باری تعالیٰ نے حضرت قطبہ رضی اللہ عنہ کے طرزِ عمل کی تائید کی۔ اس کے بعد یہ رسم ہمیشہ کے لیے مٹ گئی۔ اربابِ سیَر کہتے ہیں کہ اس کو ترک کرنے والوں میں اوّلیت کا سہرا حضرت قطبہ رضی اللہ عنہ کے سر ہے۔ حضرت قطبہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں وفات پائی۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ
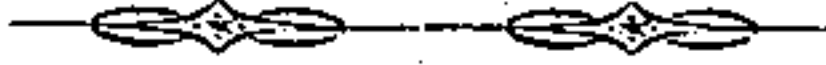
حضرت خلّاد بن سُوَید انصاری رضی اللہ عنہ

خزرج کے خاندان بنو حارث بن خزرج سے تھے۔ سلسلہ نسب یہ ہے:
خلّاد رضی اللہ عنہ بن سُوَید بن ثعلبہ بن عمرو بن حارثہ بن امراء القیس بن مالک اغر بن ثعلبہ بن کعب بن خزرج بن حارث بن الخزرج الاکبر۔

مدینہ میں اسلام کے مبلغِ اوّل حضرت مُصعَب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی تبلیغی مساعی سے سعادت اندوزِ اسلام ہوئے اور ۱۳ بعدِ بعثت میں مکہ جا کر رحمتِ عالم ﷺ کی بیعت سے مشرّف ہوئے۔ (بیعت عقبہ ثانیہ یا کبیرہ)

سرورِ کونین ﷺ نے مدینہ منوّرہ میں نزولِ اجلال فرمایا اور غزوات کا آغاز ہوا تو حضرت خلّاد رضی اللہ عنہ نے بدر، اُحد اور احزاب تینوں غزووں میں دادِ شجاعت دی۔ احزاب کے بعد حضور ﷺ نے یہودیانِ بنو قریظہ کا محاصرہ کیا تو وہ بھی آپ ﷺ کے ہمرکاب تھے۔ دورانِ محاصرہ میں یہودیوں کے قلعے کی دیوار کے نیچے سایہ میں بیٹھے تھے کہ بنانہ نامی ایک یہودی عورت نے چکّی کا پتھر ان کے سر پر قلعہ کے اوپر سے گرا دیا۔ اس کے صدمہ سے ان کا سر پھٹ گیا اور شہید ہو گئے۔ حضور ﷺ نے ان کے حق میں فرمایا:

ان له اجر شهيدين
(ان کو دو شہیدوں کا ثواب ملے گا)

لڑائی ختم ہونے کے بعد بنو قریظہ کے لوگ اسیر ہو کر حضور ﷺ کی خدمت میں پیش ہوئے تو آپ ﷺ نے بنانہ کو ڈھونڈ کر قتل کروا دیا۔ اس واقعہ میں یہودیوں کی دوسری عورتیں قتل سے محفوظ رہیں۔

حضرت خلاد رضی اللہ عنہ نے اپنے پیچھے دولڑکے چھوڑے ابراہیم رضی اللہ عنہ اور سائب رضی اللہ عنہ۔ ان دونوں کو شرف صحابیت حاصل ہوا۔

مُسنَدِ ابی داوٗد میں ہے کہ حضرت خلاد رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبران کی والدہ کو ملی تو وہ حضور ﷺ کی خدمت میں تفصیل معلوم کرنے کے لیے حاضر ہوئیں اس وقت وہ اپنے چہرے پر نقاب ڈالے ہوئے تھیں۔ کسی نے کہا:

''بی بی تمہارا بیٹا قتل ہو گیا ہے، تعجب ہے کہ ایسی مصیبت کے وقت بھی تم نے چہرے پر نقاب ڈال رکھی ہے۔''

انہوں نے نہایت اطمینان سے جواب دیا:

''میں نے اپنا بیٹا کھویا ہے، شرم وحیا تو نہیں کھوئی۔''

اس موقع پر سرکارِ دوعالم ﷺ نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''تمہارے فرزند کو دوہرا ثواب ملے گا کیونکہ اسے اہل کتاب نے قتل کیا ہے۔''

اس سلسلہ میں بعض اہلِ سِیَر نے اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ایک دلچسپ روایت نقل کی ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ غزوہ بنوقریظہ کے بعد بنوقریظہ کی ایک عورت میرے پاس بیٹھی ہوئی ہنس رہی تھی۔ اتنے میں کسی نے باہر سے آواز دی کہ فلاں عورت کہاں ہے؟

وہ عورت بولی، میں یہاں ہوں۔

پکارنے والے نے کہا، ادھر آ باہر نکل۔

وہ عورت اسی طرح ہنستی کھلکھلاتی اٹھی اور کہا کہ مجھے قتل کرنے کے لیے بلاتے ہیں...... میں نے کہا، عورتوں کے قتل کرنے کا دستور تو نہیں ہے تجھے کس لیے قتل کیا جارہا ہے۔

اس نے کہا، میرے شوہر کو مجھ سے کمال درجے کی محبت تھی اثنائے محاصرہ میں ایک دن اس نے مجھ سے کہا کہ مسلمان ہم پر قابو پائیں گے تو مردوں کو قتل اور عورتوں کو

لونڈیاں بنالیں گے۔

میں نے اس سے کہا کہ تیری جدائی میں برداشت نہیں کرسکوں گا۔

میرا شوہر بولا، تو سچ کہتی ہے۔ یوں کر کہ چکی کا پاٹ ان مسلمانوں کے سر پر گرا دے جو قلعہ کی دیوار کے نیچے بیٹھے ہیں ان میں سے کوئی مر گیا تو مسلمان اس کے قصاص میں تجھے قتل کر دیں گے اور تو مجھ سے آن ملے گی...... میں نے ایسا ہی کیا اور ایک مسلمان مر گیا اسی کے قصاص میں مجھے قتل کے لیے بلاتے ہیں۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مدت گزر گئی لیکن اس عورت کا قتل کے لیے ہنستے کھلکھلاتے جانا مجھے نہیں بھولتا۔ (الشاہد)

رضی اللہ تعالیٰ عنہ،

حضرت خارجہ بن زید انصاری رضی اللہ عنہ

خزرج کے خاندان حارث بن خزرج (یا اغر) سے تھے۔ نسب نامہ یہ ہے:

خارجہ بن زید رضی اللہ عنہ بن ابی زہیر بن مالک بن امراء القیس بن مالک اغر بن ثعلبہ بن کعب بن خزرج بن حارث بن خزرج اکبر۔

اپنے خاندان اغر کے رئیس تھے اور نہایت سلیم الفطرت تھے۔ ہجرتِ نبوی سے قبل شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہوئے اور ۱۳ھ بعدِ بعثت میں مکہ جا کر لیلۃ العقبہ میں رحمت دو عالم ﷺ کی بیعت سے سعادت اندوز ہوئے۔

ایک روایت کے مطابق حضرت ابوصدیق رضی اللہ عنہ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو حضرت خارجہ رضی اللہ عنہ ہی کے ہاں قیام کیا۔ (ایک دوسری روایت میں ان کے میزبان کا نام خبیب بن اساف رضی اللہ عنہ بتایا گیا ہے۔) چند ماہ بعد حضور ﷺ نے مہاجرینِ اور انصار کے مابین مواخاۃ قائم کرائی تو حضرت خارجہ رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا اسلامی بھائی بنایا۔ انہوں نے اپنی بیٹی حبیبہ رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کر دیا۔ حضرت حبیبہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی بیٹی اُمِ کلثوم پیدا ہوئیں۔

۲ھ ہجری میں حضرت خارجہ رضی اللہ عنہ کو "اصحابِ بدر" میں شریک ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اس غزوہ میں انہوں نے مشہور مشرک اُمیہ بن خلف کو کچھ دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ مل کر قتل کیا۔ ۳ھ ہجری میں غزوۂ اُحد میں بھی بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ شریک ہوئے اور اس بہادری سے لڑے کہ شجاعت کا حق ادا کر دیا۔ زخم پہ زخم کھاتے تھے لیکن قدم پیچھے ہٹانا گوارا نہ تھا۔ جب سارا جسم نیزوں سے چھلنی ہو گیا تو

زمین پر گر گئے۔ اُمیہ بن خلف مقتولِ بدر کے بیٹے صفوان نے انہیں پہچان لیا اور اپنے باپ کے قتل کا بدلہ اتارنے کے لیے ہونٹ، کان، ناک اور دوسرے اعضاء کاٹ لیے۔ حضرت خارجہ رضی اللہ عنہ کے بھتیجے حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ بھی اسی غزوہ میں شہید ہوئے تھے۔ حضور ﷺ نے چچا بھتیجے دونوں کو ایک ہی قبر میں دفن کرایا۔

حضرت خارجہ رضی اللہ عنہ نے اپنے پیچھے ایک بیٹی حبیبہ رضی اللہ عنہا (زوجہ صِدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ) اور ایک فرزند زید رضی اللہ عنہ نامی چھوڑے۔ زید رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں وفات پائی۔

بعض روایتوں میں ان کے ایک اور فرزند سعد رضی اللہ عنہ کا نام بھی آیا ہے۔ وہ غزوۂ اُحد میں باپ کے پہلو بہ پہلو لڑتے ہوئے رتبہ شہادت پر فائز ہوئے۔

حضرت خارجہ بن زید رضی اللہ عنہ کا شمار کبار صحابہ میں ہوتا ہے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ
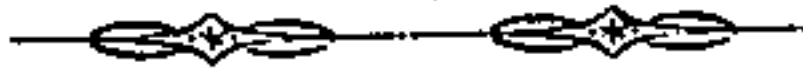
حضرت عِتبان بن مالک انصاری رضی اللہ عنہ

(۱)

غزوۂ بدر (رمضان المبارک ۲ ہجری) کے کچھ عرصہ بعد کا ذکر ہے کہ ایک دن ایک نابینا شخص سرورِ عالم ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے۔ یہ صاحب اگرچہ نُورِ بصارت سے محروم تھے لیکن ان کی پیشانی نُورِ سعادت سے چمک رہی تھی اور چہرے پر ملکوتی جلال تھا۔ انہوں نے بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں عرض کی: ''یارسول اللہ، میرے ماں باپ آپ پر قربان، آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں نابینا اور معذور ہوں، کیا اس حالت میں اپنے مکان پر نماز پڑھ سکتا ہوں۔''

حضور ﷺ نے فرمایا: ''کیا تمہارے کانوں میں اذان کی آواز پہنچتی ہے۔''

انہوں نے عرض کیا۔ ''ہاں یارسول اللہ''

ارشاد ہوا ''تو پھر مسجد میں آ کر نماز پڑھا کرو۔''

ان صاحب نے فرمانِ نبوی کی حرزِ جان بنالیا اور عمر بھر مسجد میں آ کر پنجگانہ نماز ادا کرتے رہے۔ یہ صاحبِ رسول جن کو نابینا اور معذور ہونے کے باوجود فرمانِ نبوی کا اس قدر پاس تھا، حضرت عتبان بن مالک انصاری رضی اللہ عنہ تھے۔

سیّدنا حضرت عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ کا تعلق خزرج کے خاندان بنوسالم سے تھا۔ نسب نامہ یہ ہے:

عِتبان بن مالک رضی اللہ عنہ بن عمرو بن عجلان بن زید بن غنم بن سالم بن عمرو بن عوف بن خزرج۔

حضرت عتبان رضی اللہ عنہ اپنے قبیلے کے سردار تھے اور نہایت نیک طینت تھے۔ سرورِ

عالم ﷺ نے ابھی مدینہ منورہ میں نزولِ اجلال نہیں فرمایا تھا کہ حضرت عِتبان رضی اللہ عنہ کے کانوں میں توحید کی آواز پڑی۔ انہوں نے بلا تامل اس پر لبیک کہا اور انصار کے السابقون الاولون کی صف میں شامل ہو گئے۔ جب حضور ﷺ مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ ﷺ کا پُرتپاک خیر مقدم کرنے والوں میں حضرت عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ حضور ﷺ چند دن قباء میں قیام فرمانے کے بعد خاص مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہوئے تو اثنائے راہ میں بنو سالم کا محلہ آیا۔ حضرت عِتبان بن مالک رضی اللہ عنہ اور حضرت عباس بن عبادہ رضی اللہ عنہ بنو سالم کے عمائد میں سے تھے۔ ان دونوں نے آگے بڑھ کر حضور ﷺ کو اھلاً وسھلاً کہا اور قیام کے لیے اپنا مکان پیش کیا لیکن یہ سعادت حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مقدر میں لکھی جا چکی تھی۔ اس لیے حضور ﷺ انہیں دعائیں دیتے آگے روانہ ہو گئے۔

ہجرت کے چند ماہ بعد رحمتِ عالم ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے مابین عقدِ مواخاۃ قائم کرایا تو حضرت عِتبان بن مالک رضی اللہ عنہ کو سیّدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا دینی بھائی بنایا۔ ان دونوں بھائیوں میں عمر بھر رشتہ خلوص ومودت قائم رہا۔

رمضان المبارک ۲ھ میں حق و باطل کا معرکہ اوّل بدر کے میدان میں پیش آیا تو حضرت عِتبان بن مالک رضی اللہ عنہ نے اس میں والہانہ جوش وخروش سے حصہ لیا اور مشرکین کے خلاف بڑی پامردی سے دادِ شجاعت دی۔

غزوۂ بدر کے بعد حضرت عِتبان رضی اللہ عنہ کی آنکھیں خراب ہونا شروع ہوئیں جو کچھ مدّت بعد بالکل جاتی رہیں اور وہ نابینا ہو گئے۔ اسی لیے بدر کے بعد پیش آنے والے کسی غزوے میں شریک نہ ہو سکے۔

حضرت عتبان رضی اللہ عنہ بارگاہِ نبوّت میں درجہ تقرّب رکھتے تھے اور سرورِ عالم ﷺ نے انہیں بنو سالم کی مسجد کا امام مقرر فرمایا تھا۔ صحیح مسلم میں ہے کہ حضور ﷺ نے امامت کے انتخاب کے لیے یہ اصول مقرر فرمائے تھے:

ا۔ جو سب سے زیادہ کلام اللہ پڑھا ہو...... اگر اس میں سب برابر ہوں تو

ب۔ جو سنّت سے سب سے زیادہ واقف ہو...... اگر اس میں بھی مساوات ہو تو

ج۔ جس نے پہلے ہجرت کی ہو...... اگر اس میں بھی سب برابر ہوں تو

د۔ جس کی عمر سب سے زیادہ ہو۔

حضور ﷺ کا حضرت عِتبان رضی اللہ عنہ کو امامت کے لیے منتخب فرمانا، بلاشبہ ان کی جلالتِ قدر کا بیّن ثبوت ہے۔

حضرت عِتبان رضی اللہ عنہ کو فیضانِ نبوی سے بہرہ یاب ہونے کا بے پناہ شوق تھا۔ چونکہ ان کا مکان کاشانہ رسالت ﷺ اور مسجدِ نبوی سے دو تین میل کے فاصلے پر تھا اور روزانہ آنے جانے میں دِقّت ہوتی تھی اس لیے انہوں نے اپنے مواخاتی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے یہ طے کیا کہ دونوں باری باری رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا کریں۔ چنانچہ ایک دن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ دن بھر بارگاہِ رسالت میں حاضر رہتے اور احکامِ وحی اور ارشاداتِ نبوی ﷺ سے اپنا دامن بھرتے رہتے۔ شام کو یہ تمام گہر ہائے مقدّس حضرت عتبان رضی اللہ عنہ تک پہنچا دیتے۔ دوسرے دن حضرت عتبان رضی اللہ عنہ بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوتے اور اپنا دامن قرآن و حدیث کے گہر ہائے تابدار سے بھر کے لے جاتے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک پہنچا دیتے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عتبان رضی اللہ عنہ کے مکان اور مسجد کے درمیان ایک نشیبی جگہ (وادی) تھی۔ بارش ہوتی تو تمام پانی وہاں جمع ہو جاتا تھا۔ نظر کی خرابی کی وجہ سے حضرت عتبان رضی اللہ عنہ کے لیے اس پانی میں سے گزر کر مسجد تک پہنچنا سخت مشکل تھا اس لیے وہ ایسی صورتِ حال میں گھر پر نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔ ایک دن انہوں نے جنابِ رسالت مآب ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا:

"یا رسول اللہ ﷺ جب کبھی بارش ہوتی ہے تو مسجد اور میرے مکان کے درمیان گہرا پانی کھڑا ہو جاتا ہے۔ میری نظر اس پانی سے گزر کر مجھے مسجد

تک پہنچنے کی اجازت نہیں دیتی اس لیے مجبوراً ایسی حالت میں گھر میں نماز ادا کر لیتا ہوں۔ اگر کسی دن حضور ﷺ میرے ہاں قدم رنجہ فرما کر نماز پڑھا دیں تو اسی جگہ کو سجدہ گاہ بنالوں۔''

حضور ﷺ نے فرمایا ''بہت اچھا، میں آؤں گا۔''

دوسرے دن سرورِ عالم ﷺ، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی معیت میں حضرت عتبان رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے اور ان سے پوچھا کہ تم کہاں نماز پڑھنا چاہتے ہو؟ انہوں نے وہ مقام جہاں بارش کے دنوں میں ہمیشہ نماز پڑھتے تھے، بتادی۔ حضور ﷺ نے وہیں دو رکعتیں ادا کیں۔ اس کے بعد کچھ دیر وہاں تشریف فرما رہے۔ حضرت عتبان رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کی خدمت میں بُھنا ہوا گوشت پیش کیا۔ آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہمراہ اسے تناول فرمایا اور واپس تشریف لے گئے۔

اس واقعہ کے بعد حضرت عتبان رضی اللہ عنہ نے نابینائی کے عذر پر حضور ﷺ سے گھر پر نماز پڑھنے کی اجازت مانگی لیکن حضور ﷺ نے اس بناء پر ان کی درخواست کو شرف پذیرائی نہ بخشا کہ ان کے کانوں تک اذان کی آواز پہنچتی تھی۔

مُسندِ احمد بن حنبل میں ہے کہ خادمِ رسول حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ حضرت عتبان رضی اللہ عنہ کے مکان والے واقعے کو کنوزِ حدیث میں شمار کرتے تھے اور اپنے بیٹے ابوبکر رحمۃ اللہ علیہ کو تاکید کیا کرتے تھے کہ اسے یاد رکھیں۔

حضرت عتبان رضی اللہ عنہ آخیر عمر تک مسجدِ بنوسالم کی امامت کرتے رہے۔ صحیح بخاری میں محمود بن ربیع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں (۵۲ھ میں بعہدِ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ) غزوۂ قسطنطنیہ سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ آیا تو حضرت عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت وہ بہت ضعیف العمر ہو چکے تھے، نابینا تھے اور اپنی مسجد کی امامت کرتے تھے۔

حضرت عتبان رضی اللہ عنہ نے ۵۲ھ کے بعد ہی کسی وقت سفرِ آخرت اختیار کیا۔

حضرت عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ کا شمار فضلاء صحابہ میں ہوتا ہے۔ ان سے مروی متعدد احادیث صحیحین، مسندِ احمد بن حنبل اور مسندِ ابوداؤد میں موجود ہیں۔ ان کے راویانِ حدیث میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ، ابوبکر رحمۃ اللہ علیہ بن انس رضی اللہ عنہ اور محمود بن ربیع رضی اللہ عنہ کے اسماء گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

اہل وعیال کے بارے میں کتبِ سیَر خاموش ہیں۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ
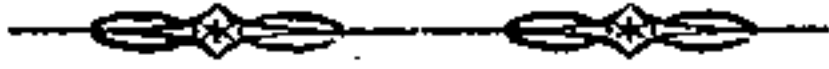
حضرت حباب بن منذر انصاری ﷜

(۱)

رمضان ۲ھ میں رحمتِ عالم ﷺ غزوۂ بدر کے لیے تشریف لے گئے اور بدر کے قریب ایک مقام پر پڑاؤ ڈالا تو ایک انصاری جاں نثار نے عرض کیا:

''یارسول اللہ، اس مقام پر اترنے کا حکم اللہ نے دیا ہے یا آپ ﷺ کی ذاتی رائے ہے۔''

حضور ﷺ نے فرمایا: ''یہ میری ذاتی رائے ہے۔''

انہوں نے عرض کیا، میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان، کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم پانی کے پاس اتریں اور تمام کنوؤں پر قبضہ کر کے ایک حوض تیار کر لیں۔ اس طرح ہمارے لشکر کو پانی بآسانی ملتا رہے گا اور دشمن پانی کی کمی کی وجہ سے پریشان ہو جائے گا۔

حضور ﷺ نے دوسرے صحابہ کرام ﷡ سے مخاطب ہو کر فرمایا، یہ صحیح کہتے ہیں (یہی طریق کار بہتر ہے۔)

چنانچہ آپ ﷺ اپنے جاں نثاروں کے ساتھ چاہِ بدر پر رونق افروز ہوئے۔

یہ صاحبِ رسول ﷜ جن کی اصابتِ رائے کا سیدِ دوعالم ﷺ نے اعتراف فرمایا، حضرت حباب بن منذر انصاری ﷜ تھے۔

(۲)

سیّدنا حضرت ابوعمر حباب بن منذر ﷜ کا تعلق خزرج کے خاندان سلمہ سے تھا۔

نسب نامہ یہ ہے:

حباب ﷜ بن منذر بن جموح بن زید بن حرام بن کعب بن غنم بن کعب بن

سلمہ۔

حضرت حباب رضی اللہ عنہ کے چچا عمرو بن جموح بنو سلمہ کے رئیس اور خاندانی بت خانے کے متولی تھے۔ لیکن بھتیجے کو اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت بخشی کہ وہ ہجرتِ نبوی سے پہلے ہی بُت پرستی پر تین حرف بھیج کر دولتِ ایمان سے بہرہ ور ہو گئے۔

رحمتِ عالم ﷺ نے مدینہ منورّہ میں نزولِ اجلال فرمایا تو حضرت حباب رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی حق کی حمایت اور سرورِ کون و مکان ﷺ کی نصرت کے لیے وقف کر دی۔ غزوات کا آغاز ہوا تو انہوں نے بدر سے تبوک تک تمام غزووں میں رحمتِ عالم ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا...... بڑے ذہین وفہیم اور صائب الرائے تھے، غزوۂ بدر میں سرورِ عالم ﷺ نے انہی کے مشورے کے مطابق چاہِ بدر پر نزولِ اجلال فرمایا۔ غزوۂ اُحد کے موقع پر قریش مکہ کی آمد آمد کی خبر مشہور ہوئی تو حضور ﷺ نے اپنے دو جاں نثاروں کو تجسس کے لیے بھیجا۔ ان کے بعد حضرت حباب بن منذر رضی اللہ عنہ کو روانہ فرمایا۔ ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضرت حباب رضی اللہ عنہ نے اپنا فرض نہایت خوبی سے انجام دیا اور دشمن کی تعداد، اسلحہ وغیرہ کے بارے میں کار آمد معلومات حاصل کر کے بار گاہِ رسالت میں پہنچائیں۔ بعض روایتوں میں ہے کہ اس غزوہ میں (تمام) خزرج (یا اس کے ایک حصہ) کا عَلَم حضرت حباب رضی اللہ عنہ کے پاس تھا۔ اسی طرح غزوۂ خیبر اور غزوۂ حنین میں بھی وہ خزرج کے علَمبر دار تھے۔

(۳)

سنہ ۱۱ھ میں سرورِ عالم ﷺ نے وصال فرمایا اور سقیفہ بنو ساعدہ میں خلافت کا معاملہ زیرِ بحث آیا تو انہوں نے سیّد الخزرج حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانے کی حمایت کی۔ اس سلسلہ میں انہوں نے دو پُر زور خطبے دیئے جن میں بڑی فصاحت و بلاغت کے ساتھ انصار کے فضائل بیان کیے اور خلافت کے لیے ان کا استحقاق ثابت کرنے کی کوشش کی۔ ایک خطبہ کے دوران میں انہوں نے اپنے بارے میں کہا:

''میں قوم کا معتمد ہوں اور لوگ میری رائے سے مستفید ہوتے ہیں۔''

ان کے اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انصار میں بڑی عزت اور وقار کے حامل تھے۔ اُن کے پُر زور خطبوں کے باوجود جب مہاجرین نے ان کی بات قبول نہ کی تو انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ دو امیر ہوں۔ ایک مہاجر اور ایک انصاری۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے یہ فرما کر اس تجویز کو بھی یکسر رد کر دیا کہ یہ ناممکن ہے۔ حضرت حباب رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر جو کچھ بھی کہا وہ نیک نیتی پر مبنی تھا اور اس میں کسی ذاتی غرض کا دخل نہیں تھا۔ چنانچہ جب عامۃ المسلمین نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی تو انہوں نے بھی سب کی پیروی کی۔

حضرت حباب رضی اللہ عنہ نے ۱۹ھ میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر پچاس برس کی تھی۔

مختلف روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حباب رضی اللہ عنہ نہایت زیرک آدمی تھے اور نہ صرف ایک اچھے خطیب تھے بلکہ شعر و شاعری کا ملکہ بھی رکھتے تھے۔ ان کا دامن روایتِ حدیث سے بھی خالی نہ تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک سچے عاشقِ رسول تھے اور باطل سے نبرد آزما ہونے کے لیے ہر وقت سر بکف رہتے تھے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ
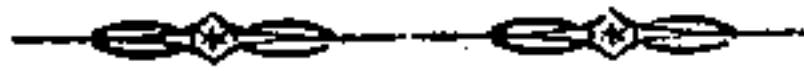
حضرت جلیبیب انصاری رضی اللہ عنہ

(۱)

بعض روایتوں میں ان کا نام ''جلیبیب رضی اللہ عنہ'' بھی آیا ہے۔ سلسلہ نسب اور خاندان کا حال معلوم نہیں لیکن اربابِ سِیَر کے نزدیک یہ بات مسلّم ہے کہ وہ مدینہ منورّہ کے رہنے والے تھے اور انصار کے کسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ اگرچہ پست قد اور کم رُو تھے لیکن پاک باطنی، نیک طینتی، شجاعت، اخلاص فی الدّین اور حبِّ رسول ﷺ کے لحاظ سے اپنی مثال آپ تھے۔ اسی لیے رحمتِ دوعالم ﷺ کو بہت محبوب تھے۔ مسندِ احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ میں حضرت ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جلیبیب رضی اللہ عنہ کی طبیعت میں مزاح بہت تھا، یہاں تک کہ خواتین سے بھی مزاح کی باتیں کر جاتے تھے جو بعض طبائع کو ناگوار گزرتی تھیں، تاہم حضور ﷺ کو ان کے حسنِ کردار پر پورا اعتماد تھا اور آپ ﷺ ان پر بڑی شفقت فرماتے تھے۔ انصار کا معمول تھا کہ جب ان کی کوئی خاتون بیوہ ہو جاتی تو وہ اس کا دُوسرا نکاح حضور ﷺ سے دریافت کیے بغیر نہ کرتے۔ ایک دفعہ حضور ﷺ نے ایک انصاری سے فرمایا کہ ''اپنی بیوہ بیٹی کا نکاح مجھے کرنے دو۔'' انہوں نے عرض کیا، ''یارسول اللہ یہ تو آپ کا کرم اور انعام ہوگا۔'' حضور ﷺ نے فرمایا، ''میں خود اس سے نکاح کا ارادہ نہیں رکھتا۔'' انصاری نے عرض کیا، یارسول اللہ! پھر آپ کس کے ساتھ میری بیٹی کا رشتہ کرنا چاہتے ہیں؟''

حضور ﷺ نے فرمایا، ''جلیبیب کے ساتھ!''

انصاری نے عرض کیا، ''یارسول اللہ میں اپنی بیوی کے ساتھ مشورہ کرلوں۔''

حضور ﷺ نے فرمایا، ''ہاں، اس میں کوئی حرج نہیں!''

انصاری نے اپنی اہلیہ سے اس بارے میں مشورہ کیا تو وہ کچھ تو حضرت جلیبیب رضی اللہ عنہ

کی کم روئی کی وجہ سے اور کچھ ان کی مزاحیہ طبیعت کی وجہ سے رشتہ دینے میں متذبذب ہوئیں۔ لڑکی نہایت زیرک اور مخلص مومنہ تھی، اس کو یہ بات معلوم ہوئی تو اس نے والدین کو اللہ کا یہ حکم یاد دلایا کہ ''جب اللہ اور رسول ﷺ کسی بات کا فیصلہ کر دیں تو کسی مسلمان کو اس میں چون و چرا کی گنجائش نہیں۔'' پھر کہا، ''آپ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کو رَدّ کرنا چاہتے ہیں، ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ آپ مجھے حضور ﷺ کے حوالے کر دیں، وہ مجھے کبھی ضائع نہ ہونے دیں گے۔ میری مرضی حضور ﷺ کی مرضی کے تابع ہے اور مجھے آپ ﷺ کا ارشاد بسر و چشم منظور ہے۔''

لڑکی کے والد نے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر سارا واقعہ عرض کیا تو حضور ﷺ لڑکی کی سعادتمندی پر بہت مسرور ہوئے اور اس کے حق میں یہ دُعا مانگی:

''الٰہی اس لڑکی پر خیر کی بوچھار کر دے اور اس کی زندگی کو کدلا اور مکدر نہ کر!''

پھر آپ ﷺ نے حضرت جلیبیب رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ فلاں لڑکی سے تمہارا نکاح کرتا ہوں۔ انہوں نے عرض کیا: ''یارسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان، آپ مجھے کھوٹا پائیں گے۔'' حضور ﷺ نے فرمایا، ''نہیں، تم خدا کے نزدیک کھوٹے نہیں ہو۔''

اس کے بعد آپ ﷺ نے حضرت جلیبیب رضی اللہ عنہ کا نکاح اس لڑکی سے کر دیا۔ حضور ﷺ کی دُعا کا یہ اثر ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کی گھریلو زندگی کو جنت بنا دیا اور وہ نہایت آسودہ حال ہو گئے۔ اہلِ سِیَر نے لکھا ہے کہ انصار میں کوئی عورت اس خاتون سے زیادہ تونگر اور شاہ خرچ نہ تھی۔

(۲)

حضرت ابو برزہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک غزوہ پر تشریف لے گئے (کتبِ سِیَر میں اس غزوہ کی تصریح نہیں کی گئی) حضرت جلیبیب رضی اللہ عنہ بھی حضور ﷺ کے ہمرکاب تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو فتح عطا کی اور مالِ غنیمت آپ ﷺ کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے پوچھا: ''ہمارے

کون کون سے آدمی لاپتہ ہیں؟"

صحابہ رضی اللہ عنہم نے کچھ آدمیوں کے نام بتائے۔ حضور ﷺ نے دوبارہ اور سہ بارہ یہی سوال کیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم چند آدمیوں کا نام لے دیتے، جلبیب رضی اللہ عنہ کی طرف کسی کا خیال ہی نہ گیا۔ اب حضور ﷺ نے فرمایا: "مجھے جلبیب رضی اللہ عنہ نظر نہیں آتا۔"

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ارشادِ نبوی سن کر چونک پڑے اور اسی وقت حضرت جلبیب رضی اللہ عنہ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ تھوڑی دور جا کر دیکھا کہ سات مشرک مقتول پڑے ہیں اور قریب ہی جلبیب رضی اللہ عنہ بھی خاک وخون میں آغشتہ پڑے ہیں۔ حضور ﷺ کو اطلاع ملی تو آپ ﷺ خود وہاں تشریف لائے۔ یہ عجیب منظر دیکھ کر طبعِ مبارک بہت متاثر ہوئی۔ حضرت جلبیب رضی اللہ عنہ کے جسمِ اطہر کے پاس کھڑے ہو کر فرمایا:

"قتل سبعة ثم قتلوه هذا منی و انا منه ! هذا منی و انا منه۔"

"سات کو قتل کر کے قتل ہوا۔ یہ مجھ سے ہے اور میں اُس سے ہوں۔ یہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں۔"

صحیح مسلم میں ہے کہ اس کے بعد سیّد المرسلین ﷺ نے حضرت جلبیب رضی اللہ عنہ کے جسدِ اطہر کو اپنے ہاتھوں پر اٹھایا اور قبر کھدوا کر اپنے دستِ مبارک سے ان کی تدفین فرمائی اور غسل نہیں دیا۔

جس شہیدِ راہِ حق کے لیے رحمتِ دو عالم فخرِ جن وانس، سیّدِ کونین ﷺ نے بتکرار فرمایا ہو کہ "یہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں۔" اور پھر جس کے جسدِ خاکی کو ساقیِ کوثر ﷺ نے اپنے مقدس ہاتھوں پر اٹھا کر جائے شہادت سے آغوشِ لحد تک پہنچایا ہو۔ اس کے عِلوِ مرتبت کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟

بنا کردند خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را!
رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

حضرت سلمہ بن سلامہ انصاری رضی اللہ عنہ

اوس کے معزز خاندان ''بنو عبد الاشہل'' سے تھے۔ نسب نامہ یہ ہے:

سلمہ بن سلامہ بن وقش بن زغبۃ بن زعوراء بن عبد الاشہل

کنیت ابو عوف تھی۔ والدہ کا نام سلمیٰ بنتِ سلمہ بن خالد بن عدی تھا وہ اوس کے خاندان بنو حارثہ سے تھیں اور شرفِ صحابیت سے بہرہ ور تھیں۔

حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے فطرتِ سعید عطا کی تھی وہ ہجرتِ نبوی سے پہلے بھرپور جوانی کے عالم میں سعادت اندوز اسلام ہوئے اور پھر ۱۳ بعدِ بعثت میں مکہ جا کر بیعتِ عقبہ کبیرہ میں شرکت کا شرف حاصل کیا۔ اپنے قبولِ اسلام کے بارے میں خود حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب میں سنِ بلوغت کو پہنچنے والا تھا، ایک مرتبہ اپنے قبیلہ بنو عبد الاشہل کے چند آدمیوں میں بیٹھا ہوا تھا کہ وہاں ایک یہودی عالم آ گیا۔ اس نے ہمارے سامنے قیامت، حساب و میزان اور جنت و جہنم کا ذکر چھیڑ دیا اور کہنے لگا کہ مشرک اور بت پرست جہنم میں پھینکے جائیں گے وہ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جائیں گے اور اللہ کے حضور میں پیش ہوں گے۔ میری قبیلے کے لوگ اس یہودی عالم سے کہنے لگے کہ کیا واقعی تم اس پر یقین رکھتے ہو کہ لوگ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جائیں گے اور اپنے اچھے بُرے اعمال کا بدلہ پائیں گے۔ یہودی عالم نے کہا، ہاں میرا یہی عقیدہ ہے اور یہی عقیدہ درست ہے۔ انہوں نے پوچھا، قیامت کی کیا نشانیاں ہیں؟ اس نے مکہ اور یمن کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ ان شہروں کی طرف نبی آخر الزماں پیدا ہوں گے۔

اس سے پوچھا گیا کہ ان کا ظہور کب ہوگا؟

یہودی عالم نے میری طرف اشارہ کر کے کہا کہ اگر یہ لڑکا زندہ رہا تو یہ اس نبی کو دیکھے گا۔

حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یہ سن کر مجھ پر عالمِ محویت طاری ہوگیا اور اس واقعہ کو ابھی چند ہی سال گزرے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کا ظہور ہوا۔ جونہی ہم لوگوں نے آپ ﷺ کی بعثت کی خبر سنی ہم فوراً ایمان لے آئے۔ وہ یہودی عالم ابھی زندہ تھا لیکن حسد اور بغض کی وجہ سے شرف اسلام سے محروم رہا۔ ہم نے اس سے کہا کہ تم ہی تو ہمیں نبی آخرالزمان (ﷺ) کی بعثت کی خبریں سنایا کرتے تھے اور اب تم ہی اُن ﷺ کو ماننے سے انکار کرتے ہو۔ وہ بولا، یہ وہ نبی نہیں جن کا میں ذکر کیا کرتا تھا۔ آخر وہ بد بخت حالتِ کفر ہی میں دنیا سے کوچ کر گیا۔

(سیرت ابنِ ہشام)

ہجرت کے ۵ ماہ بعد سرورِ عالم ﷺ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے مکان میں انصار و مہاجرین کا ایک مجمع طلب کیا اور ان میں برادری (مواخاۃ) قائم کی۔ اس موقع پر آپ ﷺ نے حضرت سلمہ بن سلامہ رضی اللہ عنہ کو اپنے پھوپھی زاد بھائی اور جلیل القدر مہاجر صحابی حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ (حواریِ رسول) کا دینی بھائی بنایا۔

حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ بڑے دلاور آدمی تھے اور سرورِ عالم ﷺ سے والہانہ محبت کرتے تھے۔ غزوات کا آغاز ہوا تو انہوں نے بدر سے لے کر تبوک تک ہر غزوے میں حضور ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا اور ہر معرکے میں اپنی شجاعت کے جوہر دکھائے۔ حافظ ابنِ حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے ''اصابہ'' میں بیان کیا ہے کہ غزوۂ بنو مصطلق میں راس المنافقین عبداللہ ابن اُبی نے سرورِ عالم ﷺ اور مہاجرین کی شان میں گستاخانہ الفاظ استعمال کیے تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ سلمہ کو بھیجیے کہ عبداللہ کا سر کاٹ لائیں۔ لیکن حضور ﷺ نے درگزر سے کام لیا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ حضرت سلامہ رضی اللہ عنہ کو بہت مانتے تھے۔انہوں نے اپنے عہدِ خلافت میں حضرت سلامہ رضی اللہ عنہ کو یمامہ کا والی مقرر فرمایا تھا۔

حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے عہد میں فتنوں نے سر اٹھایا تو حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ نے عزلت نشین ہو کر اپنے آپ کو ہمہ تن عبادتِ الٰہی کے لیے وقف کر دیا۔ جب عمر کی ۷۴ منزلیں طے کر چکے تو پیغامِ اجل آ پہنچا اور انہوں نے ۴۵ھ ہجری میں مدینہ منورہ میں وفات پائی۔

حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ کی چند روایتیں کتب حدیث میں موجود ہیں۔ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک کھانا (یا ایسی چیز جس کو آگ نے متغیر کر دیا ہو) کھا کر وضو کرنا ضروری تھا۔ایک مرتبہ کسی کی دعوتِ ولیمہ پر تشریف لے گئے اور کھانا کھا کر وضو کیا۔لوگوں نے پوچھا آپ نے تو کھانے سے پہلے وضو کیا تھا اب دوبارہ کیوں؟ فرمایا، رسول اللہ ﷺ کو بھی ایسا اتفاق پیش آیا تھا اور آپ ﷺ نے بھی ایسے ہی کیا تھا۔[1]

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

[1] جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم اور فقہا کے نزدیک کھانا کھالینے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔اچھی طرح کلی کر لینا کافی ہے۔

حضرت حنظلہ بن ابی عامر انصاری رضی اللہ عنہ

﴿غسیل الملائکہ﴾

(۱)

راس المنافقین عبداللہ بن اُبی کا بہنوئی ابو عامر اگرچہ ایک زاہدِ مرتاض تھا اور اس نے حق کی تلاش میں گوشہ عزلت اختیار کر لیا تھا۔ لیکن جب خورشیدِ اسلام فاران کی چوٹیوں سے طلوع ہوا اور مدینہ منورہ کے در و دیوار سیّد المرسلین ﷺ کی طلعتِ اقدس سے جگمگائے تو ابو عامر کی عقل پر پتھر پڑ گئے اور اس نے اسلام اور داعی اسلام ﷺ کی دشمنی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ خدا کی شان اسی ابو عامر کے فرزند کو اللہ تعالیٰ نے نورِ بصیرت عطا کیا، اس نے کسی تامّل کے بغیر دعوتِ حق پر لبّیک کہا اور رحمتِ عالم ﷺ کے جاں نثاروں میں شامل ہو گیا۔ جب اس کے باپ کی اسلام دشمنی اور شرّ انگیزی انتہاء کو پہنچ گئی تو اس کی غیرتِ ایمانی کو تابِ ضبط نہ رہی۔ ایک دن بارگاہِ رسالت ﷺ میں حاضر ہو کر عرض کی: ''یا رسول اللہ اگر اجازت ہو تو اپنے باپ کا سر اتار لاؤں۔''

رحمتِ عالم ﷺ نے فرمایا: ''نہیں، ہم ان سے بُرا سلوک نہیں کریں گے۔''

ابی عامر کے یہ سعادت مند فرزند جو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی خاطر اپنے دشمنِ حق باپ کا قِصّہ پاک کرنے پر تیار ہو گئے تھے، حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ تھے جو تاریخ میں تقی اور ''غسیل الملائکہ'' کے القاب سے مشہور ہیں۔

(۲)

حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کا تعلق اوس کے خاندان عمرو بن عوف سے تھا۔ سلسلہ نسب یہ ہے:

حنظلہ رضی اللہ عنہ بن ابی عامر عمرو بن صیفی بن مالک بن امیہ بن ضبیعہ بن زید بن

عوف بن عمرو بن عوف بن مالک بن اوس۔

حنظلہ رضی اللہ عنہ کا والد ابو عامر اپنے قبیلے کا نہایت معزز اور با اثر شخص تھا۔ وہ توریت و انجیل کا عالم اور بعثتِ پیغمبر ﷺ آخر الزمان کا قائل تھا اور اکثر دینِ خلیف کا ذکر کرتا رہتا تھا۔ ایسے ہی خیالات نے اس کو رہبانیت کی طرف مائل کیا۔ وہ ٹاٹ کا لباس پہن کر کنجِ عزلت میں بیٹھ گیا اور دن رات ریاضت میں مشغول رہنے لگا۔ زمانہ جاہلیت میں اہلِ مدینہ کے نزدیک وہ ایک مذہبی پیشوا کی حیثیت رکھتا تھا اور وہ اس کو "راہب" کے لقب سے پکارتے تھے۔ اس راہب کی بدبختی دیکھئے کہ جب (۱۱ھ بعدِ بعثت میں) مدینہ میں اسلام کی دعوت کا چرچا ہوا تو اس نے نورِ حق کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں اور اسلام کے بارے میں الٹی سیدھی باتیں کرنے لگا۔ سرورِ عالم ﷺ نے ہجرت کے بعد مدینہ منورّہ میں نزولِ اجلال فرمایا تو ابو عامر حضور ﷺ پر ایمان لانے کی بجائے آپ ﷺ سے سخت حسد کرنے لگا۔ اس نے لوگوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے اور حضور ﷺ کے خلاف بھڑکانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ خدا کی شان اسی بدبخت کے فرزند کو اللہ تعالیٰ نے شرفِ ایمان سے بہرہ ور کیا اور ایسی حرارتِ ایمانی عطا کی کہ وہ اپنے باپ کو قتل کرنے پر تُل گئے۔ لیکن رحمتِ عالم ﷺ نے اس کی اجازت نہ دی۔ ابو عامر جوشِ حسد میں مدینہ کی سکونت ترک کر کے مکہ چلا گیا اور غزوۂ اُحد میں مشرکینِ قریش کے ساتھ مل کر اہلِ حق سے لڑنے آیا۔ اس کی یہی حق دشمنی تھی جس کی بناء پر حضور ﷺ نے اس کے لیے "فاسق" کا لقب تجویز فرمایا۔ اس کے بعد وہ پھر مکہ واپس چلا گیا۔ ۸ھ ہجری میں مکہ پر پرچم اسلام بلند ہوا تو وہ ہرقل (شاہِ روم) کے پاس قسطنطنیہ چلا گیا اور وہیں ۹ھ یا ۱۰ھ ہجری میں مر گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ہرقل نے اس کا متروکہ کنانہ بن عبدِ یالیل ثقفی کو دے دیا۔

(۳)

حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ نہایت مخلص مسلمان تھے اور بارگاہِ رسالت سے "تقی" کا خطاب پایا تھا۔ غزوۂ بدر میں کسی وجہ سے شریک نہ ہو سکے۔ غزوۂ اُحد کے دن بیوی کے

پاس خلوت میں تھے کہ منادی کی آواز سنی جو مسلمانوں کو جہاد کے لیے پکار رہا تھا۔ اسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے۔ غسل کا خیال ہی نہ رہا اور مسلح ہو کر میدانِ جنگ میں جا پہنچے۔ اس وقت لڑائی شروع ہو چکی تھی۔ جاتے ہی اُن کا سامنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ سپہ سالارِ قریش سے ہو گیا۔ انہوں نے ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے گھوڑے کے پاؤں کاٹ ڈالے اور ان کو اپنی تلوار کی زد میں لے لیا کہ شداد بن اسود لیثی نے آگے بڑھ کر حنظلہ رضی اللہ عنہ پر تلوار کا ایسا وار کیا کہ وہ شہید ہو کر فرشِ خاک پر گر پڑے۔

لڑائی کے بعد سرورِ عالم ﷺ نے میدانِ جنگ کی طرف نظر کر کے فرمایا:

''حنظلہ کو فرشتے غسل دے رہے ہیں۔''

حضرت ابواُسید ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں حضور ﷺ کا ارشاد سن کر حنظلہ رضی اللہ عنہ کی نعش کے قریب گیا تو دیکھا کہ ان کے سر سے پانی ٹپک رہا ہے۔ میں الٹے پاؤں حضور ﷺ کی خدمت میں واپس آیا اور یہ ماجرا عرض کیا، ارشاد ہوا کہ ان کی اہلیہ سے دریافت کرنا چاہیے کہ کیا بات تھی؟ ابواسید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب ہم واپس مدینے آئے تو حضور ﷺ نے حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کی اہلیہ کے پاس کسی کو بھیج کر دریافت فرمایا کہ حنظلہ کس حال میں جہاد کے لیے روانہ ہوئے تھے؟ انھوں نے بتایا کہ ان کو غسل کی حاجت تھی۔ حضور ﷺ نے فرمایا اسی لیے اس کو فرشتے غسل دے رہے تھے۔ اسی دن سے وہ ''غسیل الملائکہ'' کے لقب سے مشہور ہو گئے۔

حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ نے اپنے پیچھے ایک ہفت سالہ فرزند چھوڑا۔ جن کا نام عبداللہ تھا۔ انہوں نے واقعہ حرہ (۶۳ھ) میں اپنے بیٹوں کے ہمراہ شہادت پائی۔

قبیلہ اوس کے لیے حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کی شخصیت ہمیشہ کے لیے وجہ افتخار بن گئی۔ بعض اہلِ سِیَر نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ اوس و خزرج اپنے اپنے فضائل بیان کر رہے تھے۔ فریقین نے اس موقع پر اپنے اپنے جلیل القدر اصحاب کو پیش کیا۔ اوس نے اپنے جن اصحاب کا نام لیا ان میں حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کا نام سرِ فہرست تھا۔

حضرت مُنذِر بن عُمَر و انصاری رضی اللہ عنہ

قبیلہ خزرج کے خاندان ساعدہ کے چشم و چراغ تھے نسب نامہ یہ ہے:

مُنذِر رضی اللہ عنہ بن عمرو بن خنیس بن حارثہ بن لوذان بن عبدود بن زید بن ثعلبہ خزرج بن ساعدہ بن کعب بن خزرج الاکبر۔

حضرت مُنذِر بن عمرو رضی اللہ عنہ کا شمار نہایت عظیم المرتبت صحابہ میں ہوتا ہے۔ وہ انصار کے ان چند لوگوں میں سے تھے جو زمانہ جاہلیت میں عربی لکھ پڑھ لیتے تھے۔ اللہ نے انھیں فطرتِ سلیم عطا کی تھی۔ ہجرتِ نبوی سے قبل دعوتِ توحید کی آواز کانوں میں پڑی تو فوراً اس پر لبیک کہا۔ اور ۱۳ھ بعدِ بعثت (نبوت) میں مکّہ جا کر بیعتِ عقبہ کبیر ہمیں شریک ہونے کی سعادت حاصل کی۔ بیعت کے بعد سرورِ عالم ﷺ نے شرکائے بیعت سے فرمایا کہ تم لوگ اپنے میں سے ۱۲ نقیب منتخب کر لو۔ انھوں نے ۹ نقیب خزرج سے اور ۳ اوس سے منتخب کیے۔ خزرجی نقباء میں ایک حضرت مُنذِر بن عمرو رضی اللہ عنہ تھے۔

ہجرت کے بعد حضور ﷺ پُر نور مدینہ تشریف لائے تو آپ ﷺ کا استقبال کرنے والوں میں حضرت مُنذِر بن عمرو رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ سرکارِ دوعالم ﷺ کی میزبانی کا شرف خالقِ ارض وسما نے حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے مقدر میں لکھ رکھا تھا۔

چند ماہ بعد حضور ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے مابین مواخاۃ کا رشتہ قائم کیا تو حضرت منذر رضی اللہ عنہ کو اپنے پھوپھی زاد بھائی طلیب بن عمیر رضی اللہ عنہ کا اسلامی بھائی بنایا۔ (وہ حضور ﷺ کی پھوپھی اروٰی بنتِ عبدالمطلب کے فرزند تھے) ایک دوسری روایت کے مطابق حضور ﷺ نے انھیں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا اسلام بھائی بنایا۔ واللہ اعلم

غزوات کا آغاز ہوا تو سب سے پہلے حضرت مُنذِر رضی اللہ عنہ نے غزوۂ بدر میں اپنی تلوار

کے جوہر دکھائے۔ اس کے بعد غزوہ اُحد میں بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ شریک ہوئے۔ اس لڑائی میں حضور ﷺ نے انہیں اسلامی لشکر کے میسرہ کا افسر مقرر فرمایا۔

صفر ۴ ہجری میں ابو براءِ عامر بن مالک نجدی کی درخواست پر حضور ﷺ نے ستّر مبلغین پر مشتمل ایک جماعت تبلیغِ حق کے لیے نجد روانہ فرمائی۔ یہ ستّر اصحاب نہایت عبادت گزار، متقی اور قرآن و حدیث کے عالم تھے اور قُرّاء کے لقب سے مشہور تھے۔ حضور ﷺ نے اس جماعت کا سردار حضرت مُنذِر بن عمرو رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا۔ جب یہ اصحاب بئر معونہ کی مقام پر پہنچے تو اہلِ نجد نے غدّاری کی اور رعل، ذکوان، بنی سلیم وغیرہ قبائل کے لوگوں نے انھیں گھیر لیا اور حضرت مُنذِر بن عمرو رضی اللہ عنہ اور عمرو بن اُمیہ رضی اللہ عنہ کے سوا سب کو شہید کر ڈالا۔ بنی عامر کے سردار عامر بن طفیل نے حضرت مُنذر رضی اللہ عنہ سے کہا۔ اگر تم چاہو تو تم کو امان دی جا سکتی ہے۔ انہوں نے فرمایا' تو ذرا وہ جگہ مجھے بتا دو جہاں حرام بن لمحان رضی اللہ عنہ کو تم لوگوں نے شہید کیا۔ مشرکین انہیں وہاں لے گئے تو انہوں نے اپنی تلوار نکال لی اور عامر بن طفیل سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ مجھے تمہاری امان کی ہرگز ضرورت نہیں، تم نے میرے بھائیوں کو ناحق شہید کیا، میں ان کے بغیر جی کر کیا کروں گا۔ پھر تلوار چلاتے ہوئے مشرکین کے درمیان گھس گئے اور دو کو جہنّم واصل کر کے خود رتبہ شہادت پر فائز ہو گئے۔ حضرت عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ نے (جنہیں عامر بن طفیل نے اپنی ماں کی ایک منّت پوری کرنے کے لیے رہا کر دیا تھا)۔ جب مدینہ جا کر یہ خبر حضور ﷺ کو سنائی تو آپ ﷺ کو بیحد صدمہ ہوا۔ حضرت مُنذِر کا واقعہ شہادت سن کر آپ نے فرمایا "اعنق لیموت" یعنی اس نے موت کی طرف سبقت کی۔ اس وقت سے حضرت مُنذِر کا لقب "اعنق لیموت" یا "المعنق للموت" مشہور ہو گیا۔

یہ لقب گویا اس بات کی علامت ہے کہ حضرت مُنذِر بن عمرو رضی اللہ عنہ نے راہِ حق میں آگے بڑھ کر موت کو گلے لگا لیا۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عَمر و (الاُصَیرِم) بن ثابِت اَشہلی رضی اللہ عنہ

(۱)

سیّدنا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا سینہ احادیثِ نبوی کا گنجینہ تھا۔ وہ اپنی مجالس میں علم وعرفان کے موتی لٹاتے رہتے تھے۔ یہ علم وعرفان کے موتی کیا تھے؟ عہدِ رسالت کے واقعاتِ طیبّات یادانائے کونین ﷺ کے ارشاداتِ گرامی جو وہ بڑے لطف وانبساط کے ساتھ اپنے شاگردوں اور دوسرے حاضرینِ مجلس کو سنایا کرتے تھے۔ کبھی طبیعت میں امنگ پیدا ہوتی تو شاگردوں سے امتحاناً پوچھتے:

> ''کوئی ایسا شخص بتاؤ جس نے ایک وقت کی نماز بھی نہ پڑھی اور سیدھا جنت میں داخل ہوگیا ہو۔''

تمام شاگرد بیک زبان جواب دیتے۔ ''الاُصیرِم۔ عبدالاشہل'' اگر شاگرد خاموش رہتے تو خود فرماتے: ''یہ شخص الاُصَیرِم، عبدالاشہل تھا۔''

یہ الاُصَیرِم عبدالاشہل، قبیلہ اوس کی شاخ بنوعبدالاشہل کے چشم و چراغ تھے۔ اصل نام عَمرو تھا اور ثابت بن وقش رضی اللہ عنہ (بن زغبہ بن زعوراء بن عبدالاشہل) کے لختِ جگر تھے۔ والدہ کا نام لیلیٰ بنتِ حسیل الیمان رضی اللہ عنہا تھا اور وہ محرمِ اسرارِ نبوّت حضرت حذیفہ بن حسیل الیمان رضی اللہ عنہ کی ہمشیر تھیں۔ الاُصَیرِم عمرو بن ثابت نے جن حالات میں اسلام قبول کیا اور پھر جس طرح راہِ حق میں اپنی جان قربان کی وہ ایسا حیرت انگیز واقعہ تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ذہنوں پر نقش ہوکر رہ گیا۔ ان کی مجالس میں کبھی غزوۂ اُحُد کا ذکر چھڑ جاتا تو الاُصَیرِم رضی اللہ عنہ کے جوشِ ایمان اور سرفروشی کا تذکرہ بھی ضرور ہوتا۔

(۲)

سنہ ۱۲ بعدِ بعثت میں حضرت مصعب بن عُمیر رضی اللہ عنہ کی تبلیغی مساعی سے سیّد الاوس حضرت سعد بن معاذ اشہلی رضی اللہ عنہ مشرّف بہ اسلام ہوئے تو انہیں یہ گوارا نہ ہوا کہ وہ خود تو نعمتِ ایمان سے بہرہ یاب ہو جائیں اور ان کا قبیلہ عبدالاشہل بدستور کفر و شرک کی بھول بھلیوں میں بھٹکتا رہے۔ قبولِ اسلام کے بعد گھر واپس گئے تو تمام اہلِ قبیلہ کو جمع کیا اور اُن سے مخاطب ہو کر کہا: ''تمہارا میرے بارے میں کیا خیال ہے؟''

سب نے کہا: ''آپ ہمارے سردار ہیں اور ہم میں سب سے زیادہ دانا اور صائب الرّائے ہیں۔''

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تو پھر سن لو کہ میں اللہ اور اس کے رسولِ برحق پر ایمان لے آیا ہوں تم بھی جب تک ایسا نہ کرو گے مجھے تمہارے مردوں اور عورتوں سے گفتگو کرنا حرام ہے۔''

حضرت سعد رضی اللہ عنہ اپنے قبیلے میں بے پناہ اثر و رسوخ کے حامل تھے۔ ان کے جوشِ ایمان کو دیکھ کر سارا قبیلہ سوائے ایک نوجوان کے شام ہونے سے پہلے پہلے شرفِ اسلام سے بہرہ یاب ہو گیا۔ نعمتِ ایمان سے محروم رہنے والے یہ نوجوان الاُصیرم عمرو بن ثابت تھے، ان کے والد ثابت بن وقش رضی اللہ عنہ، چچا رفاعہ بن وقش رضی اللہ عنہ، نانا حسیل الیمان رضی اللہ عنہ نانی رباب بنتِ کعب رضی اللہ عنہا اور ماموں حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ سب حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے، لیکن معلوم نہیں نوجوان عمرو بن ثابت رضی اللہ عنہ کا دل کیوں نرم نہ ہوا اور وہ بدستور اپنے قدیم مذہب پر قائم رہے۔ بنو عبدالاشہل کے اشراف حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ، حضرت اُسید بن حضیر رضی اللہ عنہ اور خاندان کے دوسرے افراد نے انہیں بہتیرا سمجھایا کہ وہ بھی دینِ حق قبول کر لیں، لیکن انہوں نے نہ مانا اور اسی طرح چار برس گزار دیئے۔ اسی دوران میں رحمتِ عالم ﷺ ہجرت فرما کر مدینہ منوّرہ تشریف لے آئے اور غزوۂ بدر بھی گزر گیا۔

(۳)

غزوۂ اُحد (شوال ۳ ہجری) میں سرورِ عالم ﷺ اپنے جاں نثاروں کے ہمراہ میدانِ جنگ میں تشریف لے گئے تو اس وقت عمرو بن ثابت رضی اللہ عنہ مدینہ میں موجود نہیں تھے۔ واپس آئے تو دیکھا کہ محلّہ سنسان پڑا ہے۔ گھر جا کر عورتوں سے پوچھا، ہمارے خاندان کے لوگ کہاں گئے؟ جواب ملا۔ ''رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ اُحد گئے ہیں۔''

یہ سن کر طبیعت میں حق و صداقت کا جوش پیدا ہوا۔ اسی وقت زرہ پہنی، خود سَر پر رکھا، ہتھیار جسم پر سجائے اور گھوڑے پر سوار ہو کر میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ابھی لڑائی کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ عمرو رضی اللہ عنہ بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ''یارسول اللہ! معرکہ کارزار گرم ہوا چاہتا ہے، یہ فرمایئے کہ پہلے اسلام قبول کروں یا ویسے ہی آپ کی حمایت میں لڑوں۔''

حضور ﷺ نے فرمایا: ''دونوں کام کرو، پہلے اسلام قبول کر لو اور پھر راہِ خدا میں لڑو۔''

عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول، میں نے ایک رکعت نماز بھی نہیں پڑھی، اگر لڑائی میں کام آ گیا تو کیا میری مغفرت ہو جائے گی؟''

حضور ﷺ نے فرمایا: ''ہاں اسلام لانے سے پہلے کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بڑا غفور الرحیم ہے۔''

یہ سن کر اسی وقت کلمہ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو گئے۔

لڑائی شروع ہوئی تو وہ بھی شمشیر بکف میدانِ رزم میں پہنچے۔ بنو عبدالاشہل ان کی سخت دلی سے واقف تھے اور ان کو یہ علم نہیں تھا کہ وہ تھوڑی دیر پہلے سعادت اندوزِ اسلام ہو چکے ہیں۔ عمرو رضی اللہ عنہ کو اپنی صفوں میں دیکھ کر برافروختہ ہوئے اور ان سے کہا کہ یہاں سے چلے جاؤ، ہمیں کسی کافر کی اعانت کی ضرورت نہیں ہے۔ اُصَیرِم رضی اللہ عنہ آبدیدہ ہو گئے اور کہا کہ میں بھی مسلمان ہوں۔

اس کے بعد تلوار چلاتے ہوئے مردانہ وار کفار کی صفوں میں گھس گئے اور ایسی جرأت وجلالت کے ساتھ لڑے کہ کفار کا منہ پھیر دیا۔ آخر بہت سے مشرکوں نے نرغہ کر کے سخت زخمی کر دیا اور وہ بے تاب وتواں ہو کر زمین پر گر گئے۔ لڑائی کے بعد بنو عبد الاشہل کے لوگ اپنے شہداء اور زخمیوں کو اٹھانے لگے تو ان پر بھی نظر پڑی ابھی کچھ سانس باقی تھا، پوچھا، ''کیا تمہیں قومی حمیت یہاں کھینچ لائی؟''

بولے: ''نہیں میں مسلمان ہو کر اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے لیے لڑا۔''

اسی حالت میں اٹھا کر گھر لائے۔ تمام بنو عبد الاشہل میں یہ خبر مشہور ہو گئی۔ سیّد الاوس حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو اس موقع پر الاصیرم رضی اللہ عنہ کی سعادت اندوزیٔ ایمان پر مسرت خیز حیرت ہوئی۔ فوراً ان کے گھر تشریف لائے اور الاصَیرِم رضی اللہ عنہ کی ہمشیرہ سے سارا واقعہ سنا۔ اسی اثناء میں الاصَیرِم رضی اللہ عنہ نے آخر ہچکی لی اور روضہ رضوان کی راہ لی۔

سرورِ عالم ﷺ نے ان کی شہادت کی خبر سُنی تو فرمایا:

انه لمن اهل الجنة بیشک وہ اہلِ جنت میں سے ہے۔

ایک اور روایت میں آپ ﷺ سے یہ الفاظ منسوب ہیں:

عمل قليلاً و اجر كثيرًا اس نے عمل تھوڑا کیا مگر اجر بہت پایا۔

حضرت الاصَیرِم عمرو بن ثابت رضی اللہ عنہ کا خاندان بنو عبد الاشہل پہلے ہی کچھ کم معزز نہیں تھا اس واقعہ نے اس کے طُرّہ امتیاز کو اور اونچا کر دیا۔ بنو عبد الاشہل الاصَیرِم رضی اللہ عنہ پر فخر کیا کرتے تھے کہ انہوں نے ایک سجدہ بھی نہ کیا لیکن جنت میں داخل ہو گئے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

حضرت معن بن عدی بلوی رضی اللہ عنہ

(۱)
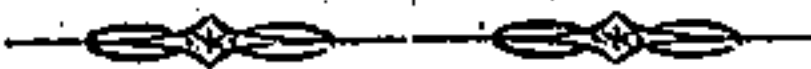
۱۱ھ ہجری میں رحمتِ کونین ﷺ نے وصال فرمایا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر قیامت ٹوٹ پڑی اور وہ شدّتِ الم سے نڈھال ہوگئے۔ اس وقت دنیا ان کی نظر میں تاریک ہو چکی تھی اور ان میں سے بعض گریہ کناں ہو کر بار بار یہ کہہ رہے تھے کہ کاش ہم رسول اللہ ﷺ کے سامنے مر جاتے اور ہمیں یہ وقت نہ دیکھنا پڑتا۔ اب اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے کہ حضور ﷺ کے بعد ہمیں کن مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑے۔ ایک صاحبِ رسول ﷺ نے یہ باتیں سُنیں تو انہوں نے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا:

''بھائیو! مجھے تو یہ پسند نہیں کہ میں اپنے آقا و مولا ﷺ کے سامنے مر گیا ہوتا۔ میری تو یہ تمنا ہے کہ جس طرح میں نے حضور ﷺ کے سامنے آپ ﷺ کی تصدیق کی، حضور ﷺ کی رحلت کے بعد بھی اسی طرح آپ ﷺ کی تصدیق کروں۔''

یہ مردِ مومن جن کے دل میں ہادیٔ برحق ﷺ کے وصال کے بعد بھی آپ ﷺ کی برملا تصدیق کرنے کی تڑپ تھی، حضرت معن بن عدی رضی اللہ عنہ تھے۔

(۲)

سیّدنا حضرت معن بن عدی رضی اللہ عنہ کا تعلق قبیلہ قضاعہ کے خاندان بلی سے تھا جو قبیلہ اوس کے خاندان عمرو بن عوف کا حلیف تھا۔ نسب نامہ یہ ہے:

معن بن عدی رضی اللہ عنہ بن الجدّ بن عجلان بن حارثہ بن جعل بن عمرو بن دوم بن ذبیان بن ہمیم بن ذہل بن بلی۔

حضرت معن بن عدی رضی اللہ عنہ کے برادرِ اکبر حضرت عاصم بن عدی رضی اللہ عنہ تھے جو بنو عجلان کے سردار تھے۔ حضرت معن بن عدی رضی اللہ عنہ کو زمانہ جاہلیت میں نہ صرف لکھنا پڑھنا آتا تھا بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں فطرتِ سعید سے بھی نوازا تھا۔ ۱۲ بعدِ بعثت میں مدینہ منورہ میں اسلام کے داعی اوّل حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی تبلیغی مساعی سے جو لوگ شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہوئے، حضرت معن بن عدی رضی اللہ عنہ بھی ان میں شامل تھے۔ ۱۳ بعدِ بعثت کے زمانہ حج میں وہ مدینہ منورہ کے پچھتر اہلِ ایمان کے ساتھ مکہ معظمہ گئے اور ''بیعتِ عقبہ کبیرہ'' میں رحمتِ عالم ﷺ کی بیعت کا شرف حاصل کیا۔ اس عہد آفرین بیعت میں جو اصحاب شریک ہوئے، انہوں نے اپنی شجاعت، بے خوفی اور اخلاص فی الدین کے ایسے نقوش صفحہ تاریخ پر ثبت کیے کہ ان کی تابانی آج بھی ہر مسلمان کے نہاں خانہ دل کی منور کر دیتی ہے۔ ایک ایسے وقت جب کہ عرب کے در و دیوار سے دینِ حق کی مخالفت کی صدائیں اٹھ رہی تھیں۔ یثرب کے ان مردانِ جری کی مختصر سی جماعت نے اپنے آپ کو مکہ کے دُرِّ یتیم ﷺ کے دامنِ رحمت سے وابستہ کر دیا اور آپ ﷺ سے یہ مقدس پیمانِ وفا باندھا کہ آپ ﷺ یثرب تشریف لائیں تو ہم اپنی جانوں اور اولادوں کے ساتھ آپ ﷺ کی حمایت وحفاظت کریں گے۔ اور پھر جب حضور ﷺ نے اپنے قدومِ میمنت لزوم سے سرزمینِ یثرب کو مشرف فرمایا تو انہوں نے اپنے عہد کو سچ کر دکھایا اور کوئی قربانی ایسی نہ تھی جو انہوں نے راہِ حق میں پیش نہ کی۔ حضرت معن بن عدی رضی اللہ عنہ انہی مردانِ حق میں سے ایک تھے۔

(۳)

ہجرت کے چند ماہ بعد سرورِ عالم ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے مابین مواخاۃ قائم کرائی تو حضرت معن بن عدی رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے برادرِ اکبر حضرت زید بن خطاب رضی اللہ عنہ کا دینی بھائی بنایا۔ اسی زمانے میں حضرت معن رضی اللہ عنہ کے بڑے بھائی حضرت عاصم بن عدی رضی اللہ عنہ بھی سعادت اندوزِ اسلام ہو گئے۔ اس طرح دونوں

بھائی اسلام کے قوی دست و بازو بن گئے۔ غزوات کا آغاز ہوا تو حضرت معن رضی اللہ عنہ نے بدر، اُحُد، احزاب اور دوسرے تمام مشاہد میں سرورِ کونین ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا اور ہر غزوے میں اپنی سرفروشی کے جوہر دکھائے۔ سرورِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد انصار نے سقیفہ بنو ساعدہ میں جمع ہو کر حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانا چاہا تو حضرت معن رضی اللہ عنہ کی رائے ان سے مختلف تھی اور وہ اس بات کے حامی تھے کہ خلیفہ کا انتخاب مہاجرینِ قریش ہی سے ہونا چاہیے۔ چنانچہ وہ اپنے ایک ہم خیال انصاری حضرت عویم بن ساعدہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ اٹھ کر چل دیئے۔ راستے میں حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور کچھ دوسرے مہاجرین مل گئے۔ دونوں بزرگوں نے انہیں انصار کے اجتماع اور ارادے سے آگاہ کیا اور مشورہ دیا کہ آپ (مہاجرین) خود ہی خلافت کے بارے میں فیصلہ کر لیں۔ تاہم مہاجرین نے سقیفہ بنو ساعدہ جانا مناسب سمجھا اور وہیں حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ کا انتخاب خلیفۃ الرسول کی حیثیت سے عمل میں آیا۔ اس سلسلہ میں صحیح بخاری میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ:

> ''جب ہم سقیفہ بنو ساعدہ کی طرف جا رہے تھے تو راستے میں ہمیں انصار کے دو نیک آدمی ملے جنھوں نے ہمیں انصار کے اجتماع اور ارادے سے مطلع کیا۔''

''دو نیک آدمیوں'' سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی مراد حضرت معن بن عدی رضی اللہ عنہ اور حضرت عویم بن ساعدہ رضی اللہ عنہ ہی تھے۔

(۴)

حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ سریر آرائے خلافت ہوئے تو سارے عرب میں فتنہ ارتداد کے شعلے بھڑک اٹھے۔ اس موقع پر صِدّیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے ایسی بلند ہمتی اور استقامت کا مظاہرہ کیا کہ تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ انہوں نے مرتدین کو کسی قسم

کی رعایت دینی سے صاف انکار کر دیا اور فرمایا کہ میں ان سے اس وقت تک لڑوں گا جب تک وہ دینِ حق کے تمام احکام کو بلا کم و کاست نہیں مانیں گے۔ چنانچہ انہوں نے مرتدین کی سرکوبی کے لیے گیارہ لشکر تیار کیے جنھیں آزمودہ کار جرنیلوں کی سرکردگی میں مختلف مقامات کی طرف روانہ کیا۔ کئی ماہ تک مرتدین سے خونریز لڑائیاں ہوتی رہیں جن میں بالآخر مرتدون کو شرمناک ہزیمت سے دوچار ہونا پڑا۔ اس سلسلہ کی سب سے خونریز جنگ مسیلمہ کذّاب کے خلاف یمامہ میں لڑی گئی۔ اس وقت اسلام لشکر کی قیادت حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کر رہے تھے اور حضرت معن بن عدی رضی اللہ عنہ بھی ان کے لشکر میں شامل تھے۔ انہیں حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے دوسو سوار دے کر پہلے ہی یمامہ کی طرف بھیج دیا تھا۔ جب عام جنگ شروع ہوئی تو حضرت معن رضی اللہ عنہ سر ہتھیلی پر رکھ کر لڑے۔ مرتدین کے ایک گروہ نے ان پر نرغہ کر کے تیروں، تلواروں اور نیزوں کا مینہ برسا دیا۔ اور یوں وہ مردِ جانباز شہادت کا خونیں کفن پہن کر مولائے حقیقی کے حضور جا پہنچا۔ اپنے پیچھے کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ
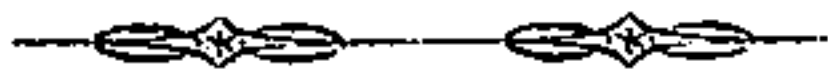
حضرت طلحہ بن البراء انصاری رضی اللہ عنہ

(۱)

بیعتِ عقبہ اولیٰ کی بعد حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ اسلام کے مبلغ کی حیثیت سے یثرب تشریف لے گئے تو ان کی تبلیغی مساعی کے نتیجہ میں یثرب کے گھر گھر میں اسلام کا چرچا ہونے لگا اور گلی گلی کوچے کوچے سے توحید کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔

سیّد الاوس حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ سعادت اندوزِ اسلام ہوئے تو ان کے اثر و رسوخ کی بدولت اوس کا شاید ہی کوئی گھرانا ایسا ہو جو نعمتِ اسلام سے محروم رہ گیا ہو، لیکن معلوم نہیں براء بن عمیر (بن دبرہ بن ثعلبہ بن غنم بن سرّی بن سلمہ بن انیف) کی عقل پر جہالت کے کیسے دبیز پردے پڑے ہوئے تھے کہ اس نے دعوتِ حق کی صدا سننے سے یکسر انکار کر دیا۔ وہ قبیلہ بلّی کا ایک صاحبِ حیثیت آدمی تھا اور اوس کے خاندان عمرو بن عوف کا حلیف تھا۔ اس خاندان کے اکثر لوگ اسلام کے دامنِ رحمت کو تھام چکے تھے، لیکن براء بدستور اپنے آبائی مذہب سے چمٹا ہوا تھا۔ ادھر براء کے نوخیز فرزند طلحہ کی حالت کچھ اور ہی تھی، طلحہ ایک جوانِ رعنا تھا اور اپنے قبیلے کی ناک تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے فطرتِ سعید سے نوازا تھا۔ اس نے اوس اور خزرج کے نوجوانوں کو والہانہ ذوق و شوق سے آگے بڑھ بڑھ کر شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہوتے دیکھا تو اس کے نہاں خانہ قلب میں بھی دینِ حق سے گہرا لگاؤ پیدا ہو گیا یہاں تک کہ وہ ہجرتِ نبوی ﷺ سے قبل علانیہ اپنے اسلام کا اظہار کرنے لگا۔ سرورِ عالم ﷺ نے مکہ سے یثرب کو ہجرت کا ارادہ فرمایا تو خاکِ یثرب کا ذرّہ ذرّہ مکہ کے دُرِّ یتیم ﷺ کے لیے ہمہ تن انتظار بن گیا۔ بوڑھے، جوان، عورتیں اور بچے سبھی رحمتِ عالم ﷺ کے اس درجہ مشتاقِ دید تھے کہ کسی پہلو چین نہ پڑتا تھا۔

طلحہ رضی اللہ عنہ بھی انہیں مشتاقانِ دید میں شامل تھے اور نہایت بے تابی سے سیّد المرسلین ﷺ کے قُدومِ میمنت لزوم کے منتظر تھے۔

(۲)

سیّد الانام خیر الخلائق رحمتِ عالم ﷺ کا یثرب میں نزولِ اجلال ہوا تو اس قدیم شہر کی قسمت جاگ اٹھی، وہ یثرب سے ''مدینۃ النبی ﷺ'' بن گیا۔ اس کے در و دیوار طلعتِ اقدس سے جگمگا اُٹھے اور اس کا گوشہ گوشہ گہوارۂ بہار بن گیا۔ انصار کی مسرّت و ابتہاج کا یہ عالم تھا کہ ان کے قدم زمین پر نہ ٹکتے تھے اور وہ فخرِ موجودات ﷺ کو اپنے درمیان پا کر اپنے آپ کو ہفت اقلیم کا مالک تصوّر کرتے تھے۔ نوجوان طلحہ رضی اللہ عنہ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے تو حضور ﷺ پُر نور کے چہرۂ اقدس پر نظر پڑتے ہی دنیا و مافیہا سے بیگانہ ہو گئے۔ عالمِ وارفتگی میں بے اختیار حضور ﷺ سے چمٹ گئے۔ آپ کے ہاتھوں کو چوما اور عرض کیا:

''یارسول اللہ! آپ مجھے جو حکم دیں گے میں اس کی تعمیل کروں گا اور آپ ﷺ کے ارشاد کی بجا آوری میں ہرگز ہرگز کوئی کوتاہی نہ کروں گا۔''

رحمتِ عالم ﷺ ان کا جذبہ عقیدت دیکھ کر متبسّم ہو گئے اور ہنستے ہوئے فرمایا، جاؤ اور اپنے باپ کو قتل کر دو۔

طلحہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! ابھی آپ کے ارشاد کی تعمیل کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر گھر کی طرف چلے۔

سرورِ عالم ﷺ نے فوراً آواز دی: ''طلحہ واپس آؤ۔ میں قطع رحمی کے لیے مبعوث نہیں ہوا۔''

یہ پہلا امتحان تھا جس میں طلحہ رضی اللہ عنہ سرخرو ہوئے۔

اس واقعہ کے بعد حضرت طلحہ بن البراء رضی اللہ عنہ رحمتِ عالم ﷺ کی زیارت اور خدمت کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ ذاتِ رسالت مآب ﷺ سے ان

کی عقیدت، محبت اور شیفتگی عشق کے درجہ تک پہنچی ہوئی تھی۔ حضور ﷺ بھی ان پر بے حد شفقت فرماتے تھے اور ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ افسوس کہ یہ زمانہ بہت مختصر ثابت ہوا ۔

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد　　　روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

کچھ عرصے بعد حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ سخت بیمار ہو گئے، یہاں تک کہ بارگاہِ رسالت ﷺ میں حاضری سے قاصر ہو گئے۔ سرورِ کونین ﷺ کو اطلاع ملی تو آپ ﷺ ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ ان کی حالت دیکھ کر آپ کو یقین ہو گیا کہ بس اب ان کا چل چلاؤ ہے۔ واپسی کے وقت ان کے لواحقین سے علیٰحدگی میں فرمایا کہ طلحہ رضی اللہ عنہ کی جانبری کی اُمید نہیں ہے۔ جب وہ اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دیں تو مجھے فوراً خبر کرنا۔ میں خود نمازِ جنازہ پڑھاؤں گا اور ان کی تکفین و تدفین میں تاخیر نہ کرنا کیونکہ مجھے یہ پسند نہیں ہے کہ مشرکوں کے درمیان ایک مومن کی میت پڑی رہے۔

ادھر حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے اخلاص اور عشقِ رسول ﷺ کی یہ کیفیت تھی کہ رات ہوئی اور ان کا وقتِ آخر قریب آیا تو گھر والوں سے کہا:

"مجھے تم خود ہی جلد دفن کر دینا تاکہ میں اپنے ربّ سے جلد مل سکوں اور رسول اللہ ﷺ کو خبر کرنے کی ضرورت نہیں۔ مبادا راستہ میں یہود کوئی تکلیف حضور ﷺ کو پہنچائیں یا کوئی جانور آپ ﷺ کو آزار پہنچائے۔"

اس وصیت کے بعد انہوں نے بھرپور جوانی کے عالم پیکِ اجل کو لبیک کہا ؎

خوش درخشید ولے شعلہ مستعجل بود

گھر والوں نے راتوں رات ہی دفن کر دیا۔ صبح کو سرورِ کونین ﷺ کو ان کی وفات کی اطلاع ملی، تو آپ ﷺ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو ساتھ لے کر

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی قبر پر تشریف لے گئے۔ نمازِ جنازہ پڑھی اور ہاتھ اٹھا کر بارگاہِ خداوندی میں دُعا کی:

"اللهم الق طلحة و انت تضحك اليه و هو يضحك اليك"

(اے اللہ طلحہ سے اس طرح مل کہ تو اس سے اور وہ تجھ سے ہنستے ہوئے ملیں) یعنی خوش ہو کر میرا پیارا بندہ آ گیا اور طلحہ خوش ہوں کہ اپنے خالق سے ملاقات ہو گئی۔

حضرت طلحہ بن البراء رضی اللہ عنہ نے مختصر عمر پائی، لیکن اپنے جوشِ اخلاص اور جذبہ فدویت کے ایسے نقوش صفحہ تاریخ پر ثبت کیے جو ابدالآباد تک ان کا نام زندہ و تابندہ رکھیں گے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت قیس بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ

(۱)

سیّد الخزرج حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سرورِ عالم ﷺ کے محبوب جان نثار تھے۔ ایک دفعہ حضور ﷺ ان کی ملاقات کے لیے تشریف لے گئے۔ آپ ﷺ کا معمول تھا کہ اجازت کے بغیر کسی کے مکان میں داخل نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے مکان کے دروازے پر کھڑے ہو کر فرمایا: ''السلام علیکم ورحمتہ اللہ'' حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کے سلام کا جواب اتنی دبی زبان میں دیا کہ آپ ﷺ کے سمعِ مبارک تک نہ پہنچا۔ چنانچہ سرورِ عالم ﷺ نے دوبارہ فرمایا: ''......السلام علیکم و رحمتہ اللہ'' حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے پھر بہت آہستہ سے آپ ﷺ کے سلام کا جواب دیا۔ پھر حضور ﷺ نے تیسری مرتبہ فرمایا...... ''السلام علیکم و رحمتہ اللہ'' اب کی بار بھی آپ ﷺ کے سلام کے جواب میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اپنی آواز بہت پست رکھی۔ حضور ﷺ نے خیال فرمایا کہ سعد رضی اللہ عنہ مجھ کو اجازت دینے میں متامل ہیں چنانچہ آپ ﷺ واپس ہو چلے۔ اب حضرت سعد رضی اللہ عنہ فوراً باہر آئے اور عرض کیا:

> ''یارسول اللہ، میرے ماں باپ آپ پر قربان، میں آپ کا سلام سن رہا تھا اور آپ کے سلام کا جواب اس لیے آہستہ دے رہا تھا کہ آپ ہم پر کثرت سے سلام کریں۔''

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی بات سُن کر حضور ﷺ متبسم ہو گئے اور ان کے گھر کے اندر تشریف لے گئے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کے لیے غسل کے انتظام کا حکم دیا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے غسل فرمایا اس کے بعد حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کی

خدمت میں موٹے کپڑے کی ایک چادر پیش کی جو زعفران یا درس (ایک قسم کی خوشبودار گھاس) میں رنگی ہوئی تھی۔ آپ ﷺ نے اس کو اپنے جسمِ مبارک پر لپیٹ لیا اور اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر دُعا مانگی:

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ صَلٰوتَكَ وَ رَحْمَتَكَ عَلٰى سَعْدٍ

(الٰہی اپنی رحمت اور مہربانی سعد پر نازل فرما)

اس کے بعد آپ ﷺ نے کھانا کھایا اور پھر واپسی کا ارادہ فرمایا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اپنا گدھا منگایا اور اس کی پشت پر چادر بچھوائی۔ ساتھ ہی اپنے بیٹے سے فرمایا کہ حضور ﷺ کے ساتھ جاؤ۔ حضور ﷺ گدھے پر سوار ہوئے تو وہ آپ ﷺ کے ساتھ چل پڑے۔ رحمتِ عالم ﷺ نے ان سے فرمایا کہ میرے ساتھ سوار ہو جاؤ، ان کو پاسِ ادب مانع ہوا اور آپ ﷺ کے ساتھ بیٹھنے سے عذر کیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا، سوار ہو جاؤ یا واپس جاؤ۔ انہوں نے حضور ﷺ کے ساتھ بیٹھنے کی جرات نہ کی اور واپس چلے گئے۔ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے یہ سعادت مند فرزند جن کو سیّد الانام ﷺ کا اس قدر ادب اور احترام ملحوظ تھا، حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہما تھے۔

(۲)

سیّدنا ابوالفضل حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہ کا شمار کبار صحابہ میں ہوتا ہے۔ ان کا تعلق خزرج کے خاندان بنو ساعدہ سے تھا۔ نسب نامہ ہے:

قیس بن سعد رضی اللہ عنہما بن عبادہ بن دُلیم بن حارثہ بن حزام بن خزیمہ بن ثعلبہ بن طریف بن خزرج بن ساعدہ بن کعب بن خزرج اکبر۔

والدہ کا نام فکیہہ رضی اللہ عنہا بنتِ عبید بن دُلیم تھا، وہ بھی بنو ساعدہ سے تھیں اور حضرت قیس رضی اللہ عنہ کے والد کی بنتِ عم تھیں۔

حضرت قیس رضی اللہ عنہ کے والدِ گرامی حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ خزرج کے رئیسِ اعظم اور بزمِ رسالت ﷺ کے خاص اراکین میں سے تھے۔ وہ نہ صرف خود ایک عظیم المرتبت

صحابی تھے بلکہ ان کی والدہ (حضرت عمرہ بنتِ مسعود رضی اللہ عنہا) اور اہلیہ (حضرت فکیہہ رضی اللہ عنہا) بھی شرفِ صحابیت سے بہرہ ور تھیں۔ حضرت قیس رضی اللہ عنہ اسی گھرانے میں بدوِ شعور کو پہنچے اور والدین کی طرح ہجرتِ نبوی ﷺ سے پہلے شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہوئے۔

مسندِ احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ میں ہے کہ سرورِ عالم ﷺ نے ہجرت کے بعد مدینہ منورّہ میں نزولِ اجلال فرمایا تو حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ ایک دن حضرت قیس رضی اللہ عنہ کو اپنے ساتھ لے کر بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا:

"یارسول اللہ یہ میرا فرزند قیس ہے میں اسے آپ کے حوالے کرتا ہوں، آپ اس سے کام لیا کریں۔"

حضرت قیس رضی اللہ عنہ نے بھی دل و جان سے اپنے آپ کو سرکارِ دو عالم ﷺ کی خدمت کے لیے وقف کر دیا اور اس طرح حضور ﷺ کی عنایات والطاف کے مَورِد بن گئے۔ اہلِ سِیَر نے لکھا ہے کہ ان کو دربارِ نبوّت میں درجہ تقرب وامتیاز حاصل تھا۔ اس کا اندازہ صحیح بخاری میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے بخوبی کیا جاسکتا ہے کہ قیس رضی اللہ عنہ دربارِ رسالت میں وہ مقام رکھتے تھے جو کسی فرمانروا کے یہاں پولیس کے افسرِ اعلیٰ کا ہوتا ہے۔

(۳)

حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہما بڑے قد کاٹھ اور ڈیل ڈول کے جوان تھے۔ گدھے پر بیٹھتے تو پاؤں زمین کو چھوتے تھے۔ چہرہ قدرتاً بالوں سے بالکل خالی تھا اس لیے اہلِ مدینہ ازراہِ مذاق کہا کرتے تھے کہ کاش ان کے لیے ایک ڈاڑھی خرید لی جاتی۔ صورت نہایت حسین وجمیل پائی تھی۔ ظاہری وجاہت اور رعب کے ساتھ وہ حسنِ باطنی سے بھی متصف تھے۔ نہایت شجاع، پاکباز، زیرک اور صائب الرائے تھے۔ فیاضی اور جود وسخا انہیں اپنے بلند حوصلہ آباؤ اجداد سے ورثے میں ملی تھی۔ اور وہ عرب کے دریادل لوگوں

میں شمار ہوتے تھے۔ شوقِ جہاد کا یہ عالم تھا کہ عہدِ رسالت کے بیشتر غزوات وسرایا میں والہانہ ذوق وشوق سے شریک ہوئے۔ اربابِ سیَر نے سریّہ سیف البحر یا جیش الخبط (رجب ۸ ھ) اور غزوۂ فتح (رمضان ۸ ھ) میں ان کی شرکت کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔ سیف البحر کی مہم کی قیادت سرورِ عالم ﷺ نے حضرت ابوعبیدہ بن جرح رضی اللہ عنہ کو سونپی تھی۔ ان کے ساتھ تین سو مہاجرین وانصار تھے جن میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہما بھی شامل تھے۔ یہ مہم بنوجہینہ کے علاقے کی طرف (قافلہ قریش کی دیکھ بھال یا اس کی توجہ منتشر کرنے کے لیے) بھیجی گئی تھی۔ یہ علاقہ مدینہ طیبہ سے پانچ روز کے فاصلے پر ساحلِ سمندر پر واقع تھا۔ اسی لیے اس کو سریّہ سیف البحر کہا گیا ہے۔ (سیف البحر کے معنی ساحلِ سمندر کے ہیں)۔ جیش الخبط یا سریّہ خبط اس کو اس لیے کہا گیا ہے کہ اس مہم کے دوران میں رسد ختم ہو جانے کی وجہ سے مسلمانوں کو درختوں کے پتّے جھاڑ جھاڑ کر کھانے کی نوبت آئی تھی۔ خبط درخت کے پتّوں کو کہتے ہیں۔ جو لاٹھی وغیرہ سے جھاڑے جاتے ہیں۔ صحیح بخاری میں ہے کہ مجاہدین نے ساحلِ سمندر پر قیام کیا تو ان کا سامانِ رسد ختم ہو گیا اور وہ درختوں کے پتّے جھاڑ جھاڑ کر کھانے پر مجبور ہو گئے۔ حضرت قیس رضی اللہ عنہ نے یہ حالت دیکھی تو انہوں نے تین مرتبہ تین تین اونٹ قرض لے کر ذبح کرائے اور لشکر کے لیے خوارک فراہم کی۔ علامہ ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ (امیرِ لشکر) سے کہا کہ ان کو روکا جائے ورنہ وہ اپنے باپ کا مال اسی طرح صرف کر دیں گے۔ چنانچہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے انہیں مزید اونٹ ذبح کرانے سے منع کر دیا۔

حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اسی مہم کے دوران میں جب پتّے کھا کھا کر ہمارے گلّے زخمی ہو گئے تو ایک دن سمندر کی موجوں نے ایک بہت بڑا آبی جانور ہماری طرف کنارے پر لا پھینکا جسے عنبر کہتے ہیں (یہ وہیل یا کوئی دوسری

بڑی مچھلی تھی) ہم لوگوں نے (جو تعداد میں تین سو تھے) نصف مہینہ تک اس کے گوشت پر گزارا کیا اور ہم سب کے سب موٹے تازے ہو گئے۔ اس مچھلی کی جسامت کا یہ حال تھا کہ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے اس کی پسلی نصب کرنے کا حکم دیا اور پھر سب سے طویل قامت آدمی (حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہ) کو سب سے بلند قامت اونٹ پر سوار کر کے اس کے نیچے سے گزارا۔ وہ بے تکلف گزر گئے اور پسلی ان کے سر سے اونچی رہی۔ ایک دن حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو اس کی آنکھ کے گڑھے میں بیٹھنے کا حکم دیا۔ چنانچہ تیرہ اصحاب آسانی سے اس میں بیٹھ گئے۔ مدینہ کو واپس ہوتے ہوئے ہم لوگوں نے بچے ہوئے گوشت کو بطور زادِ راہ ساتھ لے لیا۔ مدینہ پہنچ کر ہم نے رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں سارا واقعہ عرض کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری شکم پروری کے لیے اسے پیدا فرمادیا۔ اگر اس کا کچھ گوشت ساتھ لائے ہو تو مجھے بھی کھلاؤ۔ ہم نے حضور ﷺ کی خدمت میں گوشت پیش کیا اور آپ ﷺ نے اسے تناول فرمایا۔

حافظ ابنِ عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے ''الاستیعاب'' میں لکھا ہے کہ سریہ سیف البحر سے واپس آ کر صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہما کے اونٹ ذبح کرانے کا واقع حضور ﷺ کو سنایا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''فیاضی اور سخاوت اس گھرانے کا خاصہ ہے۔''

صحیح بخاری میں ہے کہ مہم سیف البحر سے واپس آ کر حضرت قیس رضی اللہ عنہ نے اپنے والدِ گرامی حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو مسلمانوں کی فاقہ کشی کا حال سنایا تو انہوں نے فرمایا کہ اونٹ ذبح کراتے، جواب دیا میں نے ایسا ہی کیا لیکن دوسرے دن مسلمانوں کا پھر وہی حال تھا، حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے فرمایا، اور اونٹ ذبح کراتے، عرض کیا میں نے دوبارہ ایسا ہی کیا لیکن اس کے بعد مسلمان پھر بھوک میں مبتلا ہو گئے۔ فرمایا کہ پھر ذبح کراتے۔ حضرت قیس رضی اللہ عنہ (بصد حسرت) بولے کہ مجھے روک دیا گیا۔

علامہ ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ''اُسد الغابہ'' میں بیان کیا ہے کہ جیش الخبط کے سلسلے میں

کسی نے حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو بتایا کہ حضرت قیس رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ایماء پر مزید اونٹ ذبح کرانے سے روکا گیا تھا کیونکہ وہ کہتے تھے کہ وہ اپنے باپ کا مال اسی طرح صَرف کر دیں گے۔ یہ سُن کر حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ فوراً سرکارِ دوعالم ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ کی پشتِ مبارک کے پیچھے کھڑے ہو کر کہا:

''ابن ابی قحافہ اور ابنِ خطاب کی طرف سے کوئی جواب دے کہ وہ میرے بیٹے کو بخیل کیوں بنانا چاہتے ہیں؟''

رمضان المبارک ۸ھ ہجری میں حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہما کو ان دس ہزار قدوسیوں میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا جو فتح مکہ کے موقع پر رحمتِ دوعالم ﷺ کے ہمرکاب تھے۔ حضرت قیس رضی اللہ عنہ کے والدِ گرامی حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ بارگاہِ نبوّت ﷺ میں خاص مقام رکھتے تھے۔ فتح مکہ کے دن حضور ﷺ نے اپنا جھنڈا ان کے سپرد کر رکھا تھا۔ وہ یہ علَم اٹھائے بڑی شان سے انصار کے آگے آگے چل رہے تھے۔ راستے میں ایک جگہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ، ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو ساتھ لیے کھڑے تھے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی نظر حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ پر پڑی تو بڑے جوش سے یہ شعر پڑھنے لگے۔

اليوم يوم الملحمه   اليوم تستحل الحرمه

(آج کا دن خونریزی (سخت لڑائی) کا دن ہے۔ آج کعبہ (حرم) حلال کر دیا جائے گا۔ (یا آج کے دن عزتیں اتاری جائیں گی۔)

جب رحمتِ عالم ﷺ کو حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم نے اطلاع دی کہ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ یوں اور یوں کہہ رہے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا، سعد نے غلط کہا، آج کعبہ کی عظمت دوبالا ہوگی، آج کعبہ کو غلاف پہنایا جائے گا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے حکم دیا کہ میرا جھنڈا سعد سے لے کر ان کے بیٹے قیس کو دے دیا

جائے۔ چنانچہ رایتِ نبوی حضرت قیس رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں آ گیا۔ اب حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا: ''یارسول اللہ اپنا علَم قیس کی بجائے کسی دوسرے کے سپرد فرمایئے میں ڈرتا ہوں کہ قریش کے خلاف قیس کا جوشِ انتقام تازہ نہ ہو جائے۔''

حضور ﷺ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی بات مان لی اور جھنڈا حضرت قیس رضی اللہ عنہ سے لے کر حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کے حوالے کر دیا۔

(۴)

سرورِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہ کی سیاسی اور عسکری سرگرمیوں کا سراغ حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ کے عہدِ خلافت میں ملتا ہے۔ وہ شروع ہی سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے رشتہ اخلاص و مودّت رکھتے تھے۔ سیّدنا علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ بھی ان کے قدردان تھے۔ وہ سریرآرائے خلافت ہوئے تو حضرت قیس رضی اللہ عنہ کو مصر کا والی مقرر فرمایا۔ انہوں نے بڑے مدبرانہ انداز سے مصر کا نظامِ حکومت چلایا لیکن اہلِ کوفہ کو حضرت قیس رضی اللہ عنہ کی امارتِ مصر بوجوہ پسند نہیں تھی۔ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے مصر کے حالات اس انداز سے پیش کیے کہ امیرالمومنین رضی اللہ عنہ نے حضرت قیس رضی اللہ عنہ کو امارتِ مصر سے سبکدوش کر دیا اور ان کی جگہ محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کو مصر کا والی مقرر کیا۔ حضرت قیس رضی اللہ عنہ مصر سے مدینہ آ گئے لیکن مروان بن الحکم نے ان کی مدینہ میں موجودگی کو پسند نہ کیا۔ چنانچہ وہ کوفہ چلے گئے اور ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ کے بیان کے مطابق وہیں مستقل اقامت اختیار کر لی۔ حضرت قیس رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پُرجوش حامیوں میں تھے۔ جنگِ جمل کے بعد جنگِ صفّین میں شریک ہوئے اور کئی موقعوں پر فوجِ مرتضوی کی قیادت کی۔ صفّین کے بعد خوارج نے زور باندھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کی سرکوبی کے لیے آگے بڑھے اس سلسلے میں نہروان کی خونریز جنگ پیش آئی۔ اس جنگ میں حضرت قیس رضی اللہ عنہ اپنے تمام قبیلے کے ساتھ لشکرِ مرتضوی میں شامل تھے۔ لڑائی شروع ہونے سے پہلے

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ اور حضرت قیس رضی اللہ عنہ کو اتمامِ حجت کے لیے خوارج کے پاس بھیجا کہ انہیں سمجھا بجھا کر اپنی روش کو ترک کرنے پر آمادہ کریں۔ دورانِ گفتگو میں خارجیوں کے سردار عبداللہ بن سنجر نے کہا کہ ہم آپ لوگوں کا ساتھ نہیں دے سکتے البتہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جیسا کوئی شخص ہو تو اس کی خلافت ہمیں منظور ہوگی۔ حضرت قیس رضی اللہ عنہ نے فرمایا، ''ہم میں علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ موجود ہیں تم ان کے رتبہ کا کوئی آدمی پیش کرو۔'' عبداللہ بن سنجر نے کہا، ہم میں اس رتبہ کی کوئی شخصیت نہیں۔ حضرت قیس رضی اللہ عنہ بولے، تو پھر تم جلد اپنی اصلاح کرو، مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے دلوں میں فتنہ جڑ پکڑ رہا ہے۔ اس گفتگو کے بعد فریقین میں سخت لڑائی ہوئی جس میں خوارج کو عبرت ناک شکست ہوئی۔

سنہ ۴۰ ھ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے شہادت پائی اور سیّدنا حضرت حسن رضی اللہ عنہ مسندِ خلافت پر بیٹھے تو حضرت قیس رضی اللہ عنہ ان کے بھی دست و بازو بن گئے۔

سیّدنا حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے اوائلِ خلافت میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک زبردست لشکر شام سے عراق کی جانب روانہ کیا۔ حضرت قیس رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی تو وہ پانچ ہزار جنگجوؤں کو ساتھ لے کر شامی لشکر کو روکنے کے لیے انبار پہنچے۔ ان جنگجوؤں نے اپنے سر منڈوا رکھے تھے اور موت پر بیعت کی تھی۔ شامی لشکر نے انبار کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ اسی اثناء میں امام حسن رضی اللہ عنہ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے مابین معاہدہ صلح طے پا گیا اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت قیس رضی اللہ عنہ کو لکھ بھیجا کہ انبار شامیوں کے حوالے کر کے میرے پاس مدائن آجاؤ۔ حضرت قیس رضی اللہ عنہ کو جب یہ خط ملا تو وہ بہت آزردہ خاطر ہوئے۔ اور اپنے ساتھیوں کو جمع کر کے ان سے کہا کہ اب ہمیں دو باتوں میں سے ایک اختیار کرنی ہوگی۔ قتال بلا امام یا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت۔ تمام ساتھیوں نے بیک زبان کہا کہ موجودہ صورتِ حال میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لینا ہی بہتر ہے۔ چنانچہ حضرت قیس رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کے لیے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے امان حاصل کر لی اور

سب کو لے کر مدائن آ گئے۔ چند دن بعد مدائن سے مدینہ منورّہ کا عزم کیا، اثنائے سفر میں ہر روز اپنے ساتھیوں کے لیے اپنا ایک اونٹ ذبح کراتے تھے۔ مدینہ پہنچ کر انہوں نے ہر قسم کی سیاسی سرگرمیوں سے علیٰحدگی اختیار کر لی اور گوشہ عزلت میں بیٹھ کر عبادتِ الٰہی میں مصروف رہنے لگے۔ ۶۰ ہجری کے دوران میں علیل ہو گئے۔ مدینہ کے بہت سے لوگ ان کے مقروض تھے۔ ان میں سے اکثر چونکہ قرض ادا کرنے کی سکت نہ رکھتے تھے اس لیے حضرت قیس رضی اللہ عنہ کی بیمار پرسی کے لیے آنے سے شرماتے تھے۔ حضرت قیس رضی اللہ عنہ کو ان لوگوں کی مجبوری کا علم ہوا تو اعلان کرا دیا کہ میں اپنا قرض معاف کرتا ہوں اب کسی سے کچھ نہیں لوں گا۔ یہ اعلان سن کر سارا شہر ان کی عیادت کے لیے ٹوٹ پڑا، حضرت قیس رضی اللہ عنہ بالا خانے پر تھے۔ لوگوں کا اتنا ہجوم ہوا کہ کوٹھے کا زینہ ٹوٹ گیا۔ حضرت قیس رضی اللہ عنہ کی یہ علالت طول پکڑ گئی اور کچھ عرصہ بعد انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اپنے پیچھے ایک صاحبزادے چھوڑے جن کا نام عامر تھا۔ انہوں نے اپنے والد سے حدیث روایت کی ہے۔ حضرت قیس رضی اللہ عنہ کا شمار فضلائے صحابہ رضی اللہ عنہم میں ہوتا ہے۔ اور ان سے مروی کئی احادیث کتبِ حدیث میں موجود ہیں۔ ان کے راویوں میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ، حضرت ابومیسرہ رحمۃ اللہ علیہ، حضرت عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ رحمۃ اللہ علیہ، اور شعبی رحمۃ اللہ علیہ جیسے اکابرِ اُمت شامل ہیں۔

(۵)

حضرت قیس رضی اللہ عنہ کے صحیفہ اخلاق میں سبقت فی الاسلام، حُبِّ رسول، جُود وسخا، شغفِ عبادت، تدبیر وحکمت اور شجاعت و بسالت سب سے نمایاں ابواب ہیں۔ قبولِ اسلام کا شرف انہیں ہجرتِ نبوی سے قبل ہی حاصل ہو گیا تھا۔ جبکہ ان کا عنفوانِ شباب تھا۔ سرکارِ دوجہاں ﷺ کا اس قدر ادب ملحوظ تھا کہ آپ ﷺ کے برابر بیٹھنا بھی گوارا نہ تھا۔ حضور ﷺ سے بے انتہا محبت تھی اور آپ ﷺ کی خدمت کو اپنے لیے باعثِ سعادت جانتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ بارگاہِ نبوّت میں درجہ تقرب حاصل ہو گیا تھا۔ جو

دوسخا میں وہ اپنے آباؤاجداد کے سچے جانشین تھے۔ اہلِ سیَر کا اس بات پر اتفاق ہے کہ سخاوت اور دریا دلی میں وہ اپنی نظیر آپ تھے۔ خود سیّد المرسلین ﷺ ان کی فیاضی کے مداح تھے۔ حضرت قیس رضی اللہ عنہ کے پردادا دُلیم، دادا عبادہ، والد سعد رضی اللہ عنہ اور وہ خود اپنے زمانے کے مشہور مخیّر تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ دُلیم نے اپنے زمانے میں ایک آدمی کو مقرر کر رکھا تھا جو بنو ساعدہ کے قلعے سے ان کی طرف سے پکارا کرتا تھا کہ جس کو عمدہ کھانا، گوشت اور روغن کھانے کی خواہش ہو وہ ہمارے ہاں قیام کرے۔ چنانچہ ان کا گھر مہمان خانہ عام بن گیا تھا، دُلیم کے بعد عبادہ، عبادہ کے بعد سعد رضی اللہ عنہ اور سعد رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت قیس رضی اللہ عنہ نے اس رسم کو اسی طرح قائم رکھا۔

ایک مرتبہ ایک بڑھیا ان کے پاس آئی اور اپنے افلاس کا اظہار اس طرح کیا کہ میرے گھر میں چوہے نہیں ہیں (یعنی اناج نہیں ہے)۔ فرمایا، بہت خوب، جاؤ اب تمہارے گھر میں چوہے ہی چوہے نظر آئیں گے۔ اس کے ساتھ ہی خدام کو حکم دیا کہ اس کے گھر کو غلّے، روغن اور کھانے کی دوسری چیزوں سے بھر دو۔

حافظ ابنِ عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ کثیر بن صلت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے مقروض تھے، انہوں نے مروان کو لکھا کہ تم کثیر کا مکان خرید لو اگر وہ فروخت کرنے سے انکار کریں تو میرے قرض کی واپسی کا مطالبہ کرنا، اگر قرض ادا کر دیں تو بہتر ورنہ مکان فروخت کر دیں۔ مروان نے کثیر کو بُلا کر کہا کہ تین دن کے اندر قرض ادا کریں یا اپنا مکان فروخت کر دیں۔ وہ مکان نہیں بیچنا چاہتے تھے اور قرض ادا کرنے کے لیے تیس ہزار کی رقم درکار تھی۔ سخت پریشانی کے عالم میں حضرت قیس رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے اور ان سے تیس ہزار قرض مانگا انہوں نے بلا تامّل دے دیا۔ وہ یہ رقم لے کر مروان کے پاس آئے تو اس کا دل پسیج گیا اور اس نے رقم اور مکان دونوں ان کے حوالے کر دیئے۔ وہ وہاں سے سیدھے حضرت قیس رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور ۳۰ ہزار کی رقم ان کو واپس کی۔ انہوں نے یہ رقم لینے سے انکار کر دیا اور فرمایا ہم جو چیز دیتے ہیں وہ واپس نہیں لیتے۔

حضرت قیس رضی اللہ عنہ کے والدِ گرامی حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ خلافتِ صدیقی کی ابتداء میں شام چلے گئے تھے۔ روانہ ہونے سے پہلے وہ اپنی تمام جائیداد اولاد پر تقسیم کر گئے تھے۔ ایک لڑکا ان کی وفات کے بعد پیدا ہوا اس کا حصّہ انہوں نے نہیں لگایا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت قیس رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا کہ سعد رضی اللہ عنہ نے جائیداد کی جو تقسیم کی تھی اس کو منسوخ کر کے جائیداد کو از سرِ نو تقسیم کیا جائے۔ حضرت قیس رضی اللہ عنہ نے کہا، والد نے جو تقسیم کی ہے وہ برقرار رہے گی، البتہ میں اپنے حصّے سے دست بردار ہوتا ہوں وہ نومولود کو دے دیا جائے۔

ان کی سخاوت اور استغناء کے اور بھی بہت سے واقعات کتبِ سیَر میں ملتے ہیں۔ عبادت سے شغف کا یہ عالم تھا کہ وقت کا بیشتر حصہ ذِکرِ الٰہی میں گزارتے تھے۔ سیّدنا حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت کے بعد عبادت میں انہماک اور بھی بڑھ گیا تھا۔ فرائض کے علاوہ نوافل بھی پابندی سے ادا کرتے تھے۔ نفلی روزے کثرت سے رکھتے تھے۔ مُسندِ احمد حنبل میں ہے کہ یومِ عاشورہ کے روزے کو انہوں نے اپنا معمول بنا لیا تھا۔

تدبیر و حکمت میں ان کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جو عرب بھر میں انتخاب تھے۔ ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ اس معاملہ میں وہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن بدیل رضی اللہ عنہ کی ٹکر کے آدمی تھے۔ اپنی دانائی، فیّاضی اور دوسرے اوصافِ حمیدہ کی بدولت بنو ساعدہ میں نہایت ہر دلعزیز تھے اور انصار کے دوسرے خاندان بھی ان کی بہت عزت کرتے تھے۔

سرکارِ دو عالم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کو اپنے لیے مشعلِ راہ جانتے تھے۔ ایک مرتبہ قادسیہ میں حضرت سہل بن حُنَیف رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیٹھے تھے کہ ایک جنازہ گزرا، حضرت قیس رضی اللہ عنہ کھڑے ہوگئے۔ لوگوں کھڑے ہو گئے۔ لوگوں نے کہا کہ آپ ناحق کھڑے ہوئے یہ تو ایک غیر مسلم (ذمی) کا جنازہ تھا۔ فرمایا، رسول اللہ ﷺ بھی ایک یہودی کا

جنازہ دیکھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ جب آپ ﷺ کو بتایا گیا تھا کہ یہ یہودی کا جنازہ ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا تھا، کیا حرج ہے، آخر وہ بھی تو ایک جان ہے۔

شجاعت و بسالت کے بارے میں اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ عہدِ رسالت ﷺ میں بھی اور اس کے بعد بھی متعدد محاربات میں حصہ لیا اور ہر ایک محاربہ میں مردانہ وار لڑے۔ غرض حضرت قیس رضی اللہ عنہ کی زندگی کے کسی پہلو کو دیکھیں وہ مطلعِ انوار نظر آئے گا۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ
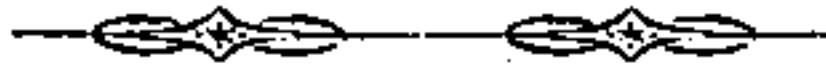
حضرت سعد بن خیثمہ انصاری رضی اللہ عنہ

رحمتِ دوعالم ﷺ غزوۂ بدر کے لیے مدینہ منورہ سے چلنے لگے تو مدینہ کے ایک گھر میں چشمِ فلک نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ حق کے پرستار ایک بوڑھے باپ اور ایک جوان بیٹے کے درمیان تکرار ہو رہی تھی۔ باپ بیٹے سے کہہ رہے تھے "بیٹا، گھر میں ہم دونوں کے سوا کوئی مرد نہیں اس لیے مناسب یہی ہے کہ ہم دونوں میں سے ایک یہیں رہے اور دوسرا جہاد میں شریک ہو، تم جوان ہو اور گھر کی دیکھ بھال بہتر طور پر کر سکتے ہو۔ اس لیے تم یہاں رہو اور مجھے رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ جانے دو۔" اس کے جواب میں سعادتمند فرزند والدِ گرامی سے کہہ رہے تھے "ابا جان! اگر جنت کے علاوہ کوئی اور معاملہ ہوتا تو مجھے گھر پر رہنے میں کوئی عذر نہ تھا، مجھے اللہ نے اتنی قدرت دی ہے کہ حضور ﷺ کی ہمرکابی کا حق ادا کر سکوں۔ اس لیے آپ یہاں رہئے اور مجھے جہاد پر جانے کی اجازت دیجئے شاید اللہ تعالیٰ مجھے شہادت کا شرف بخشے۔"

بڑی ردّ وقدح کے بعد باپ نے فیصلہ دیا کہ قرعہ ڈالتے ہیں جس کا نام آئے وہ لڑائی پر جائے اور دوسرا گھر پر رہے۔ بیٹے نے باپ کے حکم کے سامنے سرخم کر دیا۔ قرعہ ڈالا گیا تو بیٹے کا نام نکلا۔ ان کو اس قدر مسرت ہوئی کہ قدم زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ جذبہ شہادت سے سرشار اس فرزندِ صلح کا نام سعد رضی اللہ عنہ تھا اور والدِ بزرگوار کا نام خیثمہ رضی اللہ عنہ تھا۔

حضرت سعد بن خیثمہ رضی اللہ عنہ کا تعلق اوس کے خاندان عمرو بن عوف سے تھا۔ سلسلہ نسب یہ ہے:

سعد بن خیثمہ رضی اللہ عنہ بن حارث بن مالک بن کعب بن نحاط بن کعب بن

حارثہ بن غنم بن سلم بن امراء القیس بن مالک بن اوس۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے فطرتِ سعید سے نوازا تھا۔ ہجرتِ نبوی ﷺ سے کچھ عرصہ پہلے جونہی ان تک دعوتِ توحید پہنچی۔ انہوں نے بلا تامّل اس پر لبیک کہا۔ ۱۳ھ بعدِ بعثت میں ان پچھتر جوانمردوں میں شامل ہو کر مکہ گئے جنہوں نے بیعتِ عقبہ کبیرہ کی سعادت حاصل کی اور رحمتِ عالم ﷺ کو یثرب تشریف لانے کی دعوت دی۔ حضور ﷺ نے اس موقع پر حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو قبیلہ عمرو بن عوف کا نقیب مقرر فرمایا۔ ان کے والد بھی اسی زمانے میں شرفِ اسلام سے بہرہ یاب ہوئے۔ ہجرت کے بعد سرورِ عالم ﷺ نے قُباء میں نزولِ اجلال فرمایا تو قبیلہ عمرو بن عوف ہی کے ایک بزرگ حضرت کلثوم بن الہدم رضی اللہ عنہ کو چند دن آپ ﷺ کا میزبان بننے کا شرف حاصل ہوا۔ اس دوران میں جو لوگ حضور ﷺ سے ملاقات کے لیے آتے آپ ﷺ ان سے حضرت سعد بن خیثمہ رضی اللہ عنہ کے مکان میں ملتے تھے۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نہایت نیک سرشت تھے، اس لیے ان کو سعد الخیر کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ انہیں سَرورِ عالم ﷺ سے والہانہ عقیدت و محبت تھی۔ غزوۂ بدر کے موقع پر جب قرعہ فال ان کے نام پڑا تو نہایت ذوق و شوق سے حضور ﷺ کی ہمرکابی میں بدر پہنچے اور کفار کے خلاف بڑی بے جگری سے لڑے۔ ہنگامہ کارزار میں دشمن کا ایک سوار ان پر حملہ آور ہوا۔ وہ اگرچہ پیدل تھے لیکن نہایت پامردی سے حملہ آور سے نبرد آزما ہوئے۔ حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ ان کی مدد کے لیے بڑھے لیکن اس اثناء میں دشمن سوار کا وار کارگر ہو چکا تھا اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ جامِ شہادت پی کر ابدی زندگی حاصل کر چکے تھے۔ بعض روایتوں میں ان کے قاتل کا نام طعیمہ بن عدی اور بعض میں عمرو بن عبدوِدّ آیا ہے۔ اولاد کے بارے میں اختلاف ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ شہادت کے وقت ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اور بقولِ بعض انہوں نے عبداللہ نامی ایک کمسن فرزند اپنے پیچھے چھوڑا۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

حضرت زید بن دِثنہ انصاری رضی اللہ عنہ

قبیلہ خزرج کے خاندانِ بیاضہ سے تھے۔ نسب نامہ یہ ہے:

زید بن دِثنہ رضی اللہ عنہ بن معاویہ بن عبید بن عامر بن بیاضہ بن عامر بن زریق بن عبد حارثہ بن مالک بن جشم بن خزرج۔

اہلِ سِیَر نے ان کے قبولِ اسلام کے زمانے کی تصریح نہیں کی لیکن اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ اصحابِ بدر میں سے ایک تھے۔ گویا انہوں نے ہجرتِ نبوی سے پہلے یا فوراً بعد اسلام قبول کر لیا تھا۔ بدر کے بعد انہوں نے غزوۂ اُحُد، میں سرورِ کونین ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔

غزوۂ اُحُد کے کچھ عرصہ بعد قبیلہ عضل و قارہ کے چند آدمی سرورِ عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ سے درخواست کی کہ اپنے اصحاب میں سے کچھ ہمارے ساتھ روانہ فرمائیں جو ہمیں دین کی تعلیم دے سکیں۔ حضور ﷺ نے ان کی درخواست پر باختلافِ روایت چھ، سات یا دس صحابہ پر مشتمل ایک جماعت ان لوگوں کے ساتھ کر دی۔ اس جماعت میں حضرت زید بن دِثنہ رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ جب یہ جماعت رجیع کے مقام پر پہنچی تو عضل و قارہ کے لوگوں نے غداری کی اور سو تیر اندازوں کو اس جماعت پر چڑھا لائے۔ مسلمانوں نے ان غداروں کا مردانہ وار مقابلہ کیا لیکن حضرت خبیب بن عدی رضی اللہ عنہ اور زید بن دِثنہ رضی اللہ عنہ کے سوا سب شہید ہو گئے۔ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ اور زید رضی اللہ عنہ کو مشرکین نے اسیر کر لیا اور مکہ لا کر قریش کے پاس فروخت کر دیا۔ حضرت زید بن دِثنہ رضی اللہ عنہ کو اُمیہ بن خلف مقتولِ بدر کے بیٹے صفوان نے اپنے باپ

کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے پچاس اونٹوں کے عوض خریدا۔ چونکہ یہ واقعہ شہرِ حُرم (حرمت کے مہینوں) میں پیش آیا تھا اس لیے صفوان نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کو اپنے غلام نسطاس کے سپرد کر دیا کہ اشہرِ حُرم گزرنے تک اس کو اپنی حراست میں رکھو۔ حراست کے دوران میں حضرت زید رضی اللہ عنہ رات بھی عبادت میں مصروف رہتے اور دن کو روزہ رکھتے تھے۔ جو چیزیں انہیں کھانے کے لیے دی جاتیں ان میں سے گوشت نہ کھاتے تھے اور صرف دودھ پی لیتے تھے۔

صفوان نے ایک دن ان سے پوچھا کہ تم گوشت کیوں نہیں کھاتے تو فرمایا کہ جو جانور اللہ کے نام کے سوا کسی دوسرے کے نام پر ذبح کیا جاتا ہے میں اس کا گوشت حرام سمجھتا ہوں۔

اشہرِ حُرم گزر گئے تو کفارِ مکہ نے حضرت خبیب رضی اللہ عنہ اور حضرت زید رضی اللہ عنہ دونوں کو سولی پر لٹکانے کا اہتمام کیا۔ چنانچہ وہ ان مردانِ حق کو تنعیم کے مقام پر لے گئے جہاں انہوں نے دو سولیاں گاڑ رکھی تھیں۔ جب وہاں دونوں مظلوموں میں باہم ملاقات ہوئی تو وہ ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے اور ایک نے دوسرے کو مصیبت پر صبر کرنے کی وصیت کی۔ پھر کفّار نے دونوں کو الگ کر دیا۔ جب حضرت زید رضی اللہ عنہ کو سولی پر چڑھانے لگے تو ابوسفیان نے ان سے مخاطب ہو کر کہا۔

> ''اے زید تجھ کو خدا کی قسم سچ سچ بتانا، کیا تم یہ پسند کرو گے کہ تمہاری جگہ محمد (ﷺ) کی گردن ماری جائے۔ اور تم اپنے اہل وعیال میں خوش وخرم رہو۔''

اس مردِ حق آگاہ نے جو ایمان افروز جواب دیا، تاریخ نے اسے اپنے صفحات میں محفوظ کر لیا ہے۔ فرمایا: ''خدا کی قسم مجھے تو یہ بھی گوارا نہیں کہ محمد ﷺ کے پائے اقدس میں کانٹا چبھے اور میں اپنے گھر آرام سے بیٹھا رہوں۔''

مشرکین حیران رہ گئے اور ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''محمد ﷺ

کے ساتھی جس قدر محبت ان سے کرتے ہیں دنیا میں اور کسی شخص کے ایسے شیدائی نہیں ہیں۔''

اس کے بعد ظالموں نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کو سولی پر چڑھا دیا اور ان کے جسم اطہر کو تیروں کی انیوں سے چھید ڈالا۔ اس طرح وہ مردِ وفا کیش زبانِ حال سے یہ کہتا ہوا اپنے مولائے حقیقی سے جاملا۔

بجرمِ عشقِ توام میکشند دغوغا ائیست
تو نیز بر سرِ بام آچہ خوش تماشائیست
رضی اللہ تعالیٰ عنہ
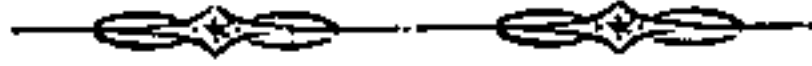
حضرت کعب بن عُجرہ بلوی رضی اللہ عنہ

(۱)

ہجرتِ نبوی کے چند سال بعد کا ذکر ہے کہ ایک دن ایک صاحبِ رسول رضی اللہ عنہ بارگاہِ رسالت ﷺ میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے سرورِ عالم ﷺ کے روئے انور پر نظر ڈالی تو اسے (بھوک کی وجہ سے) متغیر پایا۔ یہ خیال کر کے کہ معلوم نہیں حضور ﷺ کو کب سے فاقہ ہے، بے چین ہو گئے لیکن خود بھی نادار آدمی تھے گھر میں کوئی چیز نہ تھی کہ لا کر حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کرتے پھر بھی انہیں یہ گوارا نہ تھا کہ حضور ﷺ بھوکے رہیں۔ اسی وقت کوئی چیز تلاش کرنے اٹھے۔ راستے میں ایک یہودی ملا جو اپنے اونٹ کو پانی پلانا چاہتا تھا انہوں نے اسے پیشکش کی کہ وہ کنوئیں سے پانی کھینچ دیں گے اور فی ڈول اس سے ایک چھوہارہ لیں گے۔ اس نے منظور کر لیا چنانچہ انہوں نے کئی ڈول پانی کے نکالے جب کچھ چھوہارے جمع ہو گئے تو دوڑتے ہوئے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ چھوہارے پیش کیے۔ حضور ﷺ بہت خوش ہوئے اور یہ چھوہارے کھا کر ان کے لیے دُعائے خیر کی۔ یہ صاحبِ رسول جن کو حضور ﷺ سے اس قدر عقیدت اور محبت تھی کہ باوجود اپنی ناداری اور عسرت کے آپ ﷺ کو بھوکا دیکھنا گوارا نہ تھا، حضرت کعب بن عُجرہ رضی اللہ عنہ تھے۔

(۲)

حضرت ابو محمد کعب بن عُجرہ رضی اللہ عنہ کا تعلق قبیلہ بَلّی (قضاعہ) سے تھا اور انصار کے حلیف تھے۔ نسب نامہ یہ ہے:

کعب رضی اللہ عنہ بن عُجرہ بن امیّہ بن عدی بن عبید بن خالد بن عمرو بن عوف بن

غنم بن سواد بن مری بن اراشہ بن عامر بن عبیلہ بن قسیل بن فرّان بن بلّی بن عمرو بن حارث بن قضاعہ۔

حضرت کعب رضی اللہ عنہ کو ہجرتِ نبوی کی بعد قبولِ اسلام کا شرف حاصل ہوا۔ اس کے بعد عہدِ رسالت کے اکثر غزوات میں بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ شریک ہوئے اور ہر معرکے میں سر بکف ہو کر لڑے۔ ابنِ سعد رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ ایک غزوے میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے ان کا ایک ہاتھ شہید ہو گیا تھا۔

صحیحین میں حضرت کعب بن عُجرہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ میرے قریب سے گزرے جب کہ میں حدیبیہ میں تھا اور مکہ میں داخل نہ ہوا تھا۔ اس وقت میں احرام کی حالت میں تھا اور ہانڈی کے نیچے آگ جلا رہا تھا۔ جوئیں جھڑ جھڑ کر میرے چہرے پر گر رہی تھیں۔ حضور ﷺ نے مجھ سے پوچھا، کیا جوئیں تجھ کو تکلیف دیتی ہیں۔ میں نے کہا، ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا، ''اپنا سر منڈوا ڈال اور ایک فرق کھانا چھ مسکینوں کو کھلا دے (فرق تین صاع کا ہوتا ہے) یا تین روزے رکھ لے یا ایک جانور ذبح کرنے کے قابل ذبح کر دے۔''

حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کے ارشاد کی تعمیل میں اپنا سر منڈوا دیا، اس کے فدیہ میں انہوں نے کیا صورت اختیار کی۔ صحیحین میں اس کی وضاحت نہیں کی گئی۔

مسندِ احمد رحمۃ اللہ علیہ میں روایت ہے کہ ایک دن سرورِ عالم ﷺ نے خطبہ دیا جس میں مسلمانوں کی آئندہ خانہ جنگی کا ذکر فرمایا۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ بھی سامعین میں موجود تھے وہ حضور ﷺ کے خطبہ سے بہت متاثر ہوئے اور یوں محسوس کیا کہ خانہ جنگی کا بھیانک دور گویا ان کے سامنے آ گیا ہے اتنے میں کوئی صاحب چادر اوڑھے وہاں آ گئے۔ حضور ﷺ نے ان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا، اس روز یہ شخص حق پر ہوگا۔ کعب رضی اللہ عنہ یہ سُن کر فوراً اٹھے اور ان صاحب کا بازو پکڑ کر کہا، ''یا رسول اللہ! یہ شخص؟''

حضور ﷺ نے فرمایا، ہاں...... اب حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے ان کے چہرے پر نظر

ڈالی تو وہ حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ تھے۔

(۳)

سرورِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد حضرت کعب بن عُجرہ رضی اللہ عنہ مدینہ منورّہ ہی میں مقیم رہے۔ جب عہدِ فاروقی میں کوفہ آباد ہوا تو وہ کوفہ چلے گئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ کاتبِ تقدیر نے ان کی وفات دیارِ حبیب ﷺ میں لکھ رکھی تھی۔ ۵۱ھ ہجری میں مدینہ آئے اور یہیں پیکِ اجل کو لبیک کہا۔ اپنے پیچھے چار بیٹے چھوڑے، اسحاق، محمد، ربیع اور عبدالملک۔

حضرت کعب ؓ بن عُجرہ کا شمار فضلاءِ صحابہ میں ہوتا ہے۔ ان سے ۴۷ احادیث مروی ہیں۔ راویوں میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما، طارق بن شہاب رحمۃ اللہ علیہ، عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ رحمۃ اللہ علیہ، ابنِ سیرین رحمۃ اللہ علیہ اور محمد بن کعب قرظی رحمۃ اللہ علیہ جیسے جلیل القدر اصحاب شامل ہیں۔

حضرت کعب بن عُجرہ رضی اللہ عنہ سے مروی متعدد احادیث عبادات و اخلاق سے متعلق ہیں ان میں سے کچھ یہ ہیں:

(۱) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ چند الفاظ ہیں جن کو ہر فرض نماز کے بعد کہنے والا ثواب سے مایوس اور نا اُمید نہیں ہوتا یعنی ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ، ۳۳ مرتبہ الحمدللہ اور ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر کہنا۔

(۲) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جب تم میں سے کوئی وضو کرے تو اچھی طرح کرے پھر نماز کا ارادہ کرکے مسجد کی طرف جائے اور نماز میں انگلیوں کے درمیان انگلیاں ڈال کر نہ کھیلے تو وہ شروع سے آخرت تک نماز ہی میں سمجھا جائے گا۔

(۳) ایک مرتبہ نبی ﷺ بنو عبدالاشہل کی مسجد میں تشریف لائے اور وہاں مغرب کی نماز پڑھی۔ جب لوگ مغرب کی نماز پڑھ چکے تو حضور ﷺ نے دیکھا کہ وہ نفل پڑھ رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا یہ نماز (یعنی نفل) گھروں میں پڑھنے کی ہے۔

(۴) ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ گھر سے نکل کر ہمارے پاس تشریف لائے۔ ہم نے عرض کیا۔ یارسول اللہ آپ پر سلام بھیجنا تو ہم جان گئے آپ پر درود کس طرح بھیجا کریں۔ آپ ﷺ نے فرمایا اس طرح کہا کرو **اللھم صل علٰی محمد و علٰی اٰل محمد کما صلیت علٰی ابراھیم و علٰی اٰل ابراھیم انك حمید مجید اللھم بارك علٰی محمد و علٰی اٰل محمد کما بارکت علٰی ابراھیم وعلٰی اٰل ابراھیم انك حمید مجید** ۔(صحیحین)

(۵) ایک دن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سب لوگ منبر کے پاس آ جاؤ۔ چنانچہ ہم سب حاضر ہو گئے۔ جب آپ ﷺ نے منبر کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تو فرمایا آمین۔ پھر جب دوسری سیڑھی پر چڑھے تو فرمایا آمین۔ اس کے بعد تیسرے درجے پر چڑھے تو فرمایا آمین۔ جب آپ منبر سے اترے تو ہم نے عرض کیا، یارسول اللہ! ہم نے آج آپ ﷺ سے ایسی بات سنی ہے جس کو ہم نہیں سنا کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ (جب میں نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تو) جبریل علیہ السلام میرے سامنے آئے اور کہا، وہ شخص برباد ہوا جس نے رمضان کا مہینہ پایا اور اس کی مغفرت نہ کی گئی۔ میں نے کہا، آمین۔ جب میں نے دوسری سیڑھی پر قدم رکھا تو جبریل علیہ السلام نے کہا، ہلاک ہو وہ شخص کہ جس کے پاس آپ کا ذکر کیا جائے اور وہ آپ پر درود نہ بھیجے۔ میں نے کہا، آمین۔ جب میں تیسرے درجہ پر چڑھا تو جبریل علیہ السلام نے کہا، تباہ ہو جائے وہ شخص جس نے بڑھاپے کی حالت میں اپنے ماں باپ کو یا ان میں سے ایک کو پایا اور وہ ماں باپ اس کو جنت میں نہ داخل کرا سکے۔ میں نے کہا۔ آمین۔ (حاکم رحمۃ اللہ علیہ۔ ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ و طبرانی رحمۃ اللہ علیہ)

(۶) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اپنی باندیوں کو برتن توڑ دینے پر مارا پیٹا نہ کرو اس لیے کہ برتنوں کی عمریں بھی مقرر ہیں تمہاری عمروں کی طرح۔

(مسند الفردوس للدیلمی رحمۃ اللہ علیہ)

رضی اللہ تعالٰی عنہ

حضرت سعد بن حبتہ بجلی رضی اللہ عنہ

غزوۂ احزاب (۵ھ) مسلمانوں کے لیے بہت بڑا امتحان تھا لیکن ان کا ہر مرد، عورت، بوڑھا، جوان اور بچہ اس امتحان میں پورا اترا اور اپنی عزیمت واستقامت اور صبر واستقامت اور صبر واستقلال کے ایسے نقوش صفحہ تاریخ پر ثبت کیے جو ابد الآباد تک فرزندانِ توحید کے لیے مشعلِ راہ بنے رہیں گے۔ اسی غزوۂ میں پندرہ برس کی عمر کے ایک نوجوان اس جوش اور جذبے کے ساتھ لڑے کہ لوگ دنگ رہ گئے۔ سرورِ عالم ﷺ نے بھی ان کی شجاعت اور جذبہ فدویت کی تحسین فرمائی اور پاس بلا کر پوچھا، تمہارا نام کیا ہے؟ انہوں نے اپنا نام بتایا تو حضور ﷺ نے فرمایا ''اللہ تمہیں خوش نصیب کرے۔'' پھر نہایت شفقت سے ان کے سر پر اپنا دستِ مبارک پھیرا۔

رحمتِ دوعالم ﷺ سے خوش نصیبی کی دعا لینے والے یہ سعادت مند نوجوان حضرت سعد بن حبتہ رضی اللہ عنہ تھے۔ (ابنِ اثیر)

حضرت سعد رضی اللہ عنہ جو ابنِ حبتہ کے نام سے مشہور ہیں، قبیلہ بجیلہ سے تھے اور بنی عمرو بن عوف کے حلیف تھے۔ نسب نامہ یہ ہے:

سعد رضی اللہ عنہ بن بجیر بن معاویہ بن نفیل بن سدوس بن عبد مناف بن ابی اسامہ بن لحمہ بن سعد بن عبداللہ بن قذاذ بن معاویہ بن زید بن غوث بن انمار بن اراش۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے والد بجیر نے اسلام کا زمانہ نہیں پایا البتہ ان کی والدہ حبتہ رضی اللہ عنہا بنتِ مالک اسلام لائیں اور شرفِ صحابیت سے بہرہ ور ہوئیں۔ وہ اوس کے

خاندان عمرو بن عوف سے تھیں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ انہی کے نام کی نسبت سے ابن حبتہ رضی اللہ عنہ مشہور ہوئے۔ جس زمانے میں ان کی والدہ نے اسلام قبول کیا وہ کمسن تھے تاہم ماں کے ساتھ ہی شرفِ ایمان سے بہرہ ور ہوگئے۔

حافظ ابنِ عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ ابن حبتہ رضی اللہ عنہ بدر اور اُحد میں کم عمری کی بناء پر شریک نہ ہوسکے۔ غزوۂ خندق میں ان کی عمر پندرہ برس کی ہوگئی تھی اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑائی میں شریک ہونے کی اجازت دے دی۔ خندق کے بعد وہ دوسرے غزوات و مشاہد میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب رہے۔

ابنِ حبتہ رضی اللہ عنہ ایک بہادر سپاہی اور نہایت اچھے شہسوار تھے۔

حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ''اِصابہ'' میں لکھا ہے کہ ۶ھ میں صلح حدیبیہ کے بعد عیینہ بن حصن فزاری نے مدینہ سے چند میل دور ایک چراگاہ (غابہ) پر چھاپہ مارا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنیوں کو ہانک کر لے چلا۔ اتفاق سے مشہور صحابی حضرت سلمہ بن الاکوع رضی اللہ عنہ اور ایک دوسرے صاحب رسول ادھر آنکلے۔ حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ نے پہلے تو اپنے ساتھی کو اس واقعہ کی خبر دے کر مدینہ روانہ کیا اور پھر ایک ٹیلے پر چڑھ کر یا صباحاہ (اے صبح کی مصیبت) کا نعرہ لگایا اس کے بعد اکیلے ہی فزاری غارت گروں کے مقابلے پر ڈٹ گئے۔ عرب ''یا صباحاہ'' کا نعرہ اس وقت لگایا کرتے تھے جب وہ کسی مصیبت میں پھنس جائیں اور مدد چاہتے ہوں۔

حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ کے نعرے کی آواز سب سے پہلے بنو عمرو بن عوف کے محلے میں پہنچی۔ وہاں سے حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ اور ابنِ حبتہ رضی اللہ عنہ گھوڑوں پر سوار ہو کر آناً فاناً حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ کی مدد کو پہنچ گئے اور لٹیروں کو اپنے نیزوں پر رکھ لیا۔ اسی اثناء میں کچھ اور سوار بھی پہنچ گئے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے روانہ کیے تھے۔ ان جوانمردوں نے لٹیروں کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ نے ان کا دور تک تعاقب کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اونٹ واپس لے آئے۔

سرورِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد حضرت سعد بن حبتہ رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ ہی میں مقیم رہے البتہ جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں کوفہ آباد ہوا تو انہوں نے کوفہ میں بود و باش اختیار کر لی اور وہیں چند سال بعد سفرِ آخرت اختیار کیا۔ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور اسلام کے اس گوہرِ تابدار کو سرزمینِ کوفہ میں سپردِ خاک کر دیا۔

حضرت سعد بن حبتہ رضی اللہ عنہ نے اپنے پیچھے چار اولادیں چھوڑیں۔ تین لڑکے اور ایک لڑکی۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے جلیل القدر شاگرد حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ، حضرت سعد بن حبتہ رضی اللہ عنہ ہی کی اولاد سے تھے۔

حضرت سعد بن حبتہ رضی اللہ عنہ سے مروی چند احادیث بھی کتابوں میں موجود ہیں۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ
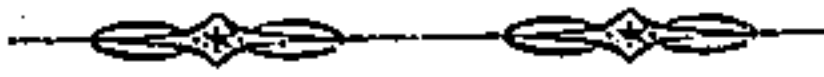
حضرت عویم بن ساعدہ انصاری رضی اللہ عنہ

(۱)

ہجرتِ نبوی ﷺ کے بعد کے زمانے کا ذکر ہے کہ ایک دن رحمتِ عالم ﷺ اپنے چند جاں نثاروں کے حلقے میں رونق افروز تھے اور انہیں اپنے ارشاداتِ مقدسہ سے مستفیض فرما رہے تھے۔ حضور ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اجازت دے رکھی تھی کہ کسی مسئلے میں ان کو کوئی اشکال پیش آئے، تو بلا جھجک اس کے بارے میں آپ سے استفسار کرسکتے ہیں۔ اسی مجلس میں ایک صاحب نے مسجدِ قباء کے بارے میں نازل ہونے والی (سورۂ توبہ کی) یہ آیت پڑھی:

(ترجمہ) ''اس میں وہ لوگ ہیں جن کو طہارت بہت مرغوب ہے اور اللہ بھی ایسے پاک رہنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔''

اور پھر حضور ﷺ سے پوچھا: ''یا رسول اللہ! اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ کون ہیں؟''

ارشاد ہوا: ''ان میں ایک مردِ صالح عویم بن ساعدہ رضی اللہ عنہ بھی ہے۔''

(۲)

سیّدنا ابوعبدالرحمٰن عویم بن ساعدہ رضی اللہ عنہ جن کے محبوبِ الٰہی ہونے کی خود سیّد المرسلین ﷺ نے شہادت دی، انصار کے السابقون الاوّلون میں سے ہیں اور کبار صحابہ رضی اللہ عنہم میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا تعلق قبیلہ اوس کی شاخ عمرو بن عوف سے تھا۔ نسب نامہ یہ ہے:

عویم بن ساعدہ رضی اللہ عنہ بن عائش بن قیس بن نعمان بن زید بن مالک بن عوف

بن عمرو بن عوف بن مالک بن اوس۔

خاندانِ عمرو بن عوف قباء میں آباد تھا۔ اس خاندان کو یہ عظیم سعادت نصیب ہوئی کہ اس کے بیشتر افراد ہجرتِ نبوی ﷺ سے پہلے ہی نعمتِ اسلام سے بہرہ یاب ہو گئے۔ ان میں حضرت عویم بن ساعدہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ یہ ۱۳ بعدِ بعثت سے پہلے کا واقعہ ہے۔ ۱۳ بعدِ بعثت کے موسمِ حج میں مدینہ منورّہ کے پچھتر اہلِ ایمان مکہ گئے اور رحمتِ عالم ﷺ کی بیعت کا شرف حاصل کیا۔ یہ عہد آفریں بیعت تاریخ میں ''بیعت عقبہ کبیرہ'' ''بیعت لیلۃ العقبہ'' اور ''بیعت عقبہ ثانیہ'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں مدینے کے ان پچھتر جواں مردوں نے مکّے کے دُرِ یتیم ﷺ کو مدینہ آنے کی دعوت دی اور آپ سے یہ مقدّس پیمانِ وفا باندھا کہ ہم آپ ﷺ کی اپنی جانوں مالوں اور اولادوں کے ساتھ اعانت اور حفاظت کریں گے اور ایسا کرنے میں خواہ ہمیں سارے عرب سے جنگ مول لینی پڑے، ہم مطلق پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ حضرت عویم بن ساعدہ رضی اللہ عنہ بھی ان مردانِ حق میں سے ایک تھے۔

سرورِ عالم ﷺ نے پہلے قباء اور پھر مدینہ منورّہ میں نزولِ اجلال فرمایا، تو حضرت عویم رضی اللہ عنہ بھی دوسرے انصار کے ساتھ حضور ﷺ کا استقبال کرنے میں پیش پیش تھے۔ چند ماہ بعد حضور ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے مابین مواخاۃ قائم فرمائی، تو حضرت عویم بن ساعدہ رضی اللہ عنہ کو حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کا دینی بھائی بنایا۔

غزواتِ نبوی ﷺ کا آغاز ہوا، تو بدر سے لے کر تبوک تک کوئی غزوہ ایسا نہیں تھا جس میں حضرت عویم بن ساعدہ رضی اللہ عنہ نے سرورِ عالم ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل نہ کیا ہو۔ فی الحقیقت اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ سے ان کی محبت، عشق کے درجے تک پہنچی ہوئی تھی اور وہ راہِ حق میں ہر وقت اپنی جان کی بازی لگانے کو تیار رہتے تھے۔ حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: رسول اللہ ﷺ نے جب کوئی نشان کھڑا کیا، عویم بن ساعدہ رضی اللہ عنہ ہمیشہ اس کے سائے میں رہے۔

حب رسول ﷺ اور شوقِ جہاد کے علاوہ حضرت عویم رضی اللہ عنہ کی جس خصوصیت نے انہیں بارگاہِ احدیت اور بارگاہِ رسالت میں درجہ محبوبیت عطا کر دیا تھا، وہ ان کی انتہا درجے کی نظافت پسندی تھی، ہر وقت پاک صاف رہتے تھے اور طہارت و نظافت کو نہایت مرغوب رکھتے تھے۔ایک رویت میں ہے کہ وہ مسلمانوں میں سب سے پہلے آدمی ہیں جنہوں نے استنجا میں پانی استعمال کیا۔ان کو دیکھ کر دوسرے مسلمان بھی ان کی تقلید کرنے لگے۔بارگاہِ الٰہی میں ان کے اس طرزِ عمل کو درجہ قبول حاصل ہوا اور اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں ان کو اپنی خوشنودی کی بشارت دی۔اس موقع پر سرورِ عالم ﷺ نے حضرت عویم بن ساعدہ رضی اللہ عنہ اور ان جیسے دوسرے نظافت پسند اصحاب سے پوچھا:

''تم لوگ طہارت کے لیے کیا طریقہ اختیار کرتے ہو کہ اللہ جل شانہ، نے تمہاری تعریف کی ہے؟''

انہوں نے عرض کیا:''یا رسول اللہ، ہمارا معمول ہے کہ ہم جنابت سے غسل کرتے ہیں اور پانی سے استنجا کرتے ہیں۔''

حضور ﷺ نے فرمایا:''یہ نہایت اچھا طرزِ عمل ہے اور ہر ایک کو اس کی پابندی کرنی چاہیے۔''

ایک اور موقع پر کسی نے حضور ﷺ سے پوچھا وہ کون لوگ ہیں جن کی نظافت اور طہارت پسندی کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے ان کی مدح فرمائی ہے،تو آپ ﷺ نے جواب میں حضرت عویم بن ساعدہ رضی اللہ عنہ کا نام خصوصیت سے لیا۔اس سے حضرت عویم رضی اللہ عنہ کی جلالتِ قدر کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

(۳)

سنہ ۱۱ ہجری میں سرورِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوئے۔ان میں سے بیشتر کی رائے یہ تھی کہ سیّد الخزرج حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا جائے۔مہاجرین کو خبر ہوئی،تو وہ مجتمع ہوئے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ،

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور چند دوسرے حضرات کو ساتھ لے کر سقیفہ بنی ساعدہ کی طرف روانہ ہوئے۔ صحیح بخاری میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اثنائے راہ میں ہمیں انصار کے دو نیک آدمی ملے۔ انہوں نے انصار کے اجتماع عام اور ان کے ارادے سے ہمیں آگاہ کی اور پھر پوچھا: ''آپ لوگوں کا کہاں کا ارادہ ہے؟'' میں نے کہا، ہم اپنے انصاری بھائیوں کے پاس سقیفہ جا رہے ہیں۔ انہوں نے کہا، وہاں جا کر آپ کیا کریں گے؟ خلافت کے بارے میں آپ خود فیصلہ کر لیں۔ میں نے کہا، نہیں، ہم وہاں ضرور جائیں گے۔

مہاجرین کے سقیفہ بنی ساعدہ پہنچتے ہی فضا بدل گئی اور تھوڑی دیر کی بحث و تمحیص کے بعد جمہور مسلمان حضرت ابو بکر صِدّیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر مجتمع ہو گئے۔ امام زہری رحمۃ اللہ علیہ اور بعض دوسرے محدثین نے لکھا ہے کہ وہ دو آدمی جو مہاجرین کی سقیفہ بنی ساعدہ کے راستے میں ملے تھے، حضرت عویم بن ساعدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت معن بن معدی رضی اللہ عنہ تھے، وہ انصار سے تعلق رکھنے کے باوجود خلافت کے معاملے میں مہاجرین کو انصار پر ترجیح دیتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ وہ انصار کے اجتماع عام سے الگ ہو کر کسی اور طرف جا رہے تھے۔ یہ واقعہ حضرت عویم بن ساعدہ رضی اللہ عنہ کی اصابتِ رائے اور دُور اندیشی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

فتنہ ردّہ کے پُر آشوب زمانے میں حضرت عویم بن ساعدہ رضی اللہ عنہ خلیفہ الرسول حضرت ابو بکر صِدّیق رضی اللہ عنہ کے دست و بازو ثابت ہوئے اور دوسرے انصار کے ساتھ مل کر مدینہ منوّرہ کی حفاظت کا فرض انجام دیا۔ اسلام کے اس رجلِ عظیم نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں سفرِ آخرت اختیار کیا۔ اس وقت وہ پینسٹھ برس کے پیٹے میں تھے۔ امیر المومنین رضی اللہ عنہ جنازے میں شریک تھے اور فرماتے جاتے تھے:

''اس وقت دنیا میں کوئی شخص بھی (بعض خصوصیات کے لحاظ سے) ان سے بہتر ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔''

حضرت عویم رضی اللہ عنہ نے اپنے دو بچے چھوڑے، عتبہ اور عبیدہ۔ ان سے ایک حدیث بھی مروی ہے۔

حضرت عویم بن ساعدہ رضی اللہ عنہ کو کتابِ سیرت میں سبقت فی الاسلام، شوقِ جہاد، حُبِّ رسول، طہارت پسندی، اصابتِ رائے اور سلامتی طبع سب سے نمایاں ابواب ہین۔ ایک روایت میں ہے کہ رحمتِ عالم فخرِ موجودات سرورِ کائنات ﷺ نے ایک مرتبہ ان کے بارے میں فرمایا: نعم العبد من عباد الله الرجل الصالح (وہ اللہ کا بہت نیک بندہ اور پرہیز گار شخص ہے) حضرت عویم بن ساعدہ رضی اللہ عنہ کی عظمت کی اس سے بڑے دلیل کیا ہوسکتی ہے کہ خود لسانِ رسالت سے انہیں ''نعم العبد'' اور ''رجلِ صالح'' کے خطابات مرحمت ہوئے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ
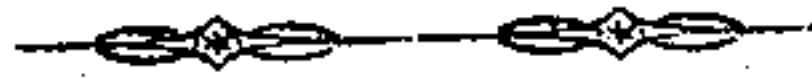
حضرت عباد بن قیس انصاری رضی اللہ عنہ

بعض نے ان کا نام عُبَاد لکھا ہے اور بعض نے عَبَّاد۔ قبیلہ خزرج کے خاندان عدی بن کعب سے ہیں۔ سلسلہ نسب یہ ہے:

عباد رضی اللہ عنہ بن قیس بن عبسہ بن اُمیّہ بن مالک بن عامر بن عدی بن کعب بن خزرج۔

انصار کے سابقین اوّلین میں سے ہیں۔ ابنِ ہشام نے ان کا نام اُن ۷۵ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں درج کیا ہے جو ۱۳ بعدِ بعثت میں مکہ جا کر لیلۃ العقبہ میں سرورِ عالم ﷺ کی بیعت سے مشرّف ہوئے اور حضور ﷺ کو مدینہ تشریف لانے کی دعوت دی۔

عباد رضی اللہ عنہ راہِ حق کے ایک جانباز سپاہی تھے۔ غزوات کا آغاز ہوا تو سب سے پہلے ان کی تلوار بدر کے میدان میں باطل کے خلاف بے نیام ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے اُحُد، خندق، خیبر وغیرہ میں رحمتِ عالم ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا اور ہر معرکے میں اپنی شجاعت کے جوہر دکھائے۔ ۸ ہجری میں موتہ کی خونریز لڑائی میں مردانہ وار لڑتے ہوئے شہادت پائی۔

مشہور فقیہ صحابی حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ، حضرت عباد بن قیس رضی اللہ عنہ کے بھتیجے تھے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

حضرت عمرو بن اخطب انصاری رضی اللہ عنہ

ہجرت نبوی ﷺ کے بعد کا ذکر ہے کہ ایک دن سرورِ عالم ﷺ اپنے جاں نثاروں کے حلقے میں تشریف فرما تھے، دین اور دنیا کی باتیں ہو رہی تھیں اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس مقدس مجلس پر نور کی بارش ہو رہی ہے۔ دورانِ گفتگو میں حضور ﷺ کو پیاس لگی آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے پانی طلب فرمایا۔ ایک خوش صورت صاحب رسول جو ذرا لنگڑا کر چلتے تھے لپک کر اٹھے اور پیالے میں پانی بھر لائے، یکا یک انہوں نے دیکھا کہ پانی میں ایک بال پڑا تھا، انہوں نے جلدی سے یہ بال نکال کر باہر پھینک دیا اور صاف پانی حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔ سرورِ عالم ﷺ بہت خوش ہوئے اور ان صاحب کے سر اور چہرے پر دستِ مبارک پھیر کر دُعا کی۔ ''الٰہی اس کو صاحبِ جمال کر دے۔''

محبوبِ ﷺ ربّ ذوالجلال کی دعا کا یہ اثر ہوا کہ بڑھاپے میں بھی ان صاحب کے چہرے پر جوانی کی آب و تاب تھی اور سو سال کی عمر تک ان کے سر اور ڈاڑھی کے تمام بال سیاہ تھے۔

سیّد المرسلین ﷺ سے صاحب جمال ہونے کی دُعا پانے والے یہ خوش بخت صاحبِ رسول حضرت عمرو بن اخطب انصاری رضی اللہ عنہ تھے۔

سیّدنا حضرت ابوزید عمرو بن اخطب رضی اللہ عنہ کا تعلق قبیلہ خزرج سے تھا۔ سلسلہ نسب یہ ہے:

عمرو رضی اللہ عنہ بن اخطب بن رفاعہ بن محمود بن بیسر بن عبداللہ بن صیف بن ععمیر

بن عدی بن ثعلبہ بن عمرو بن عامر ماء السماء

حضرت عمرو بن اخطب رضی اللہ عنہ کو ہجرتِ نبوی کے بعد قبولِ اسلام کی سعادت نصیب ہوئی اور اس کے ساتھ ہی ان کی زندگی میں حیرت انگیز انقلاب آ گیا وہ ہر وقت اپنی جان راہِ حق میں قربان کرنے کے لیے بے تاب رہتے تھے۔ مسندِ احمد بن حنبل میں ہے کہ انہوں نے عہدِ رسالت کے تیرہ غزوات میں شرکت کی اور ہر معرکے میں نہایت ثابت قدمی سے دادِ شجاعت دی۔ حضور ﷺ سے ان کو بے پناہ محبت اور عقیدت تھی۔ جب بھی موقع ملتا فیضانِ نبوی سے بہرہ یاب ہونے کے لیے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو جاتے تھے۔ اپنے جذبہ فدویت، اخلاص فی الدین اور جوشِ ایمان کی بدولت وہ حضور ﷺ کی شفقت کا مورد بن گئے تھے۔ مسندِ احمد رحمۃ اللہ علیہ ہی کی ایک روایت میں ہے کہ ایک دن حضور ﷺ نے اپنی پشتِ مبارک سے کرتا اٹھا کر فرمایا، عمرو ذرا میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرو، انہوں نے تعمیلِ ارشاد کی۔ ہاتھ پشتِ مبارک سے مہرِ نبوت پر پہنچا تو اس کو اچھی طرح دیکھ کر اپنی آنکھیں روشن کیں۔

سرورِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد چند سال مدینہ میں رہے جب بصرہ آباد ہوا تو وہاں جا کر مستقل سکونت اختیار کر لی اور وہیں ۱۲۰ سال کی عمر میں وفات پائی۔ اس وقت سر کے صرف چند بال سفید ہوئے تھے۔ وفات کے وقت ایک لڑکا اور ایک لڑکی موجود تھے۔

حضرت عمرو بن اخطب رضی اللہ عنہ سے چند احادیث بھی مروی ہیں، جو صحیح مسلم اور سنن میں موجود ہیں ان کے رواۃ میں حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ، ابونہیک ازدی رحمۃ اللہ علیہ، انس بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ اور ابوقلابہ رحمۃ اللہ علیہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت ثابت بن دحداح بلوی رضی اللہ عنہ

(۱)

صلح حدیبیہ (ذیقعدہ ۶ ھ) کے بعد رحمتِ عالم ﷺ واپس مدینہ منورہ تشریف لائے تو ایک دن آپ ﷺ کو اپنے ایک مدنی جاں نثار کی وفات کی خبر پہنچی۔ یہ خبر سُن کر حضور ﷺ سخت ملول و محزون ہو گئے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہمراہ جنازہ کے لیے تشریف لے گئے۔ جب ان کی تدفین ہو چکی تو حضور ﷺ گھوڑا منگا کر سوار ہوئے اور فرمایا:

''جنت میں چھوہارے کی کتنی شاخیں ہیں جو ابنِ دحداح کے لیے لٹکائی گئی ہیں۔''

یہ ابنِ دحداح رضی اللہ عنہ جن کے جنّتی ہونے کی لسانِ رسالت ﷺ نے بشارت دی، سیّدنا حضرت ثابت بن دحداح رضی اللہ عنہ تھے۔

(۲)

حضرت ابوالدحداح ثابت بن دحداح رضی اللہ عنہ کا شمار نہایت عظیم المرتبت صحابہ رضی اللہ عنہم میں ہوتا ہے۔ ان کا تعلق قبیلہ بلی کے خاندان عجلان یا انیف سے تھا جو قبیلہ اوس کی شاخ عمرو بن عوف کا حلیف تھا۔ نسب نامہ یہ ہے:

ثابت بن دحداح رضی اللہ عنہ بن نعیم بن غنم بن ایاس (بعض روایتوں میں حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کے والد کا نام الدحداحۃ بھی آیا ہے)

ہجرت کے بعد سرورِ عالم ﷺ نے مدینہ منورہ میں نزولِ اجلال فرمایا تو اوس و خزرج اور ان کے خلفاء میں جو لوگ ابھی تک نعمتِ اسلام سے محروم تھے وہ بھی بڑی سُرعت کے ساتھ دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ حضرت ثابت بن دحداح رضی اللہ عنہ بھی اسی زمانہ میں شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہوئے۔ کسی روایت سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ

غزوۂ بدر سے پہلے مسلمان ہوئے یا بعد میں۔ بہر صورت غزوۂ بدر کے شرکاء میں ان کا نام نہیں ہے۔ ۳ ھ میں غزوۂ اُحد پیش آیا تو اس میں حضرت ثابت بن دحداح رضی اللہ عنہ نے جانبازانہ شرکت کی اور شجاعت کا حق ادا کر دیا۔ جس وقت ایک اتفاقی لغزش سے جنگ کا پانسہ پلٹ گیا اور مسلمانوں میں انتشار پھیل گیا تو حضرت ثابت رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور پکار کر کہا:

''اے گروہِ انصار اِدھر آؤ اِدھر۔ میں ہوں ثابت بن دحداح۔ اگر رسول اللہ ﷺ شہید ہو گئے تو اللہ زندہ ہے اور ہمیشہ موجود رہے گا تمہارا فرض ہے کہ دین کے لیے لڑو، اللہ تعالیٰ تمہیں غلبہ دینے والا ہے اور تمہاری مدد کرنے والا ہے۔''

حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کی آواز سن کر چند انصاری جانباز اُن کے گرد جمع ہو گئے اور سب نے مل کر مشرکین کے ریلے کو روکا۔ دوسری طرف سے ایک اور ریلا آیا جس میں خالد بن ولید، عکرمہ بن ابو جہل، ضرار بن خطاب اور عمرو بن عاص جیسے قریش کے نامور جنگجو شامل تھے۔ ان لوگوں نے انصاری جانبازوں کو گھیر لیا۔ حضرت ثابت رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے جم کر مقابلہ کیا۔ اسی اثناء میں خالد بن ولید نے بڑھ کر حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کو نیزہ مارا اور وہ شدید زخمی ہو کر زمین پر گر پڑے۔ ایک روایت میں ہے کہ انہوں نے اسی موقع پر جامِ شہادت پیا اور وہ غزوۂ احد کے سب سے آخری شہید تھے۔ لیکن دوسری مستند روایتوں سے اس موقع پر ان کی شہادت ثابت نہیں ہوتی۔ ان روایتوں کے مطابق لڑائی کے بعد زخمیوں اور شہداء کی تلاش کی گئی تو لوگوں نے دیکھا کہ حضرت ثابت رضی اللہ عنہ اگرچہ شدید زخمی ہیں لیکن ان کی سانس چل رہی ہے۔ چنانچہ انہیں اٹھا کر مدینہ منورہ لے گئے۔ علاج معالجہ سے زخم بظاہر مندمل ہو گیا اور کئی سال تک وہ اچھے بھلے رہے لیکن صلح حدیبیہ کے بعد ایک دن یہی زخم پھر عود کر آیا اور اسی کے صدمے سے انہوں نے وفات پائی۔ وفات کے وقت کوئی اولاد زندہ نہیں تھی اور غالباً اہلیہ بھی وفات پا چکی

تھیں اس لیے حضور ﷺ نے ان کا ترکہ ان کے بھانجے حضرت ابولبابہ رفاعہ رضی اللہ عنہ بن عبدالمنذر کو عطا فرمایا۔

(۴)

حضرت ثابت بن دحداح رضی اللہ عنہ کے گلشنِ اخلاق میں اخلاص فی الدین، انفاق فی سبیل اللہ، جوشِ ایمان اور جذبہ فدویت سب سے خوشرنگ پھول ہیں۔ اپنے انہی اوصاف کی بدولت انہوں نے بارگاہِ رسالت میں درجہ محبوبیت حاصل کر لیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی:

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗۤ اَجْرٌ كَرِیْمٌ ۝
(الحدید)

(کون ہے جو اللہ کو قرض دے، اچھا قرض تاکہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا کر واپس دے، اور اس کے لیے بہترین اجر ہے۔)

تو حضرت ثابت بن دحداح رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

''یارسول اللہ، کیا اللہ تعالیٰ ہم سے قرض چاہتا ہے؟''

حضور ﷺ نے فرمایا: ''ہاں اے ابوالدحداح''

انہوں نے عرض کیا: ''یارسول اللہ ذرا اپنا دستِ مبارک مجھے دکھایئے۔''

حضور ﷺ نے اپنا دستِ مبارک ان کی طرف بڑھایا تو انہوں نے حضور ﷺ کا دستِ مبارک اپنے ہاتھ میں لے کر کہا: ''اے اللہ کے رسول میں اپنا باغ اللہ تعالیٰ کو قرض دیتا ہوں۔''

یہ باغ جو حضرت ثابت رضی اللہ عنہ نے راہِ حق میں صدقہ کر دیا کوئی معمولی باغ نہیں تھا بلکہ اس میں کھجور کے چھ سو درخت تھے اور اسی میں ان کا مکان تھا۔ حضور ﷺ سے یہ بات کر کے وہ سیدھے گھر پہنچے اور اپنی اہلیہ کو پکار کر کہا:

''وحداح کی ماں گھر سے نکل آؤ میں نے یہ باغ اپنے ربّ کو قرض دے دیا ہے۔''

ان کی اہلیہ (حضرت اُمِ دحداح رضی اللہ عنہا) بولیں: ''ابو دحداح تم نے نفع کا سودا کیا ہے۔'' یہ کہہ کر اپنا سامان اور بچے (دحداح) کو لے کر باغ سے باہر نکل آئیں۔ اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کا دحداح نامی ایک لڑکا تھا جو بعد میں ان کے سامنے ہی فوت ہو گیا تھا۔

ایک اور روایت میں جو حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے یہ واقعہ ایک دوسری صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا: ''یارسول اللہ میں اپنے مکان کی دیوار اٹھانا چاہتا ہوں۔ بیچ میں فلاں شخص کا کھجور کا درخت ہے اگر آپ اس شخص کو اس بات پر آمادہ کر لیں کہ وہ یہ درخت مجھے دے دے تو میں اپنی دیوار کی ٹیک اس سے لگا کر دیوار کو بآسانی مکمل کر لوں گا۔''

حضور ﷺ نے اُس آدمی سے فرمایا کہ تم اپنا وہ درخت اس کو دے دو، اس کے عوض اللہ تعالیٰ تمہیں جنت میں کھجور کا درخت عطا فرمائے گا۔

اس آدمی نے درخت دینے میں غدر کیا۔ حضرت ابوالدحداح رضی اللہ عنہ (ثابت رضی اللہ عنہ) کو معلوم ہوا تو وہ اس شخص کے پاس پہنچے اور اس سے کہا:

''بھائی تم اپنا کھجور کا درخت مجھے دے دو اور اس کے عوض میرا کھجور کا باغ لے لو۔''

وہ شخص اس بات پر راضی ہو گیا۔ اس کے بعد حضرت ثابت رضی اللہ عنہ سرورِ عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

> ''یارسول اللہ میں نے اس شخص سے وہ کھجور کا درخت اپنے باغ کے عوض خرید لیا ہے یہ میں آپ کی نذر کرتا ہوں۔ آپ مکان کی دیوار اٹھانے والے ضرورت مند کو دے دیجئے۔''

یہ سن کر حضور ﷺ بہت مسرور ہوئے اور کئی بار فرمایا: ''ابو الدحداح کے لیے جنت میں کھجور کے کتنے بڑے اور بھاری خوشے ہیں۔''

اس کے بعد حضرت ثابت رضی اللہ عنہ اپنی اہلیہ کے پاس پہنچے اور ان سے کہا:

''اے اُمِ دحداح، اس باغ سے نکل چل، میں نے اس باغ کو جنت کے کھجور کے عوض بیچ ڈالا ہے۔''

سعادت مند بیوی نے کہا: ''یہ تو بڑا نفع مند سودا ہوا۔''

علامہ ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ''اُسد الغابہ'' میں لکھا ہے کہ جب سورۃ الحدید کی اوپر بیان کی گئی آیت نازل ہوئی تو حضرت ثابت رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ ﷺ سے دریافت کیا: ''یا رسول اللہ کیا اللہ تعالیٰ ہم سے قرض مانگتا ہے؟''

جب حضور ﷺ نے اثبات میں جواب دیا تو انہوں نے اپنا مال صدقہ کر دیا۔

اس روایت میں مال کی تصریح نہیں کی گئی، ہو سکتا ہے کہ حضرت ثابت رضی اللہ عنہ نے باغ کے علاوہ بھی کوئی مال صدقہ کیا ہو۔ بہر صورت یہ روایات حضرت ثابت بن دحداح رضی اللہ عنہ کے جوشِ ایمان اور اخلاص فی الدین پر دال ہیں۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ
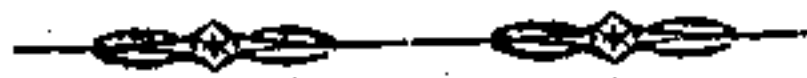
حضرت عُمیر بن حُمام انصاری رضی اللہ عنہ

ہجرتِ نبوی ﷺ سے پہلے اور فوراً بعد اہلِ مدینہ میں سے جو لوگ سعادت اندوزِ ایمان ہوئے ان میں ایک بڑی تعداد خزرج کے خاندان بنوسلمہ سے تعلق رکھتی تھی۔ ان سلمی اصحاب میں حمام بن جموح (بن زید بن حرام) کے سعادت مند فرزند عمیر رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ اسلام نے ان میں شہادت کی رُوح پھونک دی اور وہ سیّد الانام ﷺ کے ان جاں نثاروں میں شامل ہو گئے جو آپ ﷺ کے ذرا سے اشارے پر جان قربان کرنا اپنے لیے باعثِ صد افتخار و سعادت سمجھتے تھے۔ انصار اور مہاجرین کے درمیان بھائی چارہ قائم ہوا۔ تو حضور ﷺ نے حضرت عمیر بن حُمام رضی اللہ عنہ کو جلیل القدر مہاجر حضرت عبیدہ بن الحارث رضی اللہ عنہ کا دینی بھائی بنایا۔ غزوۂ بدر میں حضرت عمیر رضی اللہ عنہ ان تین سو تیرہ نفوسِ قدسی میں شامل تھے جنہیں اس موقع پر رحمتِ دو عالم ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل ہوا۔

لڑائی شروع ہونے سے پہلے سرورِ عالم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے خطبہ دیا۔ جس میں فرمایا:۔

> ''خدائے بزرگ و برتر کی قسم کہ جس کے قبضہ قدرت میں محمد ﷺ کی جان ہے جو کوئی رضائے الٰہی کی خاطر دشمنانِ حق سے لڑ کر مارا جائے گا۔ اسے بہشت نصیب ہوگی۔''

حضرت عمیر بن حمام رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کا ارشاد سُنا تو وہ اپنی صف سے نکل کر حضور ﷺ کے سامنے بڑے ادب سے کھڑے ہو گئے اور عرض کیا:

> ''یارسول اللہ، راہِ خدا میں شہید ہونے پر کیا وہی جنت ملے گی جس کے

بارے میں اللہ نے فرمایا ہے کہ اس کا طول وعرض آسمان اور زمین کی پہنائی کے برابر ہے۔''

ارشاد ہوا: ''ہاں عمیر! وہی جنت جس کے بارے میں عرضها السموات و الارض ''فرمایا گیا ہے۔''

یہ سن کر حضرت عمیر رضی اللہ عنہ کی زبان پر بے اختیار بخ بخ (واہ واہ) کے الفاظ آ گئے اور پھر انہوں نے عرض کیا:

''اے اللہ کے رسول! کیا میں بھی اس جنت کا حقدار ہو سکتا ہوں۔''

حضور ﷺ نے فرمایا: ''تم ضرور اس جنت میں داخل ہو گے۔''

اس وقت حضرت عمیر رضی اللہ عنہ کھجوریں کھا رہے تھے۔ جونہی لسانِ رسالت ﷺ سے یہ لفظ ادا ہوئے۔ انہوں نے کھجوریں پھینک دیں اور بولے:

''مجھ پر اب اتنا وقفہ بھی شاق ہے جس میں یہ کھجوریں کھا سکوں۔ میرے اور جنت کے درمیان اب کوئی چیز حائل نہیں ہو سکتی۔''

پھر تلوار چلاتے ہوئے مردانہ وار صفِ جنگاہ میں گھس گئے اور خالد بن الاعلم حلیفِ قریش کے ہاتھ سے جامِ شہادت پی کی جنت الفردوس میں پہنچ گئے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ
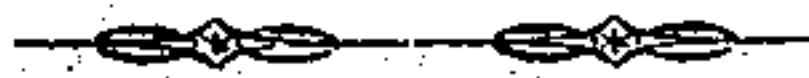
حضرت زیاد بن سکن اشہلی رضی اللہ عنہ

حضرت زیاد بن سکن رضی اللہ عنہ کا شمار انصار کے سابقین اوّلین میں ہوتا ہے۔ وہ اوس کے خاندان بنو عبد الاشہل کے چشم و چراغ تھے۔ نسب نامہ یہ ہے:

زیاد رضی اللہ عنہ بن السکن بن رافع بن امراء القیس بن زید بن عبد الاشہل۔

حضرت زیاد رضی اللہ عنہ کو سرورِ عالم ﷺ سے بے پناہ محبت اور عقیدت تھی۔ بقول ابن الکلبی وہ اصحابِ بدر میں سے ہیں۔ غزوۂ اُحد میں بھی حضور ﷺ کے ہمرکاب تھے۔ جب ایک اتفاقی غلطی سے مسلمانوں میں انتشار پھیل گیا تو ایک نازک موقع پر حضور ﷺ نے فرمایا، ''کون ہے جو میرے لیے اپنی جان اللہ کی راہ میں فروخت کرے۔'' حضرت زیاد بن السکن رضی اللہ عنہ قریب ہی کھڑے تھے۔ جونہی ان کے کانوں میں حضور ﷺ کی آواز پڑی وہ اپنے چار انصاری ساتھیوں کے ساتھ لپک کر یہ کہتے ہوئے آگے بڑھے ''ہم حاضر ہیں یارسول اللہ'' پھر وہ حضور ﷺ پر نرغہ کرنے والے مشرکین کے گروہ میں گھس گئے اور ایسی جانبازی سے لڑے کہ مشرکین کا منہ پھر گیا۔ لیکن اس کشمکش میں حضرت زیاد رضی اللہ عنہ شدید زخمی ہو کر گر پڑے۔ سرورِ عالم ﷺ نے انہیں اپنے قدم مبارک سے ٹیک لگا کر بٹھایا۔ اسی وقت حضرت زیاد رضی اللہ عنہ نے آخری ہچکی لی اور اپنی جان جاں آفرین کے سپرد کردی۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ
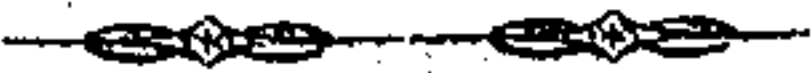
حضرت عمارہ بن زیاد اشہلی رضی اللہ عنہ

حضرت عمارہ رضی اللہ عنہ، حضرت زیاد بن السکن رضی اللہ عنہ کے فرزندِ سعادت مند تھے۔ وہ بھی پدرِ بزرگوار کے ساتھ غزوۂ اُحد میں شریک تھے۔ اس سے پہلے غزوۂ بدر میں بھی شرکت کی سعادت حاصل کر چکے تھے۔ اُحد کے دن اس شان سے لڑے کہ شجاعت بھی آفریں پکار اٹھی۔ تیرہ زخم کھا چکے تھے لیکن میدانِ جنگ سے منہ نہ موڑتے تھے، آخر چودھویں زخم کے ساتھ طاقت جواب دے گئی۔ اور بے سکت ہو کر گر پڑے۔ لوگوں نے سمجھا کہ شہید ہو گئے ہیں۔ حضور ﷺ کو اطلاع دی گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا ''عمارہ رضی اللہ عنہ کی لاش میرے پاس لاؤ۔'' صحابہ رضی اللہ عنہم فوراً ان کی طرف دوڑے۔ دیکھا تو ابھی سانس چل رہی تھی۔ اٹھا کر حضور ﷺ کے روبرو رکھ دیا۔ بولنے کی سکت نہ تھی لیکن ان کی بے نُور ہوتی ہوئی آنکھیں زبانِ حال سے پکار رہی تھیں۔

گر نثارِ قدمِ یارِ گرامی نہ کنم ۔۔۔ گوہرِ جاں بچہ کارے دگرم

حضور ﷺ نے ان کا سر اپنے مقدس قدموں پر رکھ لیا اور وہ اپنے رخساروں سے آپ ﷺ کے پائے اقدس کے تلووں کو سہلاتے ہوئے روضہ رضواں کو سدھارے۔

اللہ اللہ یہ جذبہ عقیدت اور یہ خوش بختی کہ دمِ واپسیں ہے اور سر محبوب کے قدموں پر ہے اور محبوب کون؟ فخرِ موجودات سیّد الانبیاء شہ لولاک ﷺ۔ حضرت عمارہ بن زیاد رضی اللہ عنہ کی قابلِ رشک شہادت اس شعر کا مصداق تھی۔

منم وہمیں تمنا کہ بوقتِ جاں سپردن
برخ تو دیدہ باشم تو درونِ دیدہ باشی

بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت عمارہ بن زیاد رضی اللہ عنہ نے غزوۂ بدر میں شہادت پائی۔ واللہ اعلم بالصواب۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت ثعلبہ بن غَنمہ انصاری رضی اللہ عنہ

خزرج کے خاندانِ سلمہ سے تھے۔ سلسلہ نسب یہ ہے:

ثعلبہ بن غنمہ رضی اللہ عنہ بن عدی بن ہانی بن عمرو بن سواد بن غنم بن کعب بن سلمہ

ہجرتِ نبوی ﷺ سے قبل مشرف بہ اسلام ہوئے اور پھر ۱۳ بعدِ بعثت میں مدینہ کے دوسرے اہلِ حق کے ساتھ حج کے لیے مکہ گئے۔ اسی موقع پر بیعتِ عقبہ کبیرہ (لیلۃ العقبہ) ہوئی جس میں انہوں نے رحمتِ عالم ﷺ کے جمالِ جہاں آرا سے اپنی آنکھیں روشن کیں اور آپ ﷺ کی بیعت کی سعادت حاصل کی۔ مکہ معظّمہ سے واپس مدینہ آئے تو جوشِ ایمان کا یہ عالم تھا کہ کچھ دوسرے نوجوانوں کے ساتھ مل کر اپنے قبیلے کے بُت توڑتے پھرتے تھے۔ اہلِ سِیَر نے ان کے ساتھیوں میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ کا نام خصوصیت سے لیا ہے۔ سرورِ عالم ﷺ نے مدینہ منوّرہ کو اپنے قُدومِ میمنت لزوم سے مشرّف فرمایا تو دوسرے انصار کے ساتھ حضرت ثعلبہ رضی اللہ عنہ نے بھی حضور ﷺ کے سامنے دیدہ و دل فرشِ راہ کر دیئے۔

رمضان ۲ ہجری میں حضرت ثعلبہ رضی اللہ عنہ کو غزوۂ بدر میں سرورِ عالم ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل ہوا۔ اگلے سال انہوں نے غزوۂ اُحد میں دادِ شجاعت دی۔ غزوۂ احزاب میں بھی بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ شریک ہوئے اور اسی غزوے میں مردانہ وار لڑتے ہوئے اپنی جان راہِ حق میں قربان کر دی۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ
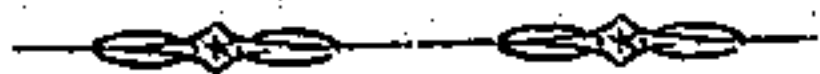
حضرت عبداللہ بن زید انصاری رضی اللہ عنہما

(صاحب الاذان)

(۱)

رحمتِ عالم ﷺ نے مکہ سے ہجرت فرما کر سرزمینِ مدینہ کو اپنے قُدومِ میمنت لزوم سے رشکِ جناں بنایا تو آپ ﷺ نے کچھ عرصہ بعد مسجدِ نبوی کی تعمیر کا اہتمام فرمایا۔ جب مسجد تعمیر ہو چکی تو آپ ﷺ نے ضرورت محسوس فرمائی کہ نماز با جماعت ادا کرنے کے لیے عام مسلمانوں کو نماز کے وقت سے کچھ دیر پہلے اطلاع دینی چاہیے۔ حضور ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرمایا کہ اس مقصد کے لیے کون سا طریقہ اختیار کرنا مناسب ہوگا؟ کسی نے عرض کیا کہ کسی بلند جگہ پر آگ روشن کر دی جایا کرے۔ کسی نے رائے دی کہ نماز کے وقت کے قریب مسجد پر جھنڈا بلند کر دیا جائے۔ کسی نے مشورہ دیا کہ جس طرح یہود اور نصاریٰ اپنی عبادت گاہوں میں نرسنگھا یا ناقوس بجاتے ہیں ہم بھی نماز کے اعلان کے لیے اسی طرح کیا کریں۔ لیکن حضور ﷺ ان میں سے کسی تجویز پر بھی مطمئن نہ ہوئے اور اس مسئلہ میں متفکر رہے تاہم وقتی طور پر آپ ﷺ نے ناقوس بجانے والی تجویز کو منظور فرما لیا۔ ابھی اس تجویز پر عمل نہیں ہوا تھا کہ دوسرے دن علی الصباح ایک انصاری صاحب رضی اللہ عنہ رسول ﷺ بارگاہِ رسالت ﷺ میں حاضر ہوئے اور یوں عرض پیرا ہوئے:

''یا رسول اللہ، رات خواب میں میرے سامنے ایک شخص آیا جس کے ہاتھ میں ناقوس تھا، میں نے اس سے کہا، ''اے اللہ کے بندے! یہ ناقوس تم بیچتے ہو؟'' اس نے کہا، ''تم اس کو کیا کرو گے؟'' میں نے کہا، ''ہم اس کو بجا

کر لوگوں کو نماز کے لیے بلائیں گے۔" اس نے کہا، "کیا میں تم کو ایک چیز نہ بتا دوں جو اس مقصد کے لیے ناقوس بجانے سے بہتر ہے"؟ میں نے کہا، "ہاں ضرور بتاؤ!" اس نے کہا "کہو!

"الله اکبر ، الله اکبر ، الله اکبر ، الله اکبر، اشهد ان لا اله الا الله، اشهد ان لا اله الا الله، اشهد ان محمدًا رسول الله، اشهد ان محمدًا رسول الله، حی علی الصلوٰة، حی علی الصلوٰة، حی علی الفلاح ، حی علی الفلاح، الله اکبر ، الله اکبر، لا اله الا الله ۔"

یہ تمام کلمات بتا کر وہ شخص مجھ سے ذرا پیچھے ہٹ گیا اور تھوڑی دیر بعد اس نے کہا، "پھر جب نماز قائم کرو تو اقامت اس طرح کہو:

"الله اکبر ، الله اکبر، اشهد ان لا اله الا الله، اشهد ان محمدًا رسول الله، حی علی الصلوٰة، حی علی الفلاح ، قد قامت الصلوٰة، قد قامت الصلوٰة، الله اکبر ، الله اکبر، لا اله الا الله ۔"[1]

---

[1] یہ روایت سنن ابی داؤد اور مسندِ دارمی سے لی گئی ہے۔ صحیحین میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں بھی کلماتِ اقامت کو ایک ہی ایک دفعہ کہنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن مسندِ احمد بن حنبل، جامع ترمذی، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، مسندِ دارمی، سننِ ابنِ ماجہ میں حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت بھی ملتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے اقامت کے سترہ کلمے سکھائے، الله اکبر چار مرتبہ اشهد ان لا اله الا الله دو مرتبہ اشهد ان محمدًا رسول الله دو مرتبہ حی علی الصلوٰة دو مرتبہ، حی علی الفلاح دو مرتبہ، قد قامت الصلوٰة دو مرتبہ، الله اکبر دو مرتبہ لا اله الا الله ایک مرتبہ۔

امام ابوحنیفہ امام سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ اور کوفہ کے دوسرے فقہاء کا اسی پر عمل ہے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ جن حدیثوں میں کلمات اقامت کو ایک دفعہ کہنے کا ذکر ہے وہ اس ابتدائی دور سے متعلق ہیں، جب اذان و اقامت کی شروعات ہوئی تھی۔ اس کے بعد عرصہ تک یہی طرزِ عمل رہا لیکن سات آٹھ سال بعد (شوال ۸ ھ میں) غزوۂ حنین سے واپسی پر حضور ﷺ نے حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کو اذان اور اقامت کی تلقین فرمائی تو اس میں آپ ﷺ نے اقامت میں بھی ہر کلمہ دو دو دفعہ کہنے کی تلقین فرمائی اس لیے بعد کا حکم ہونے کی وجہ سے اسی کو ترجیح حاصل ہے۔

سرورِ دوعالم ﷺ نے یہ خواب سن کر فرمایا، ''یہ سچا خواب ہے انشاء اللہ! تم بلال رضی اللہ عنہ کے ساتھ کھڑے ہوکر ان کلمات کی تلقین کرو جو تم نے خواب میں دیکھے ہیں اور وہ اذان پکاریں کیونکہ ان کی آواز تم سے بلند ہے۔'' انہوں نے حضور ﷺ کے حکم کی تعمیل کی اور اسی دن سے یہ اذان قیامت تک کے لیے اسلام کا شعار قرار پا گئی...... یہ صاحب رسول ﷺ جن کو یہ عظیم شرف حاصل ہوا کہ سیّد المرسلین فخرِ موجودات ﷺ نے ان کے خواب کو رویاء حق قرار دے کر ابد تک اس پر عملدرآمد کا حکم دیا، حضرت عبداللہ بن زید انصاری رضی اللہ عنہ تھے جو اپنے اس شرف کی بناء پر ''صاحبُ الاذان'' کے لقب سے مشہور ہوئے۔

(۲)

حضرت ابومحمد عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کا تعلق خزرج کے خاندان حارث بن خزرج سے تھا۔ سلسلہ نسب یہ ہے:

عبداللہ بن زید بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ بن عبدِ ربہ بن ثعلبہ بن زید بن حارث بن خزرج۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نہایت نیک طینت اور پاک باطن تھے۔ ہجرتِ نبوی ﷺ سے پہلے ان کے کانوں میں دعوتِ حق کی آواز پڑی تو انہوں نے اس کو بلا تامّل دل و جان سے قبول کر لیا اور ۱۳ بعدِ بعثت کے موسم حج میں مکہ جا کر لیلۃ العقبہ میں حضور ﷺ کی بیعت سے مشرف ہوئے۔

رحمتِ عالم ﷺ مدینہ منوّرہ تشریف لائے تو مسجدِ نبوی کی تعمیر کے بعد حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو ''صاحب الاذان'' ہونے کا عظیم شرف حاصل ہوا۔ سنن ابی داؤد اور مُسندِ دارمی میں یہ واقعہ خود ان کی زبانی منقول ہے۔ اس میں یہ اضافہ بھی ہے کہ: (جب بلال رضی اللہ عنہ ان کی تلقین کے مطابق اذان دے چکے تو) عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ اپنے گھر سے چادر گھسیٹتے ہوئے ہوئے نکلے انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کی، ''یارسول اللہ اس پاک ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا، میں نے

بھی ویسا ہی خواب دیکھا ہے جیسا عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ نے دیکھا۔" تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، "فللّٰہ الحمد۔"

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سرورِ دوعالم ﷺ کے نہایت مخلص جاں نثار تھے اور راہِ حق میں اپنی جان اور مال قربان کرنے کا جذبہ ہر وقت ان کے سینے میں موجزن رہتا تھا۔ غزوات کا آغاز ہوا تو وہ بدر، اُحد، احزاب اور دوسرے تمام غزوات میں رحمتِ عالم ﷺ کے ہم رکاب رہے اور ہر معرکے میں جذبہ فدویت کا مظاہرہ کیا۔ حافظ ابنِ عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے "الاستیعاب" میں لکھا ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر حضور ﷺ نے قبیلہ حارث بن خزرج کا علَم حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کو مرحمت فرمایا تھا۔

حجۃ الوداع کے موقع پر حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو ایک اور مہتم بالشان شرف حاصل ہوا۔ مُسندِ احمد حنبل میں ہے کہ حجۃ الوداع میں سرورِ دوعالم ﷺ نے بہت سی بکریاں لوگوں میں تقسیم فرمائیں، حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بھی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے لیکن آپ ﷺ نے انہیں کوئی بکری نہ دی۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے موئے مبارک ترشوائے تو ان میں سے کچھ حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کو عطا فرمائے۔ مہندی سے رنگے ہوئے یہ موئے مبارک حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے لیے ایک ایسی نعمت تھے کہ دنیا جہاں کے خزانے اس کے سامنے ہیچ تھے۔ خود انہوں نے زندگی بھر ان موئے مبارک کو اپنے سینے سے لگائے رکھا اور ان کے بعد ان کے خاندان نے اس دولتِ لازوال کو اپنے پاس تبرکاً محفوظ رکھا۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے ایثار و استغناء کی دولت سے بھی مالا مال کیا تھا، ابنِ اثیر رحمۃ اللہ علیہ نے "اُسد الغابہ" میں بیان کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہما کے پاس معمولی جائیداد تھی جس سے بمشکل اپنا اور اپنے اہل و عیال کا پیٹ پالتے تھے لیکن جب انہیں انفاق فی سبیل اللہ کے اجر و ثواب کا علم ہوا تو اپنی ساری کی ساری جائیداد راہِ حق میں صدقہ کر دی۔ ان کے والدہ حضرت زید بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ بھی صحابی تھے، انہوں نے

بارگاہِ رسالت ﷺ میں حاضر ہو کر یہ واقعہ عرض کیا تو حضور ﷺ نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو بُلا بھیجا، وہ حاضر ہوئے تو فرمایا، "اللہ تعالیٰ نے تمہارا صدقہ قبول کیا لیکن اب باپ کی میراث کے نام پر تم کو واپس دیتا ہے۔ اس کو قبول کرلو۔"

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے ۳۲ھ میں بعہدِ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ وفات پائی، اس وقت عمر کی چونسٹھ منزلیں طے کی تھیں۔ امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بہ نفسِ نفیس نمازِ جنازہ پڑھائی اور فضل و کمال کے اس مہرِ جہاں تاب کو آغوشِ لحد میں اتارا...... حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اپنے پیچھے دو اولادیں چھوڑیں، ایک صاحبزادہ اور ایک صاحبزادی۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہما سے صرف ایک حدیث مروی ہے جو اذان کے بارے میں ہے لیکن حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ نے تہذیب التہذیب میں ان سے مروی سات حدیثیں درج کی ہیں۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ
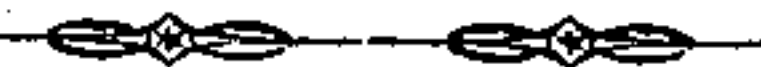
حضرت ابو اسید انصاری رضی اللہ عنہ

مالک نام تھا اور ابو اسید کنیت۔ انہوں نے اپنی کنیت ہی سے شہرت پائی۔ خزرج کے خاندان بنی ساعدہ سے تھے۔ سلسلہ نسب یہ ہے:

مالک رضی اللہ عنہ بن ربیعہ بن بدن بن عامر بن عوف بن حارثہ بن عمرو بن خزرج بن ساعدہ بن کعب بن خزرج اکبر

ہجرتِ نبوی ﷺ سے قبل سعادت اندوزِ اسلام ہوئے، اس وقت ان کا عنفوانِ شباب تھا۔ سرورِ عالم ﷺ مدینہ منورّہ تشریف لائے تو حضرت ابو اسید رضی اللہ عنہ کو گویا ہفت اقلیم کی دولت مل گئی، فیضانِ نبوی نے خوب خوب فیض یاب ہوئے۔ سرورِ عالم ﷺ سے بے انتہا محبت اور عقیدت تھی اور ہر وقت آپ پر اپنی جان قربان کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ سب سے پہلے ان کی اور عقیدت تھی اور ہر وقت آپ ﷺ پر اپنی جان قربان کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ سب سے پہلے ان کی تلوار بدر کے میدان میں چمکی اس کے بعد اُحد، خندق وغیرہ دوسرے تمام غزوات میں بھی انہوں نے حضور ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا اور ہر غزوے میں جان ہتھیلی پر رکھ کر لڑے۔ فتح مکہ کے موقع پر حضور ﷺ نے انہیں بنو ساعدہ کا عَلَم مرحمت فرمایا۔ سرورِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد ان کے کیا مشاغل رہے؟ کتبِ سِیَر ان کے بارے میں خاموش ہیں ہاں اتنا پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے ۶۰ھ میں سفرِ آخرت اختیار کیا۔ اس وقت ان کی عمر ۷۸ برس کی تھی اور تمام اصحابِ بدر ان سے پہلے وفات پا چکے تھے گویا وہ حق و باطل کے معرکہ اوّل میں شریک ہونے والے آخری صحابی تھے اور ان کی وفات سے معرکہ بدر کی

آخری نشانی بھی دنیا سے روپوش ہوگئی۔ حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں ان کی بینائی جاتی رہی تھی۔ اپنے پیچھے چار لڑکے حمید، زبیر، منذر اور حمزہ چھوڑے۔ کتبِ حدیث میں ان سے مروی چند احادیث بھی موجود ہیں جن کے راویوں میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ، حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ، ابوسلمہ رضی اللہ عنہ اور ابراہیم بن سلمہ رحمۃ اللہ علیہ قابلِ ذکر ہیں۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ
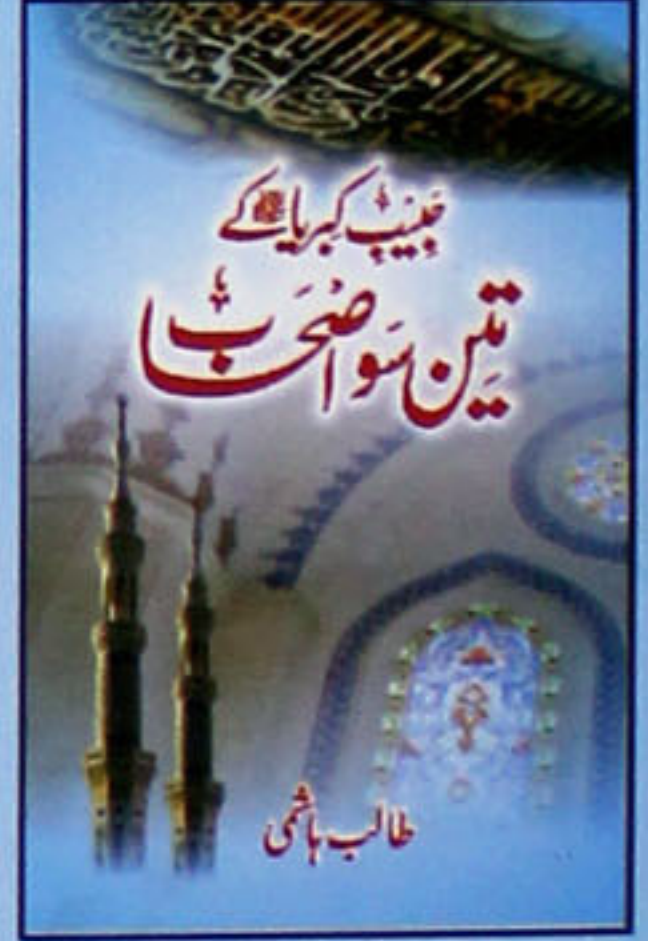
البدر پبلی کیشنز

23۔ راحت مارکیٹ اردو بازار لاہور

Ph: 042-37225030 / 37245030

Mob: 0333-4173066 / 0300-4745729